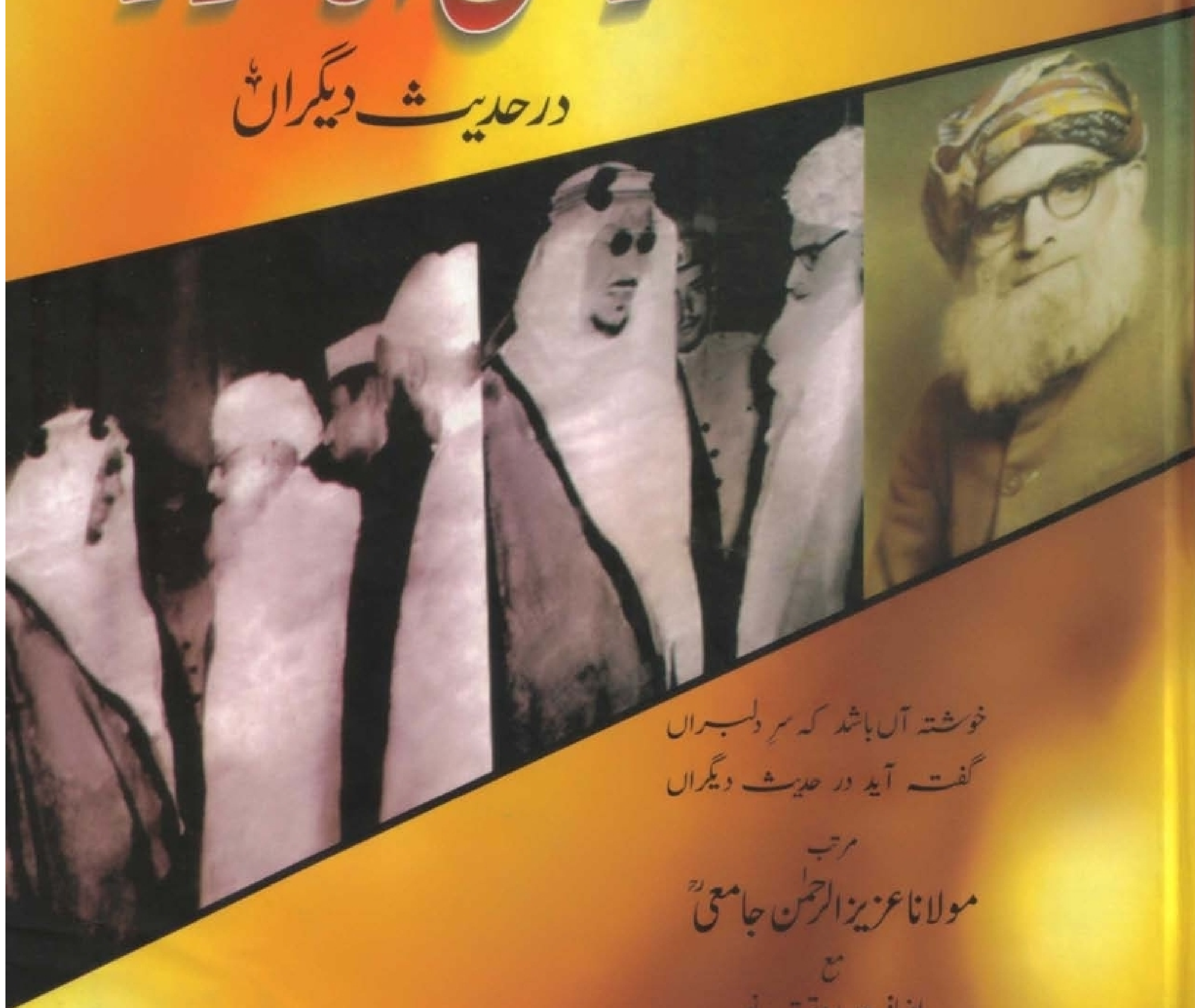
رئیسؒ الاحرار

در حدیث دیگراںؒ



خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

مرتب

مولانا عزیز الرحمٰن جامعیؒ

مع

اضافہ جدید و ترتیب نو

مشہود مُفتی (لندن)

ہندوستان کی جنگِ آزادی

اور

عُلمائے لدھیانہ

مع

مجلس احرار اسلام ہند کے بانی و صدر رئیس الاحرار

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کی سیاسی زندگی

فتاویٰ قادریہ:

مرزائیوں کے خلاف سب سے پہلا فتوی تکفیر

فتویٰ نصرۃ الابرار:

کانگریس میں شمولیت اور ہندوستان کی آزادی کا فتوی





Rais-ul-Ahrar Moulana Habib-ur-Rehman & Shah Sasood Awal (King of Soudia, 1955)



Rais-ul-Ahrar Moulana Habib-ur-Rehman Ludhianvi & shah Sassod Awal (King of Soudia)
& Others (1955)

”جب لوہے کی زنجیریں میرے ہاتھوں میں ڈالی گئیں تو مجھے بے حد خوشی حاصل ہوئی کہ سچائی اور آزادی کے راستے میں کام کرنے والے اہلِ حق اور سچائی کی آواز بلند کرنے والے مجاہدین کی سُنت ادا کر رہا ہوں۔“

مولانا حبیب الرحمان لدھیانویؒ
صدر آل انڈیا مجلس احرار اسلامؒ

فہرست

نمبر	عنوان	صفحہ
1	پیش لفظ	7
2	پیش لفظ جو "رئیس الاحرار" کتاب کے بارے میں لکھا گیا۔	8
3	نذرِ عقیدت	11
4	شیر خدا کا ایمان	12
5	علامہ کاشمیری کا فرمان	13
6	خطوط	15
7	"نور" علیٰ نور کا عکس	12
8	شورش کی تحریر "چٹان" میں	18
9	حَبیب (نظم)	20
10	سید الاحرار	21
11	تحریکِ احرار	22
12	مولانا حَبیب الرحمن صاحب لدھیانویؒ: چند نقوش و تاثرات	24
13	مجلس احرار کی تشکیل نو	26
14	گاندھی جی سے ملاقات	26
15	مولانا حَبیب الرحمٰن کا انتقال	26
16	جواہر لال نہرو کی رائے مولانا کی وفات پر	27
17	حوالہ جات	28
18	علمائے لدھیانہ کا فتویٰ دار الحرب	28
19	جواب نمبر ۲	29
20	کانگریس کے مقاصد قیام	30
21	لیگ کے موجودہ قائدین	31
22	رئیس الاحرار کی رہائی اور مفتی کفایت اللہ صاحب کا منظوم خراجِ عقیدت	32
23	نصرۃ الابرار	34
24	معذرت نامہ علماء	35
25	تاراچند کی کتاب کے صفحہ کا عکس	36
26	خاندان عطاء لدھیانہ کے متعلق حکیم الاسلام کے تاثرات	37
27	حواشی	40
28	مولانا حبیب الرحمان چٹانوں کا تحمل از شورش کشمیری	42
29	مولانا حَبیب الرحمان لدھیانوی	43
30	میاں افتخار الدین	45
31	رئیس الاحرار منٹگمری جیل میں	47
32	مفتی محمد نعیم کی مقدمہ بہاولپوری میں شرکت	51
33	مولانا مفتی ضیاء الحسن لدھیانوی	52
34	روزنامہ جنگ لندن	53
35	رئیس الاحرار	55
36	حرف تحسین	58
37	مقدمہ	59
38	حبیب اور خاندانِ حَبیب	64
39	پنجاب کا ہادی اور مربیّ	67
40	کیسے کہوں کہ درد کہاں ہے کہاں نہیں	69
41	خاندان حَبیب کی تاریخ	71
42	والد ماجد	71
43	جد امجد	72
44	والیٔ افغانستان	73
45	انڈین نیشنل کانگریس	74
46	قیادت	75
47	مجلس احرار اسلام کی صدارت	76
48	میدان عمل	76
49	قیدوبند	77
50	انتقال	77
51	تبصرے	78

52 مکتوبات 82
53 خاندان 82
54 مولانا محمد یحیٰ 83
55 مولانا محمد حسن 83
56 مولانا خلیل الرحمان 83
57 مولانا انیس الرحمان 84
58 مولانا محمد طیب 84
59 مولانا محمد ازہر 84
60 مولانا سعید الرحمن 85
61 محمد احمد رحمانی 85
62 تیس سالہ زندگی گھر سے جیل تک 87
63 تقریر 89
64 پھانسی کی کوٹھری 90
65 عورتوں کا جلوس 90
66 کم سن ساتھی عبد الرحمان عرف مانا 90
67 حافظ مشتاق احمد لدھیانوی 91
68 مولانا حبیب الرحمٰن کی فراست و ہمدردی از محمد عثمان .. 91
69 مولانا حبیب الرحمن کی دینی فراست 94
70 یاد حبیب 95
71 مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں 97
72 مولانا کی جامع شخصیت 98
73 ذکر حبیب 101
74 طالب علمی 104
75 فتنہ ارتداد قادیانیت اور اس کی سرکوبی 106
76 خطابت 107
77 حاضر جوابی 108
78 سخن دلنواز 110
79 اصابتِ رائے 111
80 مولانا حبیب الرحمن، حضرت عمر فاروقؓ کے کردار کا عکس ہے 112
81 حبیب ہند 114
82 ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی 117
83 حبیب دوست کی پیشین گوئی 119
84 رئیس الاحرار 120
85 رئیس الاحرار منٹگمری جیل میں 122
86 رئیس الاحرار کا قلمی چہرا 126
87 ہوا کا رخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھا 127
88 ذہین رہنما 130
89 اس جماعت کے تھے سردار حبیب الرحمن 131
90 جس نے تاریخ عالم سے سلطنت برطانیہ کو مٹا دیا 133
91 مجلس احرار اسلام کا قیام 133
92 لاہور بورسٹل جیل 133
93 سیّد الاحرار 135
94 رئیس الاحرار کی دو باتیں 138
95 حبیب قوم 139
96 مہمان نوازی 139
97 ذہانت و فطانت 140
98 عربوں کی دولت مندی کا خطرہ 140
99 اتحاد عرب کی دعوت 141
100 کارخانے کھولو 141
101 مدینہ یونیورسٹی 142
102 ردّ قادیانیت 142
103 رئیس الاحرار کے قادیان میں سب سے پہلے خطاب پر منظوم خراج عقیدت 143
104 قادیان میں رئیس الاحرار کی طرف سے احرار کانفرنس کا اعلان 144
105 رئیس الاحرار کی مرزائیت کے تعاقب کے لیے علماء اسلام سے اپیل 144
106 مادر علمی کی محبت 147
107 شیخین سے محبت 147

108 امیر ملّت سے عقیدت 148
109 حَبیب آغوش محبوب میں 148
110 رئیس الاحرار بھی زندہ ہیں 150
111 رئیس الاحرار کی شخصیت 1f51
112 مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی ہندوستان اور مسلمان .. 153
113 مردِ مومن 156
114 صدر ناصر اور رئیس الاحرار........................ 158
115 راسخ الاعتقاد مُسلمان 161
116 رئیس الاحرار........................ 163
117 انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے یہ چنگاری........................ 163
118 مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی: چند نقوش و تاثرات 166
119 قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید........................ 168
120 حَبیب........................ 174
121 سیدالاحرار........................ 175
122 حصہ چہارم........................ 176
123 باب دوم........................ 177
124 جن کے خطوط والد کے نام نمبر وار تاریخ کے مطابق ہیں 178
125 راشٹر پتی بھون........................ 180
126 انتباہ! 192
127 فرقہ وارانہ تصفیہ اور کانگریسی لیڈر 193
128 نوحہ کابل 237
129 حوادث داخلہ 238
130 محاربہ گردیز 238
131 شجاعت فوق الارادہ مجاہدین حریت 238
132 خدانا ترسی وسفاکی سقاویان 239
133 اسیران سقاوی کہ بجمعیۃ سقاوی رسیدہ 239
134 پسپائی دوبارہ سقاویان 239
135 قندھار 240
136 وحشت در مظالم سقوی........................ 240
137 ”مجروحین سقاوی“ 240
138 قصہ کشمیر 243
139 کشمیر کمیٹی کا قیام 243
140 احرار اور کشمیر........................ 244
141 تسلیم جاں ہے زندگی........................ 253
142 خطوط کے آئینہ میں 254
143 عزیز الرحمن جامعی، لدھیانوی ثم دھلوی 255
144 شاہ عبد القادر نور اللہ مرقدہ کا خط 257
145 شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ کا خاص خط ....
146 رئیس الاحرار کا قادیان میں داخلہ 267
147 خاندان مولانا عبد القادر لدھیانوی 268

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

"رئیس الاحرار، در حدیث دیگراں" جناب مولانا عزیز الرحمٰن جامعی رحمۃ اللہ علیہ کی مرتب شدہ کتاب ہے۔ جو کہ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد انڈیا میں لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں وہ تاثرات و خطوط ہیں جو مختلف نامور شخصیات کی طرف سے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے مولانا عزیز الرحمٰن جامعی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھے گئے۔ خط جن کو اُنہوں نے ایک کتاب کی شکل میں ترتیب دے دیا۔

پرانی شائع کردہ کتاب کو مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے جناب مشہود مُفتی نے پاکستان سے دوبارہ شائع کیا۔

مشہود مُفتی صاحب نے اس کام کا آغاز مولانا عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "رئیس الاحرار" سے شروع کیا۔ جو کہ نئی تصاویر اور ریفرنسز (حوالہ جات) کے ساتھ انڈیا بھیجی گئی۔ لیکن انڈیا میں کام بہت آہستہ ہونے کی وجہ سے اُنہوں نے پاکستان میں "رئیس الاحرار، در حدیث دیگراں" کی پہلی اشاعت کرنے کا فیصلہ کیا۔

چونکہ اصل کتاب "رئیس الاحرار" میں حوالہ جات کا کافی مواد انڈیا بھیجا جا چکا تھا۔ اس لیے اُن سب حوالہ جات کو اِس کتاب میں بھی شائع کیا جا رہا ہے تاکہ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے بزرگوں کی زندگی کے حالات و واقعات کو مختصراً بیان کیا جا سکے۔

اُمید ہے کہ آپ قارئین کو یہ کاوش پسند آئے گی۔ اللہ پاک اس محنت کو قبول فرمائیں۔

پیش لفظ جو "رئیس الاحرار" کتاب کے بارے میں لکھا گیا۔

"رئیس الاحرار" اُن مختلف کتابوں کو اکٹھا کر کے شائع کی جا رہی ہے جن میں ہمارے بزرگوں اور خاندان کی صدیوں پر پھیلی ہوئی دینی، سیاسی اور قومی و ملی خدمات درج ہیں۔ یہ حال ہے اس خاندان کا جو کم و بیش چار پشتوں سے انگریز کا باغی رہا۔ جس کی ایک مستقل تاریخ ہے اور جس کے فتوؤں نے ہندوستان کی مشترکہ زندگی کو توانائی بخشی۔

ان کتابوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور عُلمائے لدھیانہ
تحریر حضرت مُفتی ضیاء الحسین لدھیانوی

۲۔ رئیس الاحرار
تحریر مولانا عزیز الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ جامعی

۳۔ مضامین رئیس الاحرار
تحریر مولانا مُحمد احمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ

۴۔ تصاویر مہیا کیں
حاجی میاں عبد الوارث ساہیوال
چوہدری رحمت علی ساہیوال
مولانا عتیق الرحمان لدھیانوی انڈیا
چوہدری مُحمد اسماعیل (بیورو چیف نوائے وقت ساہیوال)

زندگی کے حالات و واقعات، سیاسی زندگی اور جدوجہد آزادی کے واقعات جو ان بزرگوں کے بارے میں ہیں حسب ذیل ترتیب سے شروع ہوتے ہیں:

علامہ شاہ عبد القادر لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	سالار جہاد آزادی ۱۸۵۷ء
مُفتی مُحمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	اولین فاتحان قادیانیت
مُفتی عبد اللہ لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	اولین فاتحان قادیانیت
مولانا عبد العزیز لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	اولین فاتحان قادیانیت
مُفتی مُحمد نعیم لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	نائب صدر جمیعت عُلمائے ہند۔ صدر سٹی و ضلع کانگریس لدھیانہ
رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	بانی و صدر مجلس احرار اسلام ہند
مُفتی ضیاء الحسن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	صدر مُسلم لیگ ساہیوال، صدر پنجاب ٹی بی ایسوسی ایشن،

	جنرل سیکرٹری جمیعت علمائے ہند پنجاب
محترمہ کلثوم مُفتی صاحبہ	پرنسپل بنات الاسلام ہائی سکول

مہتمم جامعہ ضیاء القرآن

مولانا عزیز الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ جامعی

مُفتی محمد احمد رحمانی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا خلیل الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

خاندانی سلسلے

ا۔ مولانا شاہ عبد القادر لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	1857ء کی جنگ آزادی میں عملی شمولیت پنجاب کی فوجوں کے کمانڈر جنگ آزادی کا فتوی دینے والے مشہور 34 علماء میں سر فہرست
	صاحب زادے
ا۔ مولانا محمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	کانگریس میں شمولیت کا سب سے پہلا
۲۔ مولانا عبد اللہ لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	فتویٰ نصرۃ الابرار
۳۔ مولانا عبد العزیز لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	قادیانیوں کے خلاف سب سے پہلا کفر کا
۴۔ مولانا سیف الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	فتویٰ۔ فتاوی قادریہ
A۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	(مولانا محمد لدھیانوی کے پوتے)
B۔ مُفتی محمد نعیم لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	مولانا عبد اللہ لدھیانوی کے بیٹے
C۔ مُفتی ضیاء الحسن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ	مُفتی محمد نعیم لدھیانوی کے بیٹے
D۔ محترمہ کلثوم مُفتی صاحبہ	مُفتی محمد نعیم لدھیانوی کی صاحبزادی

اپنے تایا محترم مُفتی ضیاء الحسین صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور علمائے لدھیانہ پڑھنے کو دی۔ جس سے متاثر ہو کر اس کتاب کو شائع کرنے کا خیال دل میں آیا۔

کتابیات

حوالہ جات کے لیے جن کتب کا حوالہ دیا وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ پسِ دیوارِ زنداں	تحریر آغا شورش کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ
۲۔ سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ	تحریر: حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ
۳۔ حیات امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ	تحریر: جانباز مرزا رحمۃ اللہ علیہ
۴۔ علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے	تحریر: حضرت مولانا سیّد محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ
۵۔ کاروانِ احرار	تحریر: جانباز مرزا
۶۔ پرانے چراغ	تحریر: مفکر اسلام مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

اوپر بیان کردہ کتب میں سے بعض حوالہ جات ترتیب وار اس کتاب کے شروع میں شائع کیے جا رہے ہیں۔

دو مشہور فتوے نصرۃ الابرار اور فتاویٰ قادریہ کا ذکر بھی اس کتاب میں آئے گا جو کہ مشہور مُفتی کے پر دادا مولانا مُفتی عبد اللہ لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے بھائیوں مولانا محمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا عبد العزیز لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہیں۔ اس پیش لفظ کے آخر میں ذکر خاص اپنے تایا مُفتی ضیاء الحسن رحمۃ اللہ علیہ مرحوم اور اپنی پھوپھو محترمہ کلثوم مُفتیؒ مرحومہ کا کروں گا۔

تاریخ ساز شخصیت مُفتی ضیاء الحسن رحمۃ اللہ علیہ جو کہ باحوصلہ مثالی شخصیت تھے۔۔ پاکستان آکر ساہیوال شہر میں آباد ہوئے۔ محمودیہ ہائی سکول، بنات الاسلام ہائی سکول اور ننگل انبیاء ہائی سکول ساہیوال میں بنائے جو کہ بھٹو دورِ حکومت میں نیشنلائز کر لیے گئے۔ محمودیہ ہائی سکول کا نام شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر رکھا گیا۔ تقریباً 32 ایسوسی ایشنوں اور اداروں جات کے سربراہ اور صدر رہے جن میں پنجاب ٹی بی ایسوسی ایشن بھی تھی۔ پورے ساہیوال ضلع کی سیاست پر کنٹرول رکھتے تھے۔ اُن دنوں میں اوکاڑہ اور عارف والا بھی ضلع ساہیوال میں شامل تھے۔ ڈپٹی کمشنر اور ضلع پولیس افسران کو بالکل عوام کا ملازم سمجھ کر معاملہ کرتے۔

مُفتی ضیاء الحسن رحمۃ اللہ علیہ مُسلم لیگ ضلع ساہیوال کے صدر اور پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ پنجاب ٹی بی ایسوسی ایشن اور مختلف ایسوسی ایشنوں کے سربراہ رہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی اور پھر پاکستان میں تحریک ختم نبوت میں لمبی جیل کاٹی۔

میری پھوپھو مرحومہ محترمہ کلثوم مُفتی صاحبہؒ کی زندگی کے بہت سے سالوں کا قریب سے مشاہدہ ہے۔ آپ نے اپنے والد مُفتی محمد نعیم رحمۃ اللہ علیہ سے درس نظامی میں عالمہ کا کورس مکمل کیا تھا۔ بنات الاسلام گرلز ہائی سکول کی پرنسپل تھیں۔ بھٹو دور میں سکول نیشنلائز ہونے کے بعد انہوں نے جامع ضیاء القرآن کے نام سے دینی ادارہ قائم کیا۔ بہت بڑی تعداد میں ہر سال لڑکیاں دینی تعلیم حاصل کرکے سند فراغت حاصل کرتی ہیں۔ ساہیوال شہر میں بہت کم گھرانے ہوں گے کہ جہاں کی خواتین اُن سے دینی تعلیم لے کر نہ گئیں ہوں۔

اُن کی زندگی ایک مثال تھی۔ نماز کی پابندی اور نماز میں خشوع وخضوع میں بے مثال تھیں۔ ۸۰ سال سے بھی زیادہ عمر تھی جب میں اُن کو نماز کے لیے کھڑا دیکھتا تو لگتا کہ پتھر کی ہوگئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائیں اور ہمیں بھی اُن جیسی نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

اب پیش لفظ کے آخر میں ایک نظم علمائے لدھیانہ کے بارے میں غازی عبد العزیز لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اور رئیس الاحرار کے بارے میں ایک نظم مولانا ظفر علی خان رحمۃ اللہ علیہ کی پیش ہے۔

نذرِ عقیدتؒ

تحریر: غازی عبدالعزیز لدھیانوی مرحوم

عالموں کا خاندان ہے لدھیانہ میں مقیم
فخر ہے جس کا حبیب[1] اور ناز ہے جس کا نعیم[2]

نسل میں سے اُس مجاہد کے ہیں یہ سب باوقار
اپنے دشمن سے جو میدان میں لڑا مردانہ وار

دین حق کا عام کرنا ان کا نصب العین ہے
مصطفی کا نام نامی ان کے دل کا چین ہے

رات دن اسلام کی خاطر یہ کرتے ہیں جہاد
اہلِ دل کہتے ہیں ان کو شادباش زندہ باد

لرزہ براندام ہے ہر وقت ان سے قادیاں
یہ اُڑا دیتے ہیں ہر جھوٹے نبی کی دھجیاں

نیک ہیں پُرجوش ہیں مزدور کے حامی ہیں یہ
جھوٹ کو نیچا دکھانے میں بڑے نامی ہیں یہ

ان کی خواہش ہے کہ پھر ہندوستان آزاد ہو
از سر نَو ملک کی تعمیر کا آغاز ہو



1 رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ
2 مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

شیرِ خدا کا ایمانؓ

تحریر: مولانا ظفر علی خان ؒ

جس کے ایثار سے ملت کی دوبالا ہوئی شان
اُس جماعت کے ہیں سردار حبیب الرحمانؒ
ان کے ماحول کو لاحول سے دیجیے تشبیہ
کہ ہوا پاس پھٹکتے ہی خضر وا شیطان
جمع ٹوڈی ہوں جہاں گریہ پہنچ جائیں وہاں
نہیں ممکن کہ کسی طرح وہ ماریں میدان
تختہ دیتے ہیں اُلٹ سارے وفاداروں کا
آتے ہی ان کے خطا ہوتے ہیں سب کے اوسان
کاسہ یِنانِ جہاں کی رگِ جاں کے حق میں
دمِ شمشیر ہے اُس شیر خدا کا ایمان

معلوم اایسا ہوتا ہے کہ "و" کی بجائے "وہ" ہوگا۔ واللہ اعلم والصوب

خطوط

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام مختلف خطوط فیملی کے پاس محفوظ ہیں۔ کچھ شخصیات کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد	صدر جمہوریہ ہندوستان
۲۔ ڈاکٹر ذاکر حسین رحمۃ اللہ علیہ	
۳۔ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ	صدر کانگریس
۴۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ	شیخ الحدیث
۵۔ مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ	صدر جمیعت علمائے ہند
۶۔ ڈاکٹر انصاری	
۷۔ پنڈت جواہر لال نہرو	وزیر اعظم ہندوستان
۸۔ مہاتما گاندھی	
۹۔ لارڈ کرپس	
۱۰۔ چودھری شیر جنگ رحمۃ اللہ علیہ	
۱۱۔ شیخ العرب والعجم مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ	
۱۲۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ	
۱۳۔ مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ	
۱۴۔ ملک برکت علی سیکرٹری مسلم لیگ	
۱۵۔ مولانا محمد احمد کاظمی رحمۃ اللہ علیہ ایم پی	
۱۶۔ مولانا حفظ الرحمن رحمۃ اللہ علیہ صاحب	
۱۷۔ مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	صدر پنجاب کانگریس
۱۸۔ خواجہ محمد یوسف	
۱۹۔ ڈاکٹر سید محمود	نائب وزیر خارجہ ہندوستان
۲۰۔ صوفی اللہ داد خان	
۲۱۔ عبد المجید قریشی	
۲۲۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری	امیر شریعت
۲۳۔ مسٹر سچر	وزیر اعظم پنجاب
۲۴۔ خان لیاقت علی خان	وزیر اعظم پاکستان

جانباز مرزا رحمۃ اللہ علیہ مرحوم کے چند الفاظ کے ساتھ: حوالہ جات کا سیکشن ختم کرتا ہوں

”رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی موت ایک قافلہ سالار کی موت تھی۔ شیر، پیشہ حریت کاروانِ زندگی کی مہار تھامے جب میدانِ کارزار میں پہنچتا، تو برطانوی سامراج کا دل دہل جاتا۔ ان کی رہنمائی میں مجلس احرار اسلام ہند نے کئی اہم فیصلے کیے۔ جنہیں تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گی۔“

جانباز مرزا رحمۃ اللہ علیہ

مولانا حبیب الرحمانؒ لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر "چٹان" میں شورش کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر

خط نمبر ۸۸۔ چٹان۔ لاہور۔ عزیز بھائی.... السلام علیکم۔ کل دوؔ بجے دوپہر کھانا کھا رہا تھا تو آل انڈیا ریڈیو سے اردو خبروں کا پروگرام شروع ہوا۔ پہلی خبر تھی آج صبح ۸ بجے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی انتقال فرما گئے۔ یہ خبر سنتے ہی میں اپنی جگہ ساکت و جامد ہو گیا۔

عزیز بھائی۔ آپ کے ساتھ اس دنیا سے میرا باپ بھی اٹھ گیا۔ کئی باتیں مجھ میں اور مولانا میں مشترک تھیں۔ مجھے جنگ شروع ہوتے ہی ۱۳؍ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ملتان میں گرفتار کر کے منٹگمری جیل میں بند کر دیا گیا اور ۱۹۴۴ء کے شروع میں رہا ہو کر تھانہ انار کلی میں نظر بند رہا "صدر احرار" ۱۷؍ دسمبر ۱۹۴۰ء کو گرفتار ہوئے اور ۴؍ جولائی ۱۹۴۵ء کو دھرم شالہ جیل سے رہا ہوئے۔ اس طرح وہ بھی پانچ سال نظر بند رہے اور میں بھی پانچ سال نظر بند رہا۔

مولانا منٹگمری جیل میں چھؔ بارہ دریاں یا چھؔ احاطے چھوڑ کر نظر بند کئے گئے اور افغانی وزیر کے نام سے جیل میں مشہور ہوئے۔ میں بھی چھ احاطے چھوڑ کر ساتویں میں نظر بند تھا کچھ دنوں بعد مجھے پتہ چلا کہ منٹگمری جیل میں کوئی افغانی وزیر نہیں "صدر احرار" بند ہیں۔ ملنے کی تدبیریں کیں راہ پیدا کی۔ ہفتے عشرے میں کامیابی ہوئی۔ ایک جمعدار کی مدد سے یہ ملاقات خفیہ ہوتی تھی۔ مولانا نے بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا اور ہاتھ ملایا۔ جب میرے اور ساتھیوں کے حالات سنے تو ان کی آنکھوں سے موتیوں کی طرح آنسو بہہ نکلے۔ فرمایا "میں کوشش کروں گا کہ تم لوگوں کی سختیاں کم ہو جائیں، اور جیل کا عملہ انسانیت سے پیش آئے۔ تم تو تین چار ساتھی ہو، میں اکیلا قیدِ تنہائی میں بند ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ دل و دماغ پر کوئی ملال نہیں۔ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ قرآن پڑھتا ہوں اور قرآن کے رموز و نکات پر غور کرتا ہوں۔ تمہارے اور میرے ملنے کی ایک ہی راہ ہے کہ تم حکومت کو درخواست دو کہ میں مولانا حبیب الرحمٰن سے قرآن پڑھنا چاہتا ہوں۔" مولانا یہ کہہ کر تشریف لے گئے، دونوں طرف کے احاطوں کے مہیب اور خوفناک دروازے بند ہو گئے۔ یہ دروازے اس لئے بند ہوئے کیونکہ ہم ہندوستان میں "احرار" اور کانگریسی تھے۔

میں نے مولانا کے ارشاد کے مطابق حکومت پنجاب اور سر سکندر حیات خاں کو لکھا کہ میں مولانا سے تفسیر قرآن پڑھنا چاہتا ہوں۔ اس کی اجازت دی جائے۔ سکندر حیات نے جواب دیا نہ آپ مولانا سے مل سکتے ہیں نہ تفسیر پڑھ سکتے ہیں۔ آپ کے لئے کسی ملا کا انتظام کر دیا جائے گا۔ میں نے حکومت کے اس خط کا بڑا سخت جواب دیا۔

دوسری بات مجھ میں اور مولانا میں یہ مشترک تھی کہ میں اور مولانا دونوں پھانسی کے تختے پر بھی حق بات کہنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور اس میں خوشی محسوس کرتے کہ اللہ کے نام کو اور کلمۂ حق کو پھانسی کے تختے پر بلند کیا جائے۔ مولانا صحابہ کا خمیر اور میں صحابہ کا اسیر ہوں اور ان کے نقش قدم پر چل رہا ہوں۔

جنگ کے زمانے کی نظر بندی بھی خوب تھی۔ مولانا مظہر علی اظہر قائد احرار بن بیٹھے اور خضر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب سے راہ رسم پیدا کر لی۔ شیخ حسام الدین اپنے بھائیوں کی وجہ سے رہا ہوئے اور پھر نہ بولے۔ خاموشی سے زندگی گزارتے رہے۔ مولانا مظہر علی اظہر نے

پاکستانی حلقوں میں مقبول ہونے کے لئے حکومت الٰہیہ کا ئر الاپا۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور لیگ کے حلقوں نے انہیں قبول نہ کیا۔ مجھے اور مولانا کو جیل ہی میں یہ حالات معلوم ہو گئے تھے۔

منٹگمری سے مولانا کو دھرم شالہ جیسے جیل میں بھیج کر حکومت نے انتقام کا آغاز کیا کیونکہ مولانا نے سکندر حیات خاں اور میاں عبدالحی وزیر تعلیم پنجاب کو سخت چھٹیاں لکھی تھیں۔ میرا بھی یہی حال تھا مجھ پر بھی منٹگمری جیل میں کیا کیا نہ ستم توڑے گئے۔ مولانا دھرم شالہ جیل میں اور میں منٹگمری جیل میں حکومت کے خلاف ڈٹے رہے۔ ایمان اور خودداری پر آنچ نہ آنے دی۔ مولانا فالج میں مبتلا ہوئے اور میں سخت قسم کی بیماری میں۔

آج مولانا اس دنیا میں نہیں ہیں پر ان کی یاد تڑپا رہی ہے ایسا مجاہد کہاں پیدا ہو گا جو پس دیوار زنداں بھی اعلائے کلمۃ الحق کر تا رہے۔ حکومت مولانا اور مجھ کو تشدد پسند سمجھتی رہی۔ حکومت کے فائلوں میں میری اور مولانا کے لئے تشدد پسند کا لفظ استعمال ہو تا رہا۔ مولانا پر چندر بوس سے ساز باز کرنے کا الزام تھا اور مجھے بم بار پارٹی کا ہم نوا سمجھا گیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو مقام سرمدی عطا فرمائے اور مجھے ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا ہو۔ ایک بھائی کی حیثیت سے آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔



حَبیب

اچھا ہوا کہ آپ بھی ہم سے بچھڑ گئے

اچھا ہوا کہ آپ بھی ہم سے بچھڑ گئے
ورنہ اُمید و یاس کا قصّہ دراز تھا

تھے لوگ بے حسی کے سمندر میں غوطہ زن
اور اس پہ یہ ستم کہ خدا بے نیاز تھا

تیرے دل و دماغ تھے قدرت کا معجزہ
سینہ ترا مدینۂ سوز و گداز تھا

ہر مرحلہ میں جبر و تشدد کا سامنا
ہر معرکہ میں فضلِ خدا کارساز تھا

القصہ! ایک عہد صحابہ کی یادگار
جس کا وجود، نغمۂ طراز حجاز تھا

شورشؔ وہ آج عازم فردوس میں ہو گیا
داردرسن کے خوف سے جو بے نیاز تھا

اے وائے! داستانِ وفا ختم ہو گئی
صرصر کی چوٹ کھا کے صبا ختم ہو گئی

جو کچھ ہوا درست ہوا، خوب تر ہوا
نوکِ قلم پہ آہ و فغاں آ گئی تو کیا؟

برہم رہا ہے نقشۂ عالم اسی طرح
آندھی اُفق سے تابر افق چھا گئی تو کیا

نالہ بلب ہیں نغمہ سرایانِ فصلِ گل
بوئے چمن کو بادِ خزاں کھا گئی تو کیا

وہ لوگ جو قفس میں رہے ہیں تمام عمر
ان کے چمن میں برق، ستم ڈھا گئی تو کیا

جن کا وجود برق جہاں تاب کا جواب
اک مرگِ ناگہاں انہیں تڑپا گئی تو کیا

کوثر پہ آ ملیں گے حریفان بادہ نوش
اے مرگِ شکریہ ترا، تو آ گئی تو کیا

"لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے"

دِل انقلابِ حال سے نالاں ہے دوستو!
شیرازۂ حیات پریشاں ہے دوستو

ناسازگار آب و ہوا ہے کہاں چلیں
صَر صَر کی زَد میں نظمِ گُلستاں ہے دوستو

جو کچھ سلوک ہم سے چمن میں کیا گیا
تاریخ اُس پہ ششدر و حیراں ہے دوستو

اپنے لہو سے لالہ و گل کو نکھار دو
یہ بھی علاج گردشِ دوراں ہے دوستو

کچھ دوستوں کے غم ہیں توکچھ ساتھیوں کی یاد
ان پر مدار دیدہ گریاں ہے دوستو

آخر کہاں چلا گیا سالار کارواں؟
کس سے کہیں کہ حشر کا ساماں ہے دوستو

اِک زد پڑی ہے زندگیٔ مستعار پر
اور سچ کہوں تو موت کا احساں ہے دوستو

چکمہ دیا اجل نے غریب الدیار کو
لوٹا ہے فصلِ گل میں خزاں نے بہار کو

از شورش کاشمیری

سیدالاحرار

ایک مردِ باخدا جرنیل ہمّت کا دھنی ۔۔۔ قوم کی خدمت میں گزری جس کی ساری زندگی
ہند کا باسی تھا وہ پنجاب کا لختِ جگر ۔۔۔ دشمنوں کے ہوش گم ہوتے تھے جس کو دیکھ کر
رعب جس کے چہرۂ پُرنور کی ادنیٰ صفت ۔۔۔ جس نے پائی قوم کی خدمت کے بدلے میں رفعت
قوم کی خدمت گزاری شغل تھا جس کا مدام ۔۔۔ جنگ آزادی میں گزری جس کی صبح جس کی شام
سرزمینِ ہند پر چمکا جو بن کر آفتاب ۔۔۔ جس نے پایا ہر قدم پر حق پسندی کا خطاب
ملک و ملّت کے فدائی تھے حبیبِ خوش بیاں ۔۔۔ یاد رکھے گا ہمیشہ جن کو اپنا گلستاں
شہر لدھیانہ کو جس کی برتری پر ناز ہے ۔۔۔ آج بھی گونجی ہوئی اس شیر کی آواز ہے
جس کی عزّت قوم کے باپو سدا کرتے رہے ۔۔۔ جس کا دم پیارے جواہر لال بھی بھرتے رہے
لیڈرانِ قوم ہوں لدھیانوی جیسے اگر ۔۔۔ شام کی تاریکیاں بن جائیں گی نورِ سحر
التجا حق جس کو چمکائے چمکتا ہے وہی ۔۔۔ اپنی منزل کی طرف بے خوف بڑھتا ہے وہی

التجا امروہوی دہلی
یکم ستمبر 1975ء

تحریکِ احرار

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری'' کے صفحہ نمبر ۲۹۰ تا صفحہ ۲۹۴ پر تحریر فرماتے ہیں:

احرار کی تحریک اگر چہ مولانا حبیب الرحمن رحمۃ اللہ علیہ لدھیانوی اور چودھری افضل حق مرحوم کی سیاسی ذہانت اور مولانا شاہ عطاء اللہ شاہ بخاری کے اخلاص، جوش اور سحر بیانی کا نتیجہ تھی، لیکن اس کے قالب میں جو دینی روح تھی وہ حضرت (رائے پوری) ہی کے تعلق اور اخلاص و درد کا پرتو تھی، مولانا حبیب الرحمٰن و مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ مرحوم نہ صرف حضرت سے بیعتؒ و انتساب کا تعلق رکھتے تھے بلکہ ان کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو ان دونوں سے بہت گہرا تعلق تھا، ان دونوں کے علاوہ احرار کے بیشتر علماء و رہنما حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت و تربیت کا تعلق رکھتے تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو احرار کی تحریک و جماعت سے بڑی توقعات تھیں، اس تحریک میں دین و سیاست کا امتزاج، عوام سے تعلق اور اس کے رہنماؤں کا جذبہ حریت و جہاد اور انگریز دشمنی اور ان کی جرأت و ہمت، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج سے بہت مناسبت رکھتی تھی اور حضرت کو یہ امید تھی کہ اس جماعت کی کامیابی سے دین کا دائرہ اثر وسیع ہوگا، اور عوام لادینی سیاسی تحریکات کے خراب اثرات سے محفوظ رہیں گے، جاننے والوں میں سے کوئی بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو تحریک احرار سے گہری دلچسپی اور اس کے رہنماؤں اور کارکنوں سے عزیزانہ اور سرپرستانہ محبت و شفقت تھی اور وہ بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا روحانی سرپرست اور پشت پناہ سمجھتے تھے۔

حضرت اپنی خداداد سیاسی بصیرت سے احرار کے لئے یہی مناسب سمجھتے تھے کہ وہ وقتی اور مقامی تحریکوں اور اندھے جوش سے اپنے کو بچا کر اپنی جدوجہد جاری رکھیں اور نافہم عوام کے جذبات و مطالبوں سے بے پرواہ ہو کر خلوص اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں اور صرف ملک کی آزادی، مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی بہتری اور دشمن اسلام تحریکوں اور سازشوں (جن میں قادیانیت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے) کا مقابلہ کرنا پیش نظر رکھیں، اسی مقصد کے پیش نظر حضرت رحمۃ اللہ علیہ جماعت احرار کی مسجد شہید گنج ایجی ٹیشن میں شرکت (جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احرار کو الجھانے کے لئے شروع کیا گیا تھا) مناسب اور قرین عقل نہیں سمجھتے تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس رجحان اور جماعت احرار سے تعلق کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا جو مولانا محمد علی صاحب جالندھری نے بیان کیا ہے، مولانا لکھتے ہیں:

> ''پنجاب میں مجلس احرار مقبول ترین جماعت تھی، جنگ کے بادل امنڈ رہے تھے، ۱۹۳۶ء کے انتخاب سر پر آ رہے تھے، اولاً حکومت پنجاب نے احرار لیڈروں سے سودا کرنا چاہا کہ انتخاب میں تم آگے آؤ، ہم تعاون کریں گے، آنے والی جنگ میں مجلس احرار نے برطانیہ کی امداد کرنے سے اس وقت تک انکار کر دیا جب تک مکمل آزادی کا اعلان نہ کیا جائے گورنر پنجاب نے شہید گنج کی مسجد گروا کر حالات تبدیل کر دیئے، مجلس احرار پر انتہائی امتحان کا وقت آیا، مسلمان انتہائی مشتعل تھے اور ایجی ٹیشن کرنا چاہتے تھے، مگر یہ راستہ غلط تھا، حکومت کے خرید کردہ لیڈروں نے مسلمانوں کو پاگل بنا دیا تھا، احرار بزرگوں نے مسلمان قوم کو راستہ سے روک کر اپنی بے پناہ مقبولیت قربان کرنی گوارا کی لیکن غلط رہنمائی کر کے اپنا وقار باقی رکھنا منظور نہ کیا، پوری مسلمان قوم ناراض ہوگئی، گورنر کا منشاء پورا ہوا، یہ سب کچھ ہونے کے بعد احرار

کے بزرگ اتفاقاً حضرت والا سے کسی جگہ مشرف بزیارت ہوئے، بار بار ہنس کر فرمایا کہ میں تو سمجھا تھا کہ کو دے میرے شیر، کو دے میرے شیر (یعنی ایجی ٹیشن کریں گے) مگر اللہ تعالیٰ نے رہنمائی فرمادی[1]۔

مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی سے جو قلبی تعلق تھا وہ کسی سے مخفی نہیں، ان حضرات کے جیل جانے کے بعد ان کے خاندان اور پسماندہ افراد کی فکر رکھتے اور ان سب کی ذمہ داری محسوس فرماتے۔

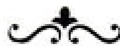
مولانا محمد علی صاحب جالندھری لکھتے ہیں:

"مولانا حبیب الرحمٰن منٹگمری جیل میں جب نظر بند تھے ملاقات کی کسی کو اجازت نہ تھی، میں رائے پور حاضر ہوا، فرمایا کہ "مولانا حبیب الرحمٰن سے ملاقات اگر کسی طرح ہو جائے تو بہت اچھا ہے، دل ملاقات کو چاہتا ہے، میں نے عرض کیا، حضرت میں انتظام کروں گا، اِس پر بہت ہی خوشی کا اظہار فرمایا، فرمایا: "ضرور کوئی انتظام کریں" سخت سردی کا زمانہ تھا، میں نے ایک ایم۔ ایل۔ اے کے ذریعہ جو میرا ملاقاتی تھا وزیر جیل منوہر لال سے اجازت لی، بذریعہ تار ملتان اجازت کی اطلاع ملی، میں نے رائے پور اطلاع دی، حضرت والا سخت سردی میں منٹگمری تشریف لائے، میں اسٹیشن پر پہلے سے موجود تھا، رات منٹگمری میں ایک دوست کے ہاں قیام کرایا، صبح مولانا حبیب الرحمٰن سے ملاقات ہوئی[2]۔

مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق بڑے بلند کلمات فرماتے تھے اور ان سے اور ان کی وجہ سے ان کے خاندان سے بڑی مُحبّت و شفقت کا برتاؤ کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا کہ "تم بخاری صاحب کو یوں ہی نہ سمجھو کہ صرف لیڈر ہی ہیں انہوں نے ابتداء میں بہت ذکر کیا ہے۔" اور فرمایا: "یقین تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا نصیب فرمایا ہے کہ باید و شاید، یہاں حالات و کیفیات کیا چیز ہے اصل تو یقین ہی ہے، اللہ تعالیٰ جس کو عطا فرمادے[3]"، مولانا محمد علی صاحب جالندھری فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بخاری صاحب کے لڑکوں کا تذکرہ آیا فرمایا کہ شاہ صاحب کے لڑکے ہیں میں تو ان کا نوکر ہوں، یہ مُحبّت اور خصوصیت ان کے اخلاص، خود فراموشی، دینی خدمت میں انہماک اور اس نفع کی بنا پر تھا، جو ان کی ذات اور ان کی ایمان فروز تقریروں سے عظیم مجمعوں میں پہنچتا تھا اور خصوصیت کے ساتھ پنجاب اور بالاخص ملتان اور اس کے نواح میں جو عقائد کی اصلاح ہوئی تھی خود شاہ صاحب اپنی تقریروں اور کوششوں کی روح اور اپنی زبان کے اثر اور اس محنت و جفاکشی کے تحمل کا راز ایک مخلص اور مقبول بندہ کے ساتھ تعلق اور اس کی دعاؤں اور مُحبّت کو سمجھتے تھے اور اس پر ان کو بڑا ناز اور بہت اعتماد تھا، احرار سے مُحبّت کی وجہ ان کی شان قلندرانہ اور جرأت رندانہ تھی، ہر نئے فتنہ اور جدید فرقہ کے مقابلہ میں یہ سینہ سپر، اور سربکف ہوتے، قادیانیت، رفض و تفضیل اور متعدد ایسی گمراہ کن تحریکیں تھیں جن کے مقابلہ میں یہی سرپھرے میدان میں آتے ؎

کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

اس لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس جماعت کے کارکنوں کی بہت سی کوتاہیوں اور غلطیوں سے بھی چشم پوشی فرماتے اور ان کے جذبہ اور ہمّت کی قدر کرتے۔



1 مکتوب مولانا محمد علی صاحب جالندھر بنام مؤلف

2 مکتوب مولانا محمد علی صاحب جالندھر بنام مؤلف

3 روایت مولانا عبد الجلیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مولانا حَبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

چند نقوش و تاثرات

تحریر مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حافظے پر زور ڈالنے سے یاد آتا ہے کہ مولانا کی سب سے پہلی زیارت ۱۹۲۹ء یا ۱۹۳۰ء کو لاہور کے ایک جلسۂ عام میں ہوئی تھی جو مجلس احرار کے زیرِ اہتمام بیرون دہلی دروازہ یا موچی دروازہ منعقد ہوا تھا، غالباً مجلس احرار کی بنیاد بھی اس وقت نئی نئی پڑی تھی۔

پہلے روز جلسے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر ہوئی، انہوں نے حاضرین جلسہ کو جو ہزاروں کی تعداد میں تھے یہ مژدہ سنایا کہ کل فلاں گاڑی سے صدر مجلس احرار مولانا حَبیب الرحمٰن لدھیانوی آرہے ہیں۔ آپ لوگ اسٹیشن پر ان کا استقبال کریں۔ یاد نہیں کہ اس سے پہلے یہ نام کانوں میں پڑ چکا تھا یا نہیں؟ قرینہ ہے کہ ضرور پڑ چکا ہوگا، اس لئے کہ ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء ہی سے زمیندار نظر سے گزرتا تھا اور ہم لوگ لکھنؤ میں اس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ یہ بات بہت بعید از قیاس ہے کہ اس کے صفحات پر اس مجاہد جنگ آزادی و سرخیل احرار کا نام بار بار نہ آیا ہو۔

ٹھیک یاد نہیں غالباً ۱۹۳۶ء یا ۱۹۳۷ء ہوگا میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی فرائض انجام دیتا تھا، اسی زمانے میں سیرت سید احمد شہید لکھنے کا خیال پیدا ہوا میں اپنے ایک عزیز شاگرد کے ساتھ لکھنؤ سے ہردوئی کے لئے پنجاب میل میں سوار ہوا، اسی درجہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بھی سفر کر رہے تھے، کشیدہ قامت، چہرہ سرخ و سفید، پیشانی اور آنکھوں سے ذہانت اور اعتماد کا اظہار، غالباً میرے بھائی صاحب (ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب) سے لکھنؤ میں وہ بار بار مل چکے تھے۔ اسی تقرب سے میری طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آیا۔ فرمایا:

" ہمارے بزرگ مولانا عبد القادر صاحب اور ان کے شیخ و مرشد حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب جن کی رائے پور میں خانقاہ ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے معتقد تھے" ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق دلایا، پوری گفتگو یاد نہیں۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ جب میرا رائے پور سے خصوصی تعلق پیدا ہوا اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد حاضری کی سعادت حاصل ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حَبیب الرحمٰن کے آنے سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جس میں محبّت و احترام دونوں شامل ہیں۔ لیکن محبّت کا پلّہ بھاری ہے۔ اپنی چارپائی کے سامنے ان کے لئے چارپائی بچھواتے ہیں، تکئے رکھواتے ہیں، حضرت کی مجلس میں کم لوگ اتنی بے تکلّفی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں جتنی مولانا۔ حضرت ان کی باتیں بغور سنتے ہیں، وہ بھی حضرت کا احترام شیخ و مرشد کی طرح کرتے ہیں لیکن اس میں بھی محبّت اور ناز کی ایک آمیزش ہوتی ہے جو نتیجہ ہے قدیم نیازمندی بڑے حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست تعلق، اور بزرگان لدھیانہ، خصوصاً مولانا عبد القادر صاحب لدھیانوی کی دینی خدمات، مجاہدانہ جذبات، حمیت دینی اور ایثار و قربانی کا۔ جس کا حضرت کے یہاں بڑا درجہ اور اعتراف تھا۔

بعض مرتبہ مولانا کی گفتگو، ان کا نقطۂ نظر اور ان کے تبصرے بہت سے حاضرین مجلس کے لئے نامانوس، اور بعض اوقات وجہ

آزمائش بن جاتے، لیکن حضرت کا ان کے ساتھ طرزِ عمل دیکھ کر کسی کو تردید یا مناظرہ و مباحثہ کی جرأت نہ ہوتی۔ البتہ بعض بے تکلّف شرکاء جن کا بڑے حضرت سے قربت کا تعلق بھی تھا اور حضرت بھی ان کی دلداری فرماتے تھے کچھ سوال و جواب کر لیتے اور کبھی کچھ سخن گرانہ باتیں بھی ہو جاتیں۔ لیکن سب احتیاط و اعتدال کے ساتھ۔

وہ ایک بار اس کا بھی موقع آیا کہ حضرت کا قیام خاص مولانا کے مکان واقع کوچہ رحمٰن بلیماران میں ہوا۔ یہاں ہفتے ہفتے، عشرے عشرے قیام رہتا۔ راقم السطور کو بھی دو ایک بار معیّت کا شرف اور مولانا کا مہمان بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مولانا، حضرت کے معمولات، ضروریات اور مزاج و مذاق سے پورے طور پر واقف تھے اور اس کی رعایت فرماتے تھے، حضرت بھی اس قیام پر خصوصی یگانگت کی بنا پر بہت منشرح اور بے تکلّف ہوتے۔ بڑی پُر تکلّف مجلسیں رہتیں جن میں حالات حاضرہ، دینی و ملی سیاست، پرانے تجربات و حقائق اور اصلاحِ نفس و اصلاحِ باطن کی لطیف آمیزش ہوتی تھی۔

حضرت کا قیام جب قصاب پورہ (نواب والی مسجد) میں ہوتا اور وہ اکثر طویل ہوتا تو صبح ہوا خوری کے وقت (جو اکثر پرانی عید گاہ کی طرف ہوتی) مولانا ساتھ ہوتے اور بے تکلّف گفتگو فرماتے رہتے۔ حضرت بھی اس سے لُطف لیتے۔ بعض خدام جن میں یہ راقم آثم بھی شریک ہے مولانا کے بعض خیالات سے اتفاق نہ کر سکتا، ادب کے ساتھ اس سے اختلاف کرتا۔ واپسی تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ لیکن کسی تلخی اور تجاوز عن الحدود کی نوبت نہ آتی۔ حضرت کی گفتگو اکثر قول فعل کا کام دیتی اور احباب و خدام کے اس شیرازے کو مجتمع رکھتی۔ دہلی کے قیام کے زمانے میں مولانا زیادہ سے زیادہ وقت حضرت کی خدمت میں گزارنے کی کوشش کرتے اور حضرت کو بھی گویا ان کا انتظار ہی رہتا۔

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ جب لکھنؤ تشریف لاتے اور طویل قیام فرماتے اور ایسا ۳، ۴ بار ہوا، تو اکثر مولانا ساتھ ہوتے یا بعد میں آکر شامل ہو جاتے۔ ایسا ایک دوبار دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں اور دو تین مرتبہ تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں ہوا۔ اس وقت مجالس کا لُطف دوبالا ہو جاتا۔

حضرت کا مولانا اور ان کے خاندان سے کیا تعلق تھا۔ کس طرح ان کو اس خاندان کا بچہ بچہ عزیز تھا۔ کس خوشی سے لدھیانہ تشریف لے جاتے اور ان کے یہاں قیام کرتے، مجلس احرار کے ساتھ آپ کا کیا مربیانہ و سرپرستانہ تعلق تھا، مولانا کے جیل جانے سے (جس کی نوبت اکثر پیش آتی تھی) حضرت کو کس قدر فکر اور تعلق خاطر پیدا ہوتا اس سب کی تفصیل سوانح حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری میں آگئی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مولانا کے سیاسی خیالات و نظریات سے پورا اتفاق نہ ممکن تھا نہ ضروری۔ ان کے خیالات و رجحانات سے بھی جو ان کے ذاتی تجربوں اور خاص طرح کی تربیت و ماحول سے پیدا ہوئے تھے، ہم آہنگی بھی کسی معاصر کے لئے خواہ وہ خرد و نیاز مند ہو ضروری نہیں۔ لیکن جس چیز میں زیادہ قیل و قال کی گنجائش نہیں وہ ان کا جذبہ حریت، انگریز دشمنی، وطن دوستی، اخلاقی بلندی، شخصیت کی دلآویزی اور ایک خاص طرح کا قائدانہ بانک پن ہے جو خود اعتمادی، پاکیزہ زندگی اور خلوص کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

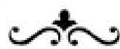
ان چند سطروں کو لکھ کر یہ نیاز مند بھی اس بزم میں شرکت کی سعادت حاصل کرتا ہے جو مولانا کے ذکر خیر کے لئے سجائی گئی ہے۔

غفر اللہ لہ و الحقہ بآبائہ الاماجین و شیوخہ المقبولین

ابو الحسن علی

ناظم ندوۃ العلماء و صدر مدرس ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۰/ شعبان ۱۳۹۵ھ ۱۸/ اگست ۱۹۷۵ء



مجلسِ احرار کی تشکیل نو

جانباز مرزا ؒ اپنی کتاب حیات امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ؒ میں تحریر کرتے ہیں:

۱۱ر جولائی ۱۹۳۱ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں احرار کانفرنس کا پہلا اجلاس مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں امیرِ شریعت سید عطاءاللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، خواجہ عبد الرحمٰن غازی، مولانا ظفر علی خاں، شیخ حسام الدین، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے مسلمان رہنما شامل ہوئے۔ اس اجلاس کی آخری قرارداد میں جداگانہ انتخاب کی پرزور حمایت کی گئی جس سے کانگریس اور ہندو پریس خصوصاً حواس باختہ ہوگئے۔ اجلاس کے اختتام پر پنجاب بھر میں احرار کے دفاتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ کام حضرت امیرِ شریعت کے سپرد ہوا اور آپ اپنے رفقاء کو لے کر اس پروگرام کو سرانجام دینے کے لیے پنجاب کے دورہ پر روانہ ہوگئے۔

گاندھی جی سے ملاقات

اسی سفر کے دوران پنجاب کی حدود سے نکل کر جب امیر شریعت دہلی اور یوپی کے اضلاع میں پہنچے تو گاندھی جی کی لندن روانگی کا پتہ چلا۔

گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن روانہ ہونے والے تھے۔ احرار رہنماؤں کی رائے تھی کہ انگریز کی میز پر بیٹھ کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ غلام ملک کا لیڈر نہیں بلکہ غیر ملکی حکومت کا اقتدار ہی کر سکتا ہے۔

۲ر اگست ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی جب بمبئی پہنچے تو امیرِ شریعت، مولانا حبیب الرحمٰن کے ساتھ انہیں ملنے کے لیے بمبئی پہنچ گئے۔ آپ نے گاندھی جی کو گول میز کانفرنس میں شمولیت سے منع کیا۔ گاندھی جی نے احرار رہنماؤں کی رائے کو وزن تو دیا لیکن لندن جانے کا ارادہ ترک نہ کیا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کا انتقال

احباب کی آمدورفت کے باعث مجالس گرم تھیں۔ حاجی دین محمد کا مکان ادیبوں، شاعروں، سیاسی رہنماؤں اور مذہبی لوگوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ امیرِ شریعت ؒ بیماری سے نجات کے لیے دل بہلانے میں مصروف تھے۔ اس طرح سے مریض اپنے مرض سے آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہا تھا کہ ۲ر ستمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت ریڈیو پر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے انتقال کی خبر سنی۔ امیرِ شریعت ؒ پر اس خبر کا اس تیزی سے اثر ہوا، جیسے پھول پر غیر موسم کا ہوتا ہے اور اس کی تمام پتیاں جھڑ کر گر جاتی ہیں۔

جماعتی زندگی کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن کو امیرِ شریعت بھائی کہا کرتے تھے، اور یہ رشتہ دونوں حضرات کے گھروں تک جا پہنچا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی موت ایک قافلہ سالار کی موت تھی۔ شیر پیشۂ حریت کاروانِ زندگی کی مہار تھامے جب میدانِ کارزار میں پہنچتا، تو برطانوی سامراج کا دل دہل جاتا۔ ان کی رہنمائی میں مجلس احرار نے کئی اہم فیصلے کیے جنہیں تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گی۔

مولانا کی موت کی خبر سن کر امیر شریعت ؒ دن بھر خاموش رہے اور کبھی کبھار ایک آہِ سرد کے ساتھ اپنی اسی خاموشی کو توڑ کر فرماتے۔

”ایک اچھے رفیق، مونس و غمخوار اور سراپا ایثار ساتھی کی جدائی نے میری سینے میں ایک اور زخم کا اضافہ کر دیا ہے۔“

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی رائے مولانا کی وفات پر

تحریر: عابد اللہ غازی

"میں نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی ہمیشہ اس لئے عزت و تعریف کی ہے کہ ان میں اپنے عقیدے پر مستقل مزاجی اور مضبوطی سے قائم رہنے کی جرأت تھی۔" (جواہر لال نہرو)

پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا کے بارے میں یہ اعتراف فرمایا ہے جس پر میں اس تاثر کا اختتام کرتا ہوں۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے میں بہت برسوں سے واقف ہوں۔ جدوجہد آزادی کے دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

مولانا موصوف جس عقیدہ پر یقین رکھتے تھے اور جس جرأت اور آہنی استقامت کے ساتھ وہ اس پر قائم رہے اس کے سبب میں ہمیشہ ان کا مداح رہا اور ان کا احترام کرتا رہا۔ آزادی سے قبل اور اس کے بعد بھی انہوں نے بہت سی تکالیف اٹھائیں۔ حتیٰ کہ آزادی کے فوراً بعد ہی پاکستان اور شمالی ہند میں جو المیہ رونما ہوا اور جس کی لپیٹ میں وہ شدید طور پر آئے، مگر اس سے ان میں تلخی نہیں آئی اور انہوں نے ہمّت نہ ہاری۔ وہ اپنے شہر لدھیانہ میں ہندو مسلمان اور سکھ سب کے ہی محترم رہے۔

ان کے انتقال سے مجھے گہرا صدمہ ہوا۔ وہ ایک جواں مرد سپاہی کی حیثیت سے ہماری آزادی کی تحریک میں یاد کئے جانے کے قابل ہیں۔

جواہر لال نہرو

تحریر: عابد اللہ غازی ایم۔اے، پی، ایچ، ڈی ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ
۲۲/ اگست ۱۹۷۵ء

I know Maulana Habibur Rahman Ludhianvi for many years. We came into frequent contact with each other during our struggle for Independence. After that also we met from time to time.

I admired him and respected him for his courage and his steadfast adherence to what he believed in. He suffered greatly before Independence and also after, but he never faltered. Even the tragedy that occured immediately after Independence in Pakistan and North India did not embitter him, although it affected him powerfully. In his own city of Ludhiana, he was respected by both Hindus and Muslims as well as sikhs. His death came to me as a great sorrow. As a great soldier in our struggle for freedom, he deserves to be remembered.

JAWAHARLAL NEHRO
New Delhi,
January 24, 1961

حوالہ جاتؒ

مختلف کتابوں سے جو حوالہ جات لیے ہیں وہ اس کتاب کے شروع میں شائع کئے جارہے ہیں۔

دیکھیئے کیا فرماتے ہیں مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ، آغا شورش کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، جانباز مرزا رحمۃ اللہ علیہ، التجا امروہوی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، وزیر اعظم جواہر لال نہرو، مُفتی محمد جمیل خان رحمۃ اللہ علیہ، مُفتی اعظم مُفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔

مولانا سید محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے میں صفحہ ۱۱۴ تا ۱۲۰ تحریر فرماتے ہیں:

عُلمائے لدھیانہ کا فتویٰ دار الحربؒ

تقریباً ۱۸۸۹ء میں یعنی انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے سے کچھ دنوں بعد عُلمائے ہند کے سامنے مندرجہ ذیل سوالات پیش کیے گئے:

۱۔ ہنود کے ساتھ معاملات دنیاوی میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں۔

۲۔ ایک جماعت قومی مسمی بہ نیشنل کانگریس جو ہندو اور مسلمان وغیرہ سکنائے ہند کے واسطے رفع تکالیف و جلب منافع دنیاوی چند سال سے قائم ہوئی ہے اور ان کا اصل اصول یہ ہے کہ بحث انہیں اُمور میں ہو جو کل جماعت ہائے ہند پر موثر ہوں اور ایسے امر کی بحث سے گریز کی جائے جو کسی ملت یا مذہب کو مضر ہوں یا خلاف سرکار ہوں تو ایسی جماعت میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں۔ (۲)

۳۔ سید احمد خاں نیچری نے جو ایک جماعت (ایسوسی ایشن) قائم کی ہے اور لوگوں کو بذریعہ اعلان مطبوعہ ۸/ اگست ۱۸۸۸ء یوں ترغیب دے رہا ہے کہ میری جماعت میں بڑے بڑے ہندو ذی وجاہت مثل راجہ بنارس وغیرہ جو کانگریس کے برخلاف ہیں، شامل ہیں۔ ہر شخص جو داخل ہو پانچ پانچ روپیہ چندہ ماہواری میرے نام علی گڑھ یا بنارس میں راجہ صاحب کے نام روانہ کیا کرے وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کی مدد کے واسطے جابجا ایسوسی ایشن انجمن اسلامیہ کے نام سے لوگوں نے شہروں میں قائم کی ہیں جو شخص ان کے ساتھ اتفاق کرنے سے برخلاف معلوم ہوتا ہے اس کے ساتھ طرح طرح کا فساد اور فتنہ برپا کر کے اس کو جبراً ملانا چاہتے ہیں۔ آیا ایسی جماعت میں مُسلمانوں کو شامل ہونا اور ان کی مدد کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور نیچری لوگ بدخواہ اسلام ہیں یا نہیں؟

حضرت امام ربانی قدس اللہ سرہ العزیز تینوں سوالوں کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

> اگر ہندو مُسلمان باہم شرکت بیع و شراء تجارت میں کرلیویں اس طرح کہ اس میں کوئی نقصان دین میں باخلاف شرع معاملہ کرنا اور سُود اور بیع فاسد کا قصہ پیش نہ آوے جائز ہے اور مباح ہے۔ مگر سید احمد صاحب سے تعلق نہ رکھنا چاہیے اگرچہ خیر خواہی قومی کا نام لیتا ہے یا واقع میں خیر خواہ ہو۔ مگر اس کی شرکت مآل کار اسلام اور مسلمانوں کے لیے سم قاتل ہے۔ ایسا میٹھا زہر پلاتا ہے کہ آدمی ہرگز نہیں بچتا۔ پس اس کے شریک مت ہونا۔ اور ہنود سے شرکت معاملہ کرلینا اور اگر ہنود کی شرکت سے اور معاملہ سے بھی کوئی خلافِ شرع امر لازم آتا ہے یا مُسلمانوں کی ذِلت یا اہانت اور ہنود کی ترقی ہوتی ہو۔ وہ کام بھی حرام ہے جیسا کہ اوپر لکھا گیا اسی طرح پر ہے اور بس

(نصرۃ الابرار: ۲۶ محرم ۱۳۰۶ھ ص ۱۹)

جواب نمبر ۲

یہ حضرات کانگریس کے ممبر کیوں نہیں رہے؟

اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ حضرت امام ربانی اور اسی طرح دیگر حضرات انتہا پسند تھے۔ ان کا مطمع نظر کامل حریت تھا۔ اگرچہ ملک اور قوم کے عام مفاد کے لیے آئینی جدوجہد کو بھی پسند فرماتے ہوئے شرکت کانگریس کے جواز کا فتویٰ دیتے رہے۔ مگر چوں کہ کانگریس کا نصب العین اس وقت صرف یہ تھا کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت ہو۔ اس لیے اپنے واسطے شرکت کانگریس کو منظور نہیں فرمایا اور حریت کاملہ کے لیے وہ راہ عمل اختیار کی جس کا تذکرہ آیندہ آئے گا۔ (ان شاء اللہ)

حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز کے متعلق سلسلۂ کلام کو ختم کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند امور کی وضاحت کر دی جائے۔ جو حضرت موصوف کے مذکورہ بالا فتوے کے لیے پس منظر یا نتائج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ ۱۸۵۷ء میں جس طرح حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز نے اپنے شیخ طریقت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی زیر قیادت جہاد آزادی میں حصہ لیا تھا اسی طرح لدھیانہ کے اس خاندان نے بھی اس جہاد میں بہت کافی حصہ لیا تھا جس کے ایک رکن مولانا عبد العزیز صاحب نقشبندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور آج مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی اور مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی اسی حریت پسند خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ (۳)

۱۸۸۴ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تو مولانا موصوف نے اس کی حمایت کی۔ سر سید گروپ نے ان کے برخلاف ایک طوفان اٹھا دیا اور ایک فرضی استفتاء مرتب کرکے علماء سے اس کا جواب حاصل کیا۔ حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز سے اس پر دستخط کرائے گئے اور پھر یہ فتویٰ مولانا عبد العزیز صاحب پر چسپاں کرکے پروپیگنڈا کیا گیا کہ مولانا عبد العزیز صاحب ہندوؤں سے مل گئے ایمان فروش ہیں۔ فاسق ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مولانا عبد العزیز صاحب نے یہ تماشا دیکھا تو حیران رہ گئے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو حقیقت حال سے مطلع کیا اور پھر خود ایک سوال مرتب کیا۔ واقعہ کے انکشاف کے بعد حضرت گنگوہی اور تمام حضرات نے (جن کے اسماء گرامی مولانا عبد العزیز صاحب کے برخلاف قابل ملامت اور نفرت انگیز طریقہ سے استعمال کیے گئے تھے) معذرت کی۔ چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ معذرت یہ ہیں:

"حامداً و مصلیاً۔"

> بندہ رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ عفی عنہ عرض کرتا ہے کہ لدھیانہ سے ایک استفتاء اس مضمون کا آیا تھا کہ جو شخص ہنود کی اعانت اور مسلمانوں کو ضرر دیوے وہ کیسا ہے۔ بندہ نے جواب لکھا تھا کہ وہ "فاسق" ہے یہ خلاصہ سوال و جواب کا ہے اب وہ فتویٰ بندہ کا طبع ہوا۔ اور اس کے اول تین صفحے لکھے دیکھے جس سے معلوم ہوا کہ وہ سوال مولوی عبد العزیز صاحب لدھیانوی کی نسبت ہے اور وہ وجوہ اعانت و اضرار اس میں مصرح لکھے ہیں۔ لہٰذا بندہ راست راست کہہ کر مسلمانوں کو مطلع کرتا ہے اور اپنا ذمہ بری کرتا ہے کہ مولوی عبد العزیز صاحب ہرگز ہرگز مصداق اس فتوے کے نہیں ہیں اور جو امور ان کی طرف اس تحریر میں منسوب ہیں، ان کی وجہ سے بندہ ہرگز ان کو محل اس جواب و فتوے کا نہیں جانتا۔ اگر سائل اس تفصیل کو درج سوال کرتا تو بندہ ہرگز یہ جواب نہ لکھتا۔ جو کچھ اس تحریر میں درج ہے اس کی تاویل صحیح ہے اگر واقعی ان سے یہ امور ایسے ہی سرزد ہوئے ہیں اور اس عبارت میں جو گستاخ کلام نسبت مولوی صاحب کے ہے وہ سخت نازیبا ہے۔ بندے کے نزدیک علماء کی شان میں ایسا کلام موجب ہتک اسلام و علم ہے۔ پس جو صاحب اس بندے کو صادق جانتے ہیں اور جو بندے کی تحریر کی وجہ سے مولوی عبد العزیز صاحب سے بد عقیدہ ہوئے ہیں، ان کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ

ہرگز مصداق اس فتویٰ بندہ کے نہیں۔ ان سے معذرت کرنا اور معافی چاہنا اور اتحاد و محبّت کرنا لازم ہے واللہ تعالیٰ ولی التوفیق۔ کتبہ الراجی رحمۃ اللہ رشید احمد گنگوہی عفی اللہ تعالیٰ عنہ۔" (۴)

جب یہ حقیقت منقح ہوچکی تو اس کے بعد شرکت کانگریس اور شرکت ایسوی ایشن کے متعلق مندرجہ بالا سوالات علمائے کرام کے سامنے پیش کیے گئے۔

کانگریس کے مقاصد قیام

۱۔ مولانا عبدالعزیز صاحب کے مندرجہ بالا واقعہ اور سوال دوم کے الفاظ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ کانگریس کے حامی عُلماء کے برخلاف جو شرمناک پروپیگنڈا آج کیا جارہا ہے وہ اسی زمانے کی پیداوار ہے۔ کانگریس پر اسلام کشی کی فرد جرم اسی وقت سے لگادی گئی ہے اور کانگریسی عُلماء کے لیے اسلام فروش، غدارِ ملت ہندوؤں کے غلام، فاسق کافر وغیرہ وغیرہ اسی وقت تصنیف ہوچکے تھے۔ آج جو کچھ کہا جارہا ہے وہ اسی آموختہ کو دہرایا جارہا ہے۔

۲۔ انڈین نیشنل کانگریس کے لفظی معنی ہیں "ہندوستانی قومیت (نیشن) رکھنے والوں کی جماعت۔"

اس کے اغراض و مقاصد پہلے ہی اجلاس میں یہ قرار دیے گئے:

۱۔ ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کرکے ایک قوم بنانا۔

۲۔ اس طرح جو ہندوستانی قوم پیدا ہو۔ اس کی دماغی اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔

۳۔ ایسے حالات کی اصلاح و ترمیم کرانا جو ہندوستان کے لیے مضرت رساں اور غیر منصفانہ ہوں اور اس طرح ہندوستان اور انگلستان کے درمیان اتحاد و یگانگت کو استوار کرنا۔

۴۔ "رفع تکالیف اور جلب منافع کے دنیاوی امور" کو جو انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم پر طے پاتے ہیں جن کا تعلق بحیثیت ہندوستانی ہونے کے تمام باشندگان ملک سے یکساں ہوتا ہے ان کو حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز بیع و شرا اور خرید و فروخت کے معاملات کی حیثیت دے رہے ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ان امور کی یہ حیثیت نہ ہو تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ میونسپل بورڈ سے لے کر اسمبلیوں، کالجوں اور ایوان تجارت تک کسی بھی ہندوستانی ادارے یا سرکاری محکمہ میں شرکت کو جائز کہا جائے۔ تمام سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری، تجارتی، معاشی، قانونی اور تعلیمی اداروں میں شرکت کانگریس حرام یہ سیاسی بدعت نہیں تو اور کیا ہے!

۵۔ کسی بات کا سرکار کے مخالف نہ ہونا بھی جواز شرکت پر اثرانداز نہیں کیا کوئی عقل تسلیم کرسکتی ہے کہ انگریز بہادر کی سرکردگی میں تو ہندو مُسلم اشتراک جائز ہو اور اگر یہ منحوس سایہ ہٹ جائے تو وہ جائز چیز ناجائز ہوجائے۔ اگر معاذ اللہ ایسا ہے تو قرآن وحدیث مرجع شریعت نہ رہا بلکہ انگریزی ہیٹ۔ معاذ اللہ شریعت کا گنبد بن گیا۔

۶۔ فتویٰ ظاہر کرتا ہے کہ ایسے مُسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل اور تعلق انتہا درجہ خطرناک ہے جو اسلام کے نام پر اپنی اغراض اور اپنے ذاتی خیالات کو کامیاب بنائیں۔

۷۔ ہندو بیشک کافر ہے۔ اس کے پاس کفر و شرک موجود ہے مگر وہ نمایاں زہر ہے، جس سے ہر انسان بچ سکتا ہے۔ لیکن اس نام نہاد قائد اسلام کے پاس میٹھا زہر ہے جس کو تمیز کرنا مشکل اور نتیجہ تباہی اور بربادی ہے۔

وہ بعض بزرگ جو آج مسٹر جناح کی قیادت عظمٰی پر مطمئن ہیں۔ قادیانیوں کے ساتھ اشتراک عمل اور تعلق کو حرام کہا کرتے تھے اور یہی نکتہ بیان فرمایا کرتے تھے۔

۸۔ فتوے سے موجودہ مُسلم لیگ کی شرکت کا حکم بھی واضح ہو جاتا ہے کیوں کہ سر سید تاہم مذہبی شخص تھے۔ نماز روزے کے بھی غالباً پابند تھے۔ شراب وغیرہ سے قطعاً مجتنب تھے اگرچہ قرآن حکیم کی آیتوں کی تاویل وتفسیر اپنی رائے کے مطابق کرتے تھے۔ نبوت ورسالت، معجزہ، وحی وغیرہ کے متعلق اپنے مخصوص خیالات کے حامی تھے مگر تاہم قرآن حکیم کے احکام کو جنجال نہ کہتے تھے۔

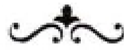
دوسروں کو بے شک یورپین وضع قطع کی ترغیب دیتے تھے مگر خود اپنی پرانی وضع قطع پر آخر تک قائم رہے۔

لیگؒ کے موجودہ قائدین

لیکن موجودہ مُسلم لیگ اور اس کے قائد ان تمام خطرات میں سر سید اور ان کے ایسوسی ایشن سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ نماز روزہ کی پابندی تو در کنار، روزہ سے صحیح واقفیت بھی نہیں۔ ان کے نزدیک قرآن پاک کے احکام معاذ اللہ ترقیات زمانہ سے پس ماندہ اور جنجال ہیں۔ (دیکھو تقریر مسٹر جناح متعلق سول میرج بل ۱۹۱۲ء)

یورپین ڈانس، کاک ٹیل وغیرہ محبوب مشاغل، وضع قطع ٹھیٹ یورپین علماء کے اقتدار ختم کرنے کا عزم مصمم، مسلم، رافضیوں اور قادیانیوں کا معجون مرکب۔ یہ تمام واقعات اظہر من الشمس ہیں جو ان سے چشم پوشی کرے یا ان پر پردہ ڈالے اس سے بڑھ کر مداہن فی الدین کون ہو سکتا ہے۔

۹۔ انڈین نیشنل کانگریس میں جواز شرکت کے حکم سے نیشن اور قومیت کے بارے میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خیال کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر فی الواقع مدار قومیت مذہب ہوتا اور متحدہ قومیت ناجائز ہوتی تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جیسے دقیقہ رس فقیہہ کے لیے قطعاً ناممکن تھا کہ وہ مشترک جماعت کے لیے نیشنل کانگریس، قومی جماعت کا لفظ برداشت کرتے اور پہلے ہی وہلا میں اس پر تنقید نہ کرتے۔ بالخصوص جب کہ سوال کا پہلا لفظ ہی یہ ہے "ایک جماعت قومی" اور جب کہ کانگریس کا پہلا مقصد ہی یہ ہو کہ ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متفق ومتحد کر کے ایک قوم بنانا "السکوت فی معرض البیان بیان" کیا ایسے ہی موقع کے لیے نہیں ہے اور کیا اس اصول کے بموجب متحدہ قومیت کے متعلق حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ واضح نہیں ہو جاتا۔



رئیس الاحرار کی رہائی اور مُفتی کفایت اللہ صاحب کا منظوم خراجِ عقیدت

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں تفصیلاً گزر چکا ہے کہ اکابرین احرار و جمعیت علمائے ہند سب نیو سنٹرل جیل ملتان میں اکٹھے کر دیئے گئے تھے وہاں پر انہوں نے کافی اچھا وقت گذارا پھر ایسا وقت بھی آیا کہ ان لوگوں کو رہائی کے احکام آنے لگے، چنانچہ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ۲۰ر فروری ۱۹۳۳ء کو رہا کر دیا گیا۔ جب رئیس الاحرار کی رہائی کے احکام آئے تو باقی ساتھی رئیس الاحرار کی جدائی سے بے قرار ہو گئے، اس پر مُفتی اعظم ہند، حضرت مولانا مُفتی کفایت اللہ صاحب نے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی جدائی اور ان کے اوصاف پر ایک قصیدہ کہا جسے پڑھ کر آدمی پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے وہ یہ ہے۔ (محمد عثمان لدھیانوی)

خدمت خلق بود خلق حبیب الرحمٰن

رہائی

اے صدیقِ محترم لدھیانوی — لو تمہاری بھی رہائی آگئی
اے شفیق قوم! رحماں کے حبیب — آگئی تیری جدائی آگئی
دوستوں کو چھوڑ کر تو بھی چلا — آہ!! کیسی شاق ہے فرقت تری

قیامِ اسیری

تو رہا جب تک تو اپنی قید کو — قید سمجھا ہی نہیں کوئی کبھی
جیل کیا تھا محفل احباب تھی — اور تُو تھا اس کی رونق روشنی
تو گیا تو اس میں کوئی شک نہیں — رونقِ بزمِ اسیراں بھی گئی
جیل کے عملے سے بالُطف و خوشی — کار برآری تری مخصوص تھی
جب کبھی الجھا کسی کا کوئی کام — تو نے سلجھایا بہ لُطف و آشتی

اخلاق

گرچہ باہر صدر تھا احرار کا — پر نہ برلی جیل میں کچھ برتری
زیب دیتی ہے قیادت بھی اسے — جو رہے زنداں میں بن کر لشکری
ہے سیاست خدمت قومی کا نام — قوم کے خادم کا حق ہے سروری

ساتھیوں کی خدمت

قیدیوں کی ہر طرح کی خدمتیں — تُو نے کیں اے مستق افسری
کچھ نہ سمجھا فرق خویش و غیر میں — سب کی یکساں دل سے خدمت تُو نے کی
شیر و شکر ہو کر تو ان میں رہا — رنج و راحت میں تری شرکت رہی
سب ترے مداح ہیں ممنون ہیں — تیری فرقت سے ہیں پژمردہ سبھی
اختلافِ رائے پر بھی دوست ہیں — سچ یہی خدمات ہیں سب سے بڑی
سب کو یاد آئیں گی تیری خدمتیں — تیرا ایثار اور جودِ حاتمی!

ذاتی اوصاف

شکر ہے اللہ کا آئے خوش خصال — حق نے کی تجھ کو عطا نیک اختری
حُسنِ صورت حُسنِ سیرت خوش دلی — خوش کلامی خوش مزاجی دل لگی
تو فقیری میں ہے دل کا بادشاہ — تجھ پہ قرباں شوکت شاہنشی
حق نے دی ہے تجھ کو جرأت بے نظیر — ہمّت مردانہ قور عزمِ قومی
غیرت قومی و استقلال و صبر! — حفظ ناموس اور ملت پروری
نہضت ملیہ میں تھی پانچویں! — یہ اسیری تیری اے حرِّ جری
قیدیوں میں چونکہ اقدم تو ہی ہے — اس لئے حاصل ہے تجھ کو برتی

قیدوبند

ہر مُصیبت ملک و ملت کے لئے — تو نے کامل خوشدلی سے جھیل لی
بند کر دینے سے تجھ کو جیل میں — تیری ہمّت میں نہیں آئی کمی
شیر پنجرے میں ہو جب بھی شیر ہے — لومڑی آزاد بھی ہے لومڑی
یک طرف فرقت کا ہے تیری ملال — دوسری جانب خوشی بھی ہے بڑی
قید مظلومی کی تھی صبر آزما — ختم اطمینان و راحت سے ہوئی
ہے یہ استقلال و ہمّت کا ثبوت — آن جیسی تھی تری ویسی رہی

دُعا

ہے دعا میری یہ صدق سوز سے — اجر کامل دے تجھے ربِّ غنی!
ملک و ملت کے لئے قربانیاں — ہوں تیر مقبول باصد خرمی
ہو امور ملک و ملت منتظم — دشمنانِ ملک وقف مدبری
حافظ و ناصر ترا اللہ ہو!! — اور ترے ہر کام میں ہو بہتری
مال و زر، اقبال ہوں تیرے غلام — کامیابی گھر کی ہو لونڈی تری
تیرا آوازہ رہے جب تک رہے — گھومتا یہ گنبد نیلو فری!

اولاد کے لیے دُعا

ہو تری اولاد صالح اور سعید — اور حاصل ہو اسے علمِ علیؓ
دے اسے اللہ اپنے فضل سے — شوکت صدیقؓ و فاروقؓ و غنیؓ
اور ہو دنیا میں ان کا نصب عین — اتباع سُنّت ۔ پیغمبری

مبارک باد

جیل سے جانا مبارک ہو تجھے — تہنیت لے مُخلصانہ اور دلی
یاں سے جا کر بھول مت جانا! ہمیں — ہے یہی بس التماس آخری

(از حضرت مولانا مُفتی کفایت اللہ صاحبؒ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج سے تقریباً اٹھاون ۵۸ سال پہلے کے اکابر علمائے ہندوستان وبغداد
ومدینہ منوّرہ اور صفیائے عظام ومشائخ کرام کا فتوے
بابت جواز شرکت انڈین نیشنل کانگریس
اور عدمِ شرکت بہر صورت سر سیّد احمد خاں
موسوم باسم خلاصلہ فتاویٰ

نصرة الابرار

جسکو

حضرت مولانا الشاہ عبد العزیز صاحب لدھیانوی نے
جمعہ کے بعد تقریر میں ارشاد فرمایا۔ اور بیہقی وقت حضرت مولانا محمد صاحب لدھیانوی نے تحریر فرمایا اور مدلل ومبرھن کیا۔
ناچیز حافظ مشتاق احمد لدھیانوی

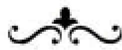
نوٹ: مولانا رشید احمد گنگوہی کے معافی نامہ اور معذرت کے بعد کانگریس کے فتویٰ کی تصویق کرنا
مولانا رشید احمد کا فتویٰ ہے۔ تو یہ فتویٰ ضروری مولانا رشید احمد نے دیا ہے۔(مرتب عزیز)

طبع اول لاہور پریس بیرون بھاٹی دروازہ لاہور ۱۸۸۶ء
طبع دوم جنڈوالیکٹرک پریس ۲۵/ دسمبر ۱۹۴۵ء کو لدھیانہ سے شائع کی گئی

معذرت نامہ عُلماء بطور اختصار تحریر ہوتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامدًا و مصلیاً۔ بندہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ عرض کرتا ہے۔ کہ لدھیانہ سے ایک استفتاء اس مضمون کا آیا تھا کہ جو شخص ہنود کی اعانت اور مُسلمانوں کو ضرر دیوے وہ کیسا ہے۔ بندہ نے جواب لکھا تھا۔ کہ وہ فاسق ہے یہ خلاصہ سوال وجواب کا ہے اب وہ فتویٰ بندہ کا طبع ہوا اور اس کے اول تین صفحے لکھے دیکھے جس سے معلوم ہوا کہ وہ سوال مولوی عبدالعزیز صاحب لدھیانوی کی نسبت ہے۔ اور وہ جو د اعانت واضرار اس میں مصرح لکھے ہیں۔ لہذا بندہ راست راست کہہ کر مسلمانوں کو مطلع کرتا ہے اور اپنا ذمہ بری کرتا ہے کہ مولوی عبدالعزیز صاحب ہرگز ہرگز مصداق اس فتوے کے نہیں ہیں۔ اور جو امور ان کی طرف اس تحریر میں منسوب ہیں ان کی وجہ سے بندہ ہرگز اس کو محل اس جواب وفتویٰ کا نہیں جانتا۔ اگر سائل اس تفصیل کو درج سوال کرتا تو بندہ ہرگز یہ جواب نہ لکھتا جو کچھ اس تحریر میں درج ہے اس کی تاویل صحیح ہے۔ اگر واقعی ان سے یہ امور ایسے ہی سرزد ہوئے ہیں اور اس عبارت میں جو گستاخ کلام نسبت مولوی صاحب کے ہے وہ سخت نازیبا ہے۔ بندہ کے نزدیک عُلماء کے شان میں ایسے کلام موجب ہتک اسلام وعلم ہے پس جو صاحب اس بندہ کو صادق جانتے ہیں اور جو بندہ کی تحریر کی وجہ سے مولوی عبدالعزیز صاحب سے بد عقیدہ ہوئے ہیں ان کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ہرگز مصداق اس فتوئے بندہ کے نہیں اس سے معذرت کرنا اور معافی چاہنا اور اتحاد و مُحبّت کرنا لازم ہے۔ واللہ تعالیٰ ولی التوفیق کتبہ الراجی رحمۃ ربہ رشید احمد گنگوھی عفی اللہ تعالیٰ عنہ مہر (۱) تحریر جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب کی درست ہے۔ ۳۔ احمد علی عفی عنہ (۲) جو تحریر جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب نے فرمائی ہے درست ہے پیر مُحمد عفی عنہ (۳) مہر تحریر مولانا صاحب درست ہے عنایت الٰہی عفی عنہ مہتمم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور (۴) تحریر مولوی صاحب ممدوح کی درست ہے ثابت علی عفی عنہ مدرس مظاہر علوم سہارنپور۔ (۵) الحق ناقال مولانا رشید احمد۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب (۶) تحریر مولانا صاحب راست ودرست ہے بندہ کے نزدیک مولوی عبدالعزیز صاحب و دیگر حضرات لدھیانوی ہرگز مخرب اسلام نہیں ہیں بلکہ معاون اسلام ہیں مولانا مُحمد حسن عفی عنہ دیوبندی۔ (۷) انا ایضا احقہ۔ بندہ عبداللہ خان (۸) جو کچھ حضرت مرشدنا مولانا رشید احمد صاحب نے تحریر فرمایا ہے وہ راست اور بے کم وکاست ہے جناب مولوی عبدالعزیز صاحب ہرگز اس قابل نہیں کہ جیسے ان کی نسبت طبع ہوا ہے بندہ احمد عفی عنہ۔ یہ تحریر مولوی رشید احمد صاحب کی درست ہے اور اس میں مولوی عبدالعزیز صاحب و مولوی مُحمد و مولوی عبداللہ صاحبان کو بخوبی جانتا ہوں نہایت متقی اور ذی علم ہیں ان سے بہتر عالم ملک پنجاب میں نہیں ہے ں جو ایسے عالموں کو ناحق تہمت لگاوے اور جھوٹی تحریر ان کی نسبت طبع کروادے وہ اس وعید کا محل ہے۔



HISTORY OF THE FREEDOM MOVEMENT IN INDIA

VOLUME THREE

by

TARA CHAND

رئیس الاحرار اور مولانا شاہ عبدالقادر کی کہانی
ڈاکٹر تاراچند کی زبانی
۱۲/ مئی ۱۸۵۷ء سے ۲/ ستمبر ۱۹۵۶ء تک

PUBLICATIONS DIVISION
MINISTRY OF INFORMATION AND BROADCASTING
GOVERNMENT OF INDIA

خاندانِ علمائے لدھیانہ کے متعلق حکیم الاسلام کے تأثرات

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب "مہتمم دار العلوم دیوبند نے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ؒ کی سوانح پر علمائے لدھیانہ کی خدمات کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے اس مضمون میں سے کچھ کلمات یہاں پر درج کیے جاتے ہیں۔ (از مؤلف)

اس خاندان کے موجودہ اخلاف کرام سے تو میرے مخلصانہ اور دوستانہ تعلقات عرصہ دراز سے قائم ہیں جیسا کہ میرے اکابر خاندان کے اس خاندان کے اکابر سے گہرے مراسم رہے ہیں اور آج اس تصور سے لدھیانہ کی آمد و رفت علمی اجتماعات اور مخلصانہ علمی مجلسیں آنکھوں میں پھر گئیں۔ لیکن اس خاندان کے اسلاف کرام سے تفصیلی تعارف اس داستان حیات ہی کے پڑھنے سے اس سفر میں میسر ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ ولی اللّٰہی خاندان کی شاخ جہاں بھی چلی گئی، شاخ طوبیٰ ہی ثابت ہوئی میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ حضرت جد امجد قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ بانی دارالعلوم دیوبند جب پہلے حج کے لئے کراچی سے حجاز مقدس روانہ ہوئے تو بادبانی جہاز ہوا ناموافق ہونے کی وجہ سے بصرہ میں لنگر انداز ہوا اور کئی دن تک ٹھہرا رہا مسافر بصرہ کی سیر کرنے کے لئے اتر گئے حضرت قاسم العلوم بھی اترے مگر تفریح طبع کے لیے نہیں بلکہ بصرہ کے اس دور کے ایک مشہور و معروف محدث سے سندِ حدیث حاصل کرنے کے لیے محدثِ ممدوح نے حضرت قاسم العلوم سے دریافت کیا کہ آپ کی سند حدیث کہاں سے ہے؟ فرمایا شاہ عبد الغنی محدث دہلوی سے فرمایا کون شاہ عبد الغنی؟ عرض کیا کہ شاہ اسحٰق دہلوی کے تلمیذ فرمایا کون شاہ اسحٰق؟ عرض کیا کہ شاہ ولی اللہ کے تلمیذ تو جھوم کر فرمایا کہ ہاں ولی اللہ شجرہ طوبیٰ ہے جس طرح اہل جنّت کا کوئی قصر اور محل نہ خالی ہوگا کہ اس میں شجرہ طوبیٰ کی شاخ پہنچی ہوئی نہ ہو اسی طرح ہندوستان میں علم کا کوئی گھرانہ نہ ملے گا جس میں خاندان ولی اللّٰہی کی کوئی شاخ نہ آتی ہو اور یہ فرما کر بڑی شفقت کے ساتھ حضرت قاسم العلوم کو سند عطا فرمائی۔ بہر حال اسی طوبائی خاندان جنّت نشان کی ایک علمی شاخ لدھیانہ کا علمی خاندان بھی ہے جو ولی اللّٰہی علوم اور ولی اللّٰہی جذبات کی امانت سینوں میں لئے ہوئے ہے۔

ان ساری ولی اللّٰہی شاخوں میں علم اور اخلاق کے ساتھ جو چیز سب سے زیادہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے وہ مجاہدانہ اسپرٹ، راہ حق میں ایثار و فنائیت، بے باکانہ حق گوئی ہر رسمی اقتدار سے نڈر ہو کر اعلان حق اور ساتھ ہی اس راہ میں کسی بھی قربانی سے نہ گھبرانا ہے یہ خصوصی وصف لدھیانوی خاندان میں بہت ہی نمایاں اور خصوصی طور پر نظر آتا ہے اور نہ صرف اسلاف خاندان ہی تک محدود ہے بلکہ آج کے اخلاف میں بھی اس کی وہی جھلک قائم ہے اور بلاشبہ یہ ایک فضل خداوندی ہے کہ کسی خاندان کی اعلیٰ روایات اور مستحسن خصوصیات پشتوں تک خاندان کا ساتھ نہ چھوڑیں اور اخلاف اپنے اسلاف کے سانچوں میں ڈھلتے رہیں۔

یہ خاندان باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ سینہ سپر رہا۔ باطل اور طاغوت کے سامنے کہیں سر نہ جھکایا اور اس پر خار راہ کی ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور برضا و تسلیم مصائب کا سامنا کیا۔ فتنہ خواہ حکومت و سیاست کی لائن سے آیا یا مذہب و دیانت کے حلقوں سے مادیت کے راستوں سے نمودار ہوا یا روحانیت کے ناموں سے انہوں نے ہر دور میں اسے پہچانا اور جلد پہچانا۔ اس کی سرکوبی اور مسلمانوں کو اس سے آگاہ کر کے اس سے محفوظ رکھا۔ برطانوی حکومت کی لائن سے جس قدر فتنے اٹھے اور جس رنگ میں بھی اٹھے ان کے خلاف اس خاندان کے اسلاف بھی اٹھے اور پھر اخلاف نے بھی وہی کچھ کیا جو اسلاف نے کر دکھایا تھا۔ اور ساتھ ہی غربت و تشدد کے تمام وہ مصائب بھی جھیلے جو اس راہ کے خواص آثار میں سے ہیں مگر کلمہ حق کی تبلیغ و ترویج نہ چھوڑی اور نہ ہی اس میں کسی اپنے اور بیگانے کی ذرہ برابر رعایت کی بلکہ

بلاخوف لومتہ لائم اعلان حق کیا خواہ اس کی پاداش میں اپنا کچھ بھی کھودینا پڑا۔ ہوسکتا ہے کہ عملی جزئیات میں سے ان سے کسی کو اختلاف ہو مگر دنیا کا کوئی بھی حق پرست انسان ان جذبات حقہ کی قدر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"اول باخر نسبتے دارہ" کے اصول پر جس طرح اس خاندان کے اسلاف پر اعلان حق کی بدولت وہ وقت بھی آیا کہ انہیں وطن مالوف اور گھر بار چھوڑ کر غربت کی زندگی اختیار کرنی پڑی اور ان کی غیبت میں دشمنان حق نے ان کے گھروں کو نہیں ان کی عبادت گاہوں تک کو جلا ڈالا۔ اسی نہج سے اخلاف خاندان کو بھی آج راہ محبت کی یہ تمام تلخیاں سہنی پڑ رہی ہیں وطن مالوف چھوٹا' گھربار ہاتھ سے نکلا۔ خاندان کے کتنے ہی مردوں عورتوں نے حیات غربت کے ساتھ موت غربت اختیار کی مدارس ہاتھ سے گئے معابد اور مساجد قبضہ سے نکل گئیں جن میں برسوں سے قال اللہ و قال الرسول کی صدائیں اٹھتی رہیں اور نہ معلوم کہ وہ باقی ہیں یا یکسر دوسرے نقشوں میں تبدیل ہو چکی ہیں مگر ان سارے فتنوں کی گرم بازاری میں یہ امانت داری کس درجہ پر عظمت ہے کہ جس طرح ان انتہائی مصائب میں اسلاف کے پیروں کو ذرہ برابر جنبش نہیں ہوئی تھی اور انہوں نے نہ صرف صبر و خیر بلکہ رضاء و تسلیم کے جذبات دکھلائے تھے اسی طرح آج کل دردناک مصیبتوں اور ہولناک پریشانیوں میں اخلاف کے پائے استقلال کو بھی ادنی جنبش نہیں ہوئی اور نہ ہی ان کے چہروں پر کسی ادنی سی بدحواسی یا اداسی کی کوئی لکیر دکھلائی دیتی ہے۔

بہر حال نوعی حیثیت سے اس علمی خاندان میں جو چیز قدر مشترک کے طور پر اسلاف و اخلاف میں نمایاں نظر آتی ہے اور ساتھ ہی اس کے آثار بھی مشترک ہیں وہ راہ حق میں بے خوفی و بے باکی' اعلاء کلمتہ اللہ اطفاء فتن اور دنیوی زندگی میں تحمل شدائد و مصائب مگر بصد تسلیم و رضا ہے حکومتی فتنہ ہی نہیں بلکہ ہر وہ فتنہ جو مذہب' قوم' فرقہ تمدن اور معاشرہ و سیاست کی راہ سے نمودار ہوا ان حضرات کی نگاہ دور بین نے ہر رنگ میں اس کے انداز قد و قامت کو پہچانا اور مخلوق کو اس سے خبردار کیا فتنہ مرزائیت کو اولاً اسی خاندان نے بھانپا اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دجل و فساد سے علمی طور پر ملک کو آگاہ کیا جس سے لاکھوں انسان گمراہی کے اس جال سے بچ گئے حتیٰ کہ اس سلسلہ کی عملی تکمیل بھی بالاخر اسی خاندان کے ہاتھوں ہوئی۔ مجلس احرار نے امیر الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی امارت و قیادت میں اس فتنہ کا عملی طور پر مقابلہ کیا اور اس سے زبردست ٹکر لی جو ظاہر میں قادیانیت سے ٹکر تھی مگر بلحاظ حقیقت یہ ٹکر برطانیہ کی طاقتور حکومت سے تھی اس لئے ان حضرات کو قید و بند کے سارے ہی تشدد آمیز مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن بالاخر سیاسی پہلوؤں سے اس جماعت باطل کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روک دینے بلکہ محدود کر دینے میں امیر الاحرار اور ان کے رفقاء کار کامیاب ہوئے جو ایک تاریخی کارنامہ ہے اور زندہ جاوید رہ کر جریدہ عالم پر سنہرے حرفوں سے بطور یادگار ثبت رہے گا۔

فتنہ نیچریت و آزادی' فتنہ بدعات و محدثات' فتنہ بے قیدی و اطلاق فتنہ تمدن و تعیش نے ان بزرگوں کے دور میں مختلف روپوں سے ابھرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے اعلیٰ ترین استقامت سے اس زیغ باطل پرور کا مقابلہ کیا' اور اسے شکستوں پر شکستیں دیں۔

اس لئے اس خاندان کا اثر و رسوخ ہمہ گیر رہا۔ پنجاب میں خصوصاً اور بیرون پنجاب میں عموماً اس علمی گھرانے کو عزت و وقعت اور مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ان کے کلمات موعظت و ہدایت کو دل کے کانوں سے سنا گیا۔ یہ اثرات پبلک سے گزر کر درباروں تک بھی پہنچے اور سلاطین وقت نے بھی ان بزرگوں کے سامنے سر عقیدت خم کیا!

بہر حال مجموعی حیثیت سے یہ خاندان پنجاب کے ایک ممتاز علمی خاندان اور علم و فضل نیز جوہر عمل کے لحاظ سے ایک مانا ہوا قبیلہ رہا ہے جس نے ہمیشہ مسلمانوں کی علمی اور دینی خدمت انجام دی ہے آج کا دور دین و تقوی کا دور نہیں اور نہ ہی دین کے لئے آج کے ناساز گار احوال مساعدۃ کر رہے ہیں دین پر قائم رہنے والا غریب اور کالقابض علی الجمر (ہاتھ میں چنگاری پکڑنے والا) کا مصداق ہے جس کا مادی ماحول میں کوئی وقار نہیں۔ غیرت خداوندی نے نہ چاہا کہ دین و دیانت کے ایسے پاک نمونے ایسے ناپاک ماحول میں رکھے جائیں۔ اس لئے انہیں اٹھالیا

گیا اور عالم بالا کو ان سے زینت دی گئی اس لئے جہاں اس دور کی بدبختی ہے کہ یہ نمونے اس میں نہ رہے وہیں ان حضرات کی ارجمندی اور سربلندی کی نشانی تھی کہ دنیا کی اس عام زبوں حالی سے پہلے ہی انہیں اٹھالیا گیا۔

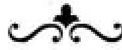
رحمھم اللہ رحمتہ واسعتہ لیکن پھر بھی انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ اخلاف نے اسلاف کا نقش قدم نہیں چھوڑا اور ان کے پاک جذبات کی امانت محفوظ ہے جس میں کوئی خیانت نہیں ہوئی۔

خصوصیات زمانہ نے گو نقشے بہت کچھ بدلے ہیں مگر شباہت نہیں مٹی۔ آب و ہوا نے مزاجوں میں تبدیلیاں بہت کچھ پیدا کر دیں مگر افتاد طبیعت نہیں بدلی۔ باد سموم نے نونہالوں کو مرجھا ضرور دیا ہے مگر پھلوں کا ذائقہ پھر بھی وہی ہے بہر حال عوارض و خصوصیات وقت نے تبدیلیاں ضرور کی ہیں مگر بنیاد اساس پر تعمیر وہی کھڑی ہوئی ہے جو پہلے سروں پر سایہ کئے ہوئے تھی۔

بزرگوں کا نقش قدم ہی در حقیقت بزرگوں کا قائم مقام ہوتا ہے اور وہ انہی کی طرح اگلوں کے لئے مربی اور فانوس رہنا ثابت ہوتا ہے اس لئے بزرگوں کی تاریخیں مدون کی جاتی ہیں اور اسی درس عبرت کے لئے قرآن حکیم نے تاریخ اور قصص اسلاف کا باب قائم کیا ہے۔

لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب (بحوالہ رئیس الاحرار صفحہ ۱۸ تا صفحہ ۲۳)

محمد طیب غفرلہ
مہتمم دار العلوم دیوبند
۷ر جمادی الثانی ۱۳۸۰ھ



حواشی

فاضل مولف کا اشارہ مولانا مُفتی محمد شفیع دیوبندی مرحوم (ف ۱۹۷۶ء، کراچی) کی طرف ہے۔ (ا۔س۔ش)

ملاحظہ ہو رسالہ "نصرۃ الابرار" مطبع صحافی، لاہور ۶ پچنس گنج، ص ۱۳

نصرۃ الابرار، شائع کردہ حافظ مشتاق احمد لدھیانوی، ۱۹۴۵ء ص ۹-۱۰

لدھیانہ کے لیے مولانا عبد القادر ابن مولانا عبد الوارث ۱۹۷۶ء میں لدھیانہ سے دہلی آئے اور ولی اللّٰہی خانوادہ علمی کے ارکان سے تعلیم حاصل کی۔ مولوی عزیز الرحمٰن جامعی نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے لیکن خود جامعی مرحوم نے لکھا ہے کہ وہ شاہ عبد القادر دہلوی کے ایک واسطے سے خلیفہ اور مجاز بیعت تھے اور انہی کے بیان کے مطابق حضرت سید احمد شہید سے ان کی مراسلت تھی، خاندان میں سید صاحب کے خطوط یادگار تھے اور چھپوا بھی دیے تھے۔ اس لیے صاف ظاہر ہے کہ شاہ ولی اللہ سے نسبت تلمذ کا اظہار ان کا سہو قلم ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی شاید ان کی پیدائش سے بھی پہلے ۱۷۶۱ء میں انتقال کر چکے تھے۔ یہ زمانہ حضرت شاہ عبد العزیز کا تھا اور اگر ان کے شاگرد ہوں تو تعجّب نہ کرنا چاہیے۔

مولانا عبد القادر لدھیانوی کے چار بیٹے تھے۔ مولانا سیف الرحمن، مولانا محمد، مولانا عبد اللہ اور مولانا عبد العزیز۔ مولانا عبد القادر نے اپنے بیٹوں، بھائیوں اور ان کی اولاد کے ساتھ دہلی پہنچ کر جہاد آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا تھا۔ ۱۸۶۰ء میں پٹیالے میں ان کا انتقال ہوا۔ مُفتی محمد نعیم مولانا عبد اللہ کے بیٹے اور حَبیب الرحمٰن ابن محمد زکریا مولانا محمد کے پوتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے صاحبزادہ محترم مولانا عزیز الرحمٰن جامعی سے خاکسار کو نیاز حاصل تھا اور مراسلت کا تعلق بھی رہا تھا۔

جنگ آزادی کے بعد یہ خاندان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ مولانا مُفتی محمد نعیم رحمۃ اللہ علیہ مشرقی پنجاب کے حوادث میں لدھیانہ کی تباہی کے بعد پاکستان آ گئے تھے۔ ۱۹۷۰ء میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں انتقال ہوا۔ مولانا حَبیب الرحمٰن بھی پاکستان آ گئے تھے لیکن وہ جلد ہی ہندوستان لوٹ گئے۔ ۱۹۵۶ء میں دہلی میں پیوند خاک ہو گئے۔

اس خاندان رفیع الارکان کی دینی، سیاسی اور قومی و ملی خدمات صدیوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ (ا۔س۔ش)

اس تحریر کی نقل و کتابت میں کئی لفظ چھوٹ گئے تھے اور کئی لفظ بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے تھے۔ خاکسار کے پیش نظر مطبع صحافی لاہور کا ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء کا اور مولوی مشتاق احمد کا ۱۹۴۵ء کا لدھیانہ ایڈیشن، دونوں ہیں جن کے مطالعہ و موازنہ سے اس اقتباس کی تصحیح کر دی ہے۔

یہاں حضرت گنگوہی کی تحریر کا عنوان "معذرت نامۂ عُلماء بطور اختصار" تحریر ہے اور اس کے ذیل میں سترہ علمائے وقت کے دستخط ہیں جن کے نام پہلے فتوے میں آئے تھے۔ ان میں مولانا محمود حسن، مولانا محمد حسن دیوبندی، مولانا محمد فضل عظیم دیوبندی، مولانا عبد الحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی وغیرہم کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انجمن انوارِ محمدیہ، امرتسر کے اکتالیس ارکان کے دستخط ہیں۔

بعض کے صفحات میں مفصل فتویٰ ہے جسے مسمی علی محمد متوطن بمبئی نے دریافت کیا تھا اور مولانا مُفتی محمد لدھیانوی (ابن مولانا عبد القادر لدھیانوی) نے تحریر فرمایا تھا۔ اس کی تائید و توثیق اور تصویب میں رئیس الاحرار مولانا حَبیب الرحمٰن لدھیانوی کے خانوادہ علمی کے اسلاف کرام کے علاوہ ایک سو پینتیس مشاہیر عُلمائے عصر کی تصدیقات و تصویبات ہیں۔ ان میں مولانا فیض الحسن اور مولانا احمد علی

محدث سہارن پوری، مولانا محمود حسن، مولانا احمد حسن (امروہوی) مولانا محمد حسن، مولانا عبد اللہ خاں، مولانا محمد منفعت علی (مدرسین مدرسہ اسلامیہ (دارالعلوم) دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبد الحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی، مولانا ارشاد حسین رام پوری، مولانا ریاست علی خان شاہ جہان پوری، مولانا احمد رضا خان بریلوی وغیرہم شامل ہیں۔ اعلیٰ حضرت بریلوی کا فتویٰ چار صفحے پر مفصل اور مستقل ہے۔ اس کا مفاد سرسید کی مخالفت اور کانگریس کی حمایت میں وہی ہے جو مولانا مفتی محمد لدھیانوی کے فتوے کا ہے۔

ان حضرات علمائے ہند کے علاوہ مدینہ منورہ کے ایک عالم علی بن الجاج یوسف خادم روضۃ النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور ایک بغدادی عالم طاہر آفندی خادم روضۂ عبد القادر جیلانی کے فتاویٰ سرسید کے بارے میں بھی ہیں۔ کانگریس کے بارے میں ان کے فتاویٰ میں کوئی بات نہیں ہے۔

آخر میں سرسید کے خلاف مولوی امداد علی کے رسالے "امداد الآفاق برجم اہل النفاق" اور مولوی غلام دستگیر قصوری کے رسالے "جواہر مضیہ فی رد نیچریہ" سے تراسی ۸۳ علمائے کرام کے فتوے درج کر دیے گئے ہیں۔ اس کے مفتیوں میں بھی مولانا عبد الحی (فرنگی محلی) مولانا لطف اللہ (علی گڑھی)، (میاں) محمد نذیر حسین (دہلوی)، مفتی عبد اللہ ٹونکی وغیرہم مشاہیر علمائے ہند کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔

فتویٰ "نصرۃ الابرار" کے مرتب و مفتی مولانا محمد تھے لیکن یہ فتویٰ درحقیقت مولانا عبد العزیز لدھیانوی کا ایک خطبۂ جمعہ تھا جو علی محمد نامی ایک شخص ساکن بمبئی کے چند سوالات کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا تھا اور ان کے بڑے بھائی مولانا محمد نے بطور فتویٰ مرتب فرما دیا تھا۔

فتویٰ "نصرۃ الابرار" کے تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے: "رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ہندوستان کی جنگ آزادی" مولفہ عزیز الرحمٰن جامی، دہلی ۱۹۶۱ء (ا۔ س۔ ش)



مولانا حبیبؒ الرحمن.... چٹانوں کا تحمل

چھوٹے چھوٹے فقروں میں گہرائی کی بات کہہ جاتے ہیں۔ استعارہ نہ تشبیہ سورج کی تیز کرنوں کی مانند بات میں روشنی ہوتی ہے اور جو بات بھی بولتے ہیں ناپ تول کر بولتے ہیں، خیالات آپ کے یہاں پہلا درجہ رکھتے ہیں۔ اسلوب ثانوی اور زبان موٴخر لیکن آواز میں وہ گھن گرج موجود ہے کہ کبھی تلوار کی شوخی کا گماں ہوتا ہے اور کبھی بجلی کی کڑک معلوم ہوتی ہے، تقریر میں موضوع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور الفاظ کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ دماغ سے مشورہ کر کے زبان پر آرہے ہیں روانی کی نسبت تحمل زیادہ ہے حاضر جوابی کی صفت مزاج کا جزو أعظم ہے۔ ان میں ظرافت عنقا ہے شاعری سے لگاؤ نہیں لیکن اپنی تقریرَ میں باموقع ایسا شعر کہہ جاتے ہیں۔ جیسے حیا آلود ہونٹوں پر کوئی شریر مسکراہٹ کھیلے، غالب نے آپ ہی کے لئے کہا ہے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

شورش کاشمیری

کچھ حوالہ جات آغا شورش کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب پسِ دیوارِ زندان سے صفحہ ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۶، ۳۶۸ تا ۳۷۱

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

ایک دن حجام نے ذکر کیا یا کانوں میں کہیں سے بھنک پڑی کہ افغانستان سے کوئی وزیر قید ہو کر آیا ہے۔ لانبا قد، رنگ گندمی، داڑھی کھچڑی، دراز قبا، صبح و شام ساتویں اور آٹھویں بارک میں چہل قدمی کرتا ہے۔ جیل کے حکام اس کا ادب کرتے اور خوف بھی کھاتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ افغانستان کا وزیر نہیں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ہیں۔ اُن کے علاوہ بہت سے کمیونسٹ اور سوشلسٹ نوجوان بھی نظر بند ہیں۔ مجھ پر نمبردار کے حملہ کی خبر ان تک پہنچی تو انہوں نے سپرنٹنڈنٹ سے دریافت کیا سپرنٹنڈنٹ مکر گیا مولانا حبیب الرحمٰن اور پریم چند بھسین نہ مانے۔ نظربندوں نے متفقہ طور پر سپرنٹنڈنٹ کی بات کو ٹھکرا دیا اور اصرار کیا کہ جب تک خود نہ دیکھ لیں اس وقت تک وہ اس کی بات کا اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ وہ تہیہ کر چکے ہیں کہ احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دیں گے سپرنٹنڈنٹ پہلے ٹالتا رہا پھر مان گیا مجھے اپنے دفتر میں بُلا بھیجا وہاں مولانا حبیب الرحمٰن تھے اور ان کے ساتھ ایک نوجوان فاختی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا میں نے خیال کیا کہ سپرنٹنڈنٹ کا صاحبزادہ ہے لیکن وہ سوشلسٹ پارٹی کے سیکرٹری مسٹر پریم چند بھسین ایم اے تھے۔ میں ان کے چہرے کی شرافت آنکھوں کی سنجیدگی اور لہجہ کی شرینی سے بے حد متاثر ہوا۔ انہوں نے پوچھا آپ پر جو حملہ ہوا ہے اس میں کسی افسر کا ہاتھ ہے؟ میں نے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ اور شیر سنگھ دونوں کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔ اس خیال کی بعد میں تصدیق ہوگئی لیکن مولانا حبیب الرحمٰن چونکہ معاملہ کو طول دینے کے حق میں نہ تھے لہٰذا قصہ ختم کر دیا گیا۔

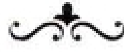
پریم چند بھسین نے سپرنٹنڈنٹ کو بے حد ڈانٹا انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ میرا سر بالکل پھٹ گیا ہے اور میں مضروب ہو کر ہسپتال میں ہوں! اس احتساب سے سپرنٹنڈنٹ کو کان ہوگئے اور ہم پہلے سے زیادہ اپنے آپ کو طاقتور سمجھنے لگے۔

تمام نظربند میری سی کلاس سے پریشان تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے گوپی چند بھارگو پر زور دیا کہ اس منتقمانہ ذہنیت کو ختم کرائے لیکن نہ سکندر حیات مانتے تھے نہ گوپی چند بھارگو ہی کو مجھ سے کوئی لگاؤ تھا سپرنٹنڈنٹ (کرشن لال چوپڑہ) میری صاف گوئی پر ناخوش تھا مولانا اور پریم کی ملاقات کے بعد اس کا رویہ مختلف ہو گیا اُس نے ہمارے احاطہ میں آنا چھوڑ دیا مولانا حبیب الرحمٰن بڑے باتدبیر انسان تھے افسروں کو مٹھی میں لے لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا میری صحت دیکھ کر انہیں سخت دھچکا لگا سپرنٹنڈنٹ کو مجبور کرتے رہے کہ مجھے دو وقت کھانا بھجوانا چاہتے ہیں سپرنٹنڈنٹ عذر کرتا رہا کہ ایک سی کلاس قیدی کو اے کلاس کا کھانا کیونکر مل سکتا ہے؟ آخر بڑے عذر و انکار کے بعد سپرنٹنڈنٹ مان گیا اچانک بھنا ہوا گوشت اور پراٹھے ملے تو میں حیران ہوا مجھے علم نہ تھا بہر حال میں نے مولانا کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا سالن اور پراٹھے لوٹا دیئے اور کہلا بھیجا کہ سی کلاس میں رہ کر میں ان مراعات کا حقدار نہیں یہ چوری ہوگی۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ جیل میں رہوں انہوں نے بڑے جتن کئے سپرنٹنڈنٹ سے کہا انسپکٹر جنرل کو لکھا سر منوہر لال پر زور دیا لیکن ان کی استدعا مسترد ہوتی رہی۔

مولانا بادشاہ طبیعت کے انسان تھے کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا اللہ ہی تمام ضرورتیں پوری کرتا کھاتے بھی اور کھلاتے بھی بہادر اور اشجع تو تھے ہی سچی بات دار کے تختہ پر بھی کہہ جاتے تھے۔ خوف پاس سے نہیں گزرا تھا جیل میں ان کا بڑا دبدبہ تھا مطالعہ کا بے حد شوق تھا گفتگو دو ٹوک کرتے چھوٹے چھوٹے فقرے کھری کھری باتیں شاہ ولی اللہ سے متعلق ابتدائی معلومات انہی سے حاصل کی تھیں، ''الفرقان'' بریلی کا

ولی اللہ نمبر بھجوایا اور کہلا بھیجا کہ اس کو سبقاً سبقاً پڑھو مکتوبات امام ربانی بھی انہی سے لے کر پڑھے اور امام غزالی کی احیاء العلوم بھی! ایک دن مجھے کہلوا بھیجا کہ سِکندر حیات کو چٹھی لکھو کہ مجھے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ پڑھنا ہے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی حسن اتفاق سے یہاں موجود ہیں اجازت دی جائے سپرنٹنڈنٹ نے درخواست لے کر انسپکٹر جنرل کو بھیج دی انسپکٹر جنرل نے حکومت سے پوچھا اوپر سے ہدایات تھیں کہ شورش اور مولانا آپس میں ملنے نہ پائیں۔ اس درخواست کو ٹھکرانا مشکل تھا جواب آیا کسی اخلاق قیدی کا انتظام کر دو پنجاب کی تمام جیلوں میں ڈھنڈوایا گیا ایسا کوئی شخص نہ ملا جو قرآن مجید ترجمہ سے پڑھا سکتا ہو سپرنٹنڈنٹ نے حکومت کو لکھا اور ساتھ ہی میری دوسری درخواست بھجوا دی درخواست میں درج تھا کہ مُسلمان کو قرآن پاک پڑھنے سے محروم رکھنا سراسر شقاوت و معصیت ہے میں اس دولت و نعمت سے محروم رہا تو قیامت کے دن سِکندر حیات اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہوں گے جواب آیا کہ باہر سے کوئی معلم رکھ دیا جائے ابھی یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن کو اٹھا کر دھرم سالہ سب جیل میں بھیج دیا گیا کوئی ہفتہ عشرہ بعد مجھ سے کہا گیا کہ دھرم سالہ جانا چاہو تو جا سکتے ہو میں لاہور کے لئے تیار تھا سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا کہ انسپکٹر جنرل نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ارادہ نہیں بدلا اِستفسار کیا ہے وہاں مولانا کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو؟ اس حیص بیص میں اور دو ہفتے نکل گئے۔



میاں افتخار الدین

مثلاً میاں افتخار الدین سیاسیات میں پہلودار انسان تھے جہاں تک خود اعتمادی کا تعلق ہے وہ ان میں سرے سے تھی ہی نہیں وہ اپنے ساتھیوں پر بھی شبہ کرتے تھے۔ جس بُت کو تخلیق کرتے خود ہی توڑ دیتے اپنے ہر فعل کو انہوں نے اپنی دولت کے زور پر جائز ٹھہرایا تھا انہیں کبھی اس کی پرواہ نہیں رہی کہ وہ کیا کرتے ہیں یا لوگ ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں وہ یہی سمجھتے تھے کہ میری دولت اور ترقی پسندی کا نعرہ یہ دونوں میری شخصیت کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہیں وہ غریبوں سے ہمدردی کا راگ بڑی اونچی سُر میں چھیڑتے تھے لیکن ان کا درد ان میں بالکل مفقود تھا۔

اُن میں یہ کمال تھا کہ انسانی فطرت کے ہر پہلو سے فائدہ اٹھاتے۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن کو الراعی برادری کے نام پر متاثر کر رکھا تھا نوجوانوں کو ترقی پسندی کے روپ میں کانگرس کے ہر گروپ سے سمجھوتہ کرتے اور توڑتے رہے مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں اٹھایا اور بہت دور لے گئے جواہر لال نے انہیں اپنا بازو بنالیا لیکن ان کی سیمابی فطرت کو قرار ہی نہ تھا انہیں بھی چکمہ دے گئے وہ ایک ہی رات میں سب کچھ بن جانا چاہتے تھے ان میں جاگیردار طبقے کی وہ ساری خوبیاں اور برائیاں موجود تھیں جو انہیں قومی سیاست کے اس مقام پر نہ لے جا سکیں جس مقام پر وہ جانا چاہتے تھے۔ اصل میں جو کچھ تھے اس میں ان کی اپنی کوئی خطا نہ تھی وہ گردوپیش کی بوالعجبیوں کا ردعمل تھے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور اکلوتا ہی رہنا چاہتے تھے وہ ممبر منتخب ہونے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے اور ووٹروں کی خرید وفروخت جائز سمجھتے تھے وہ پارٹی کی طاقت اور اپنی شخصیت سے نہیں اپنی دولت کے زور پر منتخب ہوتے تھے.... اور یہی وجہ تھی کہ جس طرح چاہتے اور جو چاہتے کر گزرتے نتیجۃً انہوں نے اپنے گردوپیش دولت اور نظریئے کی اساس پر ایک حلقہ یاراں پیدا کر لیا تھا اور دونوں ہی ایک دوسرے کے "مخلص" تھے۔ میاں صاحب کو ستائش کاروں کی ضرورت تھی اور ستائش کاروں کو میاں صاحب کی وہ خلقی طور پر ایک بڑے زمیندار تھے.... آنکھیں کھولیں تو مولوی دیدارعلی کی مشیخیت کے ہتھے چڑھ گئے مولوی صاحب لاہور کی بریلوی جماعت کے سردار تھے میاں صاحب نے لمبی سی داڑھی رکھ لی تب فرض ہی نہیں تہجد بھی پڑھتے اور میلاد کی محفلیں رچاتے تھے چونکہ مذہب کی جس دوکان پر گئے تھے اس کا مال خالص نہ تھا اس لیے ردعمل ہوا اور میاں صاحب کمیونسٹ ہوگئے پہلے ان کی خدا پرستی کا یہ حال تھا کہ اپنے مرشد کی ذات میں خدا کا جلوہ دیکھتے تھے اب ان کی بغاوت کا یہ عالم تھا کہ خدا کو خدا ہی نہیں مانتے تھے وہ عملاً تو نہیں لیکن ذہناً کمیونسٹ ضرور تھے اور ایک کمیونسٹ کی اساس یہ ہے کہ وہ مادی ہو، اور مادی ہونے کے لیے دہریہ ہونا ضروری ہے جو کمیونسٹ یہ کہتا ہے کہ وہ مارکسزم کو بھی مانتا ہے اور خدا کو بھی، وہ جھوٹا ہے یا وہ کمیونزم میں کاملاً دستگاہ نہیں رکھتا یا پھر اپنے نفس کے علاوہ مخلوق خدا کو فریب دیتا ہے کمیونزم کا ایک ہی نعرہ ہے زمین سے سرمایہ داری اور آسمان سے خدا کو نکال دو۔ یہ الگ بات ہے کہ میاں صاحب خود ایک سرمایہ دار تھے اور آسمان سے خدا کو نکالنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ان میں بلاشبہ بعض خوبیاں بھی تھیں مثلاً وہ جس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس طبقہ کی عالم آشکار برائیوں سے اونچے تھے وہ ایک عیاش انسان بالکل نہیں تھے ان کا عیش یہ تھا کہ وہ چوپال پر بٹیر لڑانے کے بجائے سیاست میں چونچیں لڑایا کرتے اور چہلیں دکھاتے تھے وہ مجموعہ اضداد تھے مسلمان بھی تھے اور دہریہ بھی۔ کمیونسٹ بھی تھے اور لیگی بھی۔ سرکار کے دوست بھی اور دشمن بھی۔ اپوزیشن کے لیڈر بھی اور حزبِ اقتدار کے خوشہ چیں بھی، کہا جاتا ہے انہوں نے اپوزیشن کو تقویت بہم پہنچائی لیکن حقیقت اس کے اُلٹ ہے انہوں نے اپوزیشن کو اپنی ذات میں مرتکز کیا نئی قیادت کو ابھرنے

ہی نہ دیا بلکہ کچل ڈالا مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے چودھری افضل حق کو بارہا زور دیا کہ وہ میاں افتخار الدین کو احرار میں لے لیں۔ چودھری صاحب نے ہمیشہ انکار کیا۔

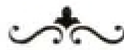
جب مولانا حبیب الرحمٰن کا اصرار بڑھا تو چودھری صاحب نے فرمایا:

''مولانا! معاف کیجیے یہ سرمایہ دار غریبوں کی جماعت میں کھڑا ہونے کی جگہ بنالیں تو غرباء احساس کمتری کے باعث بیٹھنے کی جگہ خود خالی کر دیتے ہیں اور جب بیٹھنے کی جگہ مل جائے تو صدارت خود آگے بڑھ کر ان کے پاؤں چوم لیتی ہے افتخار الدین کا صحیح مقام کانگرس ہی ہے کیونکہ وہاں اس قسم کے لاڈلے بچوں کے لیے بڑی گنجائش ہے۔ ...''

میاں صاحب نے احرار سے کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ انتقام لیا ان کے نزدیک احرار کنگلوں کا ایک گروہ تھا وہ کانگرس ہائی کمانڈ سے کہتے رہے کہ احرار ا، اسلام کا نام لے کر پنجاب میں قومی تحریک کو پیدا نہیں ہونے دیتے اس کے راستہ میں مزاحم ہیں پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن کو پیش کش کی کہ احرار کانگرس میں آجائیں تو وہ انہیں صوبہ کانگریس حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ میاں افتخار الدین نے سنا تو ڈاکٹر گوپی چند کی معرفت سردار پٹیل سے رسم و راہ پیدا کر لی اور اس ہوشیاری سے پیچ لڑایا کہ جواہر لال کی بیل ہی منڈھے نہ چڑھی۔ چودھری افضل حق گذشتہ تجربوں کی بناء پر ویسے ہی اس پیشکش کے خلاف تھے غرض یہ تجویز مولانا حبیب الرحمٰن تک رہ گئی جب میاں صاحب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو وہاں بھی احرار ہی کو ہدف ملامت بنایا پاکستان بن جانے کے بعد کوڑا کرکٹ جمع کر کے اپوزیشن کو اپنی ذات کا محور بنایا لیکن یہ محور ہی غلط تھا اپوزیشن کیا بنتی؟ میاں صاحب نے یہاں بھی احرار کو.... اندر خانہ.... تباہ کرنا چاہا وجہ ظاہر تھی کہ احرار زعماء اتنے قد آور اور عظیم تھے کہ میاں صاحب کا سیاسی چراغ ان کے مقابلہ میں روشنی ہی نہ دے سکتا تھا وہ ان کی صف میں شریک ہو کر یا انہیں اپنی صف میں لاکر عوامی مقبولیت کے لحاظ سے دوسرے درجے میں رہ جاتے تھے۔

میاں صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ ایک ہی جماعت کے ارکان کو آپس میں بدگمان کر دیتے اُن کا یہ کمال جیل میں بھی ان کے ساتھ رہا جن لوگوں میں سیاسی قیدی ہونا وحدت کا سب سے بڑا نشان تھا اور وہ اس اصل کی بنیاد پر اکٹھے تھے میاں صاحب نے اپنی دوغلی باتوں سے اس وحدت کو توڑ ڈالا دولت کی نمائش کی آخر کار ایک اختلافی خط کھینچ کر چلے گئے نتیجۃً ایک ہی کشتی کے اُن سواروں سے اخلاص رخصت ہو گیا اور وہ بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ہو گئے۔ غرض میاں صاحب اس فن کے ماہر، اس میں اُستاد اور چابک دست تھے۔

شورش کاشمیری



رئیس الاحرار منٹگمری جیل میں

تحریر: شورش کاشمیری

دسمبر ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے۔ راقم اور کچھ دوست منٹگمری سنٹرل جیل میں قید کے دن گزار رہے تھے کہ ایک اخلاقی قیدی جو ہماری خدمت پر مامور تھا، کمرہ میں دوڑا دوڑا آیا اور کہا لیجئے افغانستان کے ایک بڑے وزیر بھی قیدی بن کر آ گئے ہیں انہیں شاہی قیدیوں کے وارڈ میں رکھا گیا ہے۔۔ ہم میں سے تقریباً سب نے اس کی بات سنی ان سنی ایک کر دی۔ کیونکہ ایک تو اس کے متعلق ہمارا خیال یہ تھا کہ دہلوی ہونے کے باعث رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتا ہے اور دوسرے ہم اس وقت بھوک ہڑتال کی اسکیم بنانے میں اس قدر محو تھے کہ ہمارے لئے کسی وزیر کا اسیر بن جانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، اور یوں بھی یہ بات کچھ جچتی نہیں تھی کہ افغانستان کا وزیر یہاں کیوں؟ بہر حال ایک بات تھی ہو گئی۔ کچھ دن گزرے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ بھئی آپ لوگوں کو مولانا حبیب الرحمٰن سلام کہتے ہیں۔ احسن عثمانی نے جلدی میں پوچھا کیا ملاقات کے لئے تشریف لائے ہیں؟ کہا نہیں وہ تو ہفتہ عشرہ سے سرکاری مہمان ہیں۔

"سرکاری مہمان ہیں"

"جی ہاں"

یہیں سے یہ عقدہ کھلا کہ افغانستان کے وزیر ہونے کا اشتباہ بھی آپ ہی پر کیا گیا تھا، مولانا کی دراز قامتی، دراز ریش بارونق چہرہ، چال میں تمکنت اور حجازی عبا کے پہناوے نے اخلاقی قیدیوں کو مغالطے میں ڈال دیا اور کچھ انہوں نے اپنی خاص قسم کی نفسیات کے تحت بنالیا کہ افغانستان کا وزیر قیدی بنایا گیا ہے۔ جن لوگوں کو جیل خانے میں سی کلاس کے قیدیوں سے ملی جلی زندگی بسر کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طبقہ کی نفسیات کیا ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں رائی کا پہاڑ بنالینا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو افسانوی رنگت دینا، دن رات کا مشغلہ سمجھا جاتا ہے مولانا کے متعلق وزیر افغانستان ہونے کی "تہمت" نے سر پیر نکالے، تو پھر طرح طرح کی باتیں بھی ساتھ ہی ٹانک دی گئیں۔

خود ہمارے مشقتی (قیدی خدمت گزار) نے ہم سے بیان کیا

"صاحب کیا پوچھتے ہو، جرمنی کے ساتھ سمجھوتہ کیا تھا، بھید کھل گیا اور اب دھر لئے گئے ہیں۔"

گویا اس بے چارے کے خیال میں، افغانستان بھی برطانوی ہند کا ایک صوبہ تھا اور وزیر افغانستان قومی راہنما، جو قانون دفاع ہند کے ماتحت ماخوذ تھے!.... مولانا کو منٹگمری جیل میں آئے ہوئے پانچ چھ ہفتے گزر گئے۔ لیکن ہمارے اور ان کے درمیان سنگ وخشت کی دیواروں کے علاوہ، قانونی دیواریں بھی مزاحم تھیں، اور حکام نے سکندر حیات آنجہانی کی وزارت کے احکام کی متابعت میں ہمارے اور ان کے میل جول کی تمام راہیں مسدود کر رکھی تھیں....!

چند ہی دنوں میں مولانا کے رعب داب، ٹھاٹھ باٹھ، سج دھج اور چال ڈھال نے طلسم ہوش ربا کے بعض پُر اسرار کرداروں کی طرح قیدیوں میں ایک خاص مُعمہ کی صورت اختیار کر لی اور وہ عموماً آپ کا ذکر عقیدت واحترام، خوف وہراس اور ہیبت وحیرت سے کیا کرتے۔

ہم نے بھی اس میں اضافہ ہی مناسب سمجھا اور اپنی طرف سے، زیب داستان کی سرخیاں مہیا کر دیں...!

دو اڑھائی ماہ کی تگ ودو کے بعد چوری چھپے ملاقات کا موقع پیدا ہو گیا اور جیل خانے کے عقبی حصہ میں راقم سے ملاقات ہو گئی۔ نہایت محبت سے معانقہ کیا۔ پوچھا کہو، لکھا پڑھی کا حال کیسا ہے۔ عرض کیا، شاعری پڑھتا ہوں، نثر لکھتا ہوں۔ فرمایا کیا لکھ رہے ہو؟

"احرار رہنماؤں کے سوانح زندگی۔"

"تمہیں کیا معلوم"

"بہت کچھ معلوم ہے، کچھ آپ مدد فرمائیے۔ اور ہاں آپ کے ابتدائی حالات کی تفصیلات درکار ہیں۔"

"میرے حالات؟"

"جی ہاں"

اتنے میں جمعدار نے کہا، ذرا جلدی فرمائیے داروغہ جی آرہے ہیں، مصافحہ کیا، اور ہم ایک ہی جیل میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ ہوگئے اور وہ لمبی لمبی دیواریں ہمارے درمیان حائل ہوگئیں جو سنٹرل جیل منٹگمری میں ایوان انصاف کی سنگ دلی کا پتہ دیتی ہیں۔۔۔!

کوئی پندرہؐ روز کے بعد ہمیں ایک کاپی ملی، جس میں آپ کے لکھوائے ہوئے حالات زندگی کا ایک دلآویز خاکہ تھا۔ پیشانی پر مرقوم تھا، میں کیا اور میرے حالات زندگی کیا، چند واقعات ہیں، جو اس لئے لکھوائے دیتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو عبرت ہو۔۔۔!

یہ صحیح ہے کہ انسان کو بہت سی چیزیں سماج میں تجربہ و تعلیم سے ملتی ہیں۔ لیکن بعض خصائص طبعی طور پر ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاندان سے ورثہ میں ملتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لُطفِ عمومی سے طبیعت کا حُسن بن کر، فطرت ہوجاتے ہیں۔ مثلاً مولانا حَبیب الرحمٰن کے پردادا حضرت مولانا عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ پنجاب میں تنہا بزرگ تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لدھیانہ میں فتویٰ دیا اور چند روز کے لئے شہر میں متوازی گورنمنٹ قائم کی۔

آپ کے دادا حضرت مولانا محمد ؒ نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس علم کو بلند رکھا۔ اور جب کانگریس نے اپنا ابتدائی ڈھانچہ تیار کیا تو ہندوستان و حجاز کے علماء سے بھی ان کے حق میں فتویٰ لیا اور خود بھی اپنی بصیرت کی روشنی میں فرمایا کہ مسلمانوں کے لئے کانگریس کی شرکت جائز ہے۔ دراصل مرحوم ان بزرگوں میں سے تھے جنہیں مشیّت ایزدی اپنی شمعِ نُور سے اطاعت و بندگی کے صلہ میں اجالا کرتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ صفحۂ ہستی پر برطانیہ سے بڑھ کر مُسلمانوں کا کوئی دشمن نہیں اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں جو حالات پیدا ہوگئے ہیں ان کے پیش نظر ہندو مُسلم کے اشتراک ہی سے برطانوی نظم ونسق میں خلل ڈالا جاسکتا ہے!

!!... انگریز دشمنی کا یہ جذبہ مولانا حَبیب الرحمٰن کو ورثہ میں ملا ہے، اور یوں کہنا چاہئے کہ ان کی زندگی کے عناصر اربعہ کا ایک جزو ہے حتیٰ کہ ان کے خون کی گردش ہی اس سے قائم ہے اور طبیعت کا حسن بن کر فطرت کی نیو بن گیا ہے اور یہی جذبہ آپ کی اولاد کے رگ و پے میں بھی جاری ہے۔

قُدرت نے آپ میں بہت سے خصائص جمع کر دیئے ہیں وہ عُلماء کی محفل میں بیٹھ جاتے ہیں تو خنک لفظوں سے چشمہ صافی کی موجوں سے ایسے معانی ٹپکے پرتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک درویش مدرسۂ دل سے پڑھے ہوئے اسرار و رموز بیان کر رہا ہے۔

سیاست کے یورپی جوڑ توڑ سمجھنا سہل نہیں ہمارے علماء کی ایک کوتاہی ہے کہ وہ جہاں انگریزی زبان سے نابلد ہیں وہاں انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس سیاست کے داؤ پیچ سے کیونکر نمٹا جاسکتا ہے۔ وہ دراصل چودھویں صدی کے اس زمانے میں قرن اول کے معاشری تصور کی فضا میں گھوم پھر رہے ہیں اور راقم کا عقیدہ ہے کہ جو پانی بہہ چکا ہو اسے واپس لانا محال ہے، محال کیا بلکہ جلتی ہوئی زندگی کی طرح اس کا کوئی نقش بھی واپس نہیں لایا جاسکتا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو تو چھوڑیئے کہ وہ جامع کمالات ہونے کے باعث علماء میں ایک استثنائی مرتبہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی زبان کو سیکھا۔ اور پھر اس کے علم ونظر کے ہر گوشہ پر قابو پالیا دوسرے راقم کے نزدیک وہ اس دور میں اسلام کے واضح تصور کا صحیح فکری مظہر ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ان کے برابر نہیں۔ علماء کی صف میں جو شخص راقم کے خیال میں جدید و قدیم تصورات کے درمیان سنگم بن

سکتا ہے وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں اور راقم نے بارہا دیکھا کہ ان میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کا جوہر فکری استعداد کے طور پر موجود ہے۔

وہ معاملہ کی تہہ کو پالیتے اور گفتگو کے انداز سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اور پھر ہلکے پھلکے انداز میں اس کا تجزیہ کر کے سمجھانا چاہتے ہیں۔ گو انہیں ابوالکلام کی شستہ زبان نہیں ملی اور نہ بخاری کی طرح بیان کی افسانوی شوخی ان کا شیوۂ گفتار ہے، لیکن چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی بڑی باتیں ادا کر جاتے ہیں اور ادیب نہ ہونے کے باوجود ادب کا وقار و متانت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ سنجیدگی آپ کے کلام کا زیور ہے اور بہادری آپ کے دامان گرد کی سنہری جھالر...!

کرپس جب پہلی دفعہ ہندوستان آیا تو میاں افتخار الدین کے مکان پر آپ سے ملاقات ہوئی۔ ہندوستان کی سیاست پر ایک گھنٹہ گفتگو ہوئی، اور جب رخصت ہونے لگے تو اس نے کہا۔ آپ مجھے ایک مرتبہ پھر ملئے گا۔ میں پروگرام کے مطابق آج کلکتہ جا رہا ہوں۔ اگر آپ وہاں پہنچ جائیں تو مجھے اپنے مقصد کے لئے کئی گم شدہ راہیں مل سکتی ہیں اور پھر اس نے بعض صحافی حضرات کو ملاقات میں بتایا کہ مجھے مولانا کی گفتگو نے نہایت متاثر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک میں جن ذہین ہندوستانی سیاست دانوں سے ملا ہوں ان میں مولانا ایک سربرآوردہ سیاست داں ہیں۔

مولانا میں ذاتی محاسن بے شمار ہیں۔ مثلاً وہ جماعت کے لئے اپنی ذات اور اس کی ہر بلندی کو تیاگ (چھوڑ) دینے کے قائل ہیں اور ان کی زندگی میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے جماعت کے لئے بڑے سے بڑے ایثار کو بھی گوارا کر لیا۔ دوستوں کے دوست ہی نہیں بلکہ ان پر جی جان سے نچھاور بھی ہوتے ہیں۔ آپ کی تنظیمی صلاحیت بے پناہ ہے لیکن اب وقت کے صدموں نے انہیں کسی حد تک "تن آسان" بنا دیا ہے۔ سوچتے ہیں، کرنا بھی چاہتے ہیں اور من میں آرزوئیں بھی شعلہ بن کر لہراتی ہیں لیکن پھر مسلمانوں کی سیاست کے مرزعۂ ویران پر نظر ڈالتے ہیں تو اقبال کی زبان میں یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ ؏

مرا چہ حاصلے کشت خرابے

اقبال کی زبان... نہیں بلکہ اپنے تصور کی زبان میں...؟ کیوں کہ آپ اور شاعری دو مختلف چیزیں ہیں اور نہ معلوم قدرت نے آپ سے اس ذوق کو کیوں سلب کر لیا ہے سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں کہ ان کی طبیعت چہروں کی رعنائی سے لے کر ادب کی خوبصورتی تک کی والہ و شیدا ہے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ شعر و نغمہ کی مجلس آرائی میں صرف ہوتا ہے مگر مولانا حبیب الرحمٰن سر تاپا، شاہ جی کا تضاد ہیں نہ شعر سے دلچپی نہ حسن سے لگاؤ نہ نغمہ سے اٹکاؤ اور نہ زندگی کے جمالیاتی "دھاروں" سے رغبت۔ ایک خشک انسان جس کا نغمہ بانگ صلوٰۃ، جس کا حسن چہرہ محراب اور جس کی معراج رسن و دار کی تماشا آرائی ہے۔

سالہا سال آل انڈیا مجلس احرار کے صدر رہے اور نہایت طنطنہ سے کام کیا۔ جب صدر تھے تو بول چال کے تیور بھی صدارتی تھی۔ اب صدر نہیں تو صدر کے نقش قدم پر چلتے ہیں یعنی یہ آپ کی فطری خوبی ہے کہ اپ تابع رکھ بھی سکتے ہیں اور تابع رہ بھی سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی طرح نہیں جو اقتدار کے منصب سے ہٹ خلقی افتاد کی نقش آرائی پر اتر آتے ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں میں دیکھا گیا اور ابھی پچھلے دنوں احرار کو ایک ایسا مہلک صدمہ سہنا پڑا ہے۔

آپ نے چونؔ برس کی عُمر میں دسؔ سال چھؔ مہینے، قید خانے میں گزارے ہیں اور یہ زندگی کا پانچواں حصہ ہے لُطف یہ کہ ہندوستانی بھی کائنات انسانی کی کھیپ کا پانچواں حصہ ہے۔

عام حسابی قاعدے کی رو سے دیکھا جائے تو ہفتہ میں ڈیڑھ دن آپ نے جیل خانہ کی نذر کیا ہے اور دن رات کے چوبیس گھنٹہ میں پانچ گھنٹے ایسے ہوتے ہیں جو زنجیر و سلاسل کی بستگی میں کٹے ہیں۔

... آپ کی طویل قید پانچ برس کا وہ زمانہ ہے جو آپ نے اس دفعہ قانون دفاع ہند کے تحت بسر کیا اور استقلال کے ماتھے پر شکن تک نہ ابھری.... لیکن اس قید نے جہاں آپ کی صحت پر بُرا اثر ڈالا ہے وہاں دماغ میں عفوو درگزر کا خانہ بھی قدرے مشتعل ہو گیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شبنم کی جگہ انگارہ نے لے لی ہے۔ مولانا.... شروع شروع میں احرار کا دل سمجھے جاتے تھے.... لیکن اب انہیں دماغ بھی کہا جاتا ہے۔

اقبالؔ نے درست ہی کہا ہے۔

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

شورش کاشمیری

۲۱/ نومبر ۱۹۴۶ء

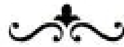


حضرت مولانا مُفتی محمد نعیم لدھیانوی کی مقدمہ بہاولپور میں شرکتؒ

مولانا مُفتی محمد نعیم لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ نام عُلماء لدھیانہ میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے جب بھی یہ نام لوگوں کی زبان پہ آتا ہے تو یہ ایک گہری سنجیدہ اور دور اندیش سیاست کا پتہ دیتا ہے سیاسی اور مذہبی اعتبار سے مُفتی صاحب مرحوم ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے علمی فقاہت اور سیاسی ذہانت ان کے چہرے سے عیاں تھی حضرت مولانا مُفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی مرحوم مولانا محمد عبد اللہ لدھیانوی مرحوم کے صاحبزادے تھے۔ جنہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو (جب وہ لدھیانہ آیا تھا اس کی بھری مجلس میں اس کے سامنے اس کو سب سے پہلے کافر کہہ دیا تھا اس بات کو مولانا محمد لدھیانوی نے فتاویٰ قادریہ میں تفصیلاً ذکر کیا ہے اس کو ہم گزشتہ صفحات میں ذکر بھی کر چکے ہیں بہر حال حضرت مولانا مُفتی محمد نعیم صاحب اس لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل تھے کہ وہ ایسے باپ کے بیٹے ہیں جنہوں نے مرزا قادیانی پر کفر کا فتویٰ دینے میں پہل کی تھی اس لئے نہایت فقیہ تھے قادیانیت کے خلاف زندگی بھر سینہ سپر رہے تقسیم ملک سے پہلے جمعیۃ عُلمائے ہند پنجاب کے صدر بھی رہے تحریک ریشمی رومال میں بھی شریک رہے حضرت شیخ الہند کے حکم پر تحریک کے سلسلہ میں پشاور جاتے ہوئے گرفتار ہوئے تین سال سزا کاٹی۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان تشریف لے آئے منڈی بہاؤالدین میں قیام فرمایا ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں شامل رہے ۱۹۶۱ء میں فیصل آباد جناح کالونی مسجد میں حضرات لدھیانہ کے اصرار پر تشریف لے آئے یہیں مقیم رہے انتہائی تبحر عالم تھے۔ مقدمہ بہاولپور میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عدالتی کاروائی میں حوالہ جات پیش کرنے کی سعادت بھی حاصل کی۔

مولانا مُفتی محمد نعیم صاحب پاکستان میں آکر علماء لدھیانہ میں ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے تھے اُن کی رائے کو بعض اوقات قول فیصل کا درجہ بھی دیا جاتا تھا۔ ۱۹۷۱ء جنوری میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں انتقال ہو گیا اور وہیں دفن ہوئے۔



مولانا مُفتی ضیاء الحسن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ

یہ نام بھی علماء لدھیانہ میں علمی اور سیاسی اعتبار سے پہچانا جاتا ہے مُفتی ضیاء الحسن صاحب حضرت مولانا مُفتی محمد نعیم لدھیانوی کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے خاندان مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ چونکہ سیاسی بھی تھا اس لئے سیاست میں بھرپور حصہ لیا تقسیم ہند کے بعد پاکستان تشریف لے آئے اور ساہیوال میں قیام فرمایا یہاں پر آپ نے مذہبی وسیاسی کام کی ابتداء کی بچیوں کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا سیاسی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ منسلک ہوگئے مسئلہ ختم نبوت پر بڑا کام کیا اور تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء اور تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء میں بھرپور حصہ لیا اور ساہیوال میں اس کام میں مرکزیت حاصل کی۔

چنانچہ مُفتی ضیاء الحسن صاحب مرحوم کے متعلق تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب کے صفحہ ۱۱۳-۱۱۴ میں اس طرح درج ہے:

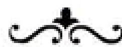
منٹگمری کے ایک رسوائے عام احراری کارکن مُفتی ضیاء الحسن نے جو حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا چچیرا بھائی ہے۔ ۳۰ر مارچ ۱۹۵۲ء کو اے ڈی ایم منٹگمری کی عدالت میں مرزا محمود.... امام جماعت احمدیہ روشن دین تنویر ایڈیٹر روزنامہ الفضل اور مسعود احمد پرنٹر پبلشر الفضل کے خلاف ایک استغاثہ دائر کیا کہ انہوں نے الفضل مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون ".... کے آخری دن" کے عنوان سے شائع کیا ہے جو دفعات ۳۰۲۔۱۱۵۔۵۰۵ تعزیرات پاکستان ماتحت آتا ہے۔ یہ مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اب تک چھ گواہان استغاثہ پیش کر چکے ہیں۔ اور اس کی آخری پیشی ۸ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ہوئی تھی۔

بقول حضرت مولانا سیّد سُلیمان ندوی

کہ نسبت خضری ہی کا اثر ہے کہ علماء لدھیانہ کے خاندان میں علم دین نسلاً بعد نسلٍ چلا آرہا ہے ورنہ علم کسی خاندان کی میراث نہیں تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ علم دوٗ سے زیادہ نسلوں میں آگے نہیں جاتا لیکن پُشت در پُشت سے یہ علم دین کی وراثت کا سلسلہ جو میں آج مولانا حبیب الرحمٰن کے خاندان میں دیکھ رہا ہوں اس کی مثال آج کے دور میں کسی اور خاندان میں نہیں ملتی۔ یہ دیکھ کر اور بھی خوشی ہوئی کہ مولانا حبیب الرحمٰن کے لڑکے اور خاندان کے دوسرے نوجوان دیوبند، سہارنپور میں علم دین حاصل کر رہے ہیں گویا علم دین کا یہ سلسلہ آٹھویں پشت میں داخل ہوگیا۔

(تقریر مولانا سید سُلیمان ندوی دسمبر ۱۹۳۸ء شاہی مسجد لدھیانہ)

(بحوالہ رئیس الاحرار صفحہ ۹۴)



روزنامہ جنگ لندن 1995-09-07

از مُفتی مُحمد جمیل خان

پھر ۱۸۸۹ء میں مجدد اور محدث کی شکل میں اس نے لوگوں سے بیعت لینی شروع کی۔ ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور یہ دعویٰ بڑھتے بڑھتے نبی، رسول تک پہنچ گیا بلکہ نعوذ باللہ آخر کار اپنے آپ کو نبی اکرم ﷺ سے افضل قرار دیا عُلماء لدھیانہ نے پہلے ہی مرحلے میں اس کے عزائم دیکھ کر اس کے کفر کا فتویٰ جاری کیا بعد ازاں مولانا رشید احمد گنگوہی اور دیگر تمام عُلماء کرام نے اس کی تصدیق و تائید کی۔

روزنامہ جنگ لندن 2004-09-07

از مُفتی مُحمد جمیل خان

۱۸۸۴ء میں جب مرزا غلام احمد قادیانی ایک پروگرام کے سلسلے میں لدھیانہ وارد ہوا تو عُلمائے لدھیانہ مولانا عبد اللہ لدھیانوی، مولانا محمد لدھیانوی، مولانا عبد العزیز لدھیانوی نے بعض علمائے کرام اور معززین کے ہمراہ مرزا غلام احمد قادیانی سے ملاقات کرنا چاہی، تاکہ اس کے عقائد واضح ہوں، مگر اس نے راہ فرار اختیار کی۔ ان حضرت نے مندرجہ بالا عقائد کی وجہ سے مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔ اس فتوے کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی نے عُلمائے کرام کے خلاف زبان درازی تیز کر دی۔ اپنے عقائد کی وضاحت کے بجائے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کی طرف منسوب کرتے کرتے مرزا غلام احمد قادیانی نے یہاں تک کہا کہ وہ بمنزلہ اللہ کے بیٹے کے ہے۔ ان عقائد کی بنیاد پر عُلمائے لدھیانہ نے دارالعلوم دیوبند، پیر گولڑہ شریف اور تمام مکاتب فکر کے عُلمائے کرام کو روانہ کیا جس کے جواب میں سینکڑوں عُلمائے کرام نے دستخطوں پر مشتمل تکفیر قادیان کے عنوان سے فتویٰ دیا۔ ۱۸۹۱ء میں مرزا غلام احمد قادیانی نے مثیل مسیح اور پھر مسیح ابنِ مریم ہونے کا دعویٰ کیا۔

روزنامہ جنگ لندن 1999-09-08

از مُفتی مُحمد جمیل خان

جس وقت مرزا غلام احمد قادیانی نے مجدد اور ملہم من اللہ کا دعویٰ کیا تو اسی وقت عُلماء لدھیانہ نے اس کی تحریروں کی روشنی میں کفر کا فتویٰ جاری کیا جس کی بعد میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور دیگر عُلماء دیوبند نے تصدیق کی اور مُسلمانوں نے اس فتویٰ کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں سے اجتناب شروع کیا اور مُختلف مقامات پر قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان مناظروں کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلا مناظرہ لدھیانہ کے عالم دین مولانا عبد اللہ لدھیانوی نے کیا اس کے بعد جو عُلمائے کرام عیسائیوں اور ہندوؤں سے مناظروں اور مقابلے میں مرزا غلام غلام احمد قادیانی کے ساتھ تھے انہوں نے خط و کتابت کے ذریعہ پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کو ان عقائد سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جب وہ اپنے غلط عقائد سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوا تو اہل حدیث عُلماء میں سے مولانا عبد الحق غزنوی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے مرزا غلام احمد قادیانی سے مناظروں اور تحریری مقابلوں کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا عبد الحق غزنوی کا مباہلہ تو بہت مشہور ہوا۔

روزنامہ جنگ لندن 2001-09-08

از مُفتی مُحمد جمیل خان

دریائے ستلج کے درمیان ایک چھوٹی سی جزیرہ نما بستی عیسیٰ پور سے اللہ تعالیٰ نے مولانا مُحمد یوسف لدھیانوی جیسی گوہر نایاب ہستی کا خمیر اٹھایا اور آپ کی ولادت چوہدری اللہ بخش کے گھر میں ہوئی جو کہ اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر گاؤں کے نمبر دار مقرر ہوئے تھے۔ والدہ جو کہ ایک ولیہ کاملہ تھیں ان کی شفقت مادری سے بچپن ہی میں محروم ہوگئے، جسکا احساس زندگی بھر رہا۔ سن پیدائش غالباً ۱۳۵۱ھ اور ۱۹۳۲ء بتایا کرتے تھے، کیونکہ اس زمانے میں کہیں اندراج وغیرہ ہوتا نہیں تھا۔ والد محترم دنیادار طبقہ سے تعلق رکھنے کے باوجود بہت ہی دیندار صاحب نسبت بزرگ تھے۔ حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی فیض صُحبت نے آپ میں تصلّب فی الدین کی مضبوط قوت پیدا فرما

دی تھی، سُنت نبوی ﷺ سے محبت اور بدعات سے نفرت آپ کے دل میں منقش ہو چکی تھی۔ قرآن مجید سے شغف کا یہ عالم تھا کہ روزانہ دس پارے کی تلاوت کرتے۔ اس روحانی ماحول میں شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی کا بچپن گزرا اور تربیت ہوئی، ۴ سال کی عمر میں والد محترم نے مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید خضر صفت بزرگ قاری ولی محمد کی خدمت میں قرآن کریم کی تعلیم کے لئے بھیج دیا۔ قاری ولی محمد صاحب کی نیکی اور تقویٰ کے اثرات حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ذہن پر بچپن میں راسخ ہو گئے، جس کا مشاہدہ دنیا نے آخر عمر تک کیا پرائمری تک تعلیم مقامی اسکول میں حاصل کی، قرآن کریم کی تکمیل کے بعد ۱۳۶۳ھ میں ۱۳ سال کی عمر میں آپ نے درس تعلیم کا آغاز مدرسہ محمو... اللہ ۱۳۹۱ ...یا۔ حضرت مولانا امداد اللہ حصاروی سے ایک سال فارسی کی تعلیم حاصل کر کے مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن احرار کے قائم کردہ مدرسہ انوریہ میں صرف و نحو کی تعلیم شروع کی۔ مولانا لطف اللہ شہید، مولانا انیس الرحمٰن جیسے مخلص ترین اساتذہ سے بہت ہی محنت اور لگن سے ابتدائی علوم پختگی سے حاصل کئے۔ اس دوران تقسیم ملک کا مرحلہ آگیا۔

روزنامہ جنگ سدن 09-09-2000

مرزا غلام احمد قادیانی کے غلط عقائد کو سب سے پہلے عُلماء لدھیانہ نے چیلنج کیا اور ۱۳۰۱ھ میں جب وہ اپنے خسر کے پاس لدھیانہ پہنچے اور وہاں اپنی مجددیت کا نغمہ الاپنا شروع کیا تو بعض لوگ اس کے ہمنوا ہو گئے اور انہوں نے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ اور اس جلسے کے اعلان کے سلسلے میں بعض لوگوں نے مرزا غلام احمد کی مدح و ستائش کرتے ہوئے کہا کہ جو ان پر ایمان لائے گا گویا "اول المسلمین" میں اس کا شمار ہوگا۔

یہ بات سن کر لدھیانہ کے ایک عالم دین مولانا عبد اللہ لدھیانوی اٹھے اور انہوں نے کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی مجدد یا بزرگ نہیں بلکہ وہ انتہا درجہ کا ملحد اور زندیق ہے۔ اس کے جواب میں مرزا غلام احمد قادیانی کے حامیوں نے کہا کہ تم مرزا غلام احمد قادیانی کی شہرت سن کر حسد میں مبتلا ہو گئے ہو۔

بہر حال دوسرے دن مرزا غلام احمد قادیانی لدھیانہ جلسہ کے لئے آیا تو لدھیانہ کے عُلمائے کرام نے اس کی کتابوں سے کفریہ کلمات اور عقائد کو جمع کر کے اس کی روشنی میں کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ ان کے فتویٰ کی ابتدائی طور پر کافی مخالفت ہوئی کیونکہ مرزا غلام احمد قادیانی مناظر اسلام کی حیثیت سے اعلیٰ شہرت پا چکا تھا اور اس کے عقائد لوگوں کے سامنے پوری طرح نہیں آئے تھے۔

بہر حال عُلماء لدھیانہ اپنے موقف پر مضبوطی کے ساتھ ڈٹے رہے اور اپنے فتویٰ کی تصدیق کے لئے دارالعلوم دیوبند گئے جس پر مولانا محمد یعقوب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے حسب ذیل فتویٰ جاری کیا۔

"یہ شخص میری دانست میں لامذہب معلوم ہوتا ہے اس شخص نے اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر فیض باطنی حاصل نہیں کیا۔ اس کے الہامات اولیاء اللہ کے الہامات سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے۔"

ادھر وقت کے عظیم صوفی بزرگ مولانا شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے روحانی وجدان سے واضح طور پر فرمادیا:

"اس شخص کا بے دین ہونا ظاہر ہے اس کے بارے میں تذبذب رکھنے والے عُلماء جلد ہی اس کو کافر قرار دیں گے۔"

چنانچہ مولانا شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ کی پیشگوئی کے بعد جلد ہی تمام عُلماء کرام نے متفقہ طور پر مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں کو کافر اور خارج از اسلام قرار دیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے عقائد عُلماء حرمین شریفین کو بھیجے گئے تو مکہ معظمہ کے رئیس القضاۃ شیخ عبد اللہ بن حسن نے درج ذیل فتویٰ جاری کیا:

"مدعی نبوت کے کفر میں کوئی شبہ نہیں جو شخص قادیانی کے دعویٰ کی تصدیق کرے یا اس کی متابعت کرے وہ بھی مدعی نبوت کی طرح کافر ہے۔ اہل اسلام سے اس کا رشتہ نکاح و بیاہ صحیح نہیں۔"

پیش لفظ ختم شُد

رئیس الاحرار

از مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ثم دہلوی

دیدۂ او بیدار دور اندیش رس

"چل مرے خامے بسم اللہ"

تاریخ کے ہر دور میں بعض شخصیتیں اس طرح ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ جن پر ساری قوم کی تعمیر کا انحصار ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام میں امام ابو حنیفہ امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور ابن خلدون رحمہم اللہ نے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی دنیا آج تک معترف ہے۔ اور حقائق نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تاریخ اسلام میں اگر یہ شخصیتیں نہ ابھرتیں تو اسلامی دنیا کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ چودھویں صدی کے آخیر تک اسلامی زندگی کے خدوخال اور اسلامی کردار کی تاریخ اب نقشِ کالحجر کی طرح اَن مٹ ہے۔

وہ ان بزرگوں کی فکری اور علمی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بقول حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اسلام کے دینی اور سیاسی مزاج اور ضابطہ اخلاق کا مرتب شدہ نقشہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ عُلماء سلف کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہر صدی میں اسلام کے مجددین پیدا ہوئے۔ یہ بزرگ حق اور کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لئے قلم وتلوار کی وہ پوری آزمائشوں میں سے ہو کر گزرے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت اس بات کی دلیل ہے کہ کلیسائی نظام کے مقابلے میں عُلماء حق شہنشاہوں سے ٹکرائے اور یہ وہ زمانہ تھا جب کلیسا کے پادری بادشاہوں کی جوتیاں چاٹتے تھے۔ یورپ میں ظلم کو جائز قرار دیتے تھے لیکن امام ابو حنیفہ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ تک تین ہزار عُلماء اور محدثین نے اعلائے کلمۃ الحق پر اپنی جانیں قربان کیں، لیکن زندگی کے اعتقادات اور کردار میں ایک حرف بھی کم نہ کیا۔

ہندوستان میں حضرت شاہ ولی اللہ کی جماعت نے جس استقامت، تدبر اور تفکر سے کام کیا، وہ اپنی جگہ دنیا کے لئے قابلِ تقلید مثال ہے۔

رئیس الاحرار مولانا حَبیب الرحمٰن لدھیانوی کا خاندان مجاہدین کے سلسلے کی ایک ایسی کڑی ہے جس کو شمار کئے بغیر ہندوستان کی اسلامی اور ملکی جدوجہد مکمل نہیں ہوتی۔ رئیس الاحرار کے افکار ایک ایسے انقلابی کے افکار تھے جو ہر حَیثیّت میں نطشے اور گوئٹے کی شاعری پر سَبقت لے گئے۔ انقلاب فرانس کے بانی روسو اور والیئر اپنے زمانے کے مشہور باغیوں میں تھے۔ لیکن بغاوت کا جو انداز مولانا حَبیب الرحمٰن نے پھیلایا وہ اپنی جگہ منفرد کردار ہے۔ ہندوستان میں اہل حق کی جماعت میں بہت سی شخصیتیں ابھریں، ان کا رنگ اور جدوجہد مقامی تھا۔ ہندوؤں میں برادران وطن کی جماعت میں بہت سے افراد سامنے آئے اور ان لوگوں نے آزادی کی جدوجہد میں ایک معیار قائم کیا۔ میری مراد پنڈت جواہر لال نہرو، پنڈت موتی لال نہرو اور مہاتما گاندھی سے ہے۔

گاندھی جی نے بھی اپنی رہنمائی کا فرض ادا کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد علمی دنیا میں ایک انفرادی حَیثیّت رکھتے تھے۔ لیکن افکار و کردار کی جو جھلک رئیس الاحرار مولانا حَبیب الرحمٰن میں پائی گئی وہ ہندوستان کی کسی بھی شخصیت میں نمودار نہ ہوئی۔ سیاسی زندگی میں مولانا حبیب الرحمٰن نے گاندھی جی سے بیسیوں دفعہ گفتگو کی اور ہر مرتبہ گاندھی جی کو مولانا کے خیالات اور ان کی حکمتِ عملی اور تدبر سے اتفاق کرنا پڑا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۴۷ء کے بعد جمعیۃ العلماء کے دفتر میں پہلی نمائندہ کانفرنس میں ایک ہزار ڈیلی گیٹوں کے سامنے یہ اعلان کیا

کہ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن نے جس طرح ملک کی سیاست کا تجزیہ کیا اور رہنمائی کی ہے، اس کے بعد کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ میں کوئی بات آپ لوگوں سے کہوں۔ میری خواہش ہے کہ تمام ڈیلی گیٹ حضرات مولانا حبیب الرحمٰن کی رہنمائی پر غور کریں اور جو تجویزیں انھوں نے آپ کے سامنے رکھیں، ان کی تائید کی جائے۔ مولانا ابوالکلام کے اس اعتراف نے بڑے بڑے لوگوں کو چونکا دیا اور مولانا حبیب الرحمٰن کی شخصیت اُبھر کر اس طرح سامنے آئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس زمانہ کا والی ٹیر اور روسو یہ ہی شخص ہے۔ امام ابوحنیفہ اور شاہ ولی اللہ کا درجہ آج اسے ہی دیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا کردار اور تدبر اس کے حصہ میں آیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد جیسے انانیت پسند انسان کا یہ اعتراف تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ جس شخص نے کبھی گاندھی جی کے افکار کو قبول نہ کیا ہو۔ اور جو اپنے افکار کی تجلی میں کوہ طور کا درجہ رکھتا ہو۔ اسی کا کسی مجلس میں اس طرح اعتراف اور اقرار مولانا حبیب الرحمٰن کی فکری رہنمائی کو ایک ایسا درجہ عطا کرتا ہے، جو ہندوستان میں کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا۔ غور کیجئے جو شخص اپنی زندگی میں صدارت کے زمانے میں گاندھی جی کے مکان تک نہ گیا ہو۔ جس کی قلمی کاوشوں کا ہر فرد معترف ہو۔ وہ ایک ڈرامائی انداز میں جمعیۃ علماء ہند کے دفتر سے اترا اور سیدھا مولانا حبیب الرحمٰن کے مکان، کوچہ رحمان دہلی میں پہنچ گیا۔

مولانا آزاد نے یہ بات ثابت کر دی کہ افکار کا جو خزانہ مولانا حبیب الرحمٰن کے پاس ہے وہ ہندوستان کے کسی دوسرے آدمی کو نصیب نہیں۔ افکار کی تخلیق انسانی زندگی کے بس کی بات نہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے جسے چاہے دے، جسے چاہے نہ دے ؎

یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

غزالی کا درجہ دنیائے اسلام میں اس لئے بڑا نہیں کہ وہ عربی کے ادیب یا خطیب تھے۔ بلکہ اس لئے ان کا درجہ بہت بڑا ہے کہ انہوں نے فکری رہنمائی میں کلیسا کی زندگی کو شکست دی اور یونانیوں کو ان کے فلسفہ کا وہ جواب دیا، جس کے بعد فلسفیوں سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی بھی اس دور میں غزالی کا دماغ اور ابن خلدون کی زبان لے کر پیدا ہوئے تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک خط میں اس بات کا اقرار کیا کہ وہ اپنے افکار میں ایک منفرد حیثیت کے مالک تھے وہ بہت ہی سوچ سمجھ کر کسی بات کا فیصلہ کرتے تھے، لیکن جب فیصلہ کر لیتے تو دنیا کی کوئی طاقت نہ تھی جو ان کے فیصلہ کو بدل دیتی۔ آخر کار مجھے شیخ عبداللہ کے بارے میں ان کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد ۱۲ سالہ زندگی میں کوئی ہفتہ ہی ایسا گزرا ہو جب کہ مولانا آزاد اور جواہر لال کا ٹیلیفون نہ آتا ہو کہ ضروری مشورہ کرنا ہے تشریف لائیے۔

مرحوم رفیع احمد قدوائی رات کو ۲ بجے کاریں بھیج کر اس لئے بلواتے تھے کہ وہ ان سے رہنمائی حاصل کرنے کے آرزومند تھے۔ ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر وہ اپنی رائے کا اسی طرح اظہار کرتے تھے جیسے برطانوی پارلیمنٹ میں کبھی لارڈ برق بولا کرتے تھے۔

انگریزی نہ جاننے کے باوجود انگریزی سیاست کے گہرے رازوں سے وہ اس طرح واقف تھے جیسے گھر کا بھیدی ہو۔ مولانا حبیب الرحمٰن کے سیاسی افکار کی خوبی یہ تھی کہ اس میں تعصب اور تشدد کو کہیں دخل نہ تھا۔ یورپ کی نئی سائنسی ترقی اور برطانوی تدبر کی وہ اس لئے تعریف کرتے تھے کہ انگریزی قوم کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے۔ کسی شخصیت کے افکار کی خوبی یہ ہے کہ وہ مستقبل کی نشان دہی کر رہا ہو۔ مولانا حبیب الرحمٰن میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود تھی۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے پاکستان کا اعلان سنتے ہی دیوبند کی ایک مجلس میں جس میں اکابر علماء شامل تھے صرف ایک جملہ کہا۔ "پاکستان کے قیام کے بعد ہندوستان میں مسلمان بے جان ہو جائے گا اور پاکستان میں اسلام کی شکل بدل جائے گی"۔

مولانا کے قریبی حلقوں میں رہنے والے لوگ جانتے ہیں کہ گاندھی جی، جواہر لال اور مولانا آزاد کے سامنے حضرت مولانا مرحوم نے جس

بے باکی کے ساتھ اپنے فکری رجحان کا اظہار کیا وہ ہندوستان میں کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی۔

"گاندھی جی ان کی باتیں سن کر رو دیتے تھے۔ مولانا آزاد ان کے فکری رجحانات کی تائید کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال ایک عقیدت مند کی طرح ان کے خیالاتِ عالیہ سنتے تھے"۔

ایسے مقام پر ہونے کے باوجود جس قلندری اور درویشی کا مرحوم نے اظہار کیا' وہ اپنی جگہ بہت اہم اسلامی کردار ہے۔ وہ اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالقادر زید مجد کم رائے پوری کے دستر خوان پر بیٹھ کر ان چند ٹکڑوں کو نہایت ہی مقدس سمجھتے تھے جو شیخ کی طرف سے انہیں دیئے جاتے۔

انہوں نے کبھی اس بات کی تمنّا نہ کی کہ کوئی بڑا عہدہ ملے۔ وہ ہر عہدے کو حق کی راہ میں کوہ گراں سمجھتے تھے۔ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کو یہی ان کی ایک بات بُھاگئی تھی کہ وہ ساری عُمر اپنے مرید باصفا کی حق گوئی اور نورانیت کا بار بار تذکرہ فرماتے تھے۔ شیخ اپنے مرید سے ایک عاشق صادق کی طرح خیالات سنتے تھے اور مرید اپنے شیخ کی مُحبّت و عشق میں شیخ کے جوتوں کو اٹھانا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔

جن لوگوں نے روحانی زندگی کے اس کردار کو دیکھا وہ جانتے ہیں کہ سیاسی زندگی کی معراج پر پہنچنے والا شخص اپنی ہستی کو شیخ کے سامنے کس طرح مٹاتا تھا۔ حضرت رائے پوری کی خدمت میں مولانا حبیب الرحمٰن نے چالیس سال گزارے۔ اور دینی معاملات اور افکار میں جس تفقہ کا ثبوت مولانا حبیب الرحمٰن نے دیا وہ آپ کو مولانا محمد احمد رحمانی کی اس مرتب شدہ کتاب میں ملے گا۔

دینی اور تبلیغی زندگی میں جس طرح انہوں نے مُسلمانوں کی رہنمائی کی اور دینی افکار کو جن الفاظ میں انہوں نے پیش کیا۔ یہ الفاظ بھی ہندوستان کے بڑے بڑے مفکّرین اور ادیبوں کو حاصل نہ ہو سکے۔ بڑے بڑے علمی اداروں سے کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ دارالمصنفین جلدوں پر جلدیں شائع کر سکتے ہیں۔ ہزار ہزار صفحہ کی کتاب میں جب تک قاری کو یہ نہ بتایا جائے کہ کتاب کا مقصد کیا ہے تو مطلب کی بات ہاتھ نہیں آتی۔ آخر مضمون کا مقصد کیا ہے وہ کیا کہنا چاہتا اور کس مقصد پر لانا چاہتا ہے لیکن خوشی کی بات ہے کہ جو کتاب اس وقت قاری کے سامنے ہے وہ اپنے مفہوم اور مقصد اور افکار کو پوری طرح قاری پر واضح کرتی ہے۔ کوئی ایسی بات آپ کو نہ ملے گی جو الفاظ کی چاشنی میں پنہاں ہو گئی ہو۔ مولانا کے الفاظ کیا ہیں۔ یہ عشق کی تیغ جگر دار ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ قاری اس کتاب کی افادیت کو سامنے رکھتے ہوئے خوش ہوگا اور علمی طبقوں میں یہ احساس جاگ اٹھے گا کہ اس کتاب سے مُسلمان ہی نہیں غیر مُسلموں کو بھی بہت بڑا فائدہ پہنچے گا۔ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی شکل وصورت جو بیان کی گئی اس میں تعصب اور جانبداری کو بہت بڑا دخل ہے۔ مولانا کے افکار میں کہیں بھی تعصب، جانب داری اور تشدد کا کوئی ذکر نہیں۔

قرآن مجید میں بلاغت کے ساتھ سادگی پائی جاتی ہے تاکہ ایک عام انسان کو بات سمجھ میں آجائے یہ ہی قرآنی انداز مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا آپ اس کتاب میں پائیں گے۔

میں نے اپنی کتاب مضامین رئیس احرار میں پوری جانفشانی اور محنت سے کام لیا ہے۔ دنیا میں زرو جواہر کی وراثت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ لیکن جن لوگوں کے ورثا علمی خزانوں کے مالک ہوں وہی لوگ زندگی کے جہاد میں کامیاب و بامراد ہوتے ہیں۔ اور یہ خوشی کی بات ہے کہ رحمانی صاحب نے اس کتاب میں اپنے ہی خاندان کی علمی تحقیقات کو مرتب اور مدوّن کرنے کا ارادہ کیا۔ کسی خاندان کے خلف الرشید ہونے کی اس سے بڑی کیا سند ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے علمی اور فکری کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔ یہ ایک دینی ضرورت تھی جو خدا کے فضل وکرم سے پوری ہو گئی۔

بے شک مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مولانا رحمانی کے والد تھے۔ لیکن وہ ایک دینی عالم اور سیاسی مفکر تھے۔ مولانا رحمانی نے اس دور کے ایک عظیم سیاست دان کی زندگی کے حالات کو مرتب کر کے علمی دنیا پر احسان فرمایا ہے۔ میں اپنے حرف تحسین کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں جو الفاظ میرے خاندان کی تاریخی نمائندگی کرتے ہیں۔

حرفِ تحسینؔ

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے مورث اعلیٰ جو ساتویں پشت میں تھے جن کا نام حافظ مولوی جان محمد صاحب تھا۔ ان کا ارشاد تھا کہ میں اور میری اولاد محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والے ان لوگوں میں سے تھے جو براہ راست عُمر بن عبد العزیز کے قریبی رشتہ دار تھے اور حضرت عُمر بن عبد العزیز حضرت عمر بن عبد اللہ کی اولاد میں سے تھے۔ میں اس نسبت فاروقی کے نام سے اس کتاب کا انتساب کرتا ہوں اور اسی کے ساتھ مذکورہ افراد کے نام جن کی کوششوں، کاوشوں اور مشوروں کے بعد یہ کتاب آپ کے سامنے پیش خدمت ہے۔

یہ بات بھی آپ کے سامنے آنی چاہیے کہ مولانا جان محمد صاحب نے ہمارے خاندان کی مسلسل روایت و حکایت کے مطابق حضرت خضر علیہ السّلام سے علم دین اور علم دنیا حاصل کیا تھا۔ وہ پیدائشی نابینا تھے لیکن ان کے علم کا کوئی احاطہ نہ تھا۔ وہ اپنی اولاد کو بتاتے تھے کہ ان کو علم خضری حاصل ہے۔ اس خاندان کی تیرہ۱۳ پشتوں سے مسلسل علم دین چلا آرہا ہے اور اب اس چودھویں پشت میں بھی حافظ، قاری، محدث، مصنف، محرر، مقرر اور بہت سے لوگ علوم جدیدہ سے فیض یاب ہیں۔ ان علماء اور فضلاء کی تعداد ایک سو۱۰۰ کے قریب ہے جو سارے ہندوستان اور پاکستان میں مختلف مقامات پر علم دین و دنیا سے دنیا والوں کو فیض یاب کر رہے ہیں۔ اس خاندان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مجاہدین ملک و ملت کا ایک ایسا خاندان ہے جس کی جدوجہد آزادی مسلسل قائم رہی ہے۔ اس سلسلہ میں قید و بند اور پھانسی تک کے تمام مصائب برداشت کئے۔

عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ثم دہلوی
۵۲۹۶ کوچہ رحمٰن چاندنی چوک۔ دہلی
۶/ اگست ۱۹۷۵ء



مقدمہ

جناب ہاشم قدوائی صاحب ریڈر شعبہ پولٹیکل سائنس علیگڑھ مُسلم یونیورسٹی

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تعصب، تنگ نظری اور جانب داری سے ہٹ کر اگر ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ لکھی جائے تو اس میں عُلمائے ربانین سر فہرست ہوں گے۔ اس تاریخ کے نہ معلوم کتنے باب ان کے خون سے لکھے گئے ہیں۔ جب کبھی حوادث کی آندھی سے یہ خاک اڑتی ہے تو اندر سے ان شہداء کے خون کی گل کاری دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ کر دیتی ہیں۔ ان کے کارناموں کو کتناہی نظر انداز کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ان پر عرصہ تک پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ان کا تعلق کسی نہ کسی نہج سے حضرت شاہ ولی اللہ ؒ سے تھا اور ان نفوس قدسیہ میں صلابت دینی، علم اور اخلاق کے ساتھ ساتھ راہِ حق میں ایثار، فداکاری، فنائیت، بے باکانہ حق گوئی، جابرانہ اور قاہرانہ اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعلاء کلمۃ الحق اور راہ عزیمت میں مطلق ہراساں اور سراسیم نہ ہونا، پامردی اور استقامت کے جواہر ہائے بے بہا، پائے جاتے تھے، استخلاصِ وطن اور احیائے اسلام کی پہلی منظم تحریک میں حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم کی قیادت میں اور اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت مولانا قاسم اور حضرت رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا عبدالقادر لدھیانوی کی سربراہی میں ان حضرات کا بہت ہی نمایاں اور بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ رہا تھا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اسلام کا ہندوستان میں باقی رہنا مشکل نظر آرہا تھا لیکن ان ہی عُلمائے حق کی مردانہ وار کوششوں سے اسلام کا سرزمین ہند میں وجود قائم رہ سکا۔ ان کی الہامی فراست نے اسلام، اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب کے دائمی بقا اور تحفّظ کے لئے ملک کے طول و عرض میں آزاد عربی مدارس کا وہ نظام قائم کیا کہ جس کی نظیر دنیا کا کوئی دوسرا اسلامی ملک نہ پیش کر سکا۔ یہ تمام تر ان حضرات کی عدیم المثال جانفشانی اور فقید المثال ایثار اور خلوص کا ثمرہ تھا۔ ان مدارس کا قیام مُسلمانانِ ہند کے لئے نعمت عظمیٰ ثابت ہوا اور ان ہی کی برکت سے ہندوستان میں اسلامی تہذیب اور شعائر اور ان کے آثار قائم رہ سکے اور ان میں سے بہت سے مدارس تحریک آزادی کی چھاؤنیاں بن گئے۔

۱۸۵۷ء کے جہاد حریت کی ناکامی کے بعد سید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے ہندوستانی مسلمانوں کے بقاء و تحفّظ کے لئے انگریزی یا جدید مغربی تعلیم کے حصول کا پروگرام پیش کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر مسلمان انگریزی تعلیم سے بے بہرہ رہتے تو ان کا ہندوستان میں کوئی مستقبل نہ ہوتا اور ان کی زبوں حالی و پس ماندگی کی کوئی حد و انتہا نہ رہتی۔ سیّد احمد خاں اس طبقے کے میر قافلہ تھے جو یہ کہتا تھا کہ مُسلمان زمانے کی ہوا کے ساتھ چلیں اور انگریزی یا مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کرلیں تبھی ترقی کے راستے پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے پروگرام کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ حکومتِ وقت کے ساتھ غیر مشروط اور غیر متزلزل وفاداری سید احمد خاں کی تحریک کا خاص مقصد قرار پایا حتیٰ کہ مذہبی عقائد اور قرآن مجید کی تفسیر تک تجدد اور فرنگیت سے نہ بچ سکی۔ انگریزوں نے اس تحریک کی

پوری حوصلہ افزائی کی اور اس وجہ سے اس ملک کے لوگوں میں انگریزوں کی طرف سے ایک خاص قسم کا انس پیدا ہو گیا۔ خود سید احمد خان کا یہ خیال تھا کہ وہ انگریز یا انگریزی حکومت کی مخالفت میں ادنیٰ بات سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس زمانے میں آئی، سی، ایس کا امتحان انگلستان میں ہوا کرتا تھا۔ جب کانگریس نے اپنے ابتدائی اجلاسوں میں اس کا مطالبہ کیا کہ یہ امتحان ہندوستان میں بھی منعقد ہوا کریں تو سید احمد خاں نے اس کی تائید کرنے سے انکار کیا۔ مسٹر اے۔ او ہیوم کے الفاظ میں وہ کانگریس کے موضوع پر گفتگو کرتے وقت عقل سے عاری ہو جاتے تھے۔ ۱۸۸۸ء سے کانگرس کی مخالفت میں وہ اتنا آگے بڑھ گئے کہ وہ سرے سے ہندوستانی قوم پرستی کے وجود کے منکر ہو گئے۔ ان خیالات میں مسٹر بیک علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل کے اثر کا بہت دخل تھا۔ چنانچہ مسٹر بدرالدین طیب جی کانگریس کے پہلے مسلمان صدر کے خط کے جواب میں ۲۴ ؍ جنوری ۱۸۸۸ء کو یہ رائے ظاہر کی کہ "میں نیشنل کانگریس کے معنی نہیں سمجھ سکا، کیا یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں رہنے والی مختلف ذاتیں اور مختلف مسلکوں پر چلنے والے ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں یا کبھی ایک قوم ہو سکتے ہیں اور کیا ان کے مقاصد اور خیالات یکساں ہو سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ قطعاً ناممکن ہے اور جب یہ ناممکن ہے تو میرے خیال میں نیشنل کانگریس کی کوئی انجمن نہیں ہو سکتی۔ مجھے کانگریس کی ہر قسم اور ہر شکل پر سخت اعتراض ہے جو ہندوستان کو ایک قوم سمجھتی ہے۔ آپ کو غالباً میرے یہ خیالات ناپسند ہوں اسلئے مجھے امید ہے اس قدر زیادہ لکھنے پر معاف کریں گے"۔ (بدرالدین طیب جی مصنفہ اے جی نورانی صفحات ۱۷۶۔۱۷۵ ترجمہ از انگریزی)

جس وقت انگریزی طرز معاشرت اور تمدن کو اختیار کر لینے کی صدائیں بلند کی جارہی تھیں اور اسے ملت اسلامیہ کی عین بہی خواہی کہا جارہا تھا، ان عُلماء نے اس کی مخالفت کی اور اس کے جواب میں ہر قسم کے طعنے سہے اور اپنے موقف سے ایک قدم نہ ہٹے۔ جہاں تک مغربیت کی مضرتوں کا تعلق تھا موجودہ زمانہ میں سرسیّد یا علیگڑھ تحریک کے سب سے بڑے شیدائی اور حامی پروفیسر رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ "جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا تعلق تھا سرسیّد اور امیر علی دونوں سے یہ طبقہ (مولویوں کا) زیادہ صاحب نظر نکلا"۔

یہ صاحب نظر اور دور بین طبقہ ۱۹۴۷ء تک برابر استخلاص وطن کی تحریک میں تن من دھن سے انتہائی پامردی اور استقامت سے شریک رہا اور بالآخر اس کی مساعی جمیلہ بار آور ہوئیں اور ملک دنیا کی سب سے بڑی سامراجی طاقت کی غلامی سے آزاد ہوا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزادی کی بہت بڑی قیمت دینا پڑی اور جب اس کی (آزادی) صبح کا آفتاب طلوع ہوا تو وہ اتنا زیادہ دھندلا تھا کہ اس میں ان ایثار پیشہ اور فداکار سپہ سالاروں اور صف شکن جنرلوں کو پہچاننا مشکل تھا۔ آزادی کے حصول کے ساتھ اور اس سے پہلے جو دردناک اور المناک واقعات پیش آئے اور جس زبردست المیہ سے اس برصغیر کو دوچار ہونا پڑا۔ اس پر انسانیت کو شرم آنے لگی۔ اس افسوسناک صورت حال کی ذمہ داری بے تدبیر مُسلم لیگی قیادت پر تھی جو ذہنی اعتبار سے سید احمد خاں کی جانشین تھی اور احیائے ہندویت کے علم بردار کانگریس کی دائیں بازو کی قیادت پر تھی جو حکومت کی کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے بے تاب اور مضطرب تھی اور جس کے سب سے بڑے لیڈر سردار ولبھ بھائی پٹیل، بقول مسٹر وی، پی مینن سکرٹیری وزارتہائے ہند "دسمبر ۱۹۴۶ء یا شروع ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کی تجویز منظور کر چکے تھے۔ عُلماء کے اس صاحب نظر طبقے کو اس کا پورا اندازہ تھا کہ مُسلم لیگ کا دو قومی نظریہ مُسلمانوں کے لئے کس درجہ تباہ کن ہو گا اور تقسیم کا سودا ان کو کتنا زیادہ مہنگا پڑے گا، لیکن برا ہو جذباتیت، خوش خیالی کا کہ ان حضرات کی ان مستحکم، مسکت اور لاجواب کر دینے والی دلیلوں کو نہ سنا گیا بلکہ ان حضرات پر ہر قسم کا سب وشتم روا رکھا گیا۔ ہندو پرستی اور ملت فروشی اور غداری کے خطابات سے نوازا گیا۔ ان پر حملے کئے گئے، ان کے جلسوں کو منتشر کیا گیا۔ حکومت کی پوری مشینری ہر طرح سے اس گروہ کی مخالف رہی۔ لیکن اس کی استقامت میں کوئی فرق نہ آیا اور بڑی بے جگری اور پامردی سے اس نے تقسیم ہند کی مضرتوں کی نشاندہی کی اور اس کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی'۔ اس سے اس گروہ کی سیاسی فراست کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ان حقائق کے باوجود بعض حلقوں میں مُسلمانوں کی سیاسی امامت کی دستار ان پر باندھی جاتی ہے جو برطانوی حکومت کے غیر مشروط اور غیر متزلزل وفاداری کے علم بردار تھے اور جن کے نزدیک سب سے بڑی فرزانگی اور دانش مندی یہ تھی کہ زمانہ کی ہوا کے مطابق چلا جائے اور سیاسی فراست سے انہیں متصف کیا جاتا ہے کہ جنہیں تقسیم کے وقت چار ساڑھے چار کروڑ مُسلمانوں کو قربان کر دینے

میں کوئی باک نہ ہوا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے۔ ان کا تعلق ایسے خانوادے سے تھا جو تقویٰ، علمِ دین، مجاہدانہ کارناموں اور سیاسی فراست کے لئے ممتاز تھا۔ آپ کے پیر دادا حضرت مولانا عبد القادر لدھیانوی نے ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں مسجد فتحپوری، چاندنی چوک، دہلی میں انگریزوں کے خلاف کمانداری کی تھی اور ہندوستانیوں کی ہزیمت کے بعد ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں ستلانہ میں ۱۸۶۱ء تک مقیم رہے۔ وہاں قیام کے دوران آپ نے رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ حکومت کی طرف سے عام معافی کے اعلان کے بعد آپ اپنے متعلقین کے ہمراہ وطن مالوف لدھیانہ روانہ ہوئے لیکن راستہ میں آپ کا وصال ہوگیا۔ آپ کے تینوں جلیل القدر صاحبزادگان یعنی حضرت مولانا محمد، حضرت مولانا عبد العزیز اور حضرت مولانا عبد اللہ لدھیانہ تشریف لائے اور علمِ دین اور فیوض روحانی سے لوگوں کو فیض یاب کرنا شروع کیا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے سید احمد خان نے ۱۸۸۸ء سے کانگرس کی مخالفت شروع کر دی اور انہوں نے مُسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے سے روکا۔ ان کے نزدیک سیاسی طور سے مُسلمانوں کا کسی ایسی جماعت میں شامل ہونا جو انگریزوں سے حقوق اور اقتدار کا مطالبہ کرے اپنے موت کے وارنٹ پر دستخط کرنا تھا۔ ان کے نزدیک چونکہ ہندوستانی قوم کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس لئے انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کا کوئی جواز نہ تھا۔ ان کے نزدیک گورنمنٹ اس زمانہ کی قانون بنانے والی کونسلوں میں صرف رئیس اور معزز لوگوں کو بلاتی تھی۔ کیونکہ ملک کے رئیس اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجہ کے آدمی خواہ وہ کتنے تعلیم یافتہ لائق ہوں حکومت کریں اور گورنمنٹ مجبور ہے کہ وہ ان کونسلوں کا ممبر صرف معزز لوگوں کو بنائے، انہیں اندیشہ تھا چونکہ مُسلمان تعداد میں کم ہیں اور تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ اس لئے اگر ہندوستان میں نمائندہ حکومت کسی بھی قسم کی قائم ہوئی تو اس میں مُسلمانوں کا نقصان ہوگا، بقول سر رضا علی جو سر سیّد اسکول کے خاص آدمی تھے اور جو سر سیّد کے جانشین اول محسن الملک کے پرائیویٹ سکریٹری تھے سر سیّد اور مسٹر بیک نے مسلمانوں کو آنکھیں بند کر کے برٹش گورنمنٹ پر بھروسہ کرنے کا سبق پڑھایا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے دادا حضرت مولانا محمد اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا عبد العزیز نے اپنی مومنانہ فراست اور سیاسی بالغ النظری کے ماتحت اس کانگریس دشمن پالیسی کی مخالفت کی اور مُسلمانوں کی کانگریس میں شرکت کے جواز میں "نصرت الابرار" کے نام سے دسمبر ۱۸۸۸ء میں ایک فتویٰ شائع کیا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اپنے اسلاف کرام کی جملہ امتیازی خصوصیتوں کے حامل تھے۔ عظیم تحریک خلافت سے لے کر حصول آزادی تک وہ انتہائی پامردی اور استقامت سے جہاد حریت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے جلیل القدر رہنماؤں میں تھا۔ آپ نے تیرہ سال چھ ماہ کی عمر جیلوں میں گزاری اور آپ نے اپنی صحت جیسی بیش بہا متاع کو ملک و قوم کی بھینٹ چڑھایا اور جملہ مصائب بخندہ پیشانی برداشت کئے۔ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ان کا بہت ہی اہم کردار رہا۔ تقریباً ۴۰ سال تک وہ اس میدان کے شہ سوار رہے۔ وہ سیاست اور اس کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ وہ بحر سیاست کے شناور تھے اور معاملہ فہمی میں اپنی مثال آپ تھے، بقول شورش کاشمیری "وہ اسلام کے واضح تصور کا صحیح فکری مظہر تھے وہ جدید اور قدیم تصورات کے مجمع البحرین تھے"[1]

ان کی سیاسی فراست اور تدبر کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ برطانیہ کے زیرک ترین مدبر، سر اسٹیفورڈ کرپس جن کا ہندوستان کی آزادی کے مذاکرات کے سلسلہ میں بڑا نمایاں حصہ رہا تھا حضرت مولانا کی گفتگو سے بہت متاثر ہوئے اور انہیں ہندوستان کے سربرآوردہ سیاست دانوں میں شمار کیا۔

---

[1] شورش کاشمیری کا انتقال ۲۴ ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو لاہور میں اچانک ہوگیا۔

وہ ساری عُمر فرقہ پرستی اور تعصب کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ انہوں نے نہ تو مُسلم فرقہ پرستوں کو بخشا اور نہ ہندو فرقہ پرستوں اور نہ ان تنگ نظر ہندو کانگریسیوں کو، جو کانگریسیت کے لبادے میں کٹر قسم کے ہندو فرقہ پرست تھے۔ جس وقت مُسلمانوں کی اکثریت جذباتیت کا شکار ہو رہی تھی اور پاکستان کی تحریک کا غلغلہ بلند تھا حضرت مولانا ان چوٹی کے مسلم قوم پرور عُلماء اور رہنماؤں میں تھے جنھوں نے پوری قوت کے ساتھ اس تحریک کی مخالفت کی اور یہ بتایا کہ اس سے مُسلمانوں کو کس درجہ ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا اور اس سے انگریز کو کس درجہ فائدہ ہوگا اور اس کی ڈپلومیسی کتنی زیادہ کامیاب ہوگی، لیکن افسوس ہے کہ دوسرے قوم پرور مُسلم رہنماؤں کی طرح حضرت مولانا کی ان باتوں پر کان نہ دھرا گیا اور پھر وہ سب کچھ دیکھنے میں آیا جس پر آج تک انسانیت ماتم کناں ہے۔

ہندوستانی سیاست کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ قوم پرور مُسلمانوں کی بات نہ مُسلم فرقہ پرستوں نے سنی نہ کانگریس نے۔ خلافت کی تحریک کے کمزور پڑنے کے بعد سے ۱۹۴۶ء تک قوم پرور مُسلمانوں نے جمعیۃ عُلماء، مجلس احرار، مُسلم یونٹی بورڈ، الہ آباد اتحاد کانفرنس، ۱۹۲۷ء کی مُسلم زعماء کی کانفرنس، آزاد مسلم کانفرس اور آل انڈیا مسلم مجلس کے پلیٹ فارموں سے ہندو مسلم مفاہمت کی تجویزیں پیش کیں، حضرت مولانا لدھیانوی ان ساری کوششوں میں پیش پیش رہے، لیکن بُرا ہوا! ہندو تنگ نظری کا کہ ان تجویزوں کو قابل اعتنا نہ سمجھا گیا اور بالآخر اس کا المناک نتیجہ تقسیم ہند میں نکلا۔ کاروان آزادی کے اس بوڑھے اور شیر دل اور صف شِکن جنرل کو یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ گھر بار لٹا، وطن مالوف چھٹا اور یہ سب اس وقت ہوا جب پرانے کانگریسی لیڈر جو نان کو آپریشن تحریک کے زمانے سے حضرت مولانا کے رفیق کار رہے تھے مشرقی پنجاب کے وزیر اعظم تھے بالآخر براستہ پاکستان آخر دسمبر ۱۹۴۷ء حضرت مولانا دہلی پہنچے اور اس کے بعد پونے نو سال آپ دہلی میں مقیم رہے لیکن نہ تو گوپی چند بھارگو اور نہ بھیم سین سچر نے کبھی حضرت مولانا کی خدمت میں اس کی پیش کش کی کہ وہ لدھیانہ واپس آئیں، ایسا کیوں ہوا؟ بظاہر اس کا کوئی جواب نہیں۔

جس آزاد ہند کا خواب اس شیر رہنما نے دیکھا جو بے خوفی اور جرأت کا مجموعہ اور جس کی ساری زندگی علامہ اقبال کے اس شعر

آئین جواں مرداں بیباکی و حق گوئی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

کی تفسیر تھی، وہ کتنا مختلف نکلا اور برطانوی شاطرانہ ڈپلومیسی کامیاب ہوئی اور زندگی، بہیمیت، بربریت کی مہینوں، دونوں ملکوں میں حکومت رہی لیکن مولانا مرحوم مومن کامل کی طرح حالات سے مایوس نہ ہوئے۔ ان کی ایمان افروز اور حوصلہ بڑھانے والی تقریروں نے ۴۸، ۱۹۴۷ء کے ہراساں اور خائف مُسلمانوں کے دلوں سے خوف و ہراس کے جذبات کو دور کیا۔ انہوں نے مُسلمانوں کو یاد دلایا کہ وہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن اور دنیا کے ہادیٔ اعظم کی مظلومانہ مکی زندگی کے اُسوۂ حسنہ کو اپنے سامنے رکھیں۔ صبر و استقامت سے کام لیں اور اس ذات مطلق پر اعتماد رکھیں! جو سب سے بڑا سہارا ہے۔ راقم الحروف کو حضرت مولانا کی کانفرنس مسلمانانِ ہند طلبیدہ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ منعقدہ دسمبر ۱۹۴۷ء مقام لکھنؤ آج تک یاد ہے۔ اس تقریر نے سننے والوں کے ایمان کو تازہ کیا اور ان میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ وہ ہراساں نہ ہوں اور اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر رہیں۔ اسی طرح سے ۴۹ء یا ۵۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے جلسہ سیرت میں ان کا یہ جملہ کتنا زیادہ معنی خیز تھا اور اس میں ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کے لئے کتنا بڑا عملی سبق تھا کہ "نہ تو ہندوستانی مسلمان حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی پر چل سکے اور نہ پاکستانی مدنی زندگی پر عمل پیرا ہو سکے! انہوں نے جملہ ہندوستانی کو ہمیشہ اس کی تلقین کی کہ وہ فرقہ پرستی کو ترک کریں! اپنے مذہب کی صحیح تعلیمات پر گامزن ہوں۔ سچے ہندو اور مسلمان اور سکھ کی طرح سچے ہندوستانی بنیں، یہی صحیح جمہوریت ہے اور یہی صحیح عافیت کا راستہ ہے۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ دونوں ملکوں کے مفاد کا تقاضہ ہے کہ وہ آپس میں خوش گوار تعلقات اچھے پڑوسیوں کی طرح رکھیں اور اپنی اقلیتوں کے ساتھ انصاف کریں۔ آج دونوں ملکوں کے سامنے یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے اس سے بھی مولانا مرحوم کے تدبر اور سیاسی بالغ النظری کا پتہ چلتا ہے۔

"رئیس الاحرار در حدیث دیگراں" ان مکتوبات کا مجموعہ ہے جو فقید احرار، بطل حریت اور کاروانِ آزادی کے صف شکن سپہ سالار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے نام عُلماء، قومی رہنماؤں، وزیروں اور سیاست دانوں غرض کہ تقریباً ہر گروہ اور ہر مکتبہ خیال کے افراد نے لکھے ہیں۔ قومی رہنماؤں کے خطوط کے مطالعے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کس قدر اور شخصیت کے مالک تھے اور ان کا قومی سیاست میں کتنا بڑا مقام تھا اور ان کی تابناک زندگی عہد آفریں زندگی تھی اور ان کو ہندوستانی رہنما کتنے احترام سے دیکھتے تھے اور ان کی رائے کو کتنی زیادہ وقعت دی جاتی تھی۔ ان کی سیاسی بصیرت اور دور بینی کے لوگ کتنے زیادہ قائل تھے اور ان کے انتقال سے ہندوستانی سیاست اور خاص کر مُسلمانوں کی سیاست میں کتنا بڑا خلا واقع ہوا ہے۔ تعزیتی خطوط سے حضرت مولانا کے حالات زندگی کے سارے پہلو واضح ہوتے ہیں۔ حضرت علیہ الرحمۃ کی شان دار خدمات اور عظیم کارناموں کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ اب ان کی سی جامع کمالات شخصیتیں کہاں پیدا ہوں گی۔ ؏

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پر روتی ہے

کاش ہم سب اور سارے ملک والے حضرت مرحوم کے نقش قدم پر چلیں۔

قدوائی ۱ر فروری ۱۹۶۱ء

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا شمار ہمارے نامی سماجی اور سیاسی کارکنوں میں ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں کئی موقعوں پر میری ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ ان کے فرزند مولانا عزیز الرحمان نے اپنے والد محترم کی سوانح عُمری لکھی ہے جو اس وقت زیرِ طبع ہے۔ مجھے امید ہے کہ مولانا صاحب کی زندگی کے مفصل حالات عام پبلک کے لئے سبق آموز ہونگے اور اس کتاب کو مقبولیت ملے گی۔

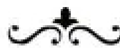
راجندر پرشاد

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے میں بہت برسوں سے واقف ہوں جدوجہد آزدی کے دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

مولانا موصوف جس عقیدہ میں یقین رکھتے تھے اور جس جرأت اور آہنی استقامت کے ساتھ وہ اس پر قائم ہے اس کے سبب میں ہمیشہ ان کا مداح رہا اور ان کا احترام کرتا رہا۔ آزادی سے قبل اور اس کے بعد بھی انہوں نے بہت سی تکالیف اٹھائیں حتیٰ کہ آزادی کے فوراً بعد ہی پاکستان اور شمالی ہند میں جو المیہ رونما ہوا۔ اور جس کی لپیٹ میں وہ شدید طور پر آئے مگر اس سے انہیں تلخی نہیں آئی اور انہوں نے ہمّت نہ ہاری۔ وہ اپنے شہر لدھیانہ میں ہندو مُسلمان اور سکھ سب کے ہی محترم رہے۔

ان کے انتقال سے مجھے گہرا صدمہ ہوا۔ وہ ایک جوانمرد سپاہی کی حیثیت سے ہماری آزادی کی تحریک میں یاد کئے جانے کے قابل تھے۔

جواہر لال نہرو
وزیرِ اعظم ہندوستان



حبیب اور خاندانِ حَبیب

از قاری محمد طیب : دارالعلوم دیوبند

احقر کے سامنے اس وقت تذکرہ بزرگان مولانا حَبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی حال مقیم دہلی دام مجدہٗ مرتبہ عزیز محترم مولوی عزیز الرحمٰن صاحب جامعی ابن مولانا ممدوح، کے اوراق کھلے ہوئے ہیں جو عزیز موصوف نے خاندانی تعارف کے طور پر بڑی محنت سے لکھے ہیں۔ اہل اللہ کے ذکر میں قدرتاً قلبی کشش اور جاذبیت ہوتی ہے کہ اسے شروع کرکے ختم کئے بغیر طبیعت نہیں مانتی، بلکہ ختم کرنے ہی کی طرف نہیں آتی، وہی کیفیت ان اوراق کے مطالعہ کے وقت مجھ پر طاری ہے۔ ہر پچھلا ورق اگلے ورق کی دعوت دیتا جارہا ہے اور جی نہیں چاہتا کہ اس تذکرہ میں کوئی آخری ورق آئے۔ بہر حال دہلی سے دیوبند تک پنج ساعہ سفر ریل میں میرا مشغلہ صرف اس تذکرہ کا مطالعہ رہا اور میں نے اول سے آخر تک اس تذکرہ کے تمام مسودہ کو غور سے پڑھا۔

حالانکہ اہل اللہ کے واقعات و احوال پڑھ کر تبصرہ کے جذبات نہیں ابھرتے بلکہ تذکرہ کے دواعی پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایسی داستانیں جو حقیقتاً زندگی اور اجتماعی زندگی کی داستانیں ہوتی ہیں کسی تقریظ کی غرض سے نہیں دیکھی جاتیں کہ رسمی طور پر اس پر کچھ سطریں لکھ دی جائیں بلکہ عقیدت و محبّت کی نگاہ سے پڑھی جاتی ہیں کہ سیپارہ دل پر خود انہیں کو نقش کیا جائے۔

اس خاندان کے موجودہ اخلاف کرام سے تو میرے مُخلصانہ اور دوستانہ تعلقات عرصہ دراز سے قائم ہیں جیسا کہ میرے اکابر خاندان کے اس خاندان کے اکابر سے گہرے مراسم رہے ہیں۔ اور آج اس تصور سے لدھیانہ کی آمد و رفت، علمی اجتماعات اور مُخلصانہ علمی مجلسیں آنکھوں میں پھر گئیں۔ لیکن اس خاندان کے اسلاف کرام سے تفصیلی تعارف اس داستان حیات ہی کے پڑھنے سے اس سفر میں میسر ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ ولی اللّٰہی خاندان کی شاخ جہاں بھی چلی گئی، شاخ طوبیٰ ہی ثابت ہوئی۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ حضرت جد امجد قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ بانی دارالعلوم دیوبند جب پہلے حج کے لئے کراچی سے حجاز مقدس روانہ ہوئے تو بادبانی جہاز ہوا ناموافق ہونے کی وجہ سے بصرہ میں لنگر انداز ہوگیا اور کئی دن تک ٹھہرا رہا۔ مسافر بصرہ کی سیر کرنے کے لئے اترگئے۔ حضرت قاسم العلوم بھی اُترے مگر تفریح طبع کے لئے نہیں بلکہ بصرہ کے اُس دور کے ایک مشہور و معروف محدث سے سندِ حدیث حاصل کرنے کے لئے۔ محدث ممدوح نے حضرت قاسم العلوم سے دریافت کیا کہ آپ کی سند حدیث کہاں سے ہے؟ فرمایا شاہ عبد الغنی محدث دہلوی سے۔ فرمایا کون شاہ عبد الغنی؟ عرض کیا کہ شاہ اسحٰق دہلوی کے تلمیذ۔ فرمایا کون شاہ اسحٰق؟ عرض کیا کہ شاہ ولی اللہ کے تلمیذ۔ تو جھوم کر فرمایا کہ ہاں ولی اللہ شجرۂ طوبیٰ ہے۔ جس طرح اہل جنّت کا کوئی قصر اور محل نہ خالی ہوگا کہ اس میں شجرہ طوبیٰ کی شاخ پہنچی ہوئی نہ ہو۔ اسی طرح ہندوستان میں علم کا کوئی گھرانہ نہ ملے گا جس میں خاندان ولی اللّٰہی کی کوئی شاخ نہ آئی ہو۔ اور یہ فرماکر بڑی شفقت کے ساتھ حضرت قاسم العلوم کو سند عطا فرمائی۔ بہر حال اسی طوبائی خاندان جنت نشان کی ایک علمی شاخ لدھیانہ کا علمی خاندان بھی ہے جو ولی اللّٰہی علوم اور ولی اللّٰہی جذبات کی امانت سینوں میں لئے ہوئے ہے۔

ان ساری ولی اللّٰہی شاخوں میں علم اور اخلاق کے ساتھ جو چیز سب سے زیادہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے وہ مجاہدانہ اسپرٹ، راہِ حق میں ایثار و فنائیت، بے باکانہ حق گوئی ہر رسمی اقتدار سے نڈر ہوکر اعلان حق اور ساتھ ہی اس راہ میں کسی بھی قربانی سے نہ گھبرانا ہے۔ یہ موجود اوصاف لدھیانوی خاندان میں بہت ہی نمایاں اور خصوصی طور پر نظر آتا ہے اور نہ صرف اسلاف خاندان ہی تک محدود ہے بلکہ آج کے اخلاف میں بھی اس کی وہی جھلک قائم ہے اور بلاشبہ یہ ایک فضل خداوندی ہے کہ کسی خاندان کی اعلیٰ روایات اور مستحسن خصوصیات پشتوں تک

خاندان کا ساتھ نہ چھوڑیں اور اخلاف اپنے اسلاف کے سانچوں میں ڈھلتے رہیں۔

یہ خاندان باطل کے مقابلہ میں ہمیشہ سینہ سپر رہا۔ باطل اور طاغوت کے سامنے کہیں سر نہ جھکایا اور اس پر خار راہ کی ہر مشکل کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور برضا و تسلیم مصائب کا سامنا کیا۔ فتنہ خواہ حکومت و سیاست کی لائن سے آیا یا مذہب و دنانت کے حلقوں سے، مادیت کے راستوں سے نمودار ہوا یا روحانیت کے ناموں سے، انہوں نے ہر دور میں اسے پہچانا اور جلد پہنچانا۔ اس کی سر کوبی کی اور مُسلمانوں کو اُس سے آگاہ کر کے اُس سے محفوظ رکھا۔ برطانوی حکومت کی لائن سے جس قدر فتنے اٹھے اور جس رنگ میں بھی اٹھے ان کے خلاف اس خاندان کے اسلاف بھی اٹھے اور پھر اخلاف نے بھی وہی کچھ کیا جو اسلاف نے کر دکھایا تھا۔ اور ساتھ ہی غربت و تشدد کے تمام مصائب بھی جھیلے جو اس راہ کے خواص آثار میں سے ہیں مگر کلمۂ حق کی تبلیغ و ترویج نہ چھوڑی اور نہ ہی اس میں کسی اپنے اور بیگانے کی ذرہ برابر رعایت کی، بلکہ بلا خوف لومۃ لائم اعلامن حق کیا، خواہ اس کی پاداش میں اپنا کچھ بھی کھو دینا پڑا۔ ہوسکتا ہے کہ عملی جزئیات میں ان سے کسی کو اختلاف ہو مگر دنیا کا کوئی بھی حق پرست انسان ان جذبات حقہ کی قدر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"اوّل بآخر نسبتے دارد" کے اصول پر جس طرح اس خاندان کے اسلاف پر اعلان حق کی بدولت وہ وقت بھی آیا کہ انہیں وطن مالوف اور گھر بار چھوڑ کر غربت کی زندگی اختیار کرنی پڑی اور ان کی غیبت میں دشمنان حق نے ان کے گھروں ہی کو نہیں ان کی عبادت گاہوں تک کو جلا ڈالا۔ اسی نہج سے اخلاف خاندان کو بھی آج راہ محبت کی یہ تمام تلخیاں سہنی پڑ رہی ہیں۔ وطن مالوف چھوٹا۔ گھر بار ہاتھ سے نکلا۔ خاندان کے کتنے ہی مردوں عورتوں نے حیات غربت کے ساتھ موت غربت اختیار کی۔ مدارس ہاتھ سے گئے۔ معاہد اور مساجد قبضہ سے نکل گئیں جن میں برسوں سے قال اللہ و قال الرسول ﷺ کی صدائیں اٹھتی رہیں اور نہ معلوم کہ وہ باقی ہیں یا یکسر دوسرے نقشوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ مگر ان سارے فتنوں کی گرم بازاری میں یہ امانت داری کس درجہ پُر عظمت ہے کہ جسطرح ان انتہائی مصائب میں اسلاف کے پیروں کو ذرہ برابر جنبش نہیں ہوئی تھی اور انہوں نے نہ صرف صبر و خیر بلکہ رضاء و تسلیم کے جذبات دکھلائے تھے، اسی طرح آج کل دردناک مصیبتوں اور ہولناک پریشانیوں میں اخلاف کے پائے استقلال کو بھی ادنیٰ جنبش نہیں ہوئی اور نہ ہی ان کے چہروں پر کسی ادنیٰ سی بدحواسی یا اداسی کی کوئی لکیر دکھلائی دیتی ہے۔

بہر حال نوعی حیثیت سے اس علمی خاندان میں جو چیز قدر مشترک کے طور پر اسلاف و اخلاف میں نمایاں نظر آتی ہے اور ساتھ ہی اُس کے آثار بھی مشترک ہیں، وہ راہ حق میں بے خوفی و بے باکی، اعلاء کلمۃ اللہ، اطفاء فتن اور دنیوی زندگی میں تحمل شدائد و مصائب مگر بصد تسلیم و رضا ہے حکومتی فتنہ ہی نہیں بلکہ ہر وہ فتنہ جو مذہب، قوم، فرقہ تمدن اور معاشرہ و سیاست کی راہ سے نمودار ہوا، ان حضرات کی نگاہ دوربین نے ہر رنگ میں اس کے انداز قد و قامت کو پہچانا اور مخلوق کو اس سے خبردار کیا۔ فتنہ مرزائیت کو اولاً اسی خاندان نے بھانپا اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دجل و فساد سے علمی طور پر ملک کو آگاہ کیا جس سے لاکھوں انسان گمراہی کے اس جال سے بچ گئے حتیٰ کہ اس سلسلہ کی عملی تکمیل بھی بالآخر اسی خاندان کے ہاتھوں ہوئی۔ مجلس احرار، نے امیر الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی امارت و قیادت میں اس فتنہ کا عملی طور پر مقابلہ کیا اور اس سے زبردست ٹکر لی جو ظاہر میں قادیانیت سے ٹکر تھی مگر بلحاظ حقیقت یہ ٹکر برطانیہ کی طاقتور حکومت سے تھی۔ اس لئے ان حضرات کو قید و بند کے سارے ہی تشدد آمیز مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بالآخر سیاسی پہلوؤں سے اس جماعتِ باطل کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روک دینے بلکہ محدود کر دینے میں امیر الاحرار اور ان کے رفقاء کار کامیاب ہوئے جو ایک تاریخی کارنامہ ہے اور زندۂ جاوید رہ کر جریدہ عالم پر سنہرے حرفوں سے بطور یادگار ثبت رہے گا۔ فتنہ نیچریت و آزادی، فتنۂ بدعات و محدثات، فتنۂ بے قیدی و اطلاق اور فتنہ تمدن و تعیش نے ان بزرگوں کے دور میں مختلف روپوں سے ابھرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے اعلیٰ ترین استقامت سے اس زیغ باطل پرور کا مقابلہ کیا' اور اسے شکستوں پر شکستیں دیں۔"

اس لئے اس خاندان کا اثر و رسوخ ہمہ گیر رہا۔ پنجاب میں خصوصاً اور بیرون پنجاب میں عموماً اس علمی گھرانے کو عزت و وقعت اور مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ان کے کلمات موعظت و ہدایت کو دل کے کانوں سے سنا گیا۔ یہ اثرات پبلک سے گزر کر درباروں تک بھی

پہنچے اور سلاطین وقت نے بھی ان بزرگوں کے سامنے سر عقیدت خم کیا!

بہر حال مجموعی حیثیت سے یہ خاندان پنجاب کا ایک ممتاز علمی خاندان اور علم و فضل نیز جوہر عمل کے لحاظ سے ایک مانا ہوا قبیلہ رہا ہے جس نے ہمیشہ مسلمانوں کی علمی اور دینی خدمت انجام دی ہے۔ آج کا دور دین و تقویٰ کا دور نہیں اور نہ ہی دین کے لئے آج کے ناساز گار احوال مساعدت کر رہے ہیں۔ دین پر قائم رہنے والا غریب اوپرا اور کالقابض علی الجمر (ہاتھ میں چنگاری پکڑنے والا) کا مصداق ہے جس کا مادی ماحول میں کوئی وقار نہیں۔ غیرت خداوندی نے نہ چاہا کہ دین و دیانت کے ایسے پاک نمونے ایسے ناپاک ماحول میں رکھے جائیں۔ اس لئے انہیں اٹھالیا گیا اور عالم بالا کو ان سے زینت دی گئی۔ اس لئے جہاں اس دور کی بدبختی ہے کہ یہ نمونے اس میں نہ رہے وہیں ان حضرات کی ارجمندی اور سربلندی کی نشانی تھی! کہ دنیا کی اس عام زبوں حالی سے پہلے ہی انہیں اٹھالیا گیا: رحمھم اللہ رحمۃ واسعۃ۔ لیکن پھر بھی انتہائی خوشی کا مقام ہے کہ اخلاف نے اسلاف کا نقش قدم نہیں چھوڑا اور ان کے پاک جذبات کی امانت محفوظ ہے جس میں کوئی خیانت نہیں ہوئی۔

خصوصیات زمانہ نے گو نقشے بہت کچھ بدلے ہیں مگر شباہت نہیں مٹی۔ آب و ہوا نے مزاجوں میں تبدیلیاں بہت کچھ پیدا کر دیں مگر افتاد طبیعت نہیں بدلی۔ باد سموم نے نونہالوں کو مرجھا ضرور دیا ہے مگر پھلوں کا ذائقہ پھر بھی وہی ہے۔ بہر حال عوارض و خصوصیاتِ وقت نے تبدیلیاں ضرور کی ہیں مگر بنیاد و اساس پر تعمیر وہی کھڑی ہوئی ہے جو پہلے سروں پر سایہ کئے ہوئے تھی۔

انقلابات زمانہ سے یہ خاندان بھی ملک کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا! مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا گھرانہ ہندوستان میں آباد رہا اور ان کے دوسرے بھائی اور مولانا مفتی نعیم صاحب کا خاندان پاکستان میں بس گیا۔ لیکن خدمات و جذبات کے سلسلہ میں افراد خاندان کی پوزیشن اور اس کے آثار بدستور نمایاں ہیں۔ بالخصوص مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی میں جس سیاسی بصیرت کا ثبوت دیتے رہے ہیں ان کی وفات کے بعد بھی ان کے مبصرانہ کلمات انہی کا سا کام کر رہے ہیں۔ ملک کے انقلابی احوال و مسائل کے سلسلہ میں مرحوم نے جن جن رایوں کا اظہار کیا تھا آج ملک ہی نہیں حکومت کے حلقوں سے بھی ان کی تائیدی صدائے بازگشت سنائی دے رہی ہے جو ان کی دور بینی اور سیاسی بصیرت کا کھلا ثبوت ہے، جیسا کہ اس کتاب میں اس کے بعض شواہد و نظائر پیش کر دیئے گئے ہیں"۔

بہر حال یہ زیر نظر تاریخی جائزہ اس خاندان کی اگلی پچھلی اور ماضی و مستقبل کی خدمات سیاسی جوش اور مذہبی ہوش کا آئینہ دار ہے جو اس خاندان کے ایک چشم و چراغ مولوی عزیز الرحمٰن جامعی، ابن مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، فاضل دیوبند مرحوم نے کافی عرق ریزی اور کاوش کے ساتھ فراہم کیا ہے۔ ان قیمتی حالات و خدمات کی محض اس لئے ضرورت نہ تھی کہ وہ ایک خاندان کی تاریخی حقیقتیں ہیں جن کا کاغذوں میں تحفظ ہو جائے بلکہ اس لئے ضرورت تھی کہ ان میں نمونۂ عمل اور حل مشکلات کا اسوہ موجود ہے جس کا تحفظ قومی نقطۂ نظر سے ضروری تھا اور جو آنے والی نسلوں کے لئے قابل تقلید مثال بن سکتا ہے اور مستقبل میں اس سے لائحہ عمل کا کام لیا جا سکتا ہے۔

بزرگوں کا نقش قدم ہی درحقیقت بزرگوں کا قائم مقام ہوتا ہے اور وہ انہی کی طرح اگلوں کے لئے مربی اور فانوس رہنا ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے بزرگوں کی تاریخیں مدون کی جاتی ہیں اور اسی درس عبرت کے لئے قرآن حکیم نے تاریخ اور قصص اسلاف کا باب قائم کیا ہے۔

لقد کان فی قصصھم عبرۃ اولی الالباب۔

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب اس سعی جمیل پر مستحق مبارکباد ہیں۔ حق تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور اس خدمت کو قبول فرمائے اور اولوالالباب کو اس سے درس عبرت لینے کی توفیق بخشے۔ آمین

محمد طیب غفرلہٗ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۷ رجمادی الثانی ۱۳۹۵ھ

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰ سوزِ صدّیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر
نگاہِ مُسلماں کو تلوار دے

(اقبال)

پنجابؒ کا ہادی اور مربّی

۲۵ محرم ۱۳۷۶ھ اتوار کا دن بہت ہی المناک دن تھا جب کہ ۹ بجے صبح کو فون پر اطلاع آئی کہ مولانا حَبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہو گیا۔ مولانا ممدوح علمی گھرانے کے ایک لائق رکن تھے۔ ان کا خاندان پنجاب کے لئے ہادی اور مربّی دین رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حریت و آزادی کا پوری قوت اور ہمّت سے علم بردار۔ مولانا ممدوح اپنی خاندانی روایات کے ماتحت ایک ذکی عالم و مفکر اور سیاسی مزاج کے رہنما تھے۔ معاملات میں گہرائی کے ساتھ سوچتے تھے ملک کی آزادی میں ان کا زبردست حصہ تھا۔ وہ پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے طبقے اور ان کے رفقاء سیاسی میں سے تھے۔ ملک کے ان دونوں رہنماؤں کو ان پر کافی اعتماد تھا۔ مولانا کے جنازے میں شرکت کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندوستان نے اپنے سیکریٹری کو اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ مولانا حَبیب الرحمٰن کی وفات سے ملک ہی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ میرا ذاتی نقصان بھی ہوا ہے۔

مولانا ممدوح سیاسی میدان کے ایک بہادر اور ان تھک سپاہی تھے۔ عمومی سیاسیات اور بین الاقوامی معاملات میں ذی اثر تھے اور ہر بنیادی مسئلہ میں ان کی ایک نکھری ہوئی رائے تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب اور دینی معاملات میں نہایت پختہ اور متصلب تھے دیانت و سیاست میں ان کے یہاں حدود تھیں اور وہ ان حدود کے سختی سے پابند تھے بااصول اور وضعدار شخصیت رکھتے تھے۔ میرا ان کا تعلق شخصی نہیں بلکہ خاندانی نوعیت کا تھا۔ موقع بموقع ہمارے اہل بیت لدھیانہ میں ان کے یہاں مقیم ہوتے تھے اور گھر جیسا معاملہ تھا۔ میرے ساتھ خصوصیت سے ممدوح کو مُخلصانہ مُحبّت تھی اور حاضر وغائب خیر خواہی فرماتے تھے۔

دارالعلوم دیوبند کے ساتھ ممدوح کو خاص شغف تھا اور اس کے بارے میں بہت اچھے اچھے معقول اور نیک مشورے پیش فرماتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے بھی کہ وہ دارالعلوم کے ایک فیض یافتہ تھے اور اس وجہ سے بھی کہ اوپر سے ان کے خاندان کے بزرگوں کو بزرگان دیوبند سے خصوصی ربط اور علاقہ تھا۔ دینی مسلک اور سیاسی مشرب میں سب ایک دوسرے کے ہم نوا تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے پہلے جس بزرگ نے کانگرس میں شامل ہو جانے کا فتویٰ دیا وہ ان کے دادا حضرت شاہ محمدؐ صاحب قدس سرہ العزیز تھے اس کے بعد پھر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ فتویٰ دیا۔ اس سے ان بزرگوں کی فراست اور جوش بُغض فی اللہ واضح ہے۔ یہی اثر مولانا حَبیب الرحمٰن اور ان کے خاندان کے دوسرے ممبروں میں رچا ہوا تھا۔ سیاسی معاملات میں ان کی گفتگو نہایت جوش اور حرارت ایمانی کے ساتھ ہوتی تھی۔ وہ دو متضاد کیفیتوں کے بیک وقت حامل تھے۔ ایک طرف دین میں تعصب اور شدت کے ساتھ اس کے دائرہ میں محدود بن کر رہنا۔ دوسرے سیاسی لائن میں وسعت جس کے دائرہ میں مسلم اور غیر مسلم یکسانی کے ساتھ جمع ہو سکیں۔ چنانچہ ان کی مجلس میں دونوں قسم کے افراد کا اجتماع رہتا تھا۔ ایک جانب خالص مذہبی قسم کے لوگ بھی ان سے مانوس تھے اور دوسری طرف سیاسی سِلسلوں سے ہندو، مُسلم، سکھ سب کی ان کے پاس

بقول حضرت رئیس الاحرار ایک بزرگ چالیسؒ سال سے اپنی کتابوں میں تہجد کی نماز پڑھ کر صبح کو جھوٹ بولتے ہیں کہ کانگریس کے حق میں فتویٰ حضرت مولانا رشید احمدؒ اور عُلماء دیوبند نے دیا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔

آمد و رفت تھی اور اس سے زیادہ حیرتناک بات یہ تھی کہ یہ سیاسی لوگ سیاسی لائن سے ہی ان کے پاس آتے تھے، مگر ساتھ ہی ان کی مذہبیت سے متاثر اور اسے ایک مذہبی مقتداء کی حیثیت بھی دیکھتے تھے۔ مولانا مرحوم ان اثرات کو دین کے حق میں استعمال فرماتے تھے اور تبلیغ حق کے فریضہ کو باحسن اسلوب ادا فرماتے رہتے تھے جس طرح سے نفسیات کا ایک ماہر اپنے کام کو انجام دیتا ہے۔ مولانا ایک دفعہ ہندوؤں کے سامنے اذان کی حقیقت اس انداز سے بیان کی کہ بہت سے ہندوؤں کی خواہش ہوئی کہ اذان کا ہندی میں ترجمہ چھپوا دیا جائے۔ مولانا نے ہندی میں اس کا سلیس ترجمہ کرواکر عربی اذان اور ہندی ترجمہ ایک خوبصورت پمفلٹ میں چھپوایا، جو ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوا۔ اور اس کے گاہک سب کے سب ہندو تھے جنھوں نے بخوش دلی اسے لیا اور اپنے بچوں کو یاد کرایا اور سمجھایا۔ اسی طرح سے وہ اسلامی مسائل کو سیاسی رنگ سے پیش کرکے اسے منوالیتے تھے، اس کے ساتھ ہی ممدوح حضرت اقدس مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری سلمہٗ اللہ تعالیٰ سے بیعت بھی تھے اور حضرت کے دینی ارشاداتِ گرامی کے سختی کے ساتھ پابند اور اسے حرزِ جان بنائے رہتے تھے۔ ان کے ہر قول وعمل سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے قلب میں دین کا رسوخ کافی ہو چکا ہے اور ان کی یہ بات خواہ وہ سیاسی رنگ کی ہی ہو، دین کے جذبہ سے خالی نہ ہوتی تھی۔ تبلیغی سلسلہ میں نہایت ہی مفکرانہ مشورے دیتے تھے بہرحال ایک طرف عملی رنگ لئے ہوئے تھے، دوسری طرف سیاست میں گہرے رسوخ کے حامل تھے جس کی باتیں مسلم اور غیر مسلم دونوں کے جذبات کو اپیل کرتی تھیں اور ایک سمت صوفی منش بھی تھے، جس سے اہل اللہ اور ان کی نسبتوں کی عظمت سے ان کا دل لبریز معلوم ہوتا تھا۔ یہ متضاد خوبیاں جمع رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہی چند در چند خوبیاں اور فضائل ہیں جس سے ان کی ہستی دلوں میں زندہ نظر آتی ہے اور آتی رہے گی۔ حق تعالیٰ نے انہیں حسن خاتمہ کی دولت سے نوازا۔ مجھے جب کبھی خط لکھتے تھے تو اس میں حُسن خاتمہ کی دعا کے لئے ضرور لکھا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ آرزو پوری فرمائی۔ پاکیزہ موت ہوئی۔ دو تین منٹ میں سب جھگڑا مٹ گیا۔ کلمہ طیبہ کے ورد کے ساتھ اچانک روح عالم بالا کو پرواز کرگئی اور موت کا حق تعالیٰ نے ظہور فرمادیا۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ حق تعالیٰ شانہ ان کی اولاد اور پس ماندوں کو ان کے نقش قدم پر چلائے ان سب کے جذبات بھی بحمد اللہ وہی ہیں جو ان کے خاندان کا ورثہ تھے اور امید ہے کہ ان کی اولاد میں سے بعض فضلاء آخر کار اپنے بہترین باپ کے صحیح جانشین ثابت ہوں گے یہ چند سطریں "اذکروا محاسن موتاکم" کے تحت بطور تسکین قلوب لکھی گئیں ورنہ ایسی ہمہ گیر شخصیتوں کا غم والم چند سطروں کی حدود میں کہاں سما سکتا ہے کیونکہ ایسے صدمات محض خاندانی یا قبائلی نہیں ہوتے بلکہ قومی اور ملکی ہوتے ہیں جن کو سطریں نہیں نمٹا سکتیں دل ہی برداشت کرتے ہیں۔ ہم سب خدام دارالعلوم دیوبند ان کا غم دلوں میں لئے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ اس غم کو وسیلہ نجات فرمائے اور ہم سب کو حسن خاتمہ کی دولت سے مالامال فرمائے۔ آمین۔

محمد طیب غفرلہٗ
دارالعلوم دیوبند
۱۶ر مئی ۱۹۶۲ء



دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر
حریم کبریا سے آشنا کر
جنھیں نانِ جویں بخشا ہے تو نے
انھیں بازوئے حیدر بھی عطا کر
(اقبال)

کیسے کہوں کہ درد کہاں ہے کہاں نہیں٭

از مُفتی عتیق الرحمان، عُثمانی ندوۃ المُصنفین، دہلی

برادرانِ من!

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

محب باصفا حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اچانک وفات سے قلب پر بجلی سی کوندگئی اور اس سانحہ کا جو صدمہ روح نے محسوس کیا ہے اس کا بیان الفاظ کے قالب میں نہیں ہو سکتا۔ ابھی چند روز ہوئے معمول کے مطابق ندوۃ المُصنفین کے دفتر میں تشریف لائے تھے۔ ان کا ہنستا ہوا چہرہ آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ مرحوم ہم سے ہمیشہ کے ئے جدا ہوگئے ہیں۔ اس وقت گزشتہ ۳۸ سال کے حالات و واقعات کا نقشہ سامنے ہے مرحوم ۱۳۴۱ھ میں میرے ساتھ ترمذی شریف کے سبق میں شریک تھے یوں تو ہماری ملاقات اس سے پہلے بھی تھی اور مختلف سیاسی اجتماعات میں شریک رہا کرتے تھے لیکن ہم سبق ہونے کے تعلق سے اب ہم میں دوستی ہوگئی تھی۔ عُلمائے دیوبند سے آپ حضرات کے بزرگوں کا تعلق نہایت قدیم و عمیق تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ کے دادا مولانا مُحمد زکریا صاحب مرحوم نے نہ صرف اپنی اولاد کو بلکہ اپنے بھائیوں اور خاندان کے دوسرے افراد کو بھی اہتمام کے ساتھ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم کے لئے بھیجا۔ مولانا مُفتی مُحمد نعیم صاحب نے اگرچہ ہم لوگوں سے کئی سال پہلے فراغت حاصل کی لیکن زمانہ ایک ہی تھا۔ اس کے بعد مولانا مُحمد یحییٰ صاحب اور مولوی مُحمد حسن صاحب وغیرہ کا زمانہ آیا۔ یہ یاد نہیں کہ مولوی مُحمد حسن صاحب ہم سے پہلے فارغ ہوئے یا بعد میں لیکن مولانا مُحمد یحییٰ صاحب میرے چچازاد بھائی مولانا مُحمد یعقوب مرحوم کے ہم سبق تھے اور مولانا یعقوب نے دورے کی کتابیں مجھ سے پہلے پڑھی تھیں۔ اکابر دیوبند سے روایتی اور قدیم روابط کے علاوہ مولانا مُحمد زکریا صاحب مرحوم کو حضرت الاستاذ خاتم المحدثین علامہ سید مُحمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے حد درجہ تعلق حاصل تھا اور اس تعلق کے مُختلف مظاہرے میں نے بار بار اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ آپ کے لدھیانہ کے پرانے مکان پر بھی اور انجمن خدام الدین کے تاریخی اجلاس لاہور کے موقع پر بھی۔ اس نسبت سے مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کو بھی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے غیر معمولی ربط تھا عمِ محترم، شیخ اسلام، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت والد ماجد مُفتی اعظم عارف باللہ مولانا شاہ مُفتی عزیز الرحمٰن صاحب عُثمانی نقشبندی قدس سرہ کی مجالس میں بھی بطور خاص حاضر رہتے تھے اور حضرت محترم مرحوم کے خاص ہم نشینوں میں تھے۔ میرے بڑے چچا اور دارالعلوم دیوبند کے روح رواں حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن عُثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص معتمد تھے۔ ان دنوں کی ایک ایک بات حافظہ میں اُبھر رہی ہے کبھی موقع ملے گا تو لکھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے ہمیشہ سے کوتاہ قلم ہوں اور اس عادت کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے اہم تاریخی واقعات جن کا تعلق براہ راست مجھ سے ہے بندش قلم میں نہیں آتے، بہر حال دوسری خصوصیات اور کمالات کے علاوہ مرحوم کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ میدان سیاست کا شہسوار ہونے کے باوجود درویش تھے اور روحانی حلقے سے اسی انداز کا تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ذہانت و ذکاوت اور قوت فیصلہ کی پختگی ضرب المثل تھی۔ مختصر تقریر کرنے والوں میں میں نے اتنا اعلیٰ درجہ کا خطیب نہیں دیکھا۔ ان کی تقریر مؤثر بھی ہوتی تھی اور عام فہم بھی۔ ایسے الفاظ اور ایسا انداز بیان اختیار کرتے تھے کہ ان کی بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھی، الجھے ہوئے مسائل و معاملات کو سلجھانے میں بھی کمال تھا۔ نازک اور مشکل وقت میں ان کی دیدہ وری کی عجیب شان ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس احرار اسلام جیسی جماعت کا جس میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری ایسے سحر

بیان اور ولولہ انگیز خطیب اور چودھری افضل حق جیسے فہیم موجود تھے، دماغ سمجھے جاتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس سے بھی ان کا تعلق اسی قسم کا تھا۔ ہمارے برادران وطن میں کوئی اس پایہ کا لیڈر ہوتا تو قوم اس کو اپنی آنکھ کا تارا بناتی۔ اس کے برخلاف مرحوم کی زندگی قربانیوں اور جاں کاہیوں کا مرقع تھی اور عمر کا ایک قیمتی حصہ جیل خانوں میں بسر کیا تھا مگر جب ملک آزاد ہوا تو ان کے لئے کہیں پناہ نہیں تھی۔ مشرقی پنجاب کے تقریباً تمام مُسلمان رہنما حالات کی مجبوری سے دوسری طرف چلے گئے لیکن مرحوم الٹے دہلی آگئے اور تادم واپسین یہیں اقامت پذیر رہے۔ میں نے حالات کی ناسازگاریوں اور کڑواہٹوں کا کوئی اثر بھی مرحوم کے مسکراتے ہوئے چہرے پر نہیں دیکھا۔ حالانکہ انقلاب کی تلخیاں ان کو مسکرانے سے روکتی تھیں مگر مرحوم ان تلخیوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ علامہ اقبال کے اکثر اشعار ان کی نوک زباں پر تھے۔ خاص طور پر شمع اور شاعرہ خضرراہ اور طلوع اسلام ان نظموں کے بند جھوم جھوم کر پڑھا کرتے تھے۔ اور اقبال مرحوم کے مشہور شعر

دم زندگی رم زندگی، غم زندگی، سم زندگی

غم رم نہ کر! سم غم نہ کھا! کہ یہی ہے شانِ قلندری

کا دلآویز مصداق تھے ہر حالت میں خوش، قانع، صابر، عام اہلِ علم کے برخلاف صفائی اور رہن سہن کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے تھے۔ سادگی کے باوجود نفیس الطبع تھے جب بھی ہمارے یہاں تشریف لاتے دفتر کی صفائی اور سلیقے کو دیکھ کر اظہار پسندیدگی کرتے۔ سالہاسال سے کثرت بول کی شکایت ہوگئی تھی جب بھی استنجا کے لئے بیت الخلاء جاتے تو بے تکلف فرماتے، تمہارے یہاں ہر چیز پاکیزہ اور صاف ہے، مگر بیت الخلاء کا لوٹا ٹھیک نہیں۔ اس میں جراثیم بھرے ہوئے ہیں۔ مرحوم کا ریمارک سو فیصدی درست تھا دوستوں کی حوصلہ افزائی بھی خوب کرتے تھے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں عید قرباں اور قربانی کے فلسفے پر آل انڈیا ریڈیو سے میری دو تقریریں نشر ہوئی تھیں۔ مرحوم نے ان کو سنا تو صرف ان کی داد دینے کے لئے تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے عجیب خصوصیتوں کے انسان تھے۔ الی اللہ اشکو، لا الی ان من انی اری الارض تبعی والہ خلد مذہب اخلاد لو غیر الحام اصابکہ بے عتبت ولکن ما علی الموت معتب

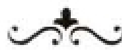
اے ہم نفساں محفل ما

افتند ولے نہ از دل ما

والسلام

مُفتی عتیق الرحمٰن عُثمانی

ندوۃ المُصنفین، دہلی۔ ۷/ستمبر ۱۹۵۶ء



خاندانِ حَبیب کی تاریخ

مجاہد جلیل، رئیس الاحرار، حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن قدس سرہٗ پاک و ہند کے ان مشہور مذہبی اور سیاسی رہنماؤں میں سے ایک ہیں جن کے نام انگلیوں پر گنے جاتے ہیں۔ آپ نے لدھیانہ کے مشہور عُلماء و مجاہدین کے گھرانے میں آنکھ کھولی۔ آپ کی ولادت ۱۱ صفر ۱۳۱۰ھ مطابق ۳ جولائی ۱۸۵۲ء اتوار کے روز صبح کے وقت ہوئی، گھر کا ماحول علمی، مذہبی، اخلاقی اور انقلابی تھا۔ اور آپ کے دادا قطب عالم حضرت مولانا شاہ محمد صاحب نور اللہ مرقدہٗ اس وقت کے مشہور عالم، فقیہہ، محدث اور مجاہدین آزادی کے قائدین میں سے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اور روحانی تربیت آپ کے دادا ہی نے فرمائی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ آپ صاف دماغ اور روشن فکر کے ساتھ میدان عمل میں اترے اور انگریزی سامراج کے خلاف جنگ آزادی میں شریک ہوگئے۔ ملک بھر میں آپ کی قیادت کو تھوڑی ہی مدت میں تسلیم کر لیا گیا اور مجاہدین کی ایک بڑی جماعت آپ کی زیر قیادت عزم و یقین، ہمت و جرأت کے ساتھ ملک کی آزادی کے راستے پر گامزن ہوئی۔

بڑے بڑے اولوالعزم اور اصحاب بصیرت لیڈروں کے قدم کئی ایک بار تحریک آزادی کے مصائب اور مشکلات کو دیکھ کر ڈگمگا گئے۔ لیکن اس مرد مجاہد کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی۔

رئیس الاحرار مولانا حَبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ قوت عمل کے قائل تھے۔ ان کے ہاں منصوبے اور پلانوں کی حَیثیت دوسرے درجہ کی تھی۔ انھوں نے صرف گفتار سے ہی کام نہیں لیا، بلکہ اپنے کردار اور قربانیوں سے پوری قوم کو عملی زندگی کا راستہ دکھایا۔ ان کی عملی زندگی ہر زمانے میں ملک و قوم کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔

اپنے دادا صاحب کے انتقال کے بعد آپ کئی ایک برس تک امرت سر حضرت مولانا نور احمد صاحب کی خدمت میں بغرض تعلیم مقیم رہے اور ان سے قرآن و حدیث کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ آپ امرت سر سے ایشیا کی مشہور عربی یونیورسٹی، دارالعلوم دیوبند میں تکمیل تعلیم کے لئے تشریف لے آئے اور تقریباً ساتؔ سال تک دارالعلوم میں تعلیم حاصل فرماتے رہے۔ حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو گہرا تعلق تھا۔ ان کے حلقوں میں آپ شریک رہے۔ اور علمی، دینی، سیاسی بصیرت حاصل کی۔ آپ کا شمار ملک کے مشہور عُلماء اور دارالعلوم کے مایہ ناز فرزندوں میں کیا جاتا ہے۔

والد ماجد

آپ کے والد حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ملک کے جیّد اور مشہور عُلماء میں سے ایک تھے۔ ان کی ذہانت، علمیت، حافظہ، تقویٰ و طہارت اور فہم کی شہرت تھی۔ حافظہ کا یہ عالم تھا صرف تین ماہ میں قرآن عزیز کو حفظ فرمالیا۔ اور رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو ایک رکعت میں بلا کسی غلطی اور تشابہ کے سنا ڈالا۔

پنجاب کے اکثر و بیشتر عُلماء مشکل مسائل، فہم حدیث اور فہم قرآن عزیز کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے علمی فیض حاصل کرتے۔ حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ کی علمی ذہانت، حافظہ اور تفقہ فی الدین کے معترف اور قائل تھے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے علم و فضل سے متاثر ہو کر کئی ایک بار آپ سے فرمایا:

"مولانا اگر آپ درس و تدریس کے لئے بیٹھ جاتے تو عُلماء کی جماعت کو آپ کی علمی تحقیقات اور مذہبی شخصیت سے فیضان

ہوتا اور وہ مقام ایک دارالعلوم بن جاتا"

دونوں بزرگوں میں بہت زیادہ تعلق اور محبّت تھی۔ حضرت شاہ صاحب ان کی کسی بات کو رد نہیں فرماتے تھے اور ایک جیّد عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ کی طرح آپ کی عزت فرماتے۔

جدِّ امجد

آپ کے علمی، مذہبی اور انقلابی خاندان کی علمی، مذہبی شہرت آپ کے جدّ امجد امام العارفین حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب قدس سرہٗ کے مجاہدانہ کارناموں سے شروع ہوئی۔ وہ اپنے زمانے کے ممتاز عالم، مجاہد وصاحبِ ارشاد وسالکین میں سے تھے۔ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلیم حاصل کی اور روحانی تربیت بھی اسی خاندان سے پائی۔ صرف ایک واسطے سے آپ مشہور مترجم قرآن حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور مجاز تھے۔

اس طرح لدھیانہ کا یہ علمی خاندان ولی اللّٰہی خاندان کی ایک علمی شاخ بھی ہے اور ان کے سینوں میں آج بھی ولی اللّٰہی علوم اور ولی اللّٰہی جذبات کی امانت موجود ہے۔

رئیس الاحرار کے جدّ امجد حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ پنجاب میں تنہا بزرگ تھے، جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزی سامراج کے خلاف لدھیانہ میں فتویٰ دیا اور انگریزی حکمرانوں سے باقاعدہ جنگ کرکے لدھیانہ میں متوازی گورنمنٹ قائم کی اور تحریک آزادی میں اپنے خاندان اور چاروں لائق فرزندوں کے ساتھ حصہ لیا۔ پنجاب کی تمام انقلابی فوجیں آپ کے زیر کمان تھیں۔ آپ کے بڑے فرزند حضرت مولانا سیف الرحمٰن مرحوم نے لدھیانہ جیل توڑ کر سیاسی قیدیوں کو رہائی دلائی اور آپ کے حکم سے شہر پر قومی پرچم لہرا دیا گیا۔ پنجاب کی افواج اور مجاہدین کو لے کر آپ دلّی تشریف لے گئے اور دہلی کے مجاہدین وقومی افواج کے ساتھ شامل ہو کر آپ نے برطانوی سامراج کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔

قومی افواج کی شکست اور بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد موضع ستلانہ ریاست پٹیالہ کے جنگلوں میں کئی برس تک روپوش رہے، کیونکہ آپ اور آپ کے خاندان کے ہر فرد کو گرفتار کرنے کے لئے بھاری انعامات رکھے گئے تھے۔

ستلانہ کے باشندوں نے اس مرد مجاہد کی اس طرح حفاظت کی کہ زبردست تلاش کے باوجود انگریزی پولیس اور فوج آپ کا پتہ نہ لگا سکی۔

آپ کی ذات مقدسہ مرجع خلائق تھی۔ امیر وغریب، شاہ وگدا عقیدت مندوں اور حلقۂ اثر میں شامل تھے۔

احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ شجاع الملک اور شاہ زمان انگریزی سیاست کا شکار ہو کر لدھیانہ آئے اور خاندان سمیت ان کو نظر بند کر دیا گیا تو ان دونوں بھائیوں نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی اور کئی روز تک خانقاہ میں رہے حضرت کے ہاں سے جو کچھ کھانے کے لئے ملا، افغانستان کا حکمراں اسے خوشی اور عقیدت سے کھاتا رہا۔

شاہ زماں آپ کی مسجد میں پانچ وقت نماز پڑھنے آتا رہا، اور چالیسؔ روز تک حضرت کے حکم سے مسجد میں اذان دی۔ شاہ زماں کے لئے شاہی خدمت گزاروں نے قالین بچھا دی تو حضرت شاہ صاحب نے شاہ زماں سے مخاطب ہو کر فرمایا یہاں فقیر اور بادشاہ میں کوئی امتیاز نہیں۔ شاہ زماں پر آپ کے ارشاد کا اثر ہوا تو وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھنے لگا اور آپ کے درس قرآن اور حدیث میں شریک ہوتا۔

اس شاہی خاندان میں سے حضرت شاہ صاحب نے تمام غیر اسلامی رسوم کو اپنے فیض روحانی سے بند کرا دیا اور پورے خاندان کو دین کی طرف متوجہ کیا۔

والئی افغانستانؒ

امیر دوست محمد خاں کو ۱۸۴۰ء میں انگریزی افواج نے گرفتار کیا۔ اور شاہ شجاع نے تخت کابل پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ افغانستان کے اس حکمران کو بھی لدھیانہ میں نظر بند کیا گیا۔ امام العارفین حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب معلوم ہوا تو آپ نے اپنے معتقدین کو بلا کر اس بادشاہ کی خدمت کا حکم فرمایا۔

امیر دوست محمد خاں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے مصائب اور تکالیف کو بیان کر کے بے اختیار رونے لگا۔ آپ نے اسے تسلی دی اور فرمایا کہ شاہ شجاع زیادہ دن حکومت نہ کر سکے گا اور قتل کر دیا جائے گا۔ اور تم دوبارہ افغانستان کے بادشاہ بنو گے۔ امام العارفین حضرت شاہ عبد القادر قدس سرہٗ کا یہ کشفِ صریح سن کر امیر دوست محمد خاں کو تسکین تو ہوئی مگر یقین نہ آیا۔ لدھیانہ سے حکومت نے والئ افغانستان کو کلکتہ لے جا کر نظر بند کر دیا۔

پورے ایک برس بعد امیر دوست محمد خاں کے لڑکے اکبر خاں نے انگریزی افواج کو شکست دی اور شاہ شجاع کو قتل کر دیا اور برطانوی حکومت اس انقلاب کے بعد امیر دوست محمد خاں کو افغانستان کا فرماں روا تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئی۔

افغانستان کو واپس جاتے ہوئے امیر دوست محمد خاں ایک سال پہلے جو قیدی تھا۔ ایک ملک کے حکمران کی حیثیت سے امام العافین حضرت شاہ عبد القادر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی درخواست کر رہا تھا۔ آپ کے دست حق پرست پر بیعت ہونے کے بعد اس نے عرض کیا کہ آپ مرے ساتھ افغانستان تشریف لے چلیں امام العارفین حضرت شاہ عبد القادر صاحب قدس سرہٗ نے اس کی دوخواست نہ مانی اور انکار کر دیا۔ نیز امیر دوست محمد خاں کو مخاطب کر کے فرمایا:

> ”فقیر اور بادشاہ کے درمیان کوئی رشتہ قائم نہیں رہ سکتا۔ تیرے ساتھ جانے سے دنیا کا بے شک فائدہ ہے لیکن دین کا سراسر نقصان۔ تم خلاف شرع حکم کرو گے اور میں اس امر سے روکوں گا! جس سے تم آزردہ ہو گے۔ اور اگر نہ روکا، تمہارا لحاظ کیا تو میں گنہ گار ہوں گا“

حضرت شاہ صاحب مسائل شرعیہ کے بیان کرنے میں امیر و غریب کو برابر خیال کرتے۔ اور دین کے بارے میں کسی کی بھی رعایت نہ فرماتے تھے۔ آپ کے فیضِ روحانی سے لاکھوں انسانوں کو راہِ ہدایت ملی اور دین کو فروغ ہوا۔

امام العارفین حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب کے چار لائق فرزند تھے جن پر اپنے والد کا علمی اور روحانی رنگ پوری طرح چڑھا ہوا تھا اور اپنے عہد کے مجاہدین آزادی، مشاہیر اساتذہ علم، اصحاب طریقت و سلوک میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے والد بزرگوار کی وراثت میں علم، حق گوئی، بہادری، ذہانت، فکر و تدبر اور خودداری کو پایا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں ان حضرات کے علمی، سیاسی اور مذہبی کارنامے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی اس طرح پر ہیں:

۱۔ حضرت مولانا شاہ سیف الرحمٰن صاحب

بڑے صاحبزادے ہیں۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت سے ٹکرلی اور لدھیانہ کا جیل خانہ توڑ کر مجاہدین کو قید سے رہا کرایا۔ شہر میں قومی پرچم لہرا کر متوازی حکومت قائم کر دی۔ قومی حکومت کی شکست کے بعد آپ دہلی سے کابل ہجرت کر گئے۔

۲۔ امام العصر حضرت شاہ محمد صاحب قدس سرہٗ

دوسرے فرزند ہیں۔ آزادیِ وطن کے لئے آپ جنگ میں شریک رہے شکست کے بعد تحریک آزادی کو منظم طریقے سے چلانے کے لئے بہار کے صدر مقام پٹنہ میں قیام فرما کر بہار، یوپی اور پنجاب کے مجاہدین کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔

انڈین نیشنل کانگریس

۱۸۸۸ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی مخالفت ہو رہی تھی اور مذہب کے نام پر ہندو، مُسلمانوں کو اس مشترک جماعت کے خلاف ابھارا جارہا تھا اور اس کے خلاف فتوے شائع کئے گئے تھے۔ آپ نے اس وقت انڈین نیشنل کانگرس میں شرکت کی حمایت کی اور فتویٰ دیا۔ اس فتویٰ کے بارے میں عجیب بات یہ ہے کہ فتویٰ لینے کے لئے ایک شخص مسمیٰ علی محمد، متوطن بمبئی کانگرس کی طرف سے ملک کے مختلف شہروں اور مذہبی مراکز میں گیا۔ لیکن پورے ملک میں اس مسئلہ پر فتویٰ نہ مل سکا کیونکہ انگریزی حکومت کے مظالم سے اونچے درجے کے عُلماء بھی خوف زدہ تھے۔ اس وقت کانگرس کی حمایت اور نگریزی حکومت کی مخالفت اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھی لیکن یہ مسئلہ جب رئیس الاحرار کے دادا حضرت شاہ محمد صاحب کی خدمت میں پیش ہوا تو انہوں نے پوری جرأت اور بہادری اور علمی دلائل کے ساتھ اس مسئلہ پر فتویٰ دیا اور جس کو " نصرۃ الابرار " کے نام سے شائع کر کے پورے ملک میں تقسیم کیا گیا جس کا مسلم برادریوں اور خاندانوں نے اثر قبول کیا، کانگرس کو تقویت ملی، انگریزی سامراج کو اس فتوے سے پورے ملک میں سخت نقصان ہوا۔ بعد میں اس فتویٰ کی تصدیق ملک کے ہر حصے اور دینی مرکز سے ہونے لگی۔ چنانچہ پانچ صدؔ عُلماء نے اس اہم فتویٰ کی تصدیق کی۔ یہ فتویٰ کانگرس کی تحریک میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور ملک کے مایۂ ناز مورخین نے اس کو اپنی کتابوں میں جلی عنوان سے درج کیا ہے۔

جمہوریۂ ہند کے پہلے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب کا مستقبل اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "نقشِ حیات " کے صفحہ ۷۱ پر اس فتویٰ کو خاص اہمیت دی ہے اور اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

مشہور مورخ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب سابق ناظم جمعیۃ عُلماء ہند نے اپنی کتاب عُلماء حق کے صفحہ ۱۰۲ پر پوری تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی ہندوستان کے مذہبی سٹیج پر ایک مبلغ اسلام اور مناظرِ دین کی نقاب اوڑھ کر ۱۳۱۰ ہجری میں نمودار ہوئے۔ سب سے پہلے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے دادا حضرت مولانا شاہ محمد صاحب اور ان کے دونوں بھائیوں مولانا عبد اللہ صاحب و حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب نے مرزا کے صحیح خدوخال کو پہچانا اور اس کی ظاہری شکل وصورت دیکھ کر تکفیر کا فتویٰ دیا۔ اس وقت اکثر عُلماء نے اس کی تکفیر کو تسلیم نہ کیا۔ لیکن بعد میں پورے ملک کے عُلماء کو عُلمائے لدھیانہ کے اس فتویٰ کو ماننا پڑا اور تصدیق کرنی پڑی۔ اس طرح عالم اسلام کے مسلمانوں کی عُلمائے لدھیانہ نے ہر نازک مقام پر رہنمائی کی اور حق کے متلاشی کو ان ہی کے حلقوں میں صراطِ مستقیم ملی۔

حضرت شاہ محمد صاحب نے بہت سی کتابیں اور رسالے فرقہ ہائے باطلہ کی تردید میں لکھے اور شائع کئے جن کی تعداد پچیس۲۵، تیس کے قریب ہے۔ ان کی مشہور کتابیں: فتاویٰ قادریہ، نصرۃ الابرار، السالکین، تقدیس الرحمٰن عن الکذب کالنقصان، انتظام المساجد، دلیل القوی وغیرہ ہیں۔

۳۔ مولانا شاہ محمد عبد الہ قدس اللہ سرّہ: آپ کے تیسرے فرزند حضرت مولانا شاہ محمد عبد اللہ صاحب قدس سرہٗ حضرت مولانا مُفتی محمد نعیم صاحب مدظلہٗ کے والد ماجد ہیں۔ آپ کی ہمّت مردانہ سے فرقہ ہائے باطلہ خصوصاً نیچری اور قادیانی ازحد خوف زدہ تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ میں آپ نے حصہ لیا۔ بڑے درجے کے عالم اور فقیہہ تھے۔ اونچے درجے کے اولیاء میں سے تھے۔ ہزاروں لوگ آپ سے بیعت تھے۔ آپ کا انتقال سہارن پور میں ہوا، وہیں مزار شریف ہے۔

۴۔ مولانا عبدالعزیز صاحب قدس سرّہ: آپ کے چوتھے صاحبزادے حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ ہیں۔ آپ بڑے پایہ کے خطیب اور واعظ تھے۔ مسائل دینیّہ کے بیان کرنے میں اپنے والد بزرگوار کی طرح کسی کی رعایت نہیں فرماتے تھے۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ آپ سے بیعت تھے۔ رشد وہدایت کا سلسلہ آپ کی خانقاہ میں جاری تھا۔ ۶۲ سال کی عُمر پائی، چالیس۴۰ برس کی عُمر میں قرآن

عزیز کا ترجمہ بیان فرمایا۔ ان کی چھوٹی صاحب زادی مسمّاۃ شفاعت بی بی کے ساتھ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کا نکاح ہوا۔ رئیس الاحرار کو آزادیٔ ہند کی تحریک میں جن مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا، ان میں رئیس الاحرار کی اہلیہ نے ان کا پورا ساتھ دیا اور کبھی اس کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ رئیس الاحرار کے جیل جانے کے بعد آنے والے کسی لیڈر یا ورکر کو ان کی عدم موجودگی محسوس نہ ہونے دی کیونکہ وہ ایک بڑے باپ کی بڑی بیٹی تھیں اور ان کی رگوں میں وہ خون تھا جس نے ایک زمانے تک ملک کی بھلائی اور آزادی کے لئے قربانیاں دی تھیں۔

مسٹر ساورکر، پنڈت سُندرلال، خورشید مصطفیٰ صاحب رضوی، مسٹر خلیق نظامی، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا سید محمد میاں صاحب نے اپنی تاریخی تصانیف میں عُلمائے لدھیانہ کی ان تمام انقلابی، مذہبی اور علمی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا عزیز الرحمٰن جامعی نے کتاب رئیس الاحرار میں تفصیل کے ساتھ ان واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔

رئیس لااحرا امولانا حبیب الرحمٰن کا خاندان ملک کا ممتاز علمی، مذہبی، سیاسی اور مجاہدین کا ایک مشہور خاندان ہے۔ اس خاندان کا اثر و رسوخ ملک گیر رہا ہے۔ ملک بھر میں اس علمی گھرانے کو عزت، وقعت اور مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور ان کے کلمات ہدایت کو دل کے کانوں سے سنا گیا۔ یہ اثر پبلک سے گزر کر درباروں تک بھی پہنچا اور سلاطین وقت نے بھی اس خاندان کے بزرگوں کے سامنے سر عقیدت خم کیا۔

اس خاندان کے بزرگوں نے ہر زمانے میں وقت کی نبض کو پہچانا اور وقت کے تقاضوں کے مطابق زبردست خدمات انجام دیں۔ ناساز گار حالات میں بھی ثابت قدمی سے عقیدے اور خیال پر قائم رہے اور الحمدللہ خاندان کے اخلاف نے اسلاف کے نقش قدم کو نہیں چھوڑا اور اس کے افراد آج بھی ملکی ملی خدمات میں پوری لگن اور اخلاص کے ساتھ مصروف کار ہیں۔

قیادت

ملک میں جب سیاسی بیداری کی روشنی پھیلی، مختلف فرقوں و جماعتوں نے برطانوی سامراج کے خلاف اعلیٰ پیمانے پر منصوبے بنائے اور منظم طریقے سے تحریکیں چلائیں۔

اس وقت مجاہدینِ آزادی کی قیادت جن بہادر اور جری رہنماؤں نے کی رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا نام ان میں سرفہرست ہے۔ آپ موجودہ دور کی اُن عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے جن سے جدوجہد آزادی کی نمایاں اور شان دار روایات وابستہ ہیں۔ سحر بیان مقرر تھے آپ کی تقریر سے مخالف صفوں میں انتشار پھیل جاتا۔ چھوٹے چھوٹے فقروں میں گہرائی کی باتیں فرماتے۔ جو بولتے ناپ تول کر بولتے، شرعی احکامات کو واضح طور پر بیان فرماتے۔

آپ کی عظیم شخصیت، علم و فہم، فکر و عمل سے متاثر ہو کر مولانا "محمد علی جوہر" نے فرمایا کہ:

> "مولانا حبیب الرحمٰن کو دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یاد آجاتے ہیں۔" آپ کی شخصیت، خلوص، ایثار، جرأت، شجاعت اور حق گوئی و بے باکی کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔

مجسمۂ اخلاق تھے جو پاس آیا ان کا ہو کر رہ گیا۔ قرآن اور حدیث پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ اسلام اور اس کی تعلیمات کو بیان کرنا آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ کی تبلیغ، کیریکٹر اور اخلاق سے متاثر ہو کر بہت سے اللہ کے بندے مشرف بااسلام ہوئے اور سینکڑوں گمراہ انسانوں نے آپ کی صُحبت اٹھا کر راہ ہدایت پائی۔ امت مسلمہ کو جس قدر فیض آپ کی ذات سے پہنچا، کسی دوسرے کو یہ بات نصیب نہ ہوئی۔

ملک کے مسلمہ لیڈر تھے۔ عُلماء اور سیاست دانوں میں آپ کو عزت و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور آپ کی رائے کو قابل عمل سمجھا جاتا۔

رفقاء اور ساتھیوں کے وفادار اور اسی وفاداری کے نتیجے میں بہت سارے نقصانات اٹھائے لیکن دوستوں اور رفیقوں کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اپنے لئے اگر الگ راہ پیدا کرتے، اور کر سکتے تھے تو مذہبی اور سیاسی میدان میں بہت آگے نکل جاتے۔ دوست اور رفیق ان کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکتے۔

مجلس احرار اسلام کی صدارت

برسوں مجلس احرارِ اسلام، ہند کے صدر رہے، جو ملک میں مقبول ترین جماعت تھی۔ آپ کی رہنمائی میں مجلس احرار کے کارکن جرأت اور بہادری کے ساتھ ملکی اور ملی فتنوں کے مقابلے میں سینہ سپر اور سر بکف ہوتے رہے۔ ملک و ملت کے لئے جس قدر قربانیاں احرار نے کیں تاریخ کے اوراق ان سے بھرپور ہیں۔

تحریک احرار میں ہر مکتب خیال کے رہنماؤں کا اجتماع اور اس تحریک میں دین و سیاست کا امتزاج، عوام سے تعلق، احرار کے رہنماؤں کا جذبہ حریت اور جہاد اور انگریز دشمنی، احرار کارکنوں و رہنماؤں کی جرأت و ہمت، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کی قیادت اور رہنمائی کا نتیجہ تھی۔

ملک کی آزادی میں احرار کا بڑا حصہ ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ انگریز، تحریک احرار کے خوف سے ملک چھوڑ گیا تو شاید غلط نہ ہوگا۔ افسوس ہے کہ احرار کی صحیح تاریخ اب تک کسی صاحب نے مرتب نہ کی جس کی اشد ضرورت ہے تاکہ آنے والی نسلوں کے لئے مجاہدین احرار کے عظیم کارنامے مشعل راہ ہوں۔

۱۹۴۰ء کی نظر بندی کے بعد احرار کو مولانا حبیب الرحمٰن کی رہنمائی حاصل نہ رہی اور جماعت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مجاہدین کی اس جماعت میں کچھ ایسے لوگ شامل ہوئے جنہوں نے جماعت کے کاز کو نقصان پہنچایا اور اپنی اغراض کے حصول کے لئے جماعت کے وقار، کارکردگی اور تنظیم کو دفن کر دیا۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کی طویل نظر بندی اور ضیغمِ احرار[1] چودھری افضل حق کی وفات سے احرار اپنے مقاصد عظیم میں کامیاب نہ ہو سکے جس سے اسلام، ملک اور قوم کو زبردست نقصان ہوا اور مجاہدین احرار بیش بہا قربانیوں کے باوجود کوئی مقام حاصل نہ کر سکے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

میدانِ عمل

۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم ترکوں پر انگریزی سامراج ہندوستانی افواج لے کر مظالم ڈھا رہا تھا۔ یہ خبریں پڑھ کر رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن خاموش نہ رہ سکے۔ ان کے دل و دماغ میں برطانوی حکومت کے خلاف نفرت، بغاوت اور انقلاب برپا کرنے کے جذبات بھڑک گئے اور یہ وہ زمانہ تھا کہ انگریزی تسلط پوری طرح ملک پر قائم ہو چکا تھا۔ کسی میں جرأت نہ تھی کہ انگریزی سامراج کے خلاف عَلَم جہاد بلند کرے۔ ایسے حالات میں رئیس الاحرار میدان میں اترے اور شہر کے ایک بڑے جلسہ کو خطاب کیا۔ برطانوی حکومت کے خلاف مدلل اور جذبات انگیز تقریر فرمائی۔ آپ کی تقریر سے انگریز سامراج کے خلاف عوام کے جذبات بھڑک گئے اور پورے شہر میں ہیجان پیدا ہو گیا۔

انگریز دشمنی کا یہ جذبہ آپ کو ورثے میں ملا تھا۔ صفحۂ ہستی پر مغربی عیسائی لٹیروں کو آپ اسلام اور مسلمانوں کا حقیقی دشمن تصور فرماتے تھے۔ ہندوستان، مشرقِ وسطیٰ، افریقہ اور ایشیا میں جو حالات پیدا ہوئے ان سازشوں اور تباہیوں کی ذمہ داری آپ کے نزدیک یورپین اقوام پر تھی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہمیشہ مغربی اقوام نے ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور افریقی ممالک کو لوٹا۔ اور خاص طور پر مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا۔ موجودہ اسرائیل اور عرب ممالک کی جنگ نے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے اس خیال کی تائید کر دی ہے مشرق وسطیٰ ہی نہیں بلکہ اسرائیل کی جنگ جویانہ کارروائی سے جس کی پشت پناہی پوری یورپین اقوام کر رہی ہیں ایشیا کی موجودہ آزادی ایک بار پھر خطرے میں پڑ گئی ہے۔

---

[1] شیرِ احرار

۱۸۵۷ء کی جدوجہدِ آزادی کے بعد انگریزی سامراج کے خلاف یہ پہلا جلسہ تھا۔ جس میں کھل کر برطانوی حکومت کے خلاف رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن نے عوام کے جذبات کو برانگیختہ کیا اور نوجوانوں کی ایک تنظیم قائم کی۔ رئیس الاحرار کے والد حضرت مولانا زکریا صاحب ؒ کے پاس ان کے ایک دوست آئے جو کہ جلسے میں شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ آپ کے صاحبزادے "حبیب الرحمٰن پر دادا اور پر دادا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر شوق شہادت سوار ہے۔ صاحبزادے کی جرأت، بے خوفی، بے باکی اور بہادری کا نتیجہ پھانسی سے کم نہ ہوگا، اس لیے آپ انھیں روکئے۔ حالات ایسے نہیں کہ اتنی تیزی سے حکومت برطانیہ کی مخالفت کی جائے۔

اس واقعے کے بعد آپ حضرت شیخ الہند ؒ کی رہنمائی میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور انقلاب برپا کرنے والے مجاہدین کی انقلابی تنظیم کے رکن بن گئے۔

قید و بند

۱۹۲۱ء کی تحریکِ آزادی میں آپ کو پہلی مرتبہ گرفتار کرلیا گیا اور پورے دو سال جیل خانہ میں بند رہنا پڑا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک بارہا آپ کو انگریزی سامراج نے گرفتار کیا۔ ملک و ملّت کے لئے ہر محاذ پر آپ کو بطور قائد اور رہنما کے ملک گیر جماعتوں اور اصحاب رائے لوگوں نے مانا۔ تقریباً پندرہ برس جو آپ کی جوانی کا بہترین زمانہ تھا، ملک، قوم اور اسلام کے لئے آپ نے انگریزی سامراج کی قید میں گزار دیا۔ آخری مرتبہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں آپ کو لاہور سے گرفتار کیا گیا اور ۴ جولائی ۱۹۴۵ء کو ویول کانفرنس کے موقع پر آپ کو بات چیت کے لئے غیر مشروط طور پر رہا کیا گیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں انگریز، ملک کو دو ٹکڑے کر کے یہاں سے رخصت ہوا۔ تقسیم ملک کے بھیانک اعلان کے ساتھ ہی ہندوستانی اقوام آپس میں لڑنے، جھگڑنے لگیں اور حالات ایسے خراب ہوئے کہ مجاہد جلیل، رئیس احرار مولانا حبیب الرحمٰن جیسے قائد، وطن پرور اور ملک کے بہی خواہ کو بھی اپنے وطن سے بے وطن ہونا پڑا اور آپ کو تمام خاندان سمیت دہلی کوچہ رحمان میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

ملک کے بگڑے ہوئے حالات میں بھی رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن نے جو ہندوستان کی خدمت کی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ دہلی کوچہ رحمان میں ان کا گھر ایک یونیورسٹی تھا۔ ایک مکتب خیال تھا، جہاں ہندو، مسلمان، سکھ شرنارتھی۔ کمیونسٹ سوشلسٹ۔ کانگرسی، ملحد و مومن سبھی آتے تھے اور آپ کے منجھلے دھلے افکار سے استفادہ کرتے۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن ہندوستان کی عظیم شخصیت تھے کہ ان کے ماننے والے کمیونسٹوں میں بھی تھے، جن سنگھ، ہندو مہاسبھا میں بھی تھے۔ الجمعیۃ، نئی دنیا، پرتاپ اور ملاپ کے دفتروں میں بھی وہ بجائے خود ایک انجمن و آنادہ گاہ تھے۔ ان کی شخصیت کی نئے ہندوستان کو بہت ضرورت تھی۔ ان بزرگوں میں سے تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ ملک و ملت کی خدمات میں صرف کیا۔ ایسے لوگوں کا وجود ملّت کا بہت ہی قیمتی سرمایہ تھا جو مذہبیت اور دینداری کے ساتھ ملکی اور قومی خدمت، ایثار و قربانی کی تاریخ بھی شاندار رکھتے ہوں۔

انتقال

۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کی صبح کو تحریکِ آزادی کے یہ بے باک اور نڈر رہنما حرکت قلب بند ہونے سے اچانک انتقال فرما گیا اور اس طرح جنگ آزادی کا علم بردار، میدانِ سیاست کا مرد جرّار، اخلاق و خصائل کا مخلص، مجلسِ علم و ادب کا صدر نشین ہم سے اچانک رخصت ہو گیا۔ اِنا اللہ وَاِنا الیہ راجعون۔ ان کا قلب اللہ تعالیٰ کی محبّت میں مستغرق اور اس کی ملاقات کے لئے بے چین تھا۔ وہ اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ایک تھے۔ حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری ؒ کی روحانی نسبت اور خلافت انھیں حاصل تھی۔ اپنے انتقال سے ایک ماہ قبل دوست، احباب اور لڑکے، لڑکیوں کو جمع کیا اور جہانِ فانی سے رخصت کی خبر دی۔ ہر قسم کے کام کار سے کنارہ کشی اختیار فرمالی۔ دن رات اللہ کی یاد میں مشغول ہوئے۔ اس زمانے میں بارہا عشق الٰہی میں یہ شعر پڑھتے ہوئے آپ کو سنا گیا۔

عشق ہمارے دھیان پڑا ہے، چین گیا آرام گیا
اب جی کا جانا ٹھہرا ہے، وہ صبح گیا کہ شام گیا

انتقال کے بعد آپ کے جسم پر موت کے اثرات نہ تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سوتے ہوئے کوئی حسین خواب دیکھتے ہوں۔ ان کے اٹھ جانے سے ملک وملت کو نقصان ہوا۔ برصغیر پاک وہند کے تمام سیاسی اور مذہبی حلقوں میں غم واندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی، اخبارات نے جلی عنوان اور سیاہ حاشیوں سے اس اندوہناک خبر کو شائع کیا اور آپ کی عظیم شخصیت پر مقالات لکھے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مدت سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تبصرے

مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے انتقال پر اپ نے رنج وغم کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

مجاہد جلیل، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جہاد آزادی کے جلیل القدر سپاہ سالار تھے۔ مرحوم جوان تھے... کہ جنگِ آزادی کا بگل بجا اور وہ مردانہ وار میدانِ کارزار میں کود پڑے انتہائی مصائب، ناقابل بیان کڑیاں جھیلیں لیکن چتون کبھی میلی نہ ہونے پائی راہ حق میں بڑی بڑی منزلیں طے ہوگئیں، وہ منزلیں طے ہوگئیں جن سے اولیائ، شہدائ، صدیقین اور انبیاء کو گزرنا پڑا تھا۔ موسیٰ کو طور پر ایک جلوہ نظر آیا تھا، یوسف کو قیدِ خانہ میں تجلی ملی تھی، یعقوب کو آنسوؤں میں ڈوبنا پڑا تھا، ایوب نے دردِ الم کی تلخیاں چکھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم دیکھو کہ لدھیانہ کے ایک نحیف وزار بندے کو راہ حق میں یہ سارے درجے مل گئے۔ عزمِ موسیٰ ملا، جزم یوسف ملا، نالۂ یعقوب ملا اور صبر ایوب سے شاد کام ہوا۔

حبیب الرحمٰن عزم صمیم کا ایک پہاڑ تھا جو ڈھے گیا۔ جرأت، ہمّت کا آتش فشاں تھا، جو ٹھنڈا پڑ گیا، حق وصداقت کا ایک صور تھا جو ہمیشہ کے لئے چپ کر دیا گیا، لیکن وہ کون ہے جو کہہ سکے "مولانا حبیب الرحمٰن" مر گئے۔

حبیب الرحمٰن مرنے کے لئے پیدا ہی نہ ہوا تھا وہ تو جینے کے لئے پیدا ہوا تھا، رہتی دنیا تک جیتا رہے گا۔

حبیب الرحمٰن کا جسم تو بے شک لاغر تھا، مگر لاغر وناتواں جسم میں وہ روح تھی جو باطل قوتوں کے مقابلہ میں پہاڑ سے بڑھ کر اٹل اور باڑھ دار تلواروں سے زیادہ کاٹ والی، عجیب اسلامی جوش تھا۔ حیرت انگیز اسلامی جذبہ تھا۔ راہ حق میں زبان سے شعلے برستے تھے اور خطابت اس پر نثار ہوتی تھی۔

جلیل القدر عظیم انسان ہونے پر بھی فروتنی، خاکساری کا مجسمہ تھا۔ ایسا شخص تھا کہ جو اپنے عظیم رتبہ سے بے خبر، اللہ کی رحمتیں ہوں۔ حبیب الرحمٰن سچ مچ مرد مسلمان تھا، غریبوں کے آگے بچھا ہوا، مگر باطل کا ٹھکرانے والا۔

رسالہ الحرم میں مولانا مُفتی زین العابدین نے ان الفاظ میں تذکرہ کیا:

> مولانا حبیب الرحمٰن اپنے اوصاف وکمال میں ایک گلدستۂ صد گل اور ایک گل صد رنگ تھے۔ سیاست دانوں کے مجمع میں وہ سیاسی تھے ادباء کی محفل میں ادیب، صوفیا کی صحبت میں صوفی۔ ہر شخص سے اس کے موضوع پر بات کرتے، بے حد ذہین تھے۔ مخاطب کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کے صفحۂ دل کی تحریر پڑھ لیتے گفتگو ٹھکی ہوئی اور مدلّل کرتے تھے۔

مختصر لفظوں میں اپنا مضمون سننے والے کے دل میں پیوست کر دیتے تھے۔

امیرِ شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجاہد جلیل کی وفات کی خبر سنی تو دیر تک خاموشی میں ڈوبے رہے اور آہ بھر کر فرمایا

"ایک اچھے رفیق، مونس، غم خوار، سراپا ایثار کی جدائی نے میرے سینے میں ایک گہرا زخم کر دیا۔ مولانا کی وفات ملک و ملت کے لئے اس صدی کا سب سے عظیم سانحہ ہے۔"

ملک کے مشہور اخبار نویس شری رنبیر نے اپنے تاثرات کا "ملاپ" اخبار میں اس طرح تذکرہ کیا:

"جہانِ فانی سے جانا سب کو ہے، لیکن جب ملک کا خدمت گار جاتا ہے تو لاکھوں آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں، ہزاروں دل چلّا اٹھتے ہیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایسے ہی سجن تھے۔ انھوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے وقت اپنے سامنے رکھا تھا کہ وطن آزاد ہونا چاہئے ہندوستانیوں کو ایک متحد قوم بن کر آگے بڑھنا چاہیے۔ اس کے لئے وہ جیون بھر لڑتے رہے، جدوجہد کرتے رہے۔ اسلامی شرع اور مذہب کے بڑے وِدوان تھے۔ اگر وہ چاہتے تو انگریز کا ساتھ دے کر بڑی بڑی جاگیریں حاصل کر سکتے تھے، لیکن ایسا کرنے کی بجائے انھوں نے حریت پسند طاقتوں کا ساتھ دیا۔ بار بار کی نظر بندیوں اور قید کو لبیک کہا۔ اُن کے اُٹھ جانے سے ملک کو نقصان ہوا، پنجاب کو نقصان ہوا، مجھے ذاتی بھی نقصان ہوا

"وہ ہے نہیں، اس خیال سے دکھ ہوتا ہے"

اخبار "پیام وطن" کے ایڈیٹر، ملک کے مایہ ناز صحافی محترم مولانا عبد الباقی صاحب نے ایک تاریخی اداریہ سپرد قلم کیا، جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا انتقال ہو گیا اور وہ کتاب زندگی ختم ہوئی جو ۶۴ برسوں تک جہدِ مسلسل اور عزم مستقیم کی ضخیم کتاب تھی۔ کل جب آپ کا انتقال ہوا، نماز فجر کے بعد دفعۃً طبیعت بگڑی۔ سیاسی اور مذہبی انجمنوں کا دھڑکتا ہوا دل یکایک خاموش ہو گیا۔

سیاست میں وہ امام کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن تبلیغ دین کا جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا وہ بالکل اچھوتا اور نرالا تھا۔ تبلیغ دین سے زندگی کی آخری ساعت تک انہیں غیر معمولی دل چسپی رہی۔ دینی، تاریخی اور مذہبی مسائل پر انہیں پورا عبور تھا۔

مولانا محمد علی صاحب ناظم ختم نبوت نے آپ کی وفات پر تعزیتی پیغام بھیجا۔

مولانا حبیب الرحمٰن خلوص، ایثار، جرأت و شجاعت کا پیکر تھے۔ آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر نہیں کیا جا سکتا۔

مُفتی عتیق الرحمٰن عُثمانی نے ان الفاظ کے ساتھ آپ کی وفات پر تعزیت کی:

"ملک کو آزاد کرانے کی سعی و جدوجہد میں جن ہستیوں نے جان کی بازی لگائی تھی ان میں رئیس الاحرار ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ وطن کے اس جانباز کی جوانی کا بہترین حصہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے میں گزرا۔ جنگِ آزادی کا کوئی قابل ذکر محاذ ایسا نہ تھا جس میں مولانا مرحوم پیش پیش نہ رہے ہوں۔"

مجاہد ملت، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، ناظم جمعیۃ عُلمائے ہند نے ان الفاظ کے ساتھ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کا ذکر کیا ہے۔

"رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اپنے سیاسی شعور، جوشِ عمل اولوالعزمی اور جدوجہد کے امتیاز سے ہمیشہ نمایاں رہے۔ تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور اس راہ میں بارہا قید کی شدید صعوبتیں برداشت کیں۔"

پاکستان کے مشہور صحافی شورش کاشمیری نے رئیس الاحرار کا قلمی چہرہ لکھا، جس کے چند اقتباسات اس طرح ہیں:

مولانا حبیب الرحمٰن راقم کے نزدیک اس دور میں اسلام کے واضح تصور کا صحیح فکری مظہر تھے۔ عُلماء کی صف میں جو

شخص راقم کے خیال میں جدید وقدیم تصورات کے درمیان سنگم بن سکتا تھا وہ مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی تھے۔
راقم نے بارہا دیکھا کہ ان میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کا جوہر فطری استعداد کے طور پر موجود ہے۔ وہ معاملہ کی تہ کو پالیتے اور گفتگو اور چہرے سے معلوم کرلیتے کہ اس کا پس منظر کیا ہے۔ پھر ہلکے پھلکے الفاظ میں تجزیہ کر کے سمجھاتے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی بڑی باتیں ادا کر جاتے۔ وقار ومتانت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے سنجیدگی آپ کے کلام کا زیور اور بہادری آپ کے دامانِ کردار کی سنہری جھالر۔

مولانا میں ذاتی محاسن بے شمار تھے۔ وہ جماعت کے لئے اپنی ذات اور اس کی ہر بلندی کو تیاگ (یعنی چھوڑ) دینے کے قائل تھے۔ ان کی زندگی میں بیشمار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے اپنی جماعت کے لئے بڑے بڑے ایثار کو گوارا کر لیا۔ دوستوں کے دوست ہی نہیں بلکہ ان پر جی جان سے نچھاور بھی ہوتے۔ آپ میں تنظیمی صلاحیت بے پناہ تھی۔

سالہا سال مجلس احرار کے صدر رہے اور نہایت طنطنے سے کام کیا اور جب صدر تھے تو بول چال کے تیور بھی صدارتی تھے۔ صدر نہیں رہے تو صدر کے نقش قدم پر چلتے' آپ کی فطری خوبی تھی کہ آپ تابع رکھ بھی سکتے تھے اور رہ بھی سکتے تھے۔ مولانا شروع میں احرار کا دل سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں ان کو دماغ بھی کہا جاتا تھا۔

پنجاب کے مشہور صحافی، غلام رسول مہر نے اپنے جذبات کا اس طرح اظہار فرمایا:

''دہلی کی طرف میری کشش باقی نہ رہ گئی۔ کیونکہ وہاں سے تعلق اور اہم رشتہ مولانا حبیب الرحمٰن کے ساتھ تھا۔ یہ رشتہ بھی میری صدہا امیدوں کی طرح ٹوٹ گیا۔ اور وہ محبوب و جوداب ایسی جگہ پہنچ گیا، جہاں پہنچنے کے لیے موت کے دروازے سے گزرے بغیر چارہ نہیں۔

میں نے ان کے انتقال کی خبر اخبارات میں پڑھی۔ پڑھ تو لی لیکن منٹوں تک اس کی صحت پر یقین نہ آیا۔ مرحوم کی وجہ سے دوستوں کی ایک بہت بڑی دنیا آپ کے گردوپیش پھر رہی تھی۔ وہ انسانیت اور اسلامیات کے اعلیٰ خصائص کا ایک روشن چراغ تھے کہ جہاں بیٹھ جاتے تھے محفل روشن ہو جاتی تھی، بہادر تھے، جوانمرد تھے۔

میرے سامنے ان کی زندگی میں ابتلاء کے بیسیوں مرحلے آئے کسی میں بھی ہراساں یا خوف زدہ یا پریشان نہ دیکھا۔ وہ میدانِ عمل کے شہسوار۔ خدا نے انہیں نازک سے نازک ماحول میں سچی بات سلیقے سے کہنے کی خاص صلاحیت عطا کی تھی۔ جو کچھ ان کی زبان پر جاری ہوتا تھا، خلوص اور صداقت کے باعث اس میں زندگی کی ایک روح خاص جلوہ گر رہتی تھی۔ ان کے سامنے ہمیشہ یقین کی روشنی رہی اور وہی روشنی ان کے تمام افکار واعمال کے لئے مشعلِ راہ تھی۔

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمد طیب صاحب مدظلہم نے ان الفاظ کے ساتھ رئیس الاحرار کے اوصاف بیان کئے ہیں۔

''مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ملک کے علمی گھرانے کے ایک لائق رکن تھے۔ ان کا خاندان ملک بھر کے لئے ہادی اور مربی دین رہا اور اس کے ساتھ ساتھ حریت اور آزادی کا پوری قوت اور ہمت سے علم بردار رہا۔ مولانا ممدوح اپنی خاندانی روایات کے مطابق ایک زکی عالم، مفکر اور راہنما تھے۔ معاملات میں گہرائی کے ساتھ سوچتے تھے۔ ملک کی آزادی میں ان کا زبردست حصہ تھا۔ ہر بنیادی مسئلہ میں ان کی ایک نکھری ہوئی رائے تھی، اس کے ساتھ ساتھ اسلامیات اور دینی معاملات میں نہایت پختہ تھے۔ دیانت وسیاست میں ان کے ہاں حدود تھے۔ ان حدود کے سختی سے پابند تھے۔ بااصول اور وضعدار شخصیت رکھتے تھے۔ ان کے ہر قول وعمل سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے قلب میں دین کا رسوخ کافی ہو چکا ہے۔ ان کی ہر بات خواہ وہ سیاسی رنگ ہی کی ہو دین کے جذبے سے خالی نہ ہوتی تھی۔''

مہاشہ کرشن ایڈیٹر اخبار پرتاپ نے ان الفاظ کے ساتھ اظہار افسوس کیا:

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی چل بسے، بتا نہیں سکتا کہ ان کی موت سے مجھے کس قدر صدمہ ہوا۔ وہ جتنے راسخ الاعتقاد مُسلمان تھے اتنے ہی سچے نیشنلسٹ۔ ہر سوال کو قوم پرستی کے زاویئے سے دیکھتے تھے۔ نہایت مؤثر پیکر تھے۔ ان کی تقریر سن کر لوگ جھوم اٹھتے تھے۔ آزمائش کے کئی موقع آئے، لیکن ان کے پائیہ ثبات میں لغزش نہ آئی، نہایت خوددار تھے، ان پر کڑے وقت آئے لیکن توکل بر خدا، انہوں نے کسی کے آگے ہاتھ نہ پسارا۔

جمہوریہ ہند کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے انتقال پر اپنے رنج وغم کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

مولانا حبیب الرحمٰن کی وفات سے ملک ہی کا نقصان نہیں ہوا، بلکہ میرا ذاتی نقصان بھی ہوا ہے۔ جدوجہد آزادی کے دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے۔ مولانا موصوف جس عقیدے پر یقین رکھتے تھے اور جس جرأت اور آہنی استقامت کے ساتھ اس پر قائم رہے اس کے سبب میں ان کا ہمیشہ مداح رہا اور احترام کرتا رہا۔ شمالی ہند میں جو المیہ رونما ہوا اور جس کی لپیٹ میں شدید طور پر آئے۔ مگر اس سے ان میں تلخی نہیں آئی۔ اور انہوں نے ہمّت نہ ہاری۔ وہ ہندو مسلمان، سکھ سب ہی کے محترم رہے۔ وہ ایک جواں مرد کی حیثیت سے ہماری آزادی کی تحریک میں یاد کئے جاتے رہیں گے۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ عُلماء ہند نے اپنے تعلق کا اظہار اور رئیس الاحرار کی عظیم شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات کا اس طرح سے اظہار فرمایا:

مجاہد جلیل، رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کو لدھیانوی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ لدھیانہ ان کا آبائی وطن تھا، جہاں ان کا جدی مکان بھی تھا اور خود ان کا بنایا ہوا مکان بھی، مگر جو سب کے لئے ہوتا ہے وہ سب کا ہوتا ہے، کسی خاص شہر کی طرف اس کی نسبت کسی تاریخی تقاضے کی بنا پر ہوتی ہے ورنہ ہر شہر اس کا اپنا شہر ہوتا ہے اور وہ آگے بڑھے تو کہنے لگتا ہے۔

ہر ملک ملکِ ماست، کہ ملکِ خدا ماست

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی شخصیت اسی طرح کی تھی مولانا حبیب الرحمٰن کا وطن اگرچہ لدھیانہ تھا۔ مگر ان کی بودوباش زمانہ طالب علمی میں درس گاہوں میں اور آخر میں دارالعلوم دیوبند میں رہی۔ مولانا کا طالب علمی کا دور ختم ہوا۔ تو وہ ملک وملت کے لئے اسٹیج پر نظر آتے تھے یا جیل خانہ میں بسیرا کرتے تھے۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن آسمانِ شہرت کے ماہتاب و آفتاب تھے اور احقر مولانا کو اس طرح دیکھا کرتا تھا جس طرح زمین کے بسنے والے چاند ستاروں کو دیکھا کرتے ہیں۔

ذہانت مولانا کا مخصوص وصف تھا جس نے آپ کو پوری جماعت میں سب سے ممتاز کر دیا تھا۔ ذہانت کے ساتھ فراست اور سیاسی بصیرت بھی ممتاز خصوصیت تھی اور کوئی بھی سمجھ دار شخص پہلی ہی مجلس میں مولانا کی ان خصوصیتوں سے متاثر ہو جاتا تھا۔

جس وصف نے مولانا کی ذہانت و بصیرت کو جوہری شان بخش دی تھی، وہ جرأت، دلیری اور بہادری تھی جو حاتم کی سخاوت کی طرح مولانا کے نام نامی کے ساتھ لازوال خصوصیت بن گئی ہے جس نے مولانا کی زندگی کو ہمیشہ مصائب کے شکنجے میں گرفتار کیا۔

اے روشنی طبع کہ تو کہ برمن بلا شدی

مولانا کے تصور کے ساتھ جس چیز کا تصور دماغ پر چھا جاتا ہے، وہ آپ کی فراخ دلی اور فراخ حوصلگی، مدارات اور تواضع ہے جو ہر اس شخص کے لئے عام ہوتی تھی جس کے متعلق وہم ہو جاتا تھا کہ وہ کسی حَیثیّت میں مولانا کا مہمان ہے۔ پھر یہ مدارات عام بھی تھیں۔

بریں خوان نعماچہ دشمن چہ دوست

حضرت مولانا کے ان اوصاف کی برکت یہ تھی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب مولانا نے دہلی میں قیام فرمایا تو یہاں ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں وہ ایسے ہی معروف تھے، جیسے کوئی مدت ہامدت سے دہلی میں رہتا ہو، پھر جب کچھ عرصے بعد وہ لدھیانہ تشریف لے گئے جس کے متعلق محض خارزار ہونے کا تصور نہیں تھا۔ بلکہ وہ مُسلمانوں کے لئے دہشت زار ہے۔ وہ لدھیانہ میں ایسے مقبول تھے جیسے تحریک کے اس دور میں جب مولانا لدھیانہ کے فرماں روا، مانے جاتے تھے۔ دو ماہ ہوئے نومبر کے دوسرے ہفتے میں احقر لدھیانہ گیا۔ جہاں مولانا کے فرزندانِ ارجمند مولانا محمد احمد رحمانی فاضل دیوبند علمی اور علمی طریقہ پر حضرت مولانا کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں تو مجھے محسوس ہوا کہ رئیس الاحرار حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن صاحب کی یاد اسی طرح تازہ ہے جس طرح ان کی زندگی میں تھی بلکہ مولانا کے صاحبزادگان کے پاس قیام کر کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کی وفات نہیں ہوئی بلکہ وہ زندہ جاوید ہیں۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شدبہ عشق

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا کے ان اخلاف کو بھی ایسی زندگی کی توفیق بخشے جو ہمیشہ فنا سے نا آشنا رہتی ہے۔

وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيز

اس مختصر مقالے میں ہم نے کوشش کی ہے کہ رئیس الاحرار کی زندگی کو روشناس کرایا جائے، لیکن مجاہد جلیل رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی مکمل حیات کو بیان نہیں کیا جاسکا۔ ان کی زندگی کے ایک پہلو کو "کتاب رئیس الاحرار" میں اس کے مصنف محترم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب جامعی نے بڑی جانفشانی کے ساتھ بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی اس عظیم خدمت کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

رئیس الاحرار کی زندگی کے حالات لکھ کر انہوں نے اسلامی اور ملکی تاریخ میں ایک بہترین اور ضروری باب کا اضافہ کیا ہے۔ مورخین کو ان کی اس کتاب سے بہت فائدہ ہوگا، اور آنے والے ہندوستان کے لوگ جدوجہد آزادی کی تصویر کو اس کتاب میں دیکھ سکیں گے۔ اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گزشتہ دور کی سیاسی مذہبی تاریخ کا پس منظر اور اس کی اچھی خاصی جھلک نظر آتی ہے لیکن ضرورت ہے کہ ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے کہ جس میں رئیس الاحرار حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن کی مذہبی زندگی کا صحیح عکس اور ملی خدمات کی تاریخ بیان کی گئی ہو۔ تاکہ سیاسی اور مذہبی دنیا کے لوگ ان کی زندگی کے ہر پہلو سے روشنی حاصل کر سکیں۔

مکتوبات

رئیس الاحرار حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن نے ملک وملت کے لئے مکتوبات کی شکل میں ایک علمی اور تاریخی سرمایہ چھوڑا ہے جس کو احقر ہی نے کتابی شکل میں مرتب کیا ہے۔ یہ مکتوبات زیر طبع ہیں۔ شائع ہونے پر مکتوبات کی ایک کتاب سیاسی، مذہبی اور علمی لوگوں کے لئے ایک اہم کتاب ثابت ہوگی اور بہت سے ایسے حقائق سے پردہ اٹھے گا جن سے ابھی تک لوگ ناواقف ہیں۔[1]

خاندان

رئیس الاحرار حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنے پیچھے مال و دولت، زروجواہر کے انبار نہیں چھوڑے۔ انہوں نے پوری زندگی ملک اور قوم کے لئے بلا کسی معاوضہ کے کام کیا۔ آزادی کے بعد بھی کسی چیز کے خواہش مند نہ تھے۔ آزادی ملنے کے ساتھ ہی اس مجاہد

[1] رحمانی صاحب کی یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔

آزادی کا گھر لُٹا۔ وطن چھوڑنا پڑا۔ ان کے عزیز ورشتہ دار اس المیہ کے نذر ہوگئے۔ لیکن انہوں نے یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ ملک میں جو کچھ ہوا، اُسے وہ انگریزی سامراج کی آخری ضرب سمجھتے تھے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ ملک میں اقوام آپس میں لڑنے جھگڑنے کی بجائے آزادی کی نعمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے متفق اور متحد ہو جائیں۔

ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کی بجائے لوک راج قائم ہو اور اس ملک کی باگ دوڑ غریب اور دیانت دار عوام کے ہاتھ میں ہو تاکہ لوگوں کو انصاف وعدل اور سکھ چین مل سکے۔

افسوس ایسا نہ ہو سکا ملک میں صوبائی، لسانی اور سینکڑوں قسم کے جھگڑے کھڑے ہوئے ہیں جن سے ملک کی عام جنتا (یعنی لوگ) کو نقصان ہوا اور وہ آزادی کا حقیقی لُطف اٹھانے سے محروم ہوگئی۔

عوم کی بجائے سرمایہ دار پیش پیش نظر آتے ہیں اور انہوں نے خرید وفروخت کا بازار تیز کر دیا۔ آج روٹی سے لے کر کرسی تک خریدی جاسکتی ہے، جو خواب آزادی کے مجاہدوں نے دیکھا تھا۔ ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ آج بھی ضرورت ہے قربانی ایثار اور جذبۂ خدمت کی تاکہ آزادی کا ہمارا یہ جہاز ساحل مراد تک پہنچ جائے۔[1]

بھائی

رئیس الاحرار حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن کے دو چھوٹے بھائی بقید حیات ہیں۔ حضرت مولانا یحیٰی صاحب۔ مولانا محمد حسن صاحب۔

مولانا محمد یحیٰی صاحب

پنجاب کے عُلماء میں جید اور مشہور عالم ہیں، جنگِ آزادی میں کئی بار آپ بھی جیل گئے۔ سینکڑوں لوگ آپ کے عقیدت مند ہیں۔ ان میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو ایک عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ میں ہونی چاہئیں۔ لدھیانہ سے اُجڑنے کے بعد لائلپور میں قیام فرمایا ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ صبح وشام ان سے روحانی فیض حاصل کرنے کے لئے جاتے ہیں۔

ان کی تقریر، کردار وعمل سے عوام وخواص متاثر ہوتے ہیں۔ شکل وشباہت رئیس الاحرار کی شبیہ ہے۔ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کے خاص شاگردوں میں سے ایک ہیں۔ ان کی ذہانت اور علم پر شاہ صاحب کو ناز تھا۔ خداخاندانِ حَبیب کے اس عظیم انسان کو لمبی عمر عطا فرمائے تاکہ مخلوق الٰہی کو فیض روحانی حاصل ہوتا رہے۔

مولانا محمد حسن صاحب رئیس الاحرار رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آج کل رحیم یار خاں میں آپ کا قیام ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور ذہین عالم ہیں۔ ساری عُمر تعلیم وتعلّم میں صرف کر دی اور اب بھی ملی اور ملکی کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے عقیدت مندوں کا بھی ایک حلقہ ہے۔ کئی ایک کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

رئیس الاحرار مولانا حَبیب الرحمٰن کے صاحبزادے اسی طرح دین واسلام کی خدمات میں مصروف ہیں، جیسے وہ خود تھے۔ یہ سب لوگ حالات کی خرابی، معاشی مشکلات کا شکار ضرور ہوئے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے اپنے خاندانی وقار، علم وعمل اور مذہبی طریق کار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور پوری لگن سے اپنی اپنی جگہ ملکی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مولانا خلیل الرحمٰن

رئیس الاحرار حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ لمبا قد، گورا رنگ، کتابی چہرہ، گفتگو اور چال میں وقار۔ نہایت ذہین اور پایہ کے عالم ہیں۔ مشکلات کے ہر دور میں اپنے والد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کے ساتھ سایہ کی طرح لگے رہے۔ جنگ آزادی

---

1 ہندوستان کی وزیراعظم اندراجی نے انہی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ایمرجنسی لگا کر ملک میں اقتصادی اور سماجی انقلاب برپا کر دیا۔ تم سلامت رہو ہزار برس۔

میں بہترین کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ کئی بار جیل جانا پڑا جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ برسوں گجرات جیل اور پنجاب کی دوسری جیلوں میں بند رہے، لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ ان کے جیل کے ساتھیوں میں آصف علی سے لے کر پرتاپ سنگھ کیروں تک شامل ہیں۔

آل انڈیا مجلس احرار کے ڈکٹیٹر رہے۔ ان کے ایک اشارے سے سینکڑوں احرار کے رضاکاروں نے انگریز کے خلاف بغاوت کی۔ آج کل پھگواڑہ جامع مسجد میں مقیم ہیں، جہاں بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ شخص جنگ آزادی کا ایک عظیم مجاہد ہے موجودہ ملکی حالات کو وہ جب دیکھتے ہیں تو ان کے چہرے پر اداسی چھا جاتی ہے اور ملک و ملت کے لئے ٹھنڈی آہ بھر کر چپ ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسا دور دیکھا ہے اور ایک ایسے دور سے گزرے ہیں جس کے حالات سُن کر آج رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خاندانی روایات کے حامل ہیں اور اپنے اسلاف کے نقش قدم پر قائم۔

مولانا انیس الرحمٰن [1]

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کے تیسرے صاحبزادے مولانا انیس الرحمٰن ہیں۔ برسوں حضرت شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں رہے۔ ان لوگوں میں ان کا شمار ہے جن لوگوں کو حضرت سے والہانہ محبّت و تعلق تھا اور حضرت کے خلفاء میں بڑے درجے کے اور مشہور خلیفہ ہیں۔ آپ سے سلسلہ بیعت بھی جاری ہے۔ مظاہر العلوم سہارن پور کے فارغ التحصیل ہیں۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگردوں میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔ نہایت ذہین عالم اور حافظ قرآن ہیں۔ مسائل دینیہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ آج کل لائل پور خالصہ کالج میں مقیم ہیں جہاں سینکڑوں بندگانِ الٰہی فیض روحانی حاصل کرنے کے لئے آپ کے پاس آتے ہیں۔ خدوخال نہایت خوب صورت ہیں۔ رنگ گورا، مخاطب سے جب بات کرتے ہیں تو ان کا رعب اور ہیبت اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ لوگ احترام اور عزت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ عُلماء کی جماعت میں ان کا ایک مقام ہے۔

مولانا محمد طیب صاحب

رئیس الاحرار کے چوتھے صاحبزادے مولانا محمد طیب صاحب ہیں۔ گندمی رنگ، بھرا ہوا جسم، رعب دار شخصیت کے مالک ہیں۔ علوم دینیہ کے عالم اور دنیاوی اعتبار سے گریجویٹ ہیں۔ دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کا ایک الگ حلقۂ احباب ہے۔ بڑے اچھے پیرایہ میں علمی، ادبی اور سیاسی مسائل بیان کرتے ہیں۔ جو لوگ ان سے واقف ہیں وہ ان کے گرویدہ ہیں۔ نمائشی کاموں سے ہمیشہ دور رہے ایک دفتر میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ اپنی کوشش سے کوچہ رحمن میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جو ان کی سرپرستی میں چل رہا ہے جس سے ملّتِ اسلامیہ کے ہزاروں خاندان فیضیاب ہیں اور وہ اپنے اس کام و کاج کی وجہ سے مُسلمانوں کے ایک بڑے طبقے میں عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بلاوجہ کے ملی کاموں میں مصروف رہ کر عوام کے دلوں میں ان کے لیے بڑی جگہ ہے۔

مولانا محمد ازہر

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے (پانچویں) صاحبزادے مولانا محمد ازہر صاحب ہیں۔ پتلے، دبلے، درمیانہ قد، گندمی رنگ، قبول صورت، چال ڈھال درویشانہ مقابل سے بات چیت کرنے میں چاق و چوبند، مدرسہ خیر المدارس جالندھر کے تعلیم یافتہ ہیں۔ مولانا خیر محمد صاحب کے مخصوص شاگردوں میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔ نہایت ذہین اور معاملہ فہم لوگوں میں سے ہیں، سلیقہ سے سچی بات کہنے کا انہیں ملکہ حاصل ہے، خوددار اور باوضع ہیں۔ اپنا مخصوص حلقۂ احباب رکھتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کے لئے ان کے دل میں بڑا درد ہے۔ پہلی ملاقات

[1] گذشتہ سال ستمبر میں انکا انتقال ہو گیا۔

میں ہی مخاطب ان کی شخصیت کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہتا۔

مولانا سعید الرحمٰن

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کے چھٹے صاحبزادے ہیں۔ حافظ قرآن دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل عالم ہیں۔ درمیانہ قد، گورا رنگ، اکہرا بدن، رنگ وروپ، وضع وقطع کے اعتبار سے خوبصورت شخصیت کے مالک ہیں۔ صحت مند اور ابھی نوجوان ہیں۔ نہایت ذہین اور پائے کے عالم ہیں۔ ہر بات کو قانون اور قاعدے سے دیکھتے ہیں۔ مُسلمانوں کے ایک طبقے میں خاصے مقبول ہیں۔ مرضی اور منشا کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ حکام بالا سے کام نکالنے اور رسوخ پیدا کرنے میں ماہر۔ لدھیانہ جو کہ ان کا آبائی وطن ہے، دوبارہ واپس آئے۔ بڑی جدوجہد اور محنت کے ساتھ انہوں نے یہاں پر جامع مسجد دومنزلہ واگزار کرائی جو ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اسلامی اور مذہبی مرکز کی شکل اختیار کر گئی۔ شہر میں ان کا حلقہ احباب ہے اور بہت سے بہی خواہ ہیں۔ کسی دباؤ کے تحت کام کرنے کے عادی نہیں۔ ان کی شخصیت سے ملک و ملت کو عظیم فائدہ پہنچ رہا ہے۔[1]

محمد احمد رحمانی

خاکسار راقم الحروف کا بھی نسبی تعلق رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کے ساتھ ہے۔ ان کی اولاد میں سب سے چھوٹا ہوں۔ زندگی کا بیشتر حصہ اس جدجہد میں گزر گیا کہ والد مرحوم کے نقشِ قدم پر چل کر ملت اسلامیہ کے کسی کام آسکوں۔ اور والد مرحوم کے ان اصولوں کو اجاگر کر سکوں جو کہ ملت کا بہترین سرمایہ ہیں۔ سب سے پہلے اس کام کے لئے ایک اخبار لدھیانہ سے (الحبیب) کے نام سے بھی نکالا، جو عرصہ تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور ملک کے بہت سے حصوں میں یہ اخبار انفرادی حیثیت سے مقبول ہوا۔ اخبار چونکہ علمی اور معیاری تھا، تجارتی نقطۂ نگاہ کی اس کو ہوا نہ لگی۔ اس لئے سرمایہ کی کمی اور حالات کی خرابی کی بنا پر یہ اہم اخبار بند کرنا پڑا۔ اس اخبار کی حق گوئی اور بیباکی کی بنا پر پنجاب ہائی کورٹ میں اس پر مقدمہ بھی چلایا گیا جہاں اس کے مخالفوں کو منہ کی کھانی پڑی۔ مگر یہ مقدمات اخبار کو بند کرنے کے باعث بنے۔ آج بھی ضرورت ہے کہ پنجاب سے اس طرح کا ملت اسلامیہ کا ترجمان اخبار نکالا جائے۔ تاکہ پنجاب کے لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دی جاسکے۔ میں نے ہندوستان کی مشہور عربی یونیورسٹی دارالعلوم دیوبند سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ وہاں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی اور شیخ الادب مولانا اعجاز علی، حضرت مولانا ابراہیم صاحب اور مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند جیسے صاحبِ علم اور صاحب نسبت بزرگوں کی صحبت ملی۔

تعلیم کے بعد کئی ایک برس تک حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں علمی اور روحانی فیض حاصل کرنے کی غرض سے مقیم رہا۔ رائے پور کے قیام میں مجھے حضرت کی صحبت سے علمی اور روحانی فیض حاصل ہوا۔ میں نے حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں سبقاً سبقاً حضرت کو تاریخی مذہبی کتابیں پڑھ کر سنائیں اور اس طرح بہت سی تصوف کی کتابیں حضرت کی خدمت میں پڑھ کر سنانے کا اتفاق ہوا۔ رائے پور کا یہ زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا جسے شیخ کا آخری زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس وقت حضرت کی مجلسوں میں ملک بھر کے عُلماء، صوفیا او رصاحب نسبت لوگوں کا اجتماع رہتا تھا۔

دارالعلوم دیوبند اور رائے پور کی روحانی اور علمی مجالس سے مجھے مذہبی، علمی، ملکی اور ملی مسائل اور حالات سمجھنے کا موقع ملتا رہا۔ میرے ذہن فکر کو ان مجالس سے اپنے لئے ایک صحیح رائے متعین کرنے کا موقع ملا۔

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کی زندگی کے آخری ایام میں خدمت کرنے کا موقع ملا۔ میرے لئے والد مرحوم کے آخری دو سال بہت قیمتی ثابت ہوئے۔ میں ان دونوں ان کے بہت قریب رہا اور مجھے بہت کچھ معلوم ہوا اور میں نے ان سے بہت کچھ

---

[1] ابتک ۱۴ ہزار مُسلمانوں کو لدھیانہ میں آباد کر چکے ہیں۔

سمجھا اور سیکھا۔

ان کے قلب مبارک میں یہ بڑا دکھ تھا کہ ان کا وطن جہاں کبھی لوگ اللہ کے نام کی آوازیں بلند کرتے تھے، خدا کا نام لینے والوں سے خالی ہے۔ انہوں نے اپنے شیخ حضرت شاہ عبد القادر کے مشورے سے ہمیں حکم دیا کہ ہم پنجاب میں آکر ملتِ اسلامیہ کی خدمت کریں اور از سرِ نو اسلامی حیات کی ابتدا کی جائے۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں کے حکم سے راقم الحروف محمد احمد رحمانی، مولانا خلیل الرحمن، مولانا سعید الرحمٰن لدھیانہ اپنے وطن میں واپس آئے اور یہیں سے پنجاب میں مُسلمانوں کی حیات جدیدہ کا کام شروع ہوا۔

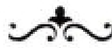
اس کام میں جس قدر توجہ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب سردار پرتاپ سنگھ کیروں نے کی۔ اس کو بُھلایا نہیں جاسکتا۔ ان کی توجہ اور مدد سے پنجاب بھر میں مساجد اور خانقاہیں واگزار ہوئیں اور ایک بار پھر پورے پنجاب میں اذان کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔

ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ اب ان مساجد اور خانقاہوں کا انتظام کیسے اور کیونکر ہو رہا ہے۔ موجودہ انتظامی ڈھانچہ اپنی کارگزاری میں کامیاب ہے یا نہیں۔ مجھے صرف اس بات کی خوشی ہے کہ جس کام کا حکم ہمیں رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اور حضرت شاہ عبد القادر رائے پوری نے دیا تھا، وہ ایک درجہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا اور یہ ایک صدقہ جاریہ ہے کہ جس کا ثواب ان بزرگوں کی ارواح کو یقیناً تاقیامت ملتا رہے گا۔ رئیس الاحرار کا سیاست سے لگاؤ بظاہر ان کی زندگی کا جزو نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے پایہ کے سیاست داں ہوتے ہوئے بھی زبردست انسان صرف مذہبی انسان تھے۔ جس طرح اسلامیات کو انہوں نے سمجھا اور اسلام کی تبلیغ کی۔ سیاست اور مذہب کو جُدا جُدا کیا۔ یہ اُن ہی کا کمال تھا۔ ان کی عظیم مذہبی شخصیت سے ملت اسلامیہ کو ہر مشکل موڑ پر رہنمائی ملی، اور بے پناہ فیض پہنچا۔ ہندو مُسلم اور دیگر مذاہب کے لوگ ان کی سیاسی اور مذہبی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

میری زندگی کی جدوجہد، دلی خواہش اور تمنّا یہ ہے کہ ملت اسلامیہ ایسے افراد اور اشخاصِ ملت کی رہنمائی کے لئے قیامت کا کام سنبھالیں اور رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی طرح ملک وملت کی بے غرض خدمت کریں تاکہ آنے والی نسلوں کو اسلام پر قائم رکھا جاسکے۔

ہم نے اس کتاب میں رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کے خاندانی حالات اور کوائف پر اکتفا کیا ہے۔ ضرورت تھی کہ رئیس الاحرار کے ان ساتھیوں کا بھی ذکر کیا جاتا، جنہوں نے ان کے دوش بدوش کام کیا، جن میں سے مشہور نام مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری۔ چوہدری افضل الحق مرحوم، مولانا مظہر علی، مولانا داؤد غزنوی، مولانا حفظ الرحمٰن اور شورش کاشمیری جس کی جوانی جیل کی سلاخوں کے درمیان گزر گئی۔ لیکن یہ مختصر مقالہ اس پوری تاریخ کو بیان کرنے کا نہیں ہے۔ اس کے لئے تاریخ کی ایک پوری کتاب چاہئے۔ وقت نے اگر فرصت دی اور توفیق الٰہی شامل حال رہی تو کوشش کروں گا کہ ایک ایسی کتاب لکھوں جس سے ان کے ساتھیوں اور احباب سے بھی لوگوں کو روشناس کرایا جاسکے۔

محمد احمد رحمانی فاضل دیوبند۔ لدھیانہ
مُفتی پنجاب ۸/ ستمبر ۱۹۷۵ء



تیس سالہ زندگی گھر سے جیل تک

۱۹۲۱ء کی تحریک آزادی سے لے کر بطل حریت، مجاہد جلیل، رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی نور اللہ مرقدہٗ کتنی ہی بار جیل گئے۔ مندرجہ ذیل مضمون میں رئیس الاحرار کی زندگی کا ابتدائی نقش مولانا خلیل الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے ترتیب دیا ہے۔ یہ اہم اور بنیادی مضمون قاری کی معلومات کے لئے۔۔۔۔۔۔۔شائع کیا جارہا ہے۔

یوں بسر کی زندگی ہم نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہوگیا

۱۹۲۱ء میں جب کانگرس کی تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت کا آغاز ہوا اور دونوں میں ہی تحریک آزادی شباب پر پہنچ گئی۔ لوگ پروانہ وار اپنے لیڈروں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جیلوں میں جارہے تھے اُس وقت لدھیانہ کے گلی کوچوں میں "ہندو مُسلم بھائی بھائی" اور "انگریز کو ہندوستان سے نکال دو" کے نعرے لگائے جارہے تھے۔ مولانا نے حالات کا جائزہ لیا اور ایک تقریر سے شہر کے لوگوں کو اپنی رہنمائی سے نوازا۔ آپ کی ایک ہی تقریر سے شہر میں آگ لگ گئی، ہزاروں کی تعداد میں نوجوان رضاکار بھرتی ہوگئے، معززین شہر نے آپ کا ساتھ دیا، چندیوم میں آپ کی آواز پر ہزاروں رضاکار سول نافرمانی کرتے ہوئے جیل میں پہنچ گئے۔ معززین شہر کو گرفتار کرلیا گیا۔ آخر میں حکومت نے ۲۱/دسمبر ۱۹۲۱ء کی صبح کو ۹ بجے آپ کو بھی گرفتار کرلیا۔ آپ پر اور آپ کے تمام ساتھیوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمہ میں آپ کو چھ ماہ قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ آپ کے تمام ساتھیوں اور رضاکاروں کے مقدمات کی سماعت کچہری کی عدالت میں نہیں ہوئی، بلکہ آپ کے مقدمہ کی سماعت کے لئے عدالت کا اجلاس جیل کے اندر ہوا اور جیل میں ہی مقدمے کا فیصلہ بھی سنایا گیا۔ حکومت کو خطرہ تھا کہ اگر آپ کو عدالت میں لایا گیا تو شہریوں کے بے پناہ ہجوم کو کنٹرول نہیں کیا جاسکے گا۔ جیل میں رضاکاروں کے علاوہ آپ کے ساتھ شہر کے معزز اصحاب میں سے مہاشہ گھسیٹا رام صاحب، مولانا محمد یحییٰ صاحب آپ کے چھوٹے بھائی اور ماسٹر تاج الدین صاحب اور ڈاکٹر سیّد یٰسین صاحب مرحوم تھے۔

لدھیانہ جیل میں آپ کی موجودگی تحریک آزادی کو زیادہ تیز کر رہی تھی۔ نوجوان اپنے شہر کے محبوب لیڈر کے پاس پہنچنے کے لئے دیوانہ وار سول نافرمانی کر رہے تھے۔ جن کو گرفتار نہیں کیا جاتا تھا وہ جیل کے سامنے دھرنا مار کر بیٹھ جاتے تھے۔ حکومت نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کے مقدمات کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ایک دن اچانک آپ کو، آپ کے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب اور ماسٹر تاج الدین صاحب کو لدھیانہ جیل سے انبالہ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ تین دن تک آپ تینوں حضرات انبالہ جیل میں رہے، انبالہ جیل سے تین دن کے بعد آپ کو اور آپ کے دونوں ساتھیوں کو میانوالی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ مولانا کو میانوالی جیل میں دس دن تک قید تنہائی میں رکھا گیا اور ایسی کوٹھری میں بند کیا گیا جہاں چوبیس گھنٹہ میں لانگری (روٹی دینے والا) اور بھنگی کے سوا کسی اور انسان کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ کوٹھڑی کے باہر چوبیس گھنٹے تالا پڑا رہتا تھا۔ ساتھیوں کو مولانا کو علم نہیں تھا کہ جیل میں کس جگہ ہیں اور مولانا کو اپنے ساتھیوں کی خبر نہیں تھی۔ غالب کا یہ شعر

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

صادق آتا تھا۔ شاید غالب مرحوم نے بھی یہ شعر اپنی اسیری کے زمانے میں ہی کہا ہوگا۔ انگریز اور خنزیر کی خصلت بالکل ایک جیسی ہے۔ خنزیر ڈھول سے بھاگتا ہے اور انگریز پروپیگنڈے سے۔ آپ کی اس قید تنہائی پر باہر عوم نے پر زور احتجاج کیا چنانچہ دس دن کے بعد آپ کو آپ کے ساتھیوں میں بھیج دیا گیا۔ اب مولانا احمد سعید صاحب، مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری۔ پنڈت نیکی رام صاحب، مولانا لقاء اللہ صاحب پانی پتی، مولوی عبد المجید صاحب سالک مدیر انقلاب، مولانا محمد داؤد غزنوی، لالہ دیش بندھو جی گپتا اور لالہ شنکر لال صاحب میانوالی جیل میں آچکے تھے۔ ان حضرت کے علاوہ ڈیڑھ صد کے قریب اور پولٹیکل قیدی تھے۔ تین چار ماہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گزرنے پائے تھے کہ جون ۱۹۲۲ئ میں تنہا آپ کو میانوالی جیل سے دھرم سالہ جیل ضلع کانگڑہ میں منتقل کر دیا گیا۔ دھرم سالہ جیل میں اس وقت ہندوستان کے مشہور و معروف لیڈر لالہ لاجپت رائے سرگباشی موجود تھے۔ لالہ جی کے ساتھ قید کے دن بہت اچھے گزر رہے تھے کہ مولانا کی رہائی کی تاریخ قریب آگئی۔ ۷، اگست ۱۹۲۲ء کو آپ کی سزا کے چھ ماہ پورے ہو جاتے تھے۔ اچانک آپ کو تاریخ رہائی سے چار یوم پہلے پولیس لدھیانہ جیل میں لے آئی۔ لدھیانہ جیل میں آپ کو دوسرا وارنٹ دکھایا گیا، آپ کی قید کے چھ ماہ پورے ہو جانے کے باوجود لدھیانہ شہر میں ابھی لوگوں کے جذبات مردہ نہیں ہوئے تھے، حکومت کو خدشہ تھا کہ ایسے حالات میں مولانا کی رہائی کہیں دوبارہ تحریک کے آغاز کا سبب نہ بن جائے۔ چنانچہ آپ پر دوسرا کیس تیار کر کے مقدمہ چلا دیا گیا۔ مقدمہ کی سماعت اس مرتبہ بھی جیل میں ہوئی اور جیل کے اندر ہی عدالت نے اس مقدمہ میں ایک سال کی سزا کا حکم سنا دیا۔ حکم سنانے کے بعد آپ کو واپس پولیس نے دھرم سالہ جیل میں پہنچا دیا۔ اب آپ دھرم سالہ جیل میں پہنچے تو لالہ جی سورگ باشی کے علاوہ شیخ حسام الدین صاحب امرت سری بھی موجود تھے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد شیخ صاحب کی قید ختم ہوگئی اور وہ رہا ہو کر امرت سر پہنچ گئے۔

قید کے ساتھ ساتھ مولانا پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ بھی ہوا تھا۔ آپ نے جرمانہ دینے سے انکار کر دیا۔ حکومت اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئی۔ ایک شام مغرب کے بعد پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے مولانا کے مکان کو گھیر لیا۔ اس وقت گھر میں مولانا مرحوم کی اہلیہ اور آپ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے علاوہ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ پولیس کے پاس گھر کے تمام سامان کی قرقی کا ورنٹ تھا جو آپ کی اہلیہ کو دکھایا گیا۔ آپ کی اہلیہ نے پولیس کو اپنی کاروائی کرنے کی بخوشی اجازت دے دی۔ پولیس نے گھر کا تمام سامان حتی کہ روزانہ استعمال کے برتن، توا اور دست پناہ (چمٹا) تک بھی اٹھا لیا گیا۔ زنانہ پولیس کے ذریعے آپ کی اہلیہ کا زیور اور دونوں چھوٹی بچیوں کے کانوں سے بالیاں تک اتروالیں۔ اگلے دن صبح کو یہ تمام سامان کو توالی کے سامنے نیلام کر دیا۔ حکومت نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ اس کا یہ اقدام جیل میں مولانا کے ارادوں کو متزلزل کر دے گا۔ لیکن یہاں یہ حال تھا کہ ؎

اِدھر آ او ظالم ہنر آزمائیں
تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

۱۶/ اگست ۱۹۲۳ء کو آپ اپنی تمام قید ختم کر کے رہا ہوئے، لدھیانہ پہنچے، گھر کی تباہی ڈیوڑھی سے ہی نظر آرہی تھی۔ بارش سے گھر کی چہار دیواری جو کچی تھی گر چکی تھی، سامان ضبط ہو چکا تھا۔ دیوار گر جانے سے بے پردگی ہونے لگی۔ آپ کی اہلیہ نے رسی کھینچ کر اس پر پھٹے ہوئے کپڑے، کچھ ٹاٹ کے ٹکڑے ڈال کر دو سال گزار دیئے۔ گھر میں پہلے ہی کیا تھا، پھر جہاں پولیس توا اور آتشگیر تک اٹھا کر لے گئی ہو اس گھر میں چور کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گھر کی غربت سامان کی ضبطی آپ کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکی۔ آپ نے اپنی اہلیہ کے چہرے پر بھی کوئی شکن نہ پایا بلکہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک آپ کی معاون رہیں۔ گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار چند دوستوں کی توجہ سے بن گئی۔ تھوڑے سے برتنوں کے ساتھ گھر کا کام چلتا رہا۔ گھر کا اجڑنا۔ سامان کی ضبطی آپ کے لئے نئی بات نہیں تھی جس سے کہ آپ یا آپ کی اہلیہ متاثر ہوتیں۔ آپ کے دادا مولانا محمد صاحب اور آپ کی اہلیہ کے والد مولانا عبد العزیز صاحب دونوں حقیقی بھائی تھے۔ اس لئے میاں بیوی یہ جانتے

تھے کہ ان کے بزرگوں نے جب ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا تھا تو ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ مکانات کو صرف ضبط ہی نہیں کیا گیا تھا، بلکہ مسمار کر دیئے گئے تھے۔ مکانوں کے علاوہ مسجد بھی مسمار کر دی گئی تھی۔ نہ رہنے کے لئے گھر تھا نہ اوڑھنے کے لئے کپڑا۔ اس کے باوجود حکومت اپنے تشدد سے آپ کے بزرگوں کو نہ دبا سکی۔ اور نہ کسی لالچ سے خرید سکی۔ اس لئے ضبطی سامان کا واقعہ مولانا، ان کی اہلیہ اور ان کے تمام خاندان کے لئے تعجّب خیز نہ تھا۔ خاندان کا ایک ایک فرد جانتا تھا کہ جو راستہ ہمارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا اور جس پر ہم چل رہے ہیں اس راستے میں اس سے بھی زیادہ مصائب اور آلام پیش آتے ہیں۔ طبیعتیں ایسے تلخ واقعات سے خاندانی طور پر عادی بن چکی تھیں۔ اس لئے اس واقعہ کی تلخی کو بھی انگبیں (شہد) سمجھ کر پی گئے اور جیل سے آتے ہی پھر انگریزی اقتدار کے خاتمہ کے لئے مصروف عمل ہو گئے۔

۱۵ اگست ۱۹۲۷ء کو چند قابل اعتراض تقاریر کی بنا پر پھر آپ کو گرفتار کر لیا گیا عدالت نے ایک سال کے لئے ضمانت طلب کی لیکن آپ نے ضمانت دینے کی بجائے ایک سال جیل میں رہنا منظور کیا۔ جیل میں آپ بالکل تنہا تھے۔ اسی جیل میں آپ پیچش جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور چار ماہ تک اس مرض نے آپ کو گھیرے رکھا۔ جس کی وجہ سے آپ کی آنتوں اور معدے کا ہضم ہمیشہ کے لئے خراب ہو گیا۔ اور آج تک آپ کی خرابیٔ صحت کی وجہ سے اسی پیچش کے حالات ہیں۔ ۱۴ اگست ۲۸ء کو آپ پوری ایک سال کی قید ختم کر کے رہا ہو گئے۔ اسٹیشن پر کئی ہزار ہندو مسلمان مرد اور عورتوں کا اجتماع ہو گیا۔ صبح ۱۰ بجے کے قریب گاڑی لاہور کی طرف سے لدھیانہ پہنچی۔ مولانا کو دیکھتے ہی ہجوم نے مولانا حبیب الرحمٰن زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔ ہندو مُسلم بھائی بھائی کے پُر زور نعرے بلند کئے۔ پولیس کافی تعداد میں اسٹیشن پر پہلے ہی موجود تھی۔ کپتان پولیس خود بھی انتظام کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ ایسے بے پناہ ہجوم میں سے نکال کر مولانا کو جیل تک لے جانا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے کپتان پولیس نے ڈپٹی کمشنر کی اجازت سے مولانا کو ریلوے انجن پر سوار کر دیا اور پولیس کے چند ذمہ دار افسران بھی اسی انجن میں سوار ہوئے۔ اس انجن سے مولانا کو جیل کے قریب لا کر اتار دیا گیا۔ ریلوے لائن لدھیانہ جیل کے قریب سے گزرتی ہے۔ یہ اس لئے کیا گیا تا کہ لوگ اسٹیشن پر ہی دھوکے میں کھڑے رہیں اور مولانا کو پولیس اطمینان سے جیل تک پہنچا دے۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا، مولانا ابھی انجن ہی میں تھے کہ ہجوم بھاری اکثریت میں جیل کے دروازے پر پہنچ گیا اب پولیس اور افسران کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ مولانا کو اسی ہجوم سے گزار کر جیل کے دروازے تک لے جائیں۔ مشتعل ہجوم کو کنٹرول کرنا آسان کام نہ تھا۔ ہجوم کا یہ مطالبہ کہ مولانا کو ہمارے سامنے چند منٹ کے لئے تقریر کرنے کی اجازت دی جائے افسران کو تسلیم کرنا پڑا[1]

ہرچہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از خرابئے بسیار

تقریر

چنانچہ مولانا نے چند منٹ کے لئے پبلک کو مخاطب کیا اور فرمایا:

"عدم تشدد ہمارا بنیادی اصول ہے اس اصول کو ہمیں کسی وقت بھی بھولنا نہیں چاہئے پُر امن رہتے ہوئے ہمیں ملک کی آزادی اور انگریزی اقتدار کے خاتمے کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانیاں دینی چاہئیں۔ اس وقت ملک کو شور و ہنگامے سے زیادہ قربانی کی ضرورت ہے جو گرجتے ہیں وہ برسا نہیں کرتے۔ عمل کرنے والے شور و ہنگامے سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ اگر آپ کو واقعی وطن سے مُحبّت ہے تو آزادی وطن کے لئے عمل کے میدان میں مظلوم بن کر حکومت کے ہر ظلم کو خندہ

---

[1] اب مولانا کو پھر گرفتار کر لیا گیا اس ۷۸ گرفتاری سے گھر کے لوگوں میں اشتعال پھیل گیا۔

پیشانی سے برداشت کرنا اپنا نصب العین بنالو مظلوم کی آہ خالی نہیں جایا کرتی۔ آپ یقین کیجئے کہ اگر ہندوستان میں کسی ایک فرد نے بھی خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو واقعی مظلوم بن کر انگریز کے ظلم کو اس نے برداشت کر لیا تب یہ حکومت زیادہ دیر تک اپنے ظلم و تشدد کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکے گی اور ہماری آنکھیں اپنے سامنے اس حکومت کو مٹتا ہوا دیکھ لیں گی۔"

مولانا کی اس تقریر کا ہجوم پر اور پولیس پر بھی بے حد اثر ہوا۔ سب کی آنکھیں پُر نم تھیں۔ ہجوم پر کامل سکون چھایا ہوا تھا۔ کسی کے اونچے سانس لینے یا کھانسنے تک کی بھی آواز نہیں آرہی تھی۔ قریب پندرہ منٹ مولانا کی تقریر جاری رہی اور آخر میں آپ نے لوگوں کو پر امن طریقے سے گھروں کو واپس لوٹ جانے کے لئے کہا۔ ہجوم اپنے محبوب رہنما کے حکم کو مانتے ہوئے واپس چلا گیا اور مولانا کو جیل میں داخل کر دیا گیا۔

پھانسی کی کوٹھڑی

جیل میں ابھی بہت کافی رضاکار موجود تھے، لیکن ان کے ساتھ افسران جیل کا سلوک بہت خراب تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور ایسی باتیں پیدا ہوگئیں جن کی بنا پر مولانا کا افسران جیل سے جھگڑا ہو گیا، رضاکاروں کے ساتھ اس بے جا سلوک کے خلاف بھی مولانا نے بہت سخت قدم اٹھایا۔ افسران جیل نے آپ کو فوراً پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا، پھانسی کی کوٹھڑی میں بند ہونے کی خبر راتوں رات شہر کے ایک ایک گھر میں پھیل گئی، لوگ اس خبر کو سنتے ہی بے چین ہوگئے۔ شہر کے بچے بوڑھے مرد اور عورتیں سبھی مولانا سے پیار کرتے تھے۔

عورتوں کا جلوس

ہندو مُسلمان عورتیں علی الصبح پانچ چھ ہزار کی تعداد میں جمع ہو گئیں۔ عورتوں نے مردوں کو کسی بھی قدم اٹھانے سے روک دیا اور خود ایک جلوس بنا کر شہر کے بڑے بڑے بازاروں سے حکومت برباد' کے نعرے لگاتی ہوئی جیل کے دروازے پر پہنچ گئیں۔ جیل کے باہر جو چیز نظر آئی توڑ ڈالی۔ سول ہسپتال اور جیل ملے ہوئے ہیں اس وقت سپر نٹنڈنٹ جیل سول سرجن تھے جو مُسلمان تھے۔ جیل کی طرف سے اس مشتعل ہجوم کا رخ ہسپتال کی طرف ہو گیا۔ سول سرجن صاحب بھاگ نکلے، لیکن ہسپتال کی تمام کرسیاں، میزیں، دواؤں کی شیشیاں، گملے، دروازوں کے شیشے جو چیز بھی سامنے آئی ہجوم کی دست برد سے بچ نہ سکی۔ عورتیں ڈاکٹر کے گھر گھس گئیں۔ اس کی بیوی سے کہا۔ ایسے ظالم انسان کی تم بیوی ہو جس نے مولانا کو پھانسی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا تمہیں شرم آنی چاہیے۔ سمجھ دار عورت نے ہجوم کے مزاج کو پہچان لیا تھا وہ جانتی تھی اس وقت ہجوم کو سمجھانا بے کار ثابت ہوگا۔ وہ بھی ہجوم کی ہاں میں ہاں ملانے لگی۔ چند آنسوؤں کے ساتھ پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ گھر توڑ پھوڑ سے بچ گیا۔ اور ہجوم مطمئن ہو کر واپس پھر جیل کی طرف چلا گیا۔ اب پانچ ہزار عورتوں کا یہ ہجوم دھرنا مار کر جیل کے سامنے بیٹھ گیا۔ افسران شہر اور جیل کے حکام عورتوں کے اس اقدام سے بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ مولانا کو فوراً پھانسی کی کوٹھڑی سے نکال کر ان کی پہلی جگہ پر پہنچا دیا۔ پھر عورتوں کے اس ہجوم کو یہ اطلاع دی کہ مولانا کو پھانسی کی کوٹھڑی سے نکال دیا گیا ہے۔ اب آپ اطمینان سے گھروں کو جائیں۔ جب اس ہجوم کو واقعی یقین ہو گیا تو واپس اپنے گھروں کو لوٹا۔

کم سِن ساتھی عبد الرحمٰن عرف "مانا"

مولانا اب پھر رضاکاروں میں واپس آ گئے اس جگہ اگر آپ کے دو کم سن رضاکار ساتھیوں کا ذکر نہ کیا گیا تو یہ ان کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہوگی۔ عبد الرحمٰن "مانا" حافظ مشتاق احمد یہ دونوں بالکل نو عمر تھے۔ پندرہ سال سے کسی کی عمر زیادہ نہ تھی۔ جیل سے باہر ان دونوں کا ہر وقت مولانا کے پاس اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ان کی مُحبّت مولانا کے ساتھ عشق کے درجے تک تھی اور ہے۔ مگر اب آپ سے بہت دور پاکستان کی

بستیوں میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ عبدالرحمٰن "مانا" اگر چہ ان پڑھ ہے لیکن مولانا کی صحبت میں مسلسل رہنے سے وہ ہندوستان کی سیاسیات کو بالکل صحیح اور ٹھیک سمجھتا تھا۔ وہ ان پڑھ ضرور تھا لیکن واقعات کی روشنی میں اس کا ذہن صحیح نتیجے پر پہنچتا تھا۔ ارادے کا اٹل، اصولوں کا پابند۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک مولانا کا ساتھ دیا۔ جب کبھی کسی تحریک کا آزادیٔ وطن کے کے لئے آغاز ہوا تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مانا قربانی کے میدان میں کسی سے پیچھے رہ گیا ہو۔ آزادیٔ ہند کا یہ جاں باز سپاہی جس نے مفلسی اور تنگ دستی میں زندگی گزار کر بھی اُف تک نہیں کی، جس کو دینے والوں نے بڑے سے بڑا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی لیکن اس کی مفلسی کے سامنے سرمائے نے ہمیشہ شکست کھائی۔ بھکاری کو سرمایہ اور دولت خرید سکتی ہے۔ قانون گنہگار کو ڈرا سکتا ہے لیکن جس نے ظلم کے خلاف بغاوت کر کے مفلسی کو اپنے گھر میں خود دعوت دی ہو اس کی مفلسی کو کون خرید سکتا ہے جس نے سچائی کو ہاتھ میں لے کر باطل قانون کو چیلنج کیا ہو اسے کون ڈرا سکتا ہے؟ وہ سچائی پر جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ لیکن باطل طاقت کے دباؤ سے وہ اپنی جگہ کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اچھی صحبت نے سچ بات کا عادی بنا دیا تھا۔ العلم وخواندن کے باب میں تو سینکڑوں نہیں ہزاروں ہی تھے اور ہیں جو اس وقت بھی اور آج بھی منطقی بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے قانون کی آڑ میں باتیں کرنے کے عادی ہیں۔ لیکن عبدالرحمٰن مانا، العلم دانست کے عملی باب سے گزر چکا تھا۔ اس لئے کسی کی علمی بحث اس کی زندگی کے رُخ کو بدل نہ سکی۔

حافظ مشتاق احمد لدھیانوی

ذہین، تعلیم یافتہ نوجوان لکھنے پڑھنے کا دھنی، مولانا کو اس سے بے حد محبّت اولاد کی طرح پیار، ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ناز ونعم میں پرورش پائی۔ مولانا جیل میں آئے تو یہ کیسے باہر رہ جاتے۔ ماں نے چہرے سے بیٹے کے ارادوں کو بھانپ لیا۔ پوچھنے سے پہلے خدمت وطن کے لئے اجازت دے دی۔ ہار پہنائے، دولھا بنا کر پیشانی کو ایک بوسہ دیا۔ آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ جاؤ بیٹا وطن کی آزادی کے لئے اگر جان تک بھی دینی پڑے تو پیٹھ نہ موڑنا! ان آنسوؤں کی لاج رکھنا! اگر تم پیٹھ موڑ کر آ گئے تو میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ بیٹا ماں کی دعائیں لے کر جیل میں مولانا کے پاس پہنچ گیا، پھر جب تک لدھیانہ آباد رہا مولانا کا ساتھ نہیں چھوڑا رہائی کے بعد مولانا نے حافظ صاحب کو لکھنؤ جانے کے لئے کہا کہ وہاں جا کر سیاسی کام بھی کرو اور اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بھی بٹاؤ! کاروبار کا سوائے چوپٹ ہو جانے کے اور کیا بننا تھا۔ سیاسی کاموں کی وجہ سے مہمانوں کی زیادتی مصروفیات کی وجہ سے دکان بند۔ پونجی کب تک ساتھ دیتی۔ آخر مفلسی نے گھر میں بسیرا کر لیا۔ بڑے گھر کی کُھرچن بھی تھوڑی نہیں ہوتی دال روٹی چلتی رہی لیکن سیاسی مصرفیات میں کمی نہ آئی۔ لکھنؤ میں بیٹھ کر تمام یوپی میں مجلس احرار کی شاخیں قائم کیں صوبے کا صدر دفتر لکھنؤ میں بنایا۔ اسی صدر دفتر کانگرس نے جب ۱۹۳۶ء میں وزارتیں قبول کی تھیں یوپی کے تمام وزراء حافظ مشتاق سے مشورہ کرنے آتے تھے۔ وطن اجڑنے تک مولانا کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

مولانا خلیل الرحمٰن لدھیانوی

مولانا حبیب الرحمٰن کی فراست و ہمدردی

از محمد عثمان، فارقلیط

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (نور اللہ مرقدہٗ) ایک نرالی شان اور آن بان کے لیڈر، رہنما اور ملت کے قائد تھے۔ ان کے بعد لدھیانہ کی قیادت لب بہ مہر ہو گئی اور وہ اس پروردگار کے دامنِ رحمت میں پہنچ گئے جہاں ان سے پہلے بڑے بڑے لوگ پہنچ چکے تھے' مرحوم کی نرالی قیادت یہ تھی کہ اس میں جوش، جذبات اور ملک کی نفسیاتی کیفیات کو زیادہ دخل تھا۔ ان کے جذبات میں حقیقت پسندی زیادہ اور ضمیر کی آواز کی لہریں کہیں فزوں تھیں۔

ہمیں دہلی شہر میں سب سے پہلے ان کے والد ماجد مرحوم سے نیاز حاصل ہوا۔ یاد پڑتا ہے کہ وہ حاجی نور الٰہی صاحب مرحوم (جنت یعنی

ہوتے، فروش) کے ایک بڑے محل میں قیام فرمایا کرتے تھے، چہرہ سرخ وسفید اور نورانی، داڑھی پختہ اور اول سے آخر تک ایک ایک بال پر سفیدی، غالباً قالب کا طول، اپنے فرزند سے کم تھا۔ نہایت بذلہ سنج خوش مزاج اور نہ بھولنے والے بزرگ تھے۔ ایک بار مرحوم نے اپنے فرزند مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کے خلاف ایک پوسٹر[1] بھی نکالا تھا، اس میں کیا تھا یہ بات دماغ سے نکل چکی ہے مگر وہ پوسٹر عارضی طیش اور غصہ کا مظہر تھا، جس کا اثر شاید ہی کسی نے لیا ہو۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی بہت جلد اپنی پر تاثیر تقریروں کی بنا پر سارے غیر منقسم ہندوستان میں مشہور ہوگئے اور جب موصوف نے حضرت شاہ عطاء اللہ بخاری مرحوم کی معیت اختیار کی اور پورا ملک ان کی گرفت میں آیا تو عموماً ہر جگہ ہی دونوں کو ایک ساتھ ہی دیکھا گیا۔ مرحوم کا خیال تھا کہ شاہ صاحب مرحوم کی جاندار تقریر کے بعد میں خود بولنا ناپسند کرتا ہوں، ان کا طرز عمل بھی ان کے قول کے مطابق ہی رہا۔

راقم کی پوری شناسائی حضرت مرحوم کے ساتھ اس وقت قائم ہوئی جب انھوں نے دہلی میں مجلس احرار قائم کی۔ اس دور میں آپ کے فرزند مولانا عزیز الرحمٰن صاحب لدھیانوی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زیر تعلیم تھے اور اخبار الجمعیۃ کے دفتر میں تشریف لاکر وقت کے مسائل پر گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ مرحوم مجلس احرار کو مستحکم بنانے کے لئے بہت کوشش فرماتے رہے۔ مگر وقت کے حالات نے آپ کو دہلی میں قیام کرنے کی مہلت نہ دی اور آپ سارے ملک کے گشت میں لگے رہے۔

مرحوم نے جو شائد آخری خطبۂ صدارت لاہور کی احرار کانفرنس میں دیا، اس خطبہ نے مسلمانانِ ہند کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور اکثر اخبارات نے اس پر خاص توجہ دی۔ خطبۂ صدارت میں جہاں آپ نے مسلمانانِ ہند کے شعور کو بیدار کیا اور ان کو اپنا فرض یاد دلایا۔ وہاں آپ نے کانگریس کی غیر معتدل روش پر بھی دل کھول کر تنقید کی اور پھر ہندو مسلم مصالحت اور مفاہمت کی طرف آئے تو مستقبل کی پوری تصویر بے نقاب کرکے رکھ دی۔ ہمیں یاد ہے کہ مرحوم کے خیالات پر جہاں عام مسلم اخبارات نے اپنا ردعمل ظاہر کیا وہاں نیشنل پریس اور ہندو اخبارات نے بھی ان کا خیر مقدم کیا۔ اگر وہ خطبہ کسی کے پاس موجود ہو تو اس پر ایک بار اور نظر ڈالے، اگر وہ زندہ بھی ہو تو سوچے کہ مرحوم نے اپنے خطبہ میں جو کچھ کہا، آزادی کے دور میں اس کی کس طرح عکاسی ہوئی۔ وہ خطبہ آج بھی بہت سے گمراہ انسانوں کو شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔

جب ملک تقسیم ہوا تو مرحوم دہلی چلے آئے۔ یہاں ان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور متعارفین کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی، یہی وہ دور تھا جب راقم کو مرحوم سے خلط ملط ہونے (یعنی ملنے ملانے) کا موقع ملا اور آخر تک تبادلۂ خیالات ہوتے رہے۔ مگر آزادی سے پہلے بھی یہ سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔ دہلی میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کی تقریروں کا طوطی بول رہا تھا، مرحوم کے زورِ خطابت کا کیا کہنا۔ ایک بار جی میں آیا کہ مولانا کے افکار وخیالات کو اعتدال پر لانے کے لئے کچھ لکھ دیا جائے، وقت کا ماحول کیا تھا؟ اس کا حال تو ذہنوں کی نذر ہوگیا، مگر اتنا یاد ہے کہ راقم نے ان کے جذباتی افکار پر کچھ نازیبا الفاظ لکھ دیئے تھے۔ اس وقت حضرت سحبان الہند، مولانا احمد سعید صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی نظامت میں اخبار الجمعیۃ سہ روزہ ہی نکلتا تھا اس میں شاہ صاحب کے بارے میں نوٹ لکھ دیا گیا مگر شاہ صاحب اس پر بہت بگڑے اور شائد سلام وکلام تک چھوڑ بیٹھے، جب راقم، اخبار زمزم کی ادارت کے لئے لاہور پہنچا تو مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم نے مختلف طریقوں سے مصالحت کرانی چاہی مگر کامیاب نہ ہوسکے۔ راقم کے لئے بہتر تھا کہ مصالحت ہوجاتی، یہ تذکرہ اس لئے کیا گیا کہ مرحوم کے محاسن اور صلح جوئی کے جذبات کا اظہار ہوجائے۔

آزادی کے بعد جب مرحوم کوچہ رحمان میں فروکش ہوئے تو آپ کے مکان پر حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری مرحوم تشریف لائے۔ راقم ملاقات کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھتے ہی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے مرحوم سے میرا تعارف کرایا۔

---

1 میں مدرسہ کی ہڑتال میں حضرت انور شاہ کے ساتھ ہوں۔

2 مولانا نے خطبہ حبیبہ حال لاہور میں دیا تھا۔

انھوں نے فوراً کہا، اخبار الجمعیۃ کبھی کبھی پڑھ لیا کرتا ہوں، اکثر لوگ تو الجمعیۃ کے عاشق ہیں اور اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ بات ختم ہوئی تو بات چاء کی خوبیوں پر جاپڑی اور راقم واپس چلا آیا۔ حضرت رائے پوری کے بارے میں جو کچھ سنا تھا وہ ان کی گفتگو سن کر صحیح معلوم ہوا۔ بڑے روشن خیال اور دور اندیش بزرگ تھے۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ جب وہ کسی کی بات کو صحیح پاتے تھے تو اسے فوراً قبول کر لیا کرتے تھے۔ ایک بار روزنامہ الجمعیۃ کے دفتر میں تشریف لائے اور فرمایا یہ تحریر ذرا پڑھ لیجئے۔ راقم نے اسے اول سے آخر تک پڑھا اور عرض کیا، مولانا! میں اس تحریر کو متعدد بار پڑھ چکا ہوں۔ وہ تحریر دراصل ایک بہت بڑے صوفی کا ایک خط تھا جو آج بھی ان کے مکتوبات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مولانا اس تحریر کو ہرگز شائع نہ کیجئے، یہ مکتوب موجودہ حالات کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس سے ناگوار باتوں کی ایک بحث چل پڑے گی، اگر کسی نے مکتوبات مجدد الف ثانی سے ان کا ایک خاص مکتوب بھی نقل کر کے شائع کر دیا تو پہلے صوفی صاحب کا خیال بدمزہ ہو کر رہ جائے گا۔ اس ضمن میں کچھ اور بحث بھی چلی مگر مرحوم میری بات سمجھ گئے اور فرمایا اچھا اس مکتوب کو شائع کرنے کا خیال واپس لیتا ہوں! اس پر معاملہ ختم ہو گیا۔

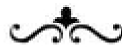
آزادی سے پہلے سہ روزہ الجمعیۃ میں راقم کا ایک ناول شائع ہوتا رہا۔ تکمیل کے بعد "...از ابلا..." کے نام سے ناول کی تمام قسطیں شائع کر دی گئیں۔ یہ ناول ان حلقوں میں بڑا مقبول ثابت ہوا جو اسلام اور عیسائیت کے بنیادی مسائل سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ مرحوم جب کبھی لدھیانہ سے تشریف لاتے تو فرمایا کرتے کہ اس ناول کے ذریعے تو نے عیسائیت کی کمر توڑ ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ ناول لدھیانہ کے عیسائی مشن کو دے چکا ہوں لیکن اس بات کی قطعی امید نہیں کہ عیسائی مشن اس کا جواب دے سکے گا۔ یہ بھی فرمایا کہ کئی دوست عیسائی پادریوں کو ناول دے کر اس کا جواب طلب کر چکا ہوں، مگر جواب دینے کی کسی کو ہمت نہیں۔ اتفاق سے راقم لاہور میں اخبار زمزم سے وابستہ ہو گیا، میری غیبت میں ایک مشہور عالم کے فرزند نے (وہ بھی مرحوم ہو چکے ہیں) اسے اپنے نام سے دوبارہ طبع کرا لیا مگر بعد میں لاہور پہنچ کر راقم سے معذرت خواہ ہوئے اور ان کی زیادتی معاف کر دی گئی۔ مولانا کا ارشاد تھا کہ اس ناول کا عیسائیوں کے پاس کوئی جواب نہیں۔

وہ وقت راقم کو بار بار یاد آتا ہے جب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب اتفاق سے دفتر الجمعیۃ میں جمع ہوتے اور ان کی بذلہ سنجیوں سے پوری فضا گونج اٹھتی۔ ایک شوشہ سحبان الہند چھوڑتے، دوسرے شوشہ پر مرحوم لدھیانوی نہلے پر دہلا لگاتے اور تیسرا شوشہ جب بخاری کی طرف سے چھوڑا جاتا تو دلوں کی کلیاں کھل جاتیں اور تمیز کرنا مشکل تھا کہ تین شوشوں میں کونسا شوشہ غالب رہا۔

آہ افسوس! آج یہ تینوں گل و بلبل اپنی باتیں سنا کر اپنے خالق کے دربار میں پہنچ چکے ہیں۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

راقم محمد عثمان فارقلیط
دہلی ۸ر فروری ۱۹۷۵ء



مولانا حبیب الرحمٰن کی دینی فراست

از قاضی سجاد حسین

ایھا الاخ العزیز ومستم بالعافیہ

دستی گرامی نامہ ملا تھا۔ فکر میں تھا کہ جواب لکھوں لیکن مصروفیت اور راحت پسندی موقع نہ دے رہی تھی۔ آج کچھ فرصت کے لمحات میسر آئے تو جواب لکھنے پر طبیعت آمادہ ہوئی۔

واقعۃً میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا ہوں کہ کتاب "رئیس الاحرار در حدیث دیگراں" کا قلمی طور پر شریک و سہیم بنوں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگرچہ مجھے رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں نیاز حاصل رہا اور ان کی بزرگانہ شفقت بھی شامل حال رہی اور صرف یہی نہیں بلکہ جناب کے دادا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شرف نیاز حاصل رہا ہے لیکن اس قدر سعادت کبھی حاصل نہیں ہوئی کہ قریب سے ان کا مطالعہ کر سکتا اور اکثر و بیشتر ان کی مجلسوں اور صحبتوں سے فیض یاب ہوتا۔ البتہ ایک واقعہ مجھے یاد ہے جس کی بنا پر میں رحمۃ اللہ علیہ کی ایمانی فراست کا بہت زیادہ قائل ہوا تھا۔

۱۹۵۵ء میں میں اپنے مخدوم و مُطاع حضرت مولانا حسین احمد صاحب ؒ کے ساتھ حج کے لئے گیا تھا اُن مقدس مقامات میں بھی ایک دوبار ملاقات ہوئی اس سفر میں مکہ معظمہ کے دوران قیام میں ایک بہت معزز شخصیت نے میرے ساتھ شخصی طور پر کچھ اچھا برتاؤ نہ کیا تھا جس کا میرے دل میں بہت مخفی شکوہ تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی شاید کسی طرح ان کے اس طرز عمل کا احساس ہو گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرے وہ مکرم ہندوستان تشریف لائے۔ میں ان سے ملنے گیا اور پھر میں ان کے اعزاز و اکرام میں مصروف ہو گیا۔ اس اعزاز و اکرام میں میں مخلص نہ تھا اور میرا یہ تمام عمل ایک انتقامی جذبہ پر مبنی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے اپنے اس جذبہ کا کسی پر اظہار نہ کیا تھا، اسی اثناء میں ایک روز رحمۃ اللہ علیہ کا صبح کے وقت ٹیلیفون آیا، مزاج پرسی کے فوراً بعد بلا کسی تمہید اور ذکر کے فرمایا۔ میں تمھیں اس طرز عمل پر مبارکباد دیتا ہوں۔ یقیناً شرفاء کے انتقام لینے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ میں نے اپنے جذبات کو پھر بھی رحمۃ اللہ علیہ سے چھپایا اور اصل حقیقت کو رحمۃ اللہ علیہ پر واضح نہ کیا۔ لیکن اس روز سے میں رحمۃ اللہ علیہ کی دینی فراست کا قائل ہو گیا تھا۔ حدیث شریف میں "اِتَّقُوا مِنْ فِرَاسَةِ الْمُومِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ" مومن کے تاڑ جانے سے ڈرتے رہا کرو، وہ اللہ کے نور کے ذریعہ دیکھ لیتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ بلاشک رحمۃ اللہ علیہ کو ایک ایمانی فراست حاصل ہے اور وہ معاملات اور واقعات کو سمجھنے میں اپنی اس ایمانی فراست سے بہت زیادہ کام لیتے تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ واسعۃً وتغمد اللہ بغفر اللہ ورضوانہ۔

عزیزم یہ چند کلمات ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اگر آپ کی رائے میں اس کتاب میں میری قلمی شرکت ضروری ہی ہے تو یہ کلمات شریک کتاب کر دیں۔

والسلام
(قاضی) سجاد حسین
۱۰/ محرم الحرام ۱۳۹۵ھ

ہوا ہے گو تندوتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جسکو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ
(اقبالؒ)

یادِ حَبیب

از مولانا محمد احمد رحمانی، لدھیانہ

مدتوں روئیں گے اربابِ وفا تیرے لئے
عُمر بھر کا داغ ہے یہ ایک دو دن کا نہیں

دارِفانی سے سبھی کو جانا ہے، لیکن جب کوئی بزرگ شخصیت دنیا سے ہمیشہ کے لئے سفر کرتی ہے تو آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں، دل چلّا اٹھتے ہیں، بستیاں ویران نظر آتی ہیں اور پورے عالم پر رنج والم کا ایک عالم طاری ہوتا ہے، کیونکہ ایسے بزرگوں کا تعلق کسی خاص خاندان یا افراد سے نہیں ہوتا بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کے لئے یہ مشترکہ سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے چلے جانے سے ہر انسان کو دکھ اور تکلیف پہنچتی ہے اور پوری انسانیت کو نقصان ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کی بے راہ روی اور گمراہیوں کے امکانات وسیع ہو جاتے ہیں۔ رئیس الاحرار حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن لدھیانوی کی شخصیت ایسی ہی تھی۔ موجودہ دور میں وہ علم وفضل، تقویٰ وطہارت، نیکی و پاکیزگی کا مجسمہ تھے اور ایک ایسے سچے انسان تھے کہ جن کا ظاہر وباطن ہمیشہ یکساں رہا اور جس نے اپنی ساری عُمر قومی اور ملی خدمات کے لئے وقف کر دی تھی۔ ایسے ہی بزرگوں کی موت کو (موت العالم) کہا جاتا ہے۔ ان بزرگوں کی موت حقیقت میں ان کی اپنی موت نہیں ہوتی بلکہ ان کی موت پوری دنیا کی موت ہوتی ہے۔

رئیس الاحرار مولانا حَبیب الرحمٰن نور اللہ مرقدہ کا پنجاب ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے ان مشہور سیاسی، مذہبی رہنماؤں میں شمار ہے جن کے نام انگلیوں پر گنے جاتے ہیں۔ آپ ۳ جولائی ۱۸۹۲ء مطابق ۱۱ صفر ۱۳۱۰ ہجری کو مُفتی اعظم پنجاب حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر پیدا ہوئے جو کہ وقت کے بڑے زبردست عالم اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ آپ نے صرف تین ماہ کے اندر قرآن پاک حفظ کیا اور رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو لدھیانہ کی مشہور دو منزلی مسجد میں ایک ہی رکعت میں چھ گھنٹے میں سنایا۔ رئیس الاحرار کا خاندان مشہور علمی، سیاسی اور مذہبی خاندان ہے۔ صدیوں سے آپ کے خاندان میں علم عرفان نسلاً بعد نسلٍ چلا آ رہا ہے۔ آج کے زمانے میں بھی ۲۹ افراد اس عظیم الشان خاندان کے ایسے ہیں کہ جنھوں نے ہندوستان کی مشہور علمی درس گاہ دارالعلوم دیوبند سے سندِ فراغ حاصل کی ہیں اور اپنے اکابر کی طرح یہ عُلماء بھی ملکی، ملی خدمات میں مصروف ہیں اور دیانت داری سے اپنے فرائض کو سرانجام دے رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں رئیس الاحرار کے جدامجد حضرت مولانا شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ نے انگریزی سامراج کے خلاف باقاعدہ جنگ کی اور لدھیانہ فتح کیا اور سب سے پہلے ملک کی سرزمین پر مولانا کے بزرگوں نے ہی قومی پرچم لہرایا۔ فتح لدھیانہ کے بعد سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی امداد کے لئے آپ دہلی پہنچے اور آخری وقت تک انگریزی سامراج کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی افواج کو شکست ہوئی اور حضرت شاہ صاحب کو دہلی کی بجائے سترانہ ضلع پٹیالہ کے جنگلوں میں قیام کرنا پڑا اور وہیں آپ نے انتقال فرمایا۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس قائم کی گئی۔ رئیس الاحرار کے دادا حضرت مولانا شاہ محمد صاحب میدان سیاست میں آئے اور آل انڈیا نیشنل کانگرس میں شامل ہونے کا فتویٰ دیا۔ اس فتوے کو ہندوستان بھر میں قبول ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کو وقت کی ضرورت اور صحیح رہنمائی

سمجھتے ہوئے پانچ صد عُلمائے ہند نے اس کی تصدیق بھی کی۔ آج سے ۷۷ سال قبل انگریزی اقتدار سے ٹکر لینا مولانا ہی کے بزرگوں کا کام تھا۔

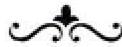
۱۹۲۱ء کی تحریک آزادی میں آپ کو پہلی مرتبہ گرفتار کیا گیا۔ اور آزادیِ ہند کے جرم میں رئیس الاحرار کو دو سال جیل میں رہنا پڑا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۴۷ء تک ملک وملت کے لئے آپ نے قربانیاں دیں اور پورے پندرہ برس قیدوبند میں گزارے۔ آخری مرتبہ دسمبر ۱۹۴۰ء میں لاہور سے گرفتار ہوئے اور ۳جولائی ۱۹۴۵ء کو رہا کئے گئے۔ جون ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کا بھیانک اعلان ہوا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی پنجاب کے دونوں حصوں میں انسانی خون کے ساتھ ہولی کھیلی جانے لگی۔ رئیس الاحرار کو حالات کی خرابی کی بنا پر اپنا عزیز شہر لدھیانہ چھوڑ کر دہلی جانا پڑا اور لدھیانہ کی بجائے دہلی رہائش اختیار کرنی پڑی۔

۲؍ستمبر ۱۹۵۶ء کی صبح کو یہ آفتاب حریت ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کے انتقال سے ملک وملت کو بھاری نقصان پہنچا۔ ان کا وجود ملت کا بہت قیمتی سرمایہ تھا۔ جو مذہبیت اور دینداری کے ساتھ ملکی اور قومی خدمت۔ ایثار اور قربانی کی تاریخ بھی رکھتا تھا۔

رئیس الاحرار کے انتقال کو ۱۹ سال ہونے کو ہیں۔ لیکن وہ کون ہے، جو کہے کہ رئیس الاحرار انتقال کر گئے، کیونکہ ان کا جاری کردہ مشن آج بھی اسی طرح جاری ہے جس طرح ان کی زندگی میں تھا۔ اور خدا نے چاہا تو ان کا یہ مشن ہمیشہ جاری رہے گا۔

خدا کرے رہے زندہ سدا پیام ترا
ہر ایک دور میں چلتا رہے یہ جام ترا

مولانا مُحمد احمد رحمانی مُفتی پنجاب
۱۶؍مئی ۱۹۷۵ء لدھیانہ



مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

متحدہ پنجاب کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا تعلق، لدھیانہ کے ایک ایسے خاندان سے تھا جو نسلوں اور پشتوں سے اپنے علم و فضل اور دین و دیانت، خدمت خلق، خدمت دین، مجاہدانہ سرفروشی اور عزیمت و بلند ہمتی میں ممتاز اور اپنی ان صفات کی وجہ سے مرجع انام تھا۔ ان کے آباواجداد میں حضرت مولانا عبدالقادر صاحب، حضرت مولانا محمد صاحب مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ یہ حضرات ہندوستان میں انگریزی سامراج کے ابتدائی مخالفوں میں سے تھے اور انھیں کی یہ خصوصیت تھی کہ مرزا قادیانی کے دعاوی باطلہ کا صحیح دینی روشنی میں ان بزرگوں نے تجزیہ فرمایا۔ اس کے فتنۂ عظیم کا مقابلہ اور اسلام کے تقاضوں سے اس پر کُفر کا فتویٰ نافذ فرمایا۔ انڈین نیشنل کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کے جواز پر بھی ۵۰۰ عُلماء کا فتویٰ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔ افسوس کہ فرقہ واریت کے شدید غلبہ نے اس کی اہمیت کے سمجھنے کا موقع نہیں دیا یہ لوگ تو مولانا حَبیب الرحمٰن کے آباؤاجداد تھے۔ ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا محمد زکریا صاحب ایک قلندر صفت، رچے بسے ہوئے بزرگ، پختہ عالم، درویش طبیعت انسان تھے، بزرگوں اور عُلماء کے ہم نشین اور بڑے بڑے وزراء اور حکامانِ وقت پر اپنے دینی دبدبہ کے ساتھ مؤثر تھے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مولانا زکریا صاحب جمعہ کے دن محلہ موچپورہ سے اپنے گھر سے کمپنی باغ کی شاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرکے تشریف لاتے تھے تو راستے میں کئی بازاروں کے دوکان دار اس خوف سے اپنی دکانیں بند کرلیتے تھے کہ مولانا ادھر سے گزریں گے۔ اگر نماز جمعہ کے قریب وقت میں ہماری دکانیں کھلی ہوئی پائیں گے تو خفا ہوں گے۔ حضرت مولانا مرحوم، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ مولانا حافظ احمد صاحب، مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا حَبیب الرحمٰن عُثمانی، حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری۔ حضرت مولانا شبیر احمد عُثمانی۔ مولانا احمد علی لاہوری۔ مولانا عبدالقادر قصوری۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے شیخ طریقت پیر مہر علی شاہ گولڑہ والے، مولانا نوراحمد صاحب پسروری، رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ حضرت مُفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن اور دوسرے سینکڑوں عُلماء اور فضلاء کے یا ہم عصر تھے یا ان کے بزرگ اور پیش رو۔ اور یہ پورا طبقہ ان کا ادب احترام کرتا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن کی زندگی میں ان کا خاندان، مولانا عبدالرشید مرحوم، عبدالحمید صاحب مرحوم۔ مُفتی ضیاءالحسن صاحب لدھیانوی، مُفتی عبدالحمید اور دوسرے بیسیوں حضرات ان کے ہمعصر تھے یا ان سے چھوٹے۔ علم و فضل کے اس لہلہاتے باغ میں مولانا حَبیب الرحمٰن نے ایک سدابہار پھول کی طرح آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل ہوئی اور پھر ابتدائی عُمر میں مرکز علمی دارالعلوم میں تشریف لے آئے۔ یہاں انھیں مولانا حبیب الرحمٰن عُثمانی کی تربیت اور حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کا فیضان التفات حاصل رہا۔ ممتاز اساتذہ وقت کی رہنمائی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور بڑی محنت کے ساتھ دینی علوم حاصل کئے۔ ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت میں مولانا پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے۔ یہیں سے ان کی مجاہدانہ دینی وسیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۶۵ء تک کم وبیش چالیس سال نہ صرف متحدہ پنجاب بلکہ پورا ہندوستان ان کے نفس گرم "تگ ودوئے پیہم" یقین محکم، اخلاص کامل، خدمت خلق اور شعلہ بار تقریروں سے گونجتا رہا۔ وہ تحریک خلافت کے جاں باز سپاہی، کانگریس کے سرگرم کارکن، مجلس احرار کے روح رواں، اسلامی مدارس کے مشیر اور خیرخواہ، اپنے نصب العین کے وفادار، اپنے ساتھیوں کے وفادار، اپنے ساتھیوں کے غم گسار تھے۔ ۱۹۳۰ء میں کراچی کانگریس میں وہ نمایاں تھے ۱۹۳۱ء میں جب گاندھی جی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جارہے تھے تو مولانا مرحوم، سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور چودھری افضل کے ساتھ بمبئی کے ساحل پر گاندھی جی کو الوداع کہہ رہے تھے۔ تحریک کشمیر نے ان کے دم سے جنم لیا۔ انگریزی زمانے کی ریاستوں میں عوام کو حق خود اختیاری دلوانے کے سلسلے میں مولانا کی بڑی خدمات ہیں۔ اپنے استاد حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے تعاون سے انھوں نے قادیانی تحریک کے استیصال کے سلسلہ میں ہمہ گیر جدوجہد فرمائی۔ تبلیغ اسلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جس پر مولانا نے کوئی توجہ نہ فرمائی ہو۔

مولانا کی جامع شخصیتؒ

از ابنِ انور شاہ کشمیریؒ

مولانا حبیب الرحمٰن کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اللہ کریم نے علم و فضل، اخلاق اعمال، تہذیب و سیاست، استغنا و توکل، فہم و فراست، خدمت دین، شغف قرآن کریم، تصوف و طریقت میں انہیں جامعیت نصیب فرمائی تھی۔ اسلامی مدارس میں پہنچ کر وہ علماء اور فضلاء کے درمیان ایک دبدبہ ور عالم نظر آتے تھے اور مسائل علمیہ و فقہیہ کی تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ عبدالقادر رائے پوری کی خانقاہوں میں پہنچ کر ذکر و شغل، مراقبۂ ذلت اور تزکیہ نفس پر ان کی نظر رہتی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی میں پہنچ کر علمی اور تاریخی انکشافات سے انہیں دل چسپی ہوتی۔ اپنے گھر پر ہوتے تو علی الصباح اپنے سب مہمانوں اور بچوں کو جمع کر کے قرآن شریف کی تلاوت اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کے ترجمہ کو سامنے رکھ کر پابندی سے تفسیر قرآن پڑھاتے۔ شاہ صاحب دہلوی کے ترجمہ سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ اس ترجمے کے دسیوں ایڈیشن انہوں نے جمع فرمائے تھے اور انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ فلاں آیت قرآنی اور فلاں لفظ کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے کیا کیا ہے۔ شاہ رفیع الدین دہلوی نے کس طرح اس مفہوم کو ادا کیا ہے۔ اور مولانا اشرف علی تھانوی نے کیا لفظ اختیار کئے ہیں۔ تراجم قرآن سے ان کی دل چسپی کا یہ عالم تھا کہ انتقال سے تین ماہ پہلے دفتر رسالہ دارالعلوم میں میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ سیّد محبوب رضوی کو بلاؤ۔ سید صاحب آئے تو تراجم قرآن پر تفصیلی گفتگو فرمائی اور ہدایت فرمائی کہ شاہ عبدالقادر کے متعدد نسخے سامنے رکھ کر ایک زائد سے زائد قابل اعتماد ترجمہ مرتب کریں۔ میں اپنی کوشش سے اسے چھاپ دوں گا۔ افسوس ہے کہ اس سے کچھ عرصے بعد مولانا کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کی یہ ہدایت پوری نہ ہو سکی جس پر میرے محترم رفیق جناب سیّد محبوب رضوی کو آج تک ملال ہے۔

مولانا لدھیانہ اور دہلی میں ہر روز اپنے محلے کا گشت فرماتے۔ ہر ہندو اور مسلم پڑوسی سے علیک سلیک اور مزاج پرسی کرتے اور جس کی جو ضرورت ہوتی بے اختیار توجہ فرماتے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات، جیل کی زندگی میں ساتھیوں کی خدمت، بیمار ساتھیوں کی تیمارداری ان کا خاص موضوع تھا۔ ان کی زندگی تک میں یا میری والدہ محترمہ جب بھی بیمار ہوئے تو مولانا اصرار کے ساتھ ہمیں لدھیانہ بلا کر مہینوں ہمارے علاج اور پرہیز گاری کھانے کا بار اٹھاتے۔ ایک مرتبہ میری والدہ صاحبہ کو بلا کر ڈیڑھ سال تک لدھیانہ رکھا۔ مہینوں ان کے قیام کے لئے الگ مکان اور ان کی کل ضروریات کا تکفل فرمایا۔ میرے بزرگ مولانا سید محمد ادریس سکھروڈی جو والد محترم حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے خادم خاص ہونے کے لحاظ سے حلقۂ انوری کے مخدوم تھے دہلی میں بیمار ہو گئے تو مولانا انہیں اپنے گھر اٹھا لے گئے اور مہینوں ان کی خدمت کی۔

مولانا کی ۳۰ سال کی زندگی اور سیکڑوں واقعات میرے حافظہ میں ہیں۔ کون کون سا واقعہ لکھوں اور کس کس کو چھوڑوں۔ ۱۹۴۶ء میں میرے برادر مولانا سیّد انظر شاہ سلمہٗ مدرسہ فتح پوری دہلی کے طالبعلم تھے۔ اردو بازار میں حضرت مولانا کی نظر ان پر پڑی۔ فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ شام کو مجھ سے احرار کے دفتر میں مل لینا، کچھ مل گیا تو تمہیں دے دوں گا اور شام کو عزیز موصوف ملے تو دس پندرہ روپے اصرار کے ساتھ ان کی جیب میں ڈال دیئے۔ سخاوت و فیاضی کا یہ عالم تھا کہ دسیوں ایسے واقعات میرے حافظہ میں ہیں۔ ان کا کوئی

دوست ان سے ملنے آیا، مولانا اسے ضرورت مند سمجھتے ہیں جب وہ اٹھ کر جانے لگا تو دروازے تک اسے پہنچانے آئے، خاموشی سے کچھ رقم اس کے حوالے کر دی۔

جرأت و بے باکی، صاف بیانی میں اپنی مثال آپ تھے۔ گاندھی جی، جواہر لال اور مولانا آزاد دل سے ان کی قدر فرماتے تھے۔ ان کے مشوروں کو گوش و ہوش سے سنتے تھے اور مولانا بے دھڑک اپنے دل کی بات ان سے کہہ دیتے اور ان کی سرگرمیوں پر انہیں ٹوکتے تھے، بہت سے لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں جب بم کا حادثہ پیش آیا تو مولانا مرحوم دوسرے روز گاندھی جی سے ملے اور فرمایا کہ اب اس واقعہ کے بعد آپ کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں یا اپنی سبھاؤں کو ختم کرو! یا مرنے کے لئے تیار رہو۔ گاندھی جی نے کہا کہ مولانا صاحب مجھے مرنا منظور ہے لیکن جو بات میرے ذہن میں ہے اسے چھپا نہیں سکتا۔ چنانچہ اس پکّے ارادے کے آدمی نے موت قبول کی مگر فرقہ واریت سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

مولانا مرحوم نے گاندھی کو اپنے استاد حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے پر بھی تیار فرمایا تھا۔ مگر گاندھی جی ۳۳ء میں گول میز کانفرنس لندن میں تھے کہ دیوبند میں حضرت علامہ کا انتقال ہو گیا اور یہ تجویز سامنے نہ آسکی۔ مولانا بڑوں کو باہم ملاتے، چھوٹوں کی علمی، تہذیبی تربیت فرماتے اور ہر شخص کے مناسب مزاج کام میں لگا دینے کا ملکہ تھا۔ حضرت مولانا تھانوی کے سیاسی مسلک سے مولانا اختلاف فرماتے۔ مگر گاہ بگاہ پوری نیاز مندی کے ساتھ حضرت مولانا تھانوی کے یہاں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو ساتھ لے کر حاضری دیتے تھے۔ شاہ صاحب بخاری کی طرف حضرت علامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیری کو متوجہ فرمانے کا سہرا بھی مولانا ہی کے سر تھا۔ پنجاب کے متعدد سفروں میں وہ حضرت شاہ صاحب بخاری کو ساتھ لے کر حضرت مولانا انور شاہ کے ساتھ رہے اور بار بار شاہ صاحب بخاری کو لے کر علامہ کے یہاں مقیم اور ان کے فیض صُحبت سے مستفید ہوئے کئی دفعہ میرے سامنے شاہ صاحب بخاری سے فرمایا کہ ان کی (حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی) باتیں غور سے سن لے۔ عُمر بھر تیرے کام آئیں گی۔

حضرت علامہ انور شاہ مولانا سے ان کے گھر، ان کی اولاد اور ان کے خاندان سے اس طرح مانوس تھے جیسے اپنے گھر اور خاندان سے۔ یہ واقعہ ہے کہ علامہ انور شاہ وقار و تمکنت کے ایک کوہِ گراں بار تھے۔ ہر کہہ و مہ سے ان کا بے تکلّف ہونا امر دشوار تھا اور نہ زندگی کے عام معاملات سے ان کا کوئی رابطہ تھا۔ مگر مولانا سے ان کی مُحبّت یہ تھی کہ جس زمانے میں مولانا حبیب الرحمٰن ملتان جیل میں قید تھے حضرت علامہ بغیر کسی اطلاع کے لدھیانہ ان کے گھر پہنچ گئے، گھر پہنچے تو مردانہ میں نہ جھاڑو لگی ہوئی تھی اور نہ فرش بچھا ہوا تھا۔ حضرت علامہ نے گھر میں مولانا کی اہلیہ صاحبہ مرحوم اور ان کی بچیوں کو کہلوایا کہ جھاڑو اور فرش بھیج دو۔ جھاڑو آگئی تو اپنے خدام سے فرمایا کہ بھائی جھاڑو دو، فرش بچھاؤ یہ اپنا گھر ہے، یہاں کسی بات کا تکلّف نہیں۔ گھر میں کون ہے جو باہر آکر ہمارے بیٹھنے کی جگہ بنائے گا؟ خود اپنا گھر سمجھو۔ میری نظروں میں آج بھی وہ منظر محفوظ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں مولانا مرحوم کے بڑے صاحب زادے مولانا خلیل الرحمٰن جیل سے رہا ہوئے تو مولانا انہیں لے کر دیوبند حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آمنا سامنا ہوا تو مولانا نے فرمایا کہ حضرت! یہ خلیل الرحمٰن ہے ابھی چند روز ہوئے سال بھر کی سزا جیل سے کاٹ کر آیا ہے۔ حضرت علامہ نے بڑی شفقت کے ساتھ مولانا خلیل الرحمٰن کے سر پر ہاتھ پھرا اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ کیوں بھائی خلیل الرحمن! یہ واقعہ یاد ہے لاؤ اپنا سر اور پیشانی مجھے دو۔ جس پیشانی پر علامہ انور شاہ کا بوسہ ثبت ہے اسے کم از کم غور سے دیکھ لوں اور اس کی زیارت کرو۔

مولانا کی زندگی کی دو حقیقتیں اور قابل ذکر ہیں۔ ایک سیاست میں ان کی دیدہ وری، ذہانت، معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت اور پس و پیش کو دیکھ کر ایک پختہ رائے قائم کرنے کی عادت۔ وہ تیس۳۰ سال بعد پیش آنے والے حالات و تغیّرات کی بُو پہلے پالیتے اور فرماتے کہ آئندہ چل کر ایسا ہوگا۔ اور ایک نہیں کئی معاملوں میں تجربہ ہوا۔ کہ انہوں نے جو سوچا تھا وہ صحیح تھا۔ تقسیم ملک سے بار بار انہوں نے فرمایا کہ ملک کا بٹوارہ

مُسلمانوں کے لئے دونوں ملکوں میں مضر ہوگا۔ مُسلمان اس طرح ہل ہل جائیں گے کہ انہیں اپنا وجود باقی رکھنا مشکل ہوگا۔ اسی احساس کے پیش نظر انہوں نے نیشنلسٹ مُسلمانوں کی صف اول کی قیادت فرمائی اور تقسیم کو روکنے کے لئے، تقسیم کا مطالبہ کرنے والے مُسلمانوں کے بھرے ہوئے ہجوموں اور مجمعوں کے تشدد کا شکار بنتے رہے لدھیانہ میں ایک وقت ایسا آیا کہ صدیوں کی گہری مقبولیت کے باوجود لیگی طبقہ نے ان کی جان لینے کی بھی کوشش کی۔ مولانا تقسیم ملک کے جو نتائج سوچتے تھے افسوس ہے کہ وہ بعد میں حرف بحرف پورے ہوئے۔ ۴۵ء میں کشمیر کے اندرونی مسائل کے جھگڑے شروع ہوگئے۔ مولانا کو معلوم ہوا کہ مجھے کشمیر کے اس حلقے سے ہمدردی ہے جو اس وقت برسر اقتدار نہ تھا۔ مولانا نے ایک گفتگو میں مجھے کشمیری کے سبھی سیاسی لیڈروں کے ماضی اور حال سے واقف کرایا اور فرمایا کہ تم جس طرح سوچتے ہو بات اس طرح نہیں۔ کشمیر میں یہ کوئی اصولی سیاست کا تنازعہ نہیں بلکہ ذاتی اقتدار کی جنگ ہے۔ بعد کے حالات نے مجھے مولانا کی رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور کر دیا۔

دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ اپنے مذہبی عقائد اور سیاسی خیالات میں پختہ تھے۔ مگر دوسرے خیالات کے لوگوں سے کھل کر ملتے اور ان سے شفقت آمیز تعلقات رکھتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ بہت سے خیالات کے افراد ان کے ارد گرد جمع ہوتے۔ سیاسی بحث ومباحثے بھی ہوتے اور مذہبی مسائل پر اظہار خیال بھی۔ مولانا بھی پوری قوت کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرتے مگر دوسروں کے خیالات بھی ٹھنڈے دل کے ساتھ سنتے اور ان کی تردید میں ایسا انداز اختیار نہ فرماتے کہ ذاتی طور پر ان لوگوں کی دل شکنی ہوتی۔ مولانا کی ذات اور ان کا گھر، سلجھے ہوئے شریف لوگوں، قومی کارکنوں، پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبروں، اخباروں کے ایڈیٹروں، کالجوں کے پروفیسروں، دینی مدارس کے عُلمائ، شعراء اور ادبا کا مرکز تھا۔ سیاسیات سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگوں نے ان کی خدمت میں صرف اس لئے حاضری دی کہ ان کے اشارات کی روشنی میں اپنے خیالات مرتب کریں۔

مولانا کے جاننے والے اور ان کے ہزاروں عقیدت مند ان کے انتقال پر ۱۵، ۲۰ برس گزر جانے کے باوجود آج تک نہیں بھولے اور سچ یہ ہے کہ وہ اتنی قیمتی زندگی رکھتے تھے کہ تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ مولانا کے صاحبزادگان جو دہلی اور مشرقی پنجاب میں منقسم ہیں اچھے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ مولانا کی قبر جامع مسجد دہلی کے شمالی رخ پر ایک مختصر سے قبرستان میں ہے۔ پچھلے برس میں ان کے مزار پر حاضر ہوا۔ ایصال ثواب کیا اور پھر دیر تک سوچتا رہا کہ کتنی بڑی زندگی کیسا نکھرا ہوا اخلاق، کتنا مضبوط کیریکٹر اور کیسی بے مثال فراست اس گوشۂ قبر میں آسودۂ راحت ہے

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
اور زمیں کھاگئی آسماں کیسے کیسے

سید محمد اظہر شاہ قیصر کشمیری
دارالعلوم دیوبند
یکم اگست ۱۹۷۵ء



ذکرِ حبیب

عجیب بات ہے! یہ فیصلہ آج کتنا مشکل و دشوار ہو گیا کہ ہمارے لئے دورِ غلامی اچھا تھا یا وہ آزادی جس کے لئے ایک صدی ہندوستان نبرد آزما رہا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جو آزادی نصیب ہوئی اور جس کے سائے میں ۱۹۷۵ء بھی شروع ہو چکا، تلخ حالات، مشکلات و مصائب، خونریزی و سفاکی بہیمیت اور درندگی، یتیم بچوں کا نالۂ وشیون، بے آسرا عورتوں کا گریہ و بکا، لٹے ہوئے قافلے، کٹے ہوئے انسان، ہجرت، ترک وطن، ان سب کے ہوتے ہوئے کیا یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ ہمارا غلامی کا دور اچھا تھا یا آزاد فضاؤں کے یہ گھٹے ہوئے سانس؟ کچھ بھی ہو اور اس سوال کا جواب کسی انداز میں دیا جائے۔ لیکن اتنی بات تو بہر حال ہے کہ مردم خیزی کا وہ دور جس کی تابانیاں غلامی کے دور میں رونق افزا تھیں۔ آزاد ہندوستان میں تو دور تک اس کا نام ونشان نہیں، جماعتیں آج بھی بن رہی ہیں اور تازہ دم قائدوں کی بھانت بھانت کی بولیاں کانوں کے پردوں کو چیرتی پھاڑتی اب بھی سننے میں آتی ہیں۔ لیکن غیر مخلصوں کا ایک ہجوم اور اخلاص ناآشنا جماعتوں کی ایک بھیڑ جو اقتدار کی جنگ میں مصروف اور اسی مقصد کے لئے ایک کشاکش کی کیفیت منظر عام پر! کہاں وہ عہد زریں کہ فعال جماعتیں، مقصد کی لگن، مشترکہ جدوجہد، سوزواخلاص، تپش وتڑپ۔ طبقۂ عُلماء میں ایسے نامور جن کے علم کے پھریرے از شرق تا غرب اڑتے، جماعت قائدین کی جانب آیئے تو فدائیت وجاں سپاری کے مرقعے، عزیمت واستقلال کے پہاڑ، بلند ہمتی کے اٹھتے ہوئے طوفان، بہتے ہوئے دریا، خونخوار لہر، چلتے پھرتے جھکّڑ، دوڑتی ہوئی آندھیاں، اس نئی نسل کو آج کس طرح سمجھائے کہ کیا تھے، حبیب الرحمٰن لدھیانوی کون تھے؟ عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، شیخ حسام الدین، مظہر علی اظہر، محمد علی جالندھری، ظفر علی خاں، اختر علی، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر اور جوانوں میں صاحبزادہ سُلیمان، جانباز، آغا شورش، خلیل الرحمٰن لدھیانوی اور عزیز الرحمٰن جامعی۔ ہاں ذکر رہا جاتا ہے ڈاکٹر محمد عالم کا اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کا.... " آج اگر ان شخصیتوں کا حدود اربعہ بیان کیجئے یا ان کا طول وعرض! تو مبالغہ آرائی کی تہمت اپنے سر لیجئے، سننے والے تو کیا یقین کریں گے جنہوں نے اس کاروان کے غبار اور بہت دور سے کھڑے ہو کر گرد راہ کو دیکھا ہے وہ بھی اب یہ کہتے ہیں کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

اور یہ حال تو صرف اس ایک جماعت کا ہے جو نام کی بھی "احرار" تھی اور اس کے اردگرد جمع ہونے والے واقعی "احرار" جن کے ذہنوں نے کبھی غلامی کو قبول نہیں کیا، جن کی روحیں ہمیشہ آزاد رہیں۔ وہ دہلی جیل میں ہوں یا ملتان ولاہور کے قید خانے میں۔ منٹ گمری دھرم شالہ کے بندی خانوں میں یا سابرمتی میں۔ ان کے جسم گرفتار کئے جا سکتے تھے، مگر ان کے ولولے بدستور آزاد رہتے۔ وہ ضمیر کے اتنے آزاد تھے کہ طمع کی کوئی زنجیر انہیں پابند نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ فقیر بے نوا ہونے کے باوجود اس قدر غیور تھے کہ ان کی غیرت قومی وملی پر حرص و آز کی کوئی پرچھائیں نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس سے ہٹ کر ذرا یاد کیجئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو، حکیم اجمل خاں صاحب کو، ڈاکٹر انصاری کو، مولانا ابوالکلام آزاد کو، مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو، اور کوہ آتش فشاں مولانا حفظ الرحمٰن کو اور ذکر کیوں چھوڑیئے گاندھی جی کا، موتی لال نہرو کا، جواہر لال نہرو کا سردار پٹیل کا، گووند ملبھ پنت کا، راجندر بابو کا، پٹہ بھائی سیتارامیا کا۔ راؤ شنکر دیو کا، اور بلبل ہند سرنہ جنی نائیڈو کا، اور انہیں بھی یاد رکھیئے! فتنہ جو دو بھائی سوبھاش سرت چندر بوس، آچاریہ نریندر دیو، اچت پٹوردھن، کرپلانی جی، رام منوہر لوہیا اور بدنام کنندۂ نکونامے چند اچے پرکاش نرائن اور یہ تو بھلانے کے قابل ہی نہیں وجے لکشمی پنڈت، ارونا آصف علی، مردولا سارابھائی۔ اور شعراء میں جوش ملیح آبادی، ظفر علی خاں،

عبد الکریم شورش اور بے چارہ شاعر انقلاب انور صابری غرض کہ کس کو بھولیئے، کس کا ذکر کیجئے، یاد کیجئے تو ایک ایک ذرہ آفتاب۔ بھولنے پر آیئے تو مہر نیمروز کسی لق و دق وادی میں جھلمل کرنے والا ایک ذرّہ بے نام و نشان یہی قافلہ جو ہندوستان کی جنگِ آزادی میں بگل بلب، درّانہ چلا جاتا تھا، قیامت بدوش، ہنگامہ بدست، شعلہ بخاکستر، انہیں میں ایک نافراموش ہونے والی شخصیت بلکہ فراموش نہ کی جانے والی ہستی، رئیس الاحرار "مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی المغفور کی بھی تھی۔ جن کا آفتاب زندگی سپہر ہندوستان پر طویل گردش کے بعد دلّی مرحوم کے افق میں ہمیشہ کے لئے چھپ گیا۔ شاجہانی مسجد کے زیر سایہ، نمناک خاک کے نیچے، عظمتوں کا ایک مینار، تقدس کی محراب، شرف و رفعت کا ممبر، عزم کا ہمالہ، تدبیر و تدبر کا ایک آتش جوالہ پڑا سوتا ہے۔ اسی مسجد کے شمالی دروازے پر کھڑے ہو جایئے، بلند و بالا سیڑھیوں پر نظر ڈالئے، اس نظر کی پہلی منزل ایک غیور انسان کی ابدی خواب گاہ ہے۔ سامنے سڑک اور دریبہ کلاں کے چوک ہیں۔ بے تاب انسان، دوڑتا، بھاگتا، ہانپتا کانپتا، گرتا پڑتا نظر آئے گا۔ انہیں کیا معلوم کہ اس سے متصل چاردیواری میں ایک طوفان رکا ہوا ہے یہ کیا جانیں کہ ایک آندھی جس نے پورے ہندوستان کو کبھی زیروزبر کر دیا تھا۔ وہ یہاں آکر تھم گئی، بقول شاعر

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا یہ ہے

یہی آپ کا اور ہمارا ہندوستان محسن کشی جس کی فضاؤں میں اس طرح گھولی گئی جیسا کہ زہر انسانی جسم کے ایک ایک رگ و ریشہ میں پہنچ جاتا ہے۔ حیرت ہے اردو کے ایک شاعر نے کن تاثرات و احوال میں یہ شعر اپنے تبرکات میں چھوڑ دیا۔

ہزار شکر کہ مرنے کے بعد قدر جانی
ہزار شکر کہ مردہ مرا پسند ہوا

خیال یہی ہے کہ محسن کشی گرد و پیش میں شاعر کا یہ خیال عام احوال و مشاہدات کے مطابق نہیں! بلکہ حالت اسی معشوق طنّاز کی صرف بیان کی گئی ہے جس نے عمر بھر عاشق نیم جان کی ناقدری کی اور مرنے کے بعد اس سراپا اخلاص کی یاد آئی، ورنہ ظاہر ہے کہ جس جہان کے زمین و آسمان نے گاندھی جی کو بھلا دیا، جس کے ذہنوں سے آزاد اتر گئے۔ حکیم اجمل خاں غائب ہوئے، ڈاکٹر انصاری فراموش کر دیئے گئے اور حسرت موہانی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ شیخ الہند ایک فراموش شخصیت اور غریب محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی تو متروکات سخن میں سے ہیں۔ اس جہان بے نشان میں شاعر کا عام تاثر لوگوں سے متعلق کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ بہر حال مبتدا تو بہت دور گیا۔ طول طویل جملہ معترضہ کے بعد آیئے اب خبر کی جانب کی "غلام ہندوستان نے اپنے عہد غلامی میں ہر جانب اور ہر شعبہ میں آفتاب و قمر پیدا کئے تھے مگر آہ اے ہندوستان!! اب تو ہی وہ عقیم ملک ہے جس کا دور آزادی غلامی کی پُر صعوبت گھڑیوں سے بھی زیادہ خوفناک اور تیرہ تار ہے۔ لدھیانہ موجود ہے، پہلے سے بہت پُررونق اور آباد، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ایک حبیب الرحمٰن پیدا نہ کر سکا.... یہ سرزمین دیوبند میں دارالعلوم کی کوہ پیکر عمارت بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن شیخ الہند، علامہ انور شاہ، مفتی کفایت اللہ اور علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی پھر یہاں پیدا نہ ہوئے۔ علی گڑھ کی چھاتی پر یونیورسٹی کی عمارت دندناتی ہے۔ اس کے حدود اربعہ کو لیجئے تو طول و عرض کی پیمائش مشکل ہی بات ہے مگر کوئی محمد علی، کوئی ضیاء الدین، کوئی لیاقت علی خاں پھر پیدا نہ ہوا۔ الہ آباد کے سنگم پر آج بھی لاکھوں مکتی کے طالبعلم غوطہ زن ہیں مگر موتی اور جواہر کسی خوش نصیب غوطہ زن کے ہاتھ نہ لگے۔ بقول شاعر ؏

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو

ساز کو دیکھا ہو گا کہ مضراب اس کے خاموش تاروں کو ایک نالۂ وشیون سے آگاہ کرتا ہے۔ ملک کے اسی خاموش ساز کو دستِ ناتواں

کے مضراب سے یہی سوالات پوچھ کر، چھیڑنے کی کتنی ناکام کوشش کر رہا ہوں، صور اسرافیل شہر خموشاں کو ہلچل میں لا سکتا ہے، نالہ نیم شب سوتے ہوؤں کو جگا سکتا ہے۔ آہ و بکا نے سینوں میں موجود دلوں کی چٹانوں کو پگھلا دیا۔ سب کچھ ہوا لیکن اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا،.... یہی رئیس الحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی جو کم از کم نصف صدی سیاست کے گردوں پر آفتاب کی طرح چمکتے رہے۔ افسوس کہ اس کاروان عزم و استقلال کی روانگی کے بعد غبار راہ بھی نایاب ہے،.... آہ!! کہ آج مولانا حبیب الرحمٰن کو سمجھانے کے لئے قلم مصروفِ خرام ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ وہ جس جماعت میں ہوتے اس کا تعارف ہوتے، جہاں سے نکل جاتے ان کے پیچھے ایک آندھی دھماکہ خیز انداز میں اٹھتی اور گزرنے والے کی اطلاع دیتی۔ بہر حال اب تو خواہی نہ خواہی یہ ناگوار فریضہ بھی انجام دینا ہوگا۔ مرحوم سے متعلق کچھ یادیں ہیں۔ شاید ان دھندلے چراغوں میں کسی آفتاب کا سراغ لگ سکے۔ مگر کیا عرض کروں۔ شاعر نے کہا تھا۔

عہدِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

بہ ادنیٰ تصرف مصرعہ اولیٰ جو صورت حال کا صحیح ترجمان ہے، عرض ہے ؎

"عہدِ طفلی اور شباب کی باتیں"

مولانا کو دیکھنا تو نصیب ہوا مگر خود وہ اس بد نصیب کا عہد طفلی تھا.... زندگی نے انگلی پکڑ کر آگے بڑھایا اور طفولیت نے دھکیل دھکیل کر سن شعور تک پہنچایا تو مولانا گورستان کی زینت بن چکے تھے،.... الحاصل! مطالعۂ زندگی ناتمام، مرحوم کے خدوخال سے واقفیت ناقص، پھر لکھوں تو کیا لکھوں، مختصر یہ کہ دید و شنید دونوں کو جمع کرتا ہوں۔

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

جن حقیقتوں کو دنیا اپنی طویل ترین زندگی میں تجربے میں لا چکی اور جن کے لئے عرف عام میں (سامنے کی بات) کا عنوان دیا گیا ہے، ان حقائق کو کون جھٹلا سکتا ہے بات یہ کہنا ہے کہ ملکی اثرات، قومی اثرات، نسلی اور قبائلی اثرات اور خاندانی روایات سے انسان جُدا نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ ایک مسلمہ ہے جس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں تو پھر مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے اس جوش اور ولولۂ جہاد بلکہ حریت پسندانہ جذبات کا کس طرح انکار ممکن ہے جو مرحوم کو اپنے خانوادہ سے وراثتاً ملے تھے۔ آپ ہی کے جد امجد مولانا عبد القادر صاحب لدھیانوی، لدھیانہ کے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی استخلاص وطن کی تحریک میں براہ راست مجاہدانہ شرکت کی۔ گویا کہ مولانا اس لگی ہوئی آگ کے دور سے تماشائی نہیں تھے بلکہ اپنی تمام توانائیوں کے ساتھ دڑانا اس میں کود بھی پڑے تھے۔ شہادت کسی اور کی نہیں بلکہ اس ہنگامہ ریز بلاخیز دور کے اس مصنف کی ہے جو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر قریب ترین مشاہد بنا ہوا تھا۔ استخلاص وطن کا مشہور ڈائری نویس "عبد اللطیف" اپنے روزنامچہ میں رقم طراز ہے:

"ہم ہمیں روز پس از خیمہ روز مردمان تونک با مولوی عبد القادر متوطن لدھیانہ آمادۂ ستیز شدند" ص ۷۱

یعنی ۲۷ جون کو مولانا عبد القادر کی زیر سرکردگی ٹونک کی ایک تازہ دم ٹکڑی فرنگیوں سے متصادم ہو گئی۔" مترجم جناب خلیق احمد نظامی کا یہ اضافہ بھی قابل غور ہے کہ " مولانا عبد القادر نے لدھیانہ سے دہلی آکر مسجد فتح پوری میں قیام کر لیا تھا۔" ص ۱۹۷ مصنف و مترجم دونوں کی یہ وضاحت مولانا عبد القادر صاحب کی شرکتِ جہاد کو ہر شک و شبہ سے بالاتر قرار دے رہی ہے۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ مولانا موصوف نے صرف رسمًا ہی شرکت نہیں کی تھی بلکہ اس رُستہ خیزی دور میں دہلی ہی میں فروکش ہو گئے تھے، اس ہنگامہ کے بظاہر فرد ہونے کے بعد مولانا ہی کی ذات گرامی تھی کہ آپ نے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ لے کر اس کی عام

اشاعت کا سر وسامان بہم پہنچایا تھا اور یہیں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ موصوف شعلہ بدامن ہونے کے ساتھ شعلہ زن بھی تھے اور جو آتش فشاں لاوا ان کے اندر ہی سلگ رہا تھا پھوٹ کر وہی آتش سیال ملک میں تموج پذیر تھا۔ بہتر حال ایک ایسے ماحول میں نشوونما پانے والے طفل نوخیز سے کیسے ممکن تھا کہ حریت پسندی کے اسی سودا سے اس کا سر سمایا ہوا نہ ہو جو اس کے خانوادہ کی وراثت تھی!

پھر اس بات کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ جس عہد میں مولانا لدھیانوی مرحوم کا عہد طفلی تا شباب گزر رہا تھا وہی اس بد قسمت ملک کا وہی رستاخیزی دور ہے جس میں آزادی کی آگ ملک کے اندرونی حصوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی اور اسے بھی ملحوظ رکھئے کہ مولانا اسی سرزمین پنجاب کے ایک فرد تھے جہاں کے باشندے اپنی مخصوص پرجوش طبیعتوں کے اعتبار سے پورے ہندوستان کے مکھن کہے جانے کے مستحق ہیں۔

طالب علمی

چنانچہ وہ جس زمانے میں دارالعلوم میں طالب علمی کا دور گزار رہے تھے حضرت مولانا زکریا صاحب سہارن پوری جن کا تعلق "مظاہر علوم" سہارن پور سے تھا مصلحت وقت کہئے یا جذبات کا ٹھٹھر جانا!! اس علمی و دینی درس گاہ کو حریت پسندی کی پرچھاؤں سے بھی محفوظ رہنے کی کوشش کی گئی تھی، پھر بلا کیسے ممکن تھا کہ مولانا سہارن پوری اسی نمناک ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود آزاد فضاؤں میں گرم سپر ہوتے۔ ادھر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی معاصرت، طبیعت کی تیزی اور ولولوں کا عہد شباب! مولانا زکریا صاحب ہی کا بیان ہے کہ

..."میں جب کبھی دیوبند آتا اور مولانا لدھیانوی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ اپنے ایک مخصوص طنزیہ جملہ کا مجھ کو نشانہ بناتے۔"

طنز اسی جمود و تعطل پر تھا جس سے مظاہر علوم اور اس کے فرزند گزر رہے تھے یا گزارے جا رہے تھے۔ اس خاکسار کے قلم میں اب وہ تاب و حوصلہ بھی نہیں کہ اس طنز کو نقل ہی کر دے!.... کچھ بھی ہو، اتنی بات تو واضح ہے کہ مولانا حبیب الرحمن، اس دور میں اپنے اندر دعوتی رنگ پیدا کر چکے تھے اور ان کی ہنگامہ ریز طبیعت کسی مصلحتی فقدان عمل سے ساز کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ پھر دارالعلوم دیوبند کا اس پر ماحول مستزاد کہ اس کارخانۂ علم و عمل کے بانی ہی نے ۱۸۵۷ء میں ان ہی بکھرے ہوئے منتشر جذبات حریت کو دارالعلوم کی شکل دی تھی۔ جن جذبات نے لاکھوں ہندوستانیوں کے لئے سر و تن کی قربانی اور گھر و بار کی ویرانی آسان تر کر دی تھی، سننے کے قابل ہے یہ ایک تاریخی لطیفہ بھی کہ خود دارالعلوم پر بھی ایک ایسا وقت آیا کہ یہاں کا مصلحت بیں طبقہ اس دانش گاہ کو جنگ آزادی سے دور تر رکھنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ ٹھیک انہیں اوقات میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ حریت پسندی کا طوفان اپنے دوش ناتواں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ سوچا یہی گیا کہ حضرت مرحوم کو بھی وقتی مصلحت کے اس گر سے واقف کر کے ان کی مساعی کو بھی محدود تر بنا لیا جائے۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لئے المغفور مولانا مناظر احسن گیلانی کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ آپ کی تحریک کے شدید ردعمل سے دارالعلوم کو بھی نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہے اور بات غلط بھی نہیں تھی بلکہ برطانیہ کے دارالعوام میں خاص دارالعلوم پر بھی سوال و جواب ہو چکا تھا اور فرنگی سیاست کے بڑے بڑے جغادری ہندوستان میں دارالعلوم کی ان تیز گامیوں پر مطلع تھے، جو اس ادارے کی سربراہ کی قیادت میں مسلسل جاری تھیں۔ القصہ! مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہی کا بیان ہے کہ.... "تحریک سے عارضی دست برادری کے اسی پیغام لطیف پر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا.... "کہ ان سے جا کر کہہ دو!! کہ حضرت بانی قدس سرہٗ (حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ) کے ان عزائم پر میں سب سے زیادہ مطلع ہوں، جو اس دانش گاہ کے قائم کرنے سے متعلق تھے اور یہ بھی کہو کہ دارالعلوم در حقیقت ایک فوجی چھاؤنی ہے جس پر بانی قدس سرہٗ نے علم و دانش گاہ کا پردہ ڈال دیا۔" والقصۃ بطولھا....

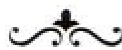
حاصل اس جملہ معترضہ کا یہ ہے کہ اسی فوجی معسکر میں حبیب مرحوم جیسا بانکا مجاہد طالب علمانہ داخلہ لینے کے بعد ایک جاں سپار و

فدائے حریت مجاہد بن کر نہ نکلتا تو اور کیا بنتا۔ جب درس گاہ کے چھوٹے اور بڑے حریت پسندی کی آگ کو نگل رہے تھے اور ان کے نہاں خانے سے بھی آگ انگارے بن کر نہ نکلتی تو کیا پھر سرد پانی کے ذخیرے یا ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے سامنے آتے۔ کوئی الجھا ہوا سوال نہیں ہے صاف اور بے غبار حقیقت کو آخر کس لئے فلسفیانہ موشگافیوں کے نذر کر دیا جائے.... بہر حال یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ مولانا کی سہ آتشہ شخصیت میں ان کی خاندانی روایات دار العلوم دیوبند کے حریت پسندانہ محرکات اور سرزمین پنجاب کی شعلہ نوائی کو خاص دخل تھا۔ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ خود کاتب الحروف کا عہد طفلی تھا اور مرحوم ایک ایسی عمارت تھے جو شباب کے دور سے گزر کر بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی، اس لئے ان کے سیاسی کارناموں و دینی خدمات کا احصا نہ کر سکتا ہوں۔

ہم یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالباً چالیس سال وہ ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایک آندھی کی طرح گرم رفتار رہے، ہندوستان کی ایسی کون سی حریت پسند جماعت ہے جس سے مولانا کا قریبی تعلق نہ رہا ہو، کانگریس، جمعیۃ العلماء، خلافت کمیٹی اور آخر میں ان کا اوڑھنا بچھونا جماعت احرار تھی، جس کے وہ رئیس الاحرار تھے۔ بارہا ان کی تقریروں میں سنا گیا کہ اس مؤخر الذکر پارٹی کے پچاس ہزار رضا کار تھے، جن کی قیادت وہ انجام دیتے۔ اس جماعت کا دائرہ کار پنجاب خصوصی طور پر اور یوپی میں سہارن پور میرٹھ، مراد آباد، بجنور، دہلی اور کشمیر تک سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ پنجاب بشمول ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کو وہ اپنے ناخن تدبیر سے کھولتے اور ہر تحریک میں قائدانہ ان کی شرکت ہوتی، بالآخر آزادی کا جو خواب وہ خاندانی طور پر دیکھ رہے تھے، ۱۹۴۷ء میں اس کی بھیانک تعبیر سامنے آئی۔ بھیانک اس لئے کہ وہی لدھیانہ جو ان کی جائے پیدائش تھی اور جہاں کے ذرے ذرے میں وہ آزادی کے نقیب کی حیثیت سے روح پھونک چکے تھے۔۔۔ آزادی نے اسی لدھیانہ کو ایک اجڑا ہوا دیار اور ان کی آنکھوں کے سامنے شہر خموشاں بنا دیا۔ سوچتا ہوں کہ ان کا سوانح نگار اس دلدوز سانحہ کی تعبیر کن الفاظ و انداز سے کرے گا کہ اسی لدھیانہ میں ان کا گھر اجڑا، ان پر حملہ ہوا، وہ معاشی ابتریوں کا شکار ہوئے۔ اپنوں نے آنکھیں چرائیں، غیروں نے آنکھیں دکھائیں ایک کیمپ میں وہ مقیم رہے اور ایک مہاجر قافلے میں بعنوان ہجرت اس پاکستان میں ان کو امن ملی، جس کے تخیل کی پاتال پر ربع صدی انہوں نے تیشہ زنی کی تھی۔ ہندوستان کی سیاست اگر ہچکولے لے رہی تھی تو ان زلزلوں کا شکار کم از کم حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ دوبارہ ہندوستان آئے لیکن یہاں کی زمین و آسمان بدل چکا تھا۔ انہیں اپنی جلیل خدمات کا کوئی گراں قدر معاوضہ تو درکنار اس ساری فدئیت کا کوئی معترف بھی نہیں ملتا تھا.... غالباً ان کا سکونِ دل ہلا، ان کے دماغ نے جواب دے دیا، ان کے عزائم ٹھٹھر گئے۔ ان کے ولولوں نے یہ کہہ کر کفن کی چادر ہمیشہ کے لئے تان لی ؎

دیارِ عمر میں اب قحط مہر ہے فانی
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

مکرر عرض کرتا ہوں کہ سیاسی زندگی کے نشیب و فراز اور اس راہ کے پیچ و خم میں ان کی جوانی اور بیباک کارناموں کے لئے خود ان کے فرزند ارجمند مولانا عزیز الرحمٰن جامعی کی "رئیس الاحرار" کا مطالعہ کرنا چاہئے۔



فتنہ ارتداد قادیانیت اور اس کی سرکوبی

یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ علمی و دینی، سیاسی و سماجی متنوع خدمات کے کسی شعبہ میں پیچھے نہیں رہتے۔ اس درس گارہ کی تربیت، زندگی کو ایک ایسے رخ پر ڈالنے کی ضامن ہے جہاں کا فاضل کبھی محدث، گاہے مفسر، داعی، امیر کارواں، مبلغ دین اور ہمہ جہت کوششوں کا امین ہوتا ہے۔ اسے مسیلمہ کذاب کے مقابل فریضۂ حق ادا کرتے ہوئے شمشیر بدست بھی دیکھا جاسکتا ہے اور خانقاہوں کے گوشوں میں "ہو حق" کے نعروں میں مصروف بھی، وہ تبلیغ دین کے لے کمربستہ بھی نظر آئے گا اور اس کا فیضانِ علم چہار سو مواج بھی دکھائی دے گا۔ ان روایات پارینہ کی امین و محافظ رئیس الاحرار کی ذات بھی تھی، ادھر ان کا شباب تھا اور دوسری جانب فتنہ قادیانیت کا عروج، ان کی خصوصی جماعت نے دین کے اس سب سے بڑے مہلک فتنہ کو محسوس کیا اور احرار کی تمام توانائیاں دین محمدی کے خلاف اس کھلی بغاوت کو کچلنے کی خاطر جمع کر دی گئیں۔ پنجاب کے ایک ایک گوشہ میں ختم نبوت کے راگ اس پُر سوز لب و لہجہ میں الاپے گئے کہ اب ۱۹۷۴ء میں ان کی بازگشت پاکستانی پارلیمنٹ میں سنی گئی۔ مولانا کے دادا مولانا شاہ محمد صاحب نے ۱۳۰۱ھ میں قادیانیوں کے خلاف فتویٰ دیا۔

انہوں نے قادیان کی زمین پر نعرۂ حق بلند کیا اور کشمیر کے کوہساروں کی چوٹیوں تک اسے پہنچا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا کی یہ جلیل خدمات ان کے لئے زاد آخرت ثابت ہوں گی اور انصاف پسند مورخ کا قلم مستقبل قریب میں جب ان ذروں سے قادیانیت کے خلاف جدوجہد کا آفتاب بنائے گا تو اس کی شعاعوں میں حبیب الرحمٰن کے وجود کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔ مقدمہٴ بھاول پور جس میں ان کے استاد و دینی قائد علامۃ، الامام حضرت مولانا السیّد محمد انور شاہ الکشمیری طاب ثراہٗ نے حضرت مولانا شاہ محمد لدھیانوی کے فتویٰ تکفیر مرزا جو کہ ۱۳۰۱ھ میں دیا گیا تھا اور عُلماء دیوبند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا یعقوب کے دستخطوں سے شائع ہوا تھا، کے بعد امت مرحومہ کے سامنے قادیانی فرقے کو امت سے علیٰحدہ کرنے کی راہ دکھائی۔ مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے خاندان کی شرکت اس مقدمہ میں ایک حقیقت ہے۔ علامہ مشرقی سے دو دو ہاتھ، سر سکندر حیات خاں سے نبرد آزمائی، خضر حیات سے جنگ و جدال، مسجد شہید گنج کے لئے تڑپ، مولانا کی خدمات کے وہ جلی عنوانات ہیں جن میں ان کے کارناموں کو تلاش کیا جاسکتا ہے اور یہ توکل کی بات ہے کہ ہندوستان میں جماعت اسلامی کی دینی بے راہ روی پر اکابر عُلماء کو مرکز واحد پر جمع کرنے کی پوری ذمہ داری مولانا حبیب الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کے دوش ناتواں پر تھی، پاکستان میں کچھ پہلے اور ہندوستان میں ۱۹۷۴ء میں جماعت اسلامی کی طویل قلابازیوں کے بعد اس کے چہرے سے وہ نقاب کشائی خود جماعت کے امیر نے کی اور تاریخ کے اس ہائلہ کو دہلی ہی کی زمین پر دہرایا گیا اور اسی شکل و صورت میں جس میں عنایت اللہ مشرقی نے اپنے فکر کے پورے سرمایہ کو جمنا کی موجوں کے نذر کیا تھا۔ اسی سے بالکل قریب اسی دہلی کی شاہجہانی مسجد کے زیر سایہ جماعت اسلامی نے بھی اپنے تخیل کو ہوا سے بھرے ہوئے غبارے کی طرح فضا میں اڑا دیا اور اس طرح مولانا حبیب الرحمٰن کی اس دانش مندی کو تسلیم کر لیا اور ان کی عاقبت بینی کی تصدیق کر دی جو انہوں نے ۲۵ سال پہلے جماعت کے ڈھانچے کا جائزہ لینے کے بعد قائم کی تھی۔ مولانا مرحوم ایک نقاد طبع ہونے کے باوجود طالب علمی ہی میں سیاسی جھمیلوں میں اس طرح الجھ کر رہ گئے تھے کہ طالب علمی کی واقعی مراعات وہ قائم نہ رکھ سکے، مگر اس کے باوجود وہ فطری طور پر علمی ذوق کے آدمی تھے۔ صبح کو ان کے یہاں حنار (یعنی حاضری) مجلس کے سامنے ایک تفسیری نشست ہوتی جس میں قرآن مجید کے متعدد تراجم پڑھے جاتے اور مولانا تفسیری نکات اہتمام سے بیان فرماتے۔ حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ الدہلوی کے ترجمہ سے انہیں عشق تھا اور اس

پاکیزہ والہامی ترجمہ کے مسلسل مطالعہ سے اس کی گہرائی وگیرائی پر تمام واقفیت رکھتے۔ عام مجلسوں میں بھی آیاتِ قرآنی اور حضرت شاہ صاحب کے افادات کو جاذب انداز میں پیش فرماتے، اپنے استاذ حضرت علامہ کشمیری کے ارشادات پر بھی عبور تھا اور جابجا ان کا افادہ فرماتے، سیاسی بکھیڑوں کے باوجود دعوتی رنگ بھی ان پر غالب تھا اور غیر مُسلم حلقہ کو اسلام کی خوبی وزیبائی پر مطلع کرنے کی تڑپ سے خالی نہیں تھے۔ آزاد ہندوستان میں جب فرقہ پرستی، ذہنیتوں کو اتھل پتھل کر رہی تھی، اور مسجد کے بلند وبالا میناروں سے اذان کی آواز بھی فرقہ پرستوں کو ناگوار گزرتی تھی تو مرحوم مولانا نے ان ناگوار جذبات کو ایک عجیب انداز میں ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اذان کا ہندی ترجمہ شائع کیا اور غالباً اس کے ساتھ مختصر تشریح بھی خاص اشاعت غیر مُسلم حلقے میں کی گئی اور بتایا گیا کہ خدا کی عبادت کے لئے یہ دعوت خود اپنی تعبیر میں کتنی شیریں اور کتنی لطیف ہے، مولانا کی یہ کوشش بروئے کار آئی اور اذان کی آوازوں سے بدکنے والا طبقہ ان حلاوت آمیز کلمات کی مٹھاس خود محسوس کرنے لگا.... غیر مُسلم دوست واحباب کا وسیع ترین حلقہ جو مولانا نے اپنی ذاتی صلاحیتوں سے بنایا تھا، اسے اسلام کی خوبیوں پر مطلع کرتے اور اس طرح بلا وجہ بدگمانی کی بنا پر اس تلخی اور بعد کو دور فرماتے جو مختلف مذاہب میں دیدہ ودانستہ اسلام کے خلاف پیدا کر دی گئی ہے۔

خطابت

عجیب بات ہے کہ جس طرح بعض ملکوں اور علاقوں کی خصوصیات وہاں کے باشندوں سے اس طرح مربوط ہو کر رہ گئیں کہ ان روایات سے منفک (یعنی علیحدہ) کرکے وہاں کے باشندوں کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح بعض اداروں وعلمی درس گاہوں کا حال ہے کہ ان کے زیر دامن تربیت پانے والے بعض اپنی انفرادی خصوصیت رکھتے ہیں۔ جماعتی زندگی میں بھی اس کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں، غرضیکہ احرار پارٹی، پنجاب جس کا مسقط الراس ہے اس پارٹی میں جمع ہونے والے اور خصوصاً اعلیٰ سطح کے افراد غالباً کوئی ان میں بدقسمت ہوگا جو خطابت کے جوہر سے خالی ہو۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سحر آفریں خطابت، مظہر علی اظہر کی وکیلانہ بحث صاحب زادہ سید فیض الحسن قاضی احسان احمد شجاع آبادی اور چھوٹے بڑے تقریباً تمام ہی احراری ایک پرجوش خطابت کا کامل ومکمل نمونہ تھے۔ ہر ایک کا رنگ جدا اور طرز نرالا تھا، غالباً ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۵ء کا زمانہ ہے جب ہندستان کی سیاسی زندگی بڑی تیزی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ وزارتی کمیشن اور اس سے پہلے ایک کمیشن اور پھر لارڈ ویول کی شملہ کانفرنس سیاست کے منظر عام پر ایک منظر کے بعد دوسرا منظر سامنے آرہا تھا یہی وہ وقت تھا جب مُسلم لیگ اپنے اس دعوے کو کہ وہی ہندوستان کے مُسلمانوں کی نمائندہ ہے، واقعات وشواہد سے مضبوط کرنے کے فکر میں لگی ہوئی تھی اور جیسا کہ سیاسی چکمہ بازیوں کا عام حال ہے خاص اس جزء میں بھی یہ جماعت اپنے گھناؤنے ہتھیار قوت وسرعت سے استعمال کرتی۔ قوم پرور جماعتیں اور قوم پرور مُسلمان زد پر تھے۔ جگہ جگہ اکابر سیاست کو پامال کیا جارہا تھا۔ غالباً شملہ کانفرنس کی واپسی پر مولانا ابوالکلام آزاد علی گڑھ اسٹیشن پر دھر لئے گئے اور جو طوفان وبدتمیزی ریلوے پلیٹ فارم پر برپا کیا گیا اس سے سیاست کا سارا پانی ہی گدلا ہو گیا۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن اور ان کے تمام ارکان جماعت ہندوستان کے طول وعرض میں ان چیرہ دستیوں کا شکار تھے۔ یہی وہ وقت تھا کہ راقم دہلی میں طالب علم تھا۔ میں نے یہ منظر دیکھا کہ بلّیماران کے ایک جلسہ میں جس میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم خطاب کرنے والے تھے، دہلی کی مسلم لیگ کے سربراہ شیخ عبدالسّلام مرحوم نے اپنی فوج ظفر موج کی قیادت کرتے ہوئے جلسہ میں جو ہلڑ بازی کی وہ اب بھی یاد ہے۔۔۔ غرضیکہ لیگ کی اس سیاست نے ہندوستان کے وسیع ترین علاقے کو قوم پرور جماعتوں کے لئے مقتل بنا ڈالا تھا۔ اس وقت دہلی میں ایک خاص جلسہ اس مقصد کے لئے ہونے والا تھا کہ قوم پرور مُسلمانوں کا نقطۂ نظر بھی فرنگی سیاست کے کشتی بانوں کے سامنے آئے یہ جلسہ اپنے مقصد کے اعتبار سے وقیع تھا اور مُسلم لیگ اسے اپنے لئے ایک بڑا چیلنج تصور کرتی تھی۔ خوب یاد ہے کہ دہلی میں غالباً اس جلسے کے لئے کئی بار اہتمام کیا گیا۔ اکابر جمعیۃ میں سے کوئی مشہور اور غیر معروف ایسا نہیں تھا جو اس وقت دہلی میں موجود نہ ہو۔ مگر نیشنل گارڈ کے جواں مردوں نے بار بار کی

کوشش کے باوجود جلسہ کا انعقاد ناممکن بنا دیا۔ پھر مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ ۱۹۴۵ء میں ایک روز جامع مسجد کے سامنے اردو پارک میں ایک عظیم ترین اجتماع کا اعلان ہوا۔ جس میں جمیعۃ علماء کے ساتھ احرار پارٹی کے کرتا دھرتا شریک ہوئے۔ رات کو ایک اسٹیج پر جواہر لال، سردار پٹیل بلکہ کانگریس کے چوٹی کے لیڈر اور دوسری جانب قوم پرور حلقہ کا لب لباب! سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سحر انگز خطابت کا یہ عجیب منظر تھا کہ تمام رات مخالفوں کو نہ صرف اپنی بات سنائی بلکہ شاہ صاحب نے سننے والوں سے پاکستان کی مخالفت میں ہاتھ اٹھوا دیئے تھے۔۔۔ بہر حال عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قوم پرور مسلمانوں کو اپنے خاص نقطۂ نظر کو عوام میں پہنچانے کے لئے ہمیشہ احرار پارٹی کی ضرورت پیش آتی تھی۔ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ احرار میں ہر شخص مقرر تھا اور سب کے خطابت کے رنگ جدا جدا تھے۔ البتہ بعض ارباب خطابت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساحرانہ انداز کی کامیاب یا ناکام نقل کرنے کی کوشش کرتے۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی تقریر اور خطابت بھی ایک امتیازی وصف لئے ہوئے تھی، وہ بالعموم کرسی پر بیٹھ کر تقریر کرتے اور ان کی خطابت کی غزل شروع ہوتی۔ غزل کی طرح ہر مصرعہ جدا ہوتا۔ لب ولہجہ کی شوکت، بھاری بھر کم انداز' جس بات کو کہتے وقیع انداز میں! جس مصرعہ کو اٹھاتے تو قیامت بنا دیتے۔ ایک مصرعہ سنانے کے بعد اپنے داہنے ہاتھ سے داڑھی کو موڑتے اور ہونٹوں میں دبا لیتے۔ وہ دوران خطابت اس کا اندازہ بھی لگاتے کہ مجمع ان کی منشور غزل سے کس حد تک متاثر ہو رہا ہے،۔۔۔ ٹھیک ان اوقات میں چشمہ کے نیلگوں گلاس کے عقب سے وہ اپنی عقابی نظروں کو اذہان کے تجسس میں روانہ کرتے اور اس احتساب کے بعد مصرعہ ثانی اٹھاتے۔ تقریر پنجابی ہوتی یا اردو میں ہوتی، وہ بین الاقوامی سیاست پر تبصرہ کرنے کے بعد اچانک مجمع سے کہتے:

"میں دریافت کرنا چاہتا ہوں، جو بات میں کہہ رہا ہوں ٹھیک ہے یا غلط"

کبھی کبھی اپنی پارٹی کی عظیم اکثریت کا بیان کرتے تو لہجہ کی پوری قوت واستحکام کے ساتھ فرماتے:

"میرے پاس نصف لاکھ تعداد میں رضاکار ہیں۔ یہ ہندوستان کی تمام قوم پرور پارٹیوں میں ایک منفرد خصوصیت ہے۔"

فرنگی سیاست کے تار پود کو بکھیرتے، ملکی سیاست پر تبصرہ ہوتا اور بین الاقوامی سیاسی مدوجزر کی نشان دہی کرتے۔ تقریر کا اختتام بھی بہت البیلا (انوکھا) تھا۔ وہ عام مقررین کی طرح خاتمہ پر دھیرے دھیرے پہنچنے کی عادی نہیں تھے، بلکہ اچانک کسی جملہ کو پہلے سے زیادہ پرشکوہ انداز میں کہتے اور دفعتہً کرسی سے اٹھ جاتے۔ وہ دارالعلوم دیوبند میں آخر زندگی میں آئے اور یہ سفر ان کی زندگی کا آخری سفر تھا۔ شام کو بعد عصر مسجد کے وسطی دروازے میں ایک کرسی پر بیٹھ کر طلباء کو خطاب فرمایا، جس میں تمام اکابر دارالعلوم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب اور ان کے استاذ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ راقم اس وقت مسجد کے اندرونی حصہ میں ان کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا ان کی گردن کے عقبی حصہ میں کھڑی ہوئی ہڈی ان کی موت کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ حسب دستور تقریر سے بے تابی کے ساتھ اٹھتے تو زبان حال یہ کہہ رہی تھی ۔

باتیں ہماری یاد رہیں باتیں پھر ایسی نہ سنئے گا
کہتے کسی کو سنئے گا تو دیر تک سردھنئے گا

حاضر جوابی

مرحوم بلا کے حاضر جواب تھے اور کسی وقت ان کو خاموش کرنا ممکن نہیں تھا۔ مولانا سلطان الحق صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند کا بیان ہے کہ ایک بار غالباً لکھنؤ یا مراد آباد میں کوئی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں دیوبند سے بھی شرکاء کی ایک جماعت عازم سفر ہوئی۔ سہارن پور اسٹیشن پر شام کی گاڑی سے سفر تھا، اچانک پنجاب سے آنے والی گاڑی میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم اور ان کے رفیق سفر ایک ڈبے سے نمودار ہوئے اور اسی گاڑی سے روانہ ہوگئے جس میں دیوبند کے شرکاء بھی تھے۔ لکسر کے اسٹیشن پر گاڑی میں کافی تاخیر ہوتی ہے اور عموماً مسافر شب کا کھانا یہیں لیتے ہیں۔ دیوبندی شرکاء نے دستر خوان بچھایا اور ہر ایک نے اپنے زاد راہ کو کھول کر دستر خوان پر چن دیا۔

مولانا سلطان الحق صاحب اپنی تمام نیاز مندیوں کے باوجود کہنے میں بہت جری اور سننے میں وسیع الحوصلہ ہیں، وہ اس منظر کو دیکھ کر بے قابو ہو گئے اور بولے کہ:

"مولانا! آپ میں اور مولانا مدنی میں بس یہی تو کمی ہے، اگر مولانا مدنی ہوتے تو جماعت کے بغیر کبھی لقمہ نہ توڑتے۔"

مولانا سلطان سمجھتے تھے کہ یہ ایک تیر ہے جو بالیقین نشانے پر بیٹھے گا لیکن مرحوم رئیس الاحرار نے ایک پُر زور قہقہہ لگایا اور فرمایا۔۔۔

"غلط کہتے ہو، مجھ میں اور مولانا مدنی میں اگر صرف اتنا ہی فرق ہوتا تو اس کمی کو میں کبھی کا پوری کر چکا ہوتا۔"

اس حاضر جوابی کے ساتھ طبیعت میں بڑی بے تکلفی و وارفتگی تھی جس میں پنجابی روایات کو بھی خاص دخل تھا۔ ان کا قلب اپنے اساتذہ کی عظمت اور اہل اللہ کے احترام سے لبریز تھا۔ مگر یہ احساسِ عظمت مصنوعی تکلّف کی شکل کبھی اختیار نہ کرتا۔ ایک بار دیوبند میں دیکھا کہ وہ دفترِ اہتمام میں گاؤ تکیہ پر اپنے خاص انداز میں لیٹے ہوئے تھے، ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ گردن کے نیچے تھے اور ان کی خطابت کا آبشار بلندیوں سے نیچے گر رہا تھا اور سامعین میں حضرت مہتمم صاحب کے علاوہ خود ان کے استاذ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ رائے پور کی خانقاہ میں بعد مغرب انہیں اس حال میں بھی پایا کہ ان کے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ رائے پوری ایک چارپائی پر تشریف فرما تھے اور مقابل کی دوسری چارپائی مرحوم رئیس الاحرار اپنی مخصوص بے تکلفی کے ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ان کا دل و دماغ نہ صرف احساسِ عظمت کا آشیانہ بلکہ اپنے اساتذہ اور اکابرین کے ساتھ وارفتگی اور عقیدت کا دل کش مرقع تھا، وہ اساتذہ کی اولاد بلکہ ان کے متعلقین سے بھی محبت و اخلاص کا معاملہ کرتے۔ دہلی میں ایک بار ان کے ایک صاحبزادے نے ہندوستان کے ایک باعظمت صاحبزادے کی شان میں کوئی ناروا بات کہہ دی، وہ تیزی کے ساتھ اٹھے اور اپنے پاؤں کا جوتا اٹھا کر بے تکلف اپنے اس بچہ پر پل گئے۔ یہ تعبیر، صورت واقعہ کی حقیقی ترجمانی کے لئے اختیار کی گئی ہے، کہتے جاتے تھے کہ

"وہ صاحبزادہ تجھ سے ہزار درجہ بہتر اور اس کا باپ تیرے باپ سے لاکھوں مراحل آگے، پھر تجھے کیا حق ہے کہ اس صاحبزادے کے بارے میں ایسی نازیبا بات منہ سے نکالے۔"

غرضکہ اپنے اکابر سے والہانہ تعلق اور ان کے متعلقین کی خبر گیری مرحوم کا خاص امتیاز تھا، اگرچہ کبھی کبھی وارستگی مزاج کی بنا پر تعلق کے مظاہرہ میں دوسرے کے لئے کافی الجھن پیدا ہو جاتی۔۔۔ عرض کر چکا ہوں کہ ۱۹۴۰ئ کے بعد ۱۹۴۷ئ تک یہ راقم دلی میں طالبعلمی کرتا تھا۔ ایک بار غالباً جمعیۃ علما کی کسی بلائی ہوئی میٹنگ میں شرکت کے لئے دہلی تشریف فرماتے تھے۔ مجھے معلوم ہوا تو ان سے ملاقات کے لئے فرودگاہ پر پہنچا، مرحوم اس وقت ایک مجمع میں تشریف رکھتے تھے اور وہی مشہور و معروف خطابت کی آتش باری جاری تھی، میں نے مصافحہ کے ہاتھ بڑھائے تو مولانا نے اپنے ہاتھ بڑھاتے ہوئے فرمایا:

"میرے پاس اس وقت کچھ دینے کے لئے نہیں ہے۔ اگر جمعیۃ نے مصارف سفر دے دیئے تو کچھ تمہیں بھی دے دوں گا۔"

اس واقعہ پر تیس سال سے زائد گزرتے ہیں، مگر اب اس ذہنی الجھن کو فراموش نہیں کر سکا جو اس وقت اس جملہ کو سننے کے بعد محسوس ہوئی تھی، مگر وہ اپنی بے تکلفی، خلوص اور بزرگانہ شفقت کی بنا پر اس طرز کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک واقعہ یاد آیا۔۔۔ دہلی میں پارلیمانی وفد جس میں کرپس بھی شریک تھے، آیا ہوا تھا۔ ہندوستان کا سیاسی دماغ کھنچ کر دہلی پہنچ چکا تھا، اور وینڈسر پیلس، جو آصف علی مرحوم کی قیام گاہ تھی، مولانا ابو الکلام آزاد کی عارضی رہائش کی بنا پر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسوں کے لئے مخصوص تھی۔ فتحپوری اور سنٹیل کالج کے طلباء نے ایک روز مولانا آزاد مرحوم سے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ قبیل فجر (فجر سے تھوڑی دیر پہلے) طلبا کا یہ وفد "ویندسر" حاضر ہو گیا۔ خاکسار بھی اس میں شریک تھا۔ اس وقت مولانا آزاد کی رہائش گاہ پر ماسٹر تارا سنگھ، سرچندولال تردیدی لالہ بھیم سین سچر، پنڈت جواہر لال نہرو، پرتاپ سنگھ کیروں اور پنجاب کے بہت سے زعماء ملاقات کے منتظر تھے۔ اجمل خان

صاحب نے ہم طلباء کو بتایا کہ مولانا غسل صبح گاہی میں مصروف ہیں۔ کچھ وقفہ کے بعد مولانا آزاد نے طلباء کو باریابی کا موقع عنایت فرمایا۔ طلباء کی یہ جماعت اندر قدم رکھ رہی تھی اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم اندر سے باہر تشریف لا رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے ایک چسٹر زیب تن فرمار کھا تھا سر پر سرخ رومال اور وہی طویل و عریض چشمہ ان کی آنکھوں پر! مشافہہ (رُوبرو) نہ ہو میری ان کوششوں کے باوجود مرحوم کی اچانک مجھ پر نظر پڑ گئی، الامان الحفیظ! ان کا اس وقت کا بزرگانہ عتاب آسمانی قہر سے کم نہیں تھا۔ وہ اس پر بہت ناراض تھے کہ تم اس ذلیل انداز میں ملاقات کے لئے کیوں آئے۔ ان کا چہرہ تمتمار ہا تھا اور حسب دستور گرج رہے تھے۔ پھر ان طلباء سے مجھے جدا کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں براہ راست لے کر پہنچے اور اپنے خصوصی انداز میں فرمایا:

”آپ اسے پہچانتے ہیں؟ یہ ہندوستان کے دینی و علمی کارواں کے قافلہ سالار خاتم المحدثین مولانا انور شاہ کشمیری کا چھوٹا بچہ ہے۔“

مرحوم جب کسی کا تعارف کراتے تو بے حد وقیع کلمات استعمال فرماتے۔ یہ منظر بھی بارہا دیکھا کہ وہ اپنے مکان پر تشریف فرما ہیں۔ فون آیا، انہوں نے جواب کے لئے اٹھایا اور سائل کے جواب میں جواباً فرماتے:

”میں مولانا حبیب الرحمٰن بول رہا ہوں“

تکلّف برطرف اپنے بچوں کو بھی مولانا کے ساتھ خطاب فرماتے۔

سخنِ دلنواز

مرحوم کی باتیں بھی عجیب و غریب ہوتیں۔ غالباً پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ شخصیتوں کے احتسابی جائزہ میں بے نظیر واقع ہوئے تھے۔ ایک بار یہ خاکسار، دہلی میں نظام الدین اولیاء تانگہ پر جارہا تھا۔ دوسری جانب وہ کار میں واپس تشریف لا رہے تھے۔ خدا جانے انہوں نے مجھے کس طرح دیکھ لیا، تانگہ کے بالکل قریب کار رک گئی اور مولانا دروازہ کھول کر صاف وستھری سڑک پر نکل آئے۔ علیک سلیک کے بعد میرے اس سوال پر کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ فرمایا۔۔۔ ”مولوی یوسف امیر جماعت تبلیغی کے پاس گیا تھا۔ اس سے کہہ کر آیا ہوں اپنی جماعت میں مولوی اور لیڈروں کو مت گھسنے دینا، ورنہ تیری ساری تحریک و دعوت تباہ ہو جائے گی۔“

ایک مرتبہ دیوبند میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

”میں نے مولوی یوسف امیر جماعت تبلغ سے پوچھا کہ یوسف مجھے صحیح صحیح بتا تیرا جواہر لال کی حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے، اس پر مولوی یوسف بولا کہ مولانا ہر رات میں تہجد کے بعد دعا کرتا ہوں کہ ”اے اللہ! اگر جواہر لال کی حکومت آپ کے لئے پسندیدہ ہے تو اسے بقائے طویل عطا فرما اور اگر ناپسندیدہ ہے تو اس میں اصلاح فرما دے۔“

فرماتے تھے کہ میں نے یہ بات جواہر لال کو سنائی تو اس نے پر زور قہقہہ لگایا۔ آزاد ہندوستان میں پنڈت جی کے وزارتی جاہ و جلال سے ان کی بے تکلف طبیعت نے کبھی مرعوبیت قبول نہیں کی تھی۔ جواہر لال کی بھی اپنے خاص عملہ کو ہدایت تھی کہ مولانا جب اور جس وقت ملاقات کرنا چاہیں ان کی آمد و رفت کو عام ملاقاتی ضابطوں سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ واقف کاروں کا بیان ہے کہ وہ جاتے اور خاص اس صوفے پر جا کر جواہر لال سے قریب بیٹھ جاتے جو پنڈت جی کا مخصوص تھا۔ اور پوری بے تکلفی سے ان کے کاندھوں کو تھپتھپاتے ایک روز فرمایا:

”پنڈت جی کامیاب حکومت کے خیال میں مت رہنا، ہندوستان کی موجودہ ترقی ان دو تین بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے، جو آپ کے ملک میں تشریف فرما ہیں (اشارہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی جانب تھا) کبھی کبھی ان کی خانقاہوں میں حاضری دے کر نیک دعائیں لے آیا کرو“!

جواہر لال اس نیک مشورہ پر مسکرا کر رہ گئے۔ دلّی کے سرکاری دفتروں میں پہنچ جاتے تو اونچے عہدے داروں کے کاندھوں پر اپنا دست شفقت رکھ کر ”بیٹا“ کے ساتھ خطاب ہوتا، اور بلاشبہ اس دل نشین انداز اور سخن دل نواز سے رُکے ہوئے کام اور رشفہ غ لکار میں پڑی

ہوئی الجھنوں کو چٹکیوں میں حل کر لیتے۔ راقم الحروف جب دیوبند سے فارغ ہوا تو ایک بار دلّی میں اپنے مکان پر مجھ سے فرمایا کہ اب کیا کرے گا؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کا جو مشورہ ہو۔۔۔ فرمایا:

"اگر میرا مشورہ مانتا ہے تو کھتولی ضلع مظفر نگر چل، وہاں زمین کا ایک قطعہ لے دوں گا، چھپر ڈال لے، اور مدرسہ "انوریہ" کا افتتاح کر دے، میرے دوؔ بچے محمد احمد اور سعید الرحمٰن تیرے ساتھ رہیں گے۔"

اس عجیب و غریب تجویز پر میں ساکت وصامت رہ گیا، مولانا نے حسب دستور داڑھی کو خم دے کر دانتوں میں دبایا، عقابی نظریں میرے چہرے پر ڈالیں اور فرمایا اچھا تیرے سمجھ میں نہیں آئی، چل کوئی اور بات کر!

اصابت رائے

خدائے تعالیٰ نے انہیں سیاست و فراست اور تدبیر و تدبر کی جو غیر معمولی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں اور جن سے وہ ملکی مسائل میں کام لیتے ان کی تو عام شہرت ہے، مجھے تو یہ بتانا ہے کہ مرحوم عام معاملات میں بھی اصابت رائے اور عاقبت اندیشی کے جوہر سے خالی نہیں تھے، چنانچہ طالب علمی سے فراغت کے بعد میرے شفیق استاد اور خاص مربی مولانا قاری اصغر علی صاحب مرحوم نے حضرت مولانا فخر الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں خاکسار کا پیغام دیا۔ ان ہی دنوں دہلی کا سفر ہوا تو مرحوم مجھ سے دریافت فرمانے لگے کہ شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ میں نے قاری صاحب مرحوم کی اسی تجویز کا ذکر کیا، سنتے ہی ایک مقدس ترین شخصیت کا نام لے کر فرمایا کہ "وہ اس میں مخالف رہیں گے اس لئے اس خیال کو چھوڑ دو۔"

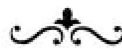
بعد کے واقعات نے مرحوم کی اصابت رائے کی تصدیق کر دی۔ انہیں خانوادۂ انوری کے ساتھ غیر معمولی شغف تھا۔ مجھے اپنی زندگی میں کوئی ایسا موقع یاد نہیں پڑتا کہ ان سے ملاقات ہوئی ہو اور انہوں نے خالی ہاتھ آنے دیا ہو۔ والدۂ مرحومہ ایک زمانہ میں لدھیانہ کے مشہور میموریل ہسپتال میں زیر علاج تھیں، راقم بھی ان کے ساتھ تھا۔ اتفاقاً عید وہیں آگئی۔ مولانا مرحوم نے جس طرح کے ملبوسات اپنے بچوں کے لئے تیار کئے اس سے زائد قیمتی اور اعلیٰ خاکسار کے لئے بھی تیار کئے اور جب اس تعلق کے اظہار کے لئے قلم حرکت کرتا ہے تو بے اختیار اپنے والد ماجد قدس سرہٗ علامہ کشمیری کا وہ مشہور قول یاد آتا ہے:

"مجھے ہندوستان میں صرف دوؔ ہی وفادار خاندان ملے، ایک بجنوز میں مولانا مشیّت اللہ صاحب (مرحوم) اور پنجاب میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا۔"

آہ کہ اب دونوں تو وہ خاک کے نیچے مصروف خواب ہیں۔ اور "خانوادۂ انوری" کے مخلصین کی فہرست میں ان اہم شخصیتوں کا فقدان ہے۔ والد ماجد بھی مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم کے ساتھ خاص تعلق رکھتے۔ مرحوم جس زمانے میں جیل میں ہوتے اور والد ماجد کا پنجاب کا سفر ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ لدھیانہ میں مولانا حبیب الرحمٰن کے مکان پر تشریف فرما نہ ہوں۔ شورش دار العلوم کے بعد جب کشمیر سے دیوبند مراجعت فرمارہے تھے تو اس زمانے میں مولانا مرحوم ملتان سینٹرل جیل میں اسیر تھے۔ والد مرحوم نے ملتان کا سفر فرمایا اور جیل ہی میں ان سے ملاقات فرمائی۔ اب اخلاص و محبّت، بزرگانہ شفقت و مودت کے یہ بلند و بالا مینار زمین کے برابر ہو چکے اور ان کی تصاویر کی وساطت سے جو پس ماندہ محروم قسمت حلقے کے ذہنوں میں ہے صرف اتنا سن لیتے ہیں۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں، ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہو جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو !وہ خواب ہیں ہم

انظر شاہ۔ ۳۱/ جنوری ۱۹۷۵ء



مولانا حبیب الرحمٰن، حضرت عمرؓ فاروق رضی اللہ عنہ کے کردار کا عکس ہے

از محمود علی خان

امیر الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ قرون اولیٰ کے مجاہدین کا مجسم نمونہ تھے۔ ملک کو غیر ملکی پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے قید و بند کی صعوبتوں کو لبیک کہا اور ہر قسم کی قربانی کو لبیک کہنے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ اس سلسلہ میں نہ صرف غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف وہ ہمیشہ نبرد آزما رہے بلکہ خود اپنوں کی مخالفتوں اور ایذا رسانیوں کا بھی نشانہ بنے رہے۔ لیکن ان میں یہ خوبی تھی کہ ان کو صبر کے ساتھ برداشت کرتے اور خندہ پیشانی کے ساتھ پریشان کن حالات کا سامنا کرتے رہے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ انہوں نے میری سیاسی تربیت اور رہنمائی پر خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ غلطیوں پر تنبیہ اور صحیح عمل پر داد تحسین سے ہمت افزائی ان کی خاص عادت تھی۔ وہ بلا کسی جھجک کے حق گوئی میں پس و پیش نہ کرتے تھے۔ وہ صائب رائے سیاست داں اور مستقل مزاج رہنما تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات اس کے شاہد ہیں کہ قدرت نے انہیں بصیرت، تدبر، معاملہ فہمی اور دور بینی کی اعلیٰ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔

انہوں نے مجلس احرار ہند کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض کو جس طریقہ پر انجام دیا اور ضبط و نظم کو جس صورت میں قائم رکھتے ہوئے مخالفتوں کے طوفانوں کا مقابلہ کیا اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ حضرت امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے تعلقات بہت زیادہ گہرے تھے اور حضرت شاہ صاحب ان کی رہنمایانہ صلاحیتوں سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے۔ اس لئے ان کی رائے کے مطابق عمل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ آج بھی میرے کانوں میں حضرت شاہ صاحب کے الفاظ گونج رہے ہیں۔ انہوں نے ایک موقع پر حضرت مولانا صاحب کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کردار کا عکس ہیں۔

میرا متعدد بار کا مشاہدہ ہے کہ احرار کے اجتماعات کے موقع پر ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ کہ حضرت مولانا تشریف لے آئے تو سب مؤدب ہو گئے اور ایسا معلوم ہوا کہ پوری مجلس ان کے رعب اور بزرگی سے متاثر ہے۔

در حقیقت مولانا مرحوم کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ ان کا سیاسی کردار بے داغ اور اتنا اعلیٰ تھا کہ اس کی بنا پر ان کا مقام ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں کی صفِ اوّل میں رہا۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ راشٹر پتا مہاتما گاندھی جی ہوں یا پنڈت جواہر لال نہرو ہوں، مولانا ابو الکلام آزاد ہوں یا سبھاش چندر بوس، سردار پٹیل ہوں یا ڈاکٹر راجندر پرشاد ہوں۔ ہر ایک ان کی عزت و قدر کرتا تھا اور مولانا مرحوم حسبِ عادت ان سے صاف گوئی کے ساتھ گفتگو فرماتے تھے۔

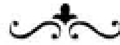
اس موقع پر ایک واقعہ کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک کے زمانے میں لکھنؤ سے مجھے مسٹر وصی احمد مرحوم نے تار دے کر بلایا اور بتایا کہ مسٹر رفیع احمد قدوائی مرحوم کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ قدوائی صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ اس تحریک میں احرار بھی حصہ لے رہے ہیں لیکن ان باتوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ میری رائے اور مشورہ احرار لیڈروں تک پہنچا دیا جائے۔ جس کا میں نے وعدہ کیا اور لدھیانہ حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر میں نے جو گفتگو ہوئی تھی عرض کی۔ تب مولانا مرحوم نے ان لیڈروں کے اجتماع کا لاہور میں انتظام فرمایا کہ جو جیل سے باہر تھے۔ بحث و تمحیص کے بعد قدوائی صاحب سے مل کر مزید گفتگو کرنے کی تجویز منظور ہوئی۔ حضرت مولانا مرحوم اور میرے یہ کام سپرد کیا گیا۔ لیکن واپسی پر میں بیمار ہو گیا اور سہارن پور سے حضرت مولانا پہلے لکھنؤ جا

کر قدوائی صاحب سے ملے اور پھر قدوائی صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب وغیرہ سے جو جیل میں تھے مولانا مرحوم کی ملاقات کا انتظام کیا۔ چنانچہ بات چیت کے بعد ایک مسودہ تیار ہوا جس کی آخری منظوری مہاتما جی سے منگانے کا پروگرام بنا۔ ان تجاویز میں ایک بات یہ بھی طے پائی تھی کہ غیر ملکی حکومت سے اگر کسی وقت کوئی گفتگو ہوگی تو اس میں احرار کے نمایندہ کو بھی شامل کیا جائے گا۔

لیکن اس گفتگو کی بات الہ آباد کی سی، آئی، ڈی کو معلوم ہوگئی۔ چنانچہ مولانا مرحوم کو واپسی پر لاہور میں اور قدوائی صاحب کو لکھنؤ میں گرفتار کرلیا گیا۔ اگر کہیں ایسا نہ ہوتا تو ملک کی صورت آج کتنی مختلف ہوتی یہ نہیں کہا جاسکتا۔

مولانا مرحوم کی کئی اہم موقعوں پر رہنمایانہ سرگرمیوں کی اور بھی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایام ماضی کا تصور کرتا ہوں تو بہت سے واقعات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کبھی فرصت میں ضرور کچھ لکھوں گا انشاء اللہ۔ اس موقع پر تو اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ برادرِ محترم مولانا عزیز الرحمٰن صاحب جامعی کا حکم نامہ ملا۔ اس لئے یہ چند سطور لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ بجٹ کا زمانہ ہونے کے باعث فرائض منصبی کی انجام دہی کی مصروفیات سے اتنا وقت بھی بہ دشواری نکالنے میں کامیاب ہوا ہوں۔

محمود علی خاں
وزیر اوقاف حکومت یوپی۔ لکھنؤ
۲۸/ فروری ۱۹۷۵ء



حَبیبؒ ہند

از اخلاق حسین قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیز گرامی مولانا عزیز الرحمٰن جامعی اپنے والد محترم مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بارے میں دوسرے لوگوں کے تاثرات پر ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس میں بڑے لوگوں کے خیالات و تاثرات درج ہوں گے اور میں حضرت مرحوم کے سامنے صرف ایک کارکن اور طالب علم تھا' پھر میں کیا اور حضرت ؒ کے متعلق میرے تاثرات کیا؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت رئیس الاحرار کی ذاتِ گرامی کے بارے میں اگر کسی کے تاثرات قلبی اور حقیقی ہو سکتے ہیں تو وہ ایک قومی کارکن ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ مولانا لدھیانوی کی انسانی عظمت اور اسلامی اخوت کے گہرے جذبات کے بے پردہ دیکھنے اور برتنے کا موقع بڑے لوگوں کے مقابلے میں چھوٹے کارکنوں کو بہت زیادہ ملا۔

بلا تشبیہ کے عرض کر رہا ہوں کہ رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے شکار ابو بکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جیسے بڑے لوگ بھی تھے۔ لیکن بلال رضی اللہ عنہ و عمار رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی عظمت کا جس کھلے رنگ میں مشاہدہ کیا وہ بس انہی خوش قسمتوں کا حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی کے بعد بڑے لوگ تو باہوش و حواس زندہ رہے لیکن بلال رضی اللہ عنہ اور ابو ذر رضی اللہ عنہ زندگی سے بیزار ہو گئے۔

میں مدرسہ عالیہ فتح پوری کا ایک طالب علم تھا کہ مجھے اپنے محلہ کڑہ شیخ چاند کی ایک تقریب میں مولانا کو پہلی بار قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

یہ غالباً ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔

لال کنویں پر علاقہ کی مجلس احرار کا جھنڈا لہرانے کی رسم مولانا مرحوم نے ادا کی۔ میں اس وقت علاقہ کی احرار کا سکریٹری تھا، اس کے بعد چاء پارٹی ہوئی۔ مولانا سے میرا تعارف کرایا گیا۔ مولانا نے نہایت بے تکلفی اور محبت سے فرمایا:

اچھا! تم سکریٹری ہو، آؤ، میرے پاس آو!

میں نہیں کہہ سکتا کہ مولانا کے ان جملوں میں کتنا پیار تھا، کتنا خلوص تھا، اور کتنا اثر تھا۔ مولانا کے اس پیار نے مجھے احرار کی سرخ وردی پہنادی۔ میرے گھر والوں میں دونوں قسم کے خیالات موجود تھے، سخت قسم کے احراری اور جمعیتی بھی تھے اور نہایت کٹر قسم کے مسلم لیگی بھی تھے۔

میرا مذاق اڑایا گیا، بُرا بھلا بھی کہا گیا۔ لیکن احرار کی سرخ وردی پہن کر میں بلا تکلف مارچ کرتا تھا، کیونکہ مولانا کی حوصلہ افزائی اور محبت نے مجھے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ میرے ساتھ دلّی کے اچھے اچھے گھرانوں کے لڑکے بھی اسی نشے میں سرشار تھے۔

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا مرحوم اور احرار کے دوسرے رہنماؤں کی اس خصوصیت کا جواب نہیں تھا۔ ان حضرات نے مسلم عوام کو قومی تحریکات میں شامل کیا، کارکنوں کو آگے بڑھایا، رضاکاروں میں لیڈری کی صلاحیت اور حوصلہ پیدا کیا اور مسلم نوجوان انہی حضرات کی عوامی محبت سے میدان میں نکلے۔

ہمارے عُلماء کرام اپنی مذہبی عقیدت سے ایک طبقہ کو ضرور متاثر کرتے تھے لیکن عوامی جوش وخروش اسی تحریک کی بدولت پیدا ہوتا تھا۔

حضرت لدھیانوی کا وہ دور جو سیاسی رہنمائی، تدبر وجرأت اور قربانیوں کا بے مثال دور تھا، اس کا بڑا حصہ راقم نے دور سے دیکھا، البتہ ۴۷ئ کے انقلاب کے بعد جب مولانا نے دلّی میں قیام فرمایا، اس وقت مجھے مولانا کی مُحبّت بھری صحبتوں سے فیض حاصل کرنے کا کافی موقع ملا۔ اس دور میں کئی دفعہ مولانا نے مجھ سے فرمایا :

''مولوی صاحب! میرے پاس قلم دوات لے کر بیٹھ جاؤ، میں لکھنے پڑھنے کا آدمی نہیں ہوں، بعض مذہبی مسائل پر میں نے بہت کچھ سوچا ہے اسے میں لکھوانا چاہتا ہوں۔'' مولانا مرحوم مذہبی مسائل پر بھی جب اپنے مخصوص انداز میں چند جچے تلے جملے فرمایا کرتے تھے تو ان میں بڑی دینی بصیرت اور دینی فہم نظر آتا تھا۔ لیکن افسوس کہ میں مولانا کو وقت نہ دے سکا۔

غالباً ۵۰ء کا واقعہ ہے کہ ماہنامہ دارالعلوم میں میرا ایک مضمون ''حیات النّبی ﷺ'' پر چھپا تھا۔ مولانا نے اس مضمون کو پڑھا۔ اس کے بعد میں مولانا کو راستہ میں مل گیا، حسب عادت مولانا میرا بازو پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ دولت خانہ پر مجھ سے فرمایا، تم کہاں پھنس گئے ہو، میرے پاس کیوں نہیں آتے۔ تم نے حیات النبی ﷺ پر اچھا مضمون لکھا ہے لیکن یہ تو بتاؤ! کہ حیات النّبی ﷺ کی حقیقت کیا ہے ؟

جہاں تک روح کا تعلق ہے وہ تو مومن اور کافروں کی مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے جسم بعض صلحاء کا بھی قبروں میں محفوظ رہتا ہے۔

مولوی صاحب! میں نے بہت غور کیا کہ پھر حیات النبی کی حقیقت کیا ہے ؟ تو بھائی میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اپنی امت کی طرف حیات ظاہری سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔

یہی حیات النّبی ﷺ کی حقیقت ہے۔

پھر مولانا مرحوم نے حضرت مجدد صاحب کے ایک مکتوب کا حوالہ دے کر فرمایا: مجدد صاحب نے توجہ الی الحق اور توجہ الی الخلق پر ایک مکتوب میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے، بھائی اب اس مسئلہ پر دوبارہ لکھو۔

واقعی میرے سامنے ایک نئی راہ کھل گئی تھی،

مولانا مرحوم اخلاقی جرأت میں بھی اپنے ہم عصروں کے اندر ممتاز مقام رکھتے تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

دہلی کے ایک دینی مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا، جماعت کے دوسرے بزرگوں کے علاوہ حضرت مولانا احمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے۔ انہوں نے اپنی کچھ اراضی دینی مدرسوں اور جماعتوں کے لئے وقف کی تھی۔

جلسہ میں مولانا احمد سعید صاحب نے اپنے مخصوص لچھے دار انداز بیان میں ان رئیس صاحب کی تعریف کی، شاید اس مدرسہ کے مہتمم صاحب نے مولانا سے کہا تھا کہ آپ ان رئیس صاحب کو میرے مدرسہ کی طرف بھی توجہ دلایئے گا۔ اس لئے مولانا نے ان کی فیاضی کو سراہا اور تعریف کی۔

مولانا کے بعد رئیس الاحرار کھڑے ہوئے اور قرآن کریم کی فضیلت بیان کرتے ہوئے جلال میں آگئے اور فرمایا:

> ''اسلام نے اس امت کو بہت کچھ دیا ہے، یہ امت اس کا حق ادا نہیں کر سکتی، پھر اسلام کی خدمت پر دولت مندوں کی تعریف کیوں کی جاتی ہے۔''

بڑھاپے اور بیماری کی نقاہت کے باوجود وہ اللہ کا شیر گرجنے لگا اور عُلماء کرام کو کو استغنا اور قناعت کا سبق دے کر بیٹھ گیا۔ میں نے مولانا احمد سعید کی طرف دیکھا کہ ان پر کیا اثر ہے تو مولانا سر جھکائے مسکرا رہے تھے۔

یہ چند سطریں ایک نیاز مند کے مُخلصانہ تاثرات ہیں، ورنہ میں کہاں اور وہ شیر دل عالم دین اور خوددار مجاہد وطن کہاں ؟ رحمۃ اللہ علیہ

واسطہ

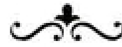
آج ہم، ملک سے غریبی ہٹاؤ کا نعرہ سنتے ہیں لیکن وطن دوستی کی ان مثالوں کو مٹانے کے درپے ہیں جو مثالیں یہاں کے خواص و عوام لیڈروں اور جنتا کو ایمانداری سادگی اور قربانی کا سبق دیتی ہیں۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک سے غریبی کیسے دور ہوگی جب کہ اوپر سے لے کر نیچے تک مفاد پرستی اور تعیّش کی زندگی کا دور دورہ ہے۔

آزادی کی تاریخیں لکھی جارہی ہیں۔ آزادی اور جمہوریت کے جشن منائے جارہے ہیں مگر نہ ابوالکلام آزاد کا ذکر ہے، نہ حسین احمد مدنی اور حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا۔ جس نے زندگی کا تمام سرمایہ وطنِ عزیز کی آزادی پر قربان کر دیا۔ جیلوں میں اپنی صحت برباد کی۔ اپنا گھر بار لٹا کر اپنے آپ کو پردیسی بنالیا۔

کیا ہمارے جمہوری حکمراں اس پر توجہ کریں گے کہ آزدی کے جن پروانوں کو ہر سطح پر نظر انداز کیا جارہا ہے انہیں آگے لایا جائے۔ ان کی قربانیوں کی اجاگر کیا جائے ان کی زندگی کو بطور سبق کے نئی نسلوں کو پڑھایا جائے۔

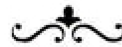
اخلاق حسین قاسمی دہلوی
ناظم جمعیۃ علماءِ ہند، دہلی
۲۷/ جنوری ۷۵ء



یہی ہے شانِ قلندری

قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

میرا عیش غم، میرا شہد سم، میری بود ہم نفس عدم
تیرا دل حرم، گرد عجم، تیرا دیں خریدۂ کافری
دمِ زندگی، رمِ زندگی غمِ زندگی، سمِ زندگی
غمِ رم نہ کر، سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری
(اقبالؔ)



ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی

اطہر صدیقی دیوبند

پچاس برس پہلے کا تصور کرتے ہی ذہن و دماغ میں ایک عظیم کش مکش، ایک عظیم سیاسی جدوجہد اور ایک عظیم انقلابی بیداری کے نقوش ابھر آتے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی سرزمینِ مقدس ایک جہنم زار بن چکی تھی۔ چاروں طرف بغض و منافرت کا لاوا سا پک رہا تھا۔ برٹش حکومت کے بہیمانہ جورو تشدد کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے پورے ماحول کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔ ایک طرف جذبۂ وطنیت اور سوز بغاوت سے بھبھکتے ہوئے انسانوں کے دماغ تھے اور ایک طرف توپ و تفنگ کے کھلے ہوئے دہانے تھے۔ ایک طرف قہر و جبروت کی حکمرانی تھی اور ایک طرف ہزار ہا بیکسوں اور مظلوموں کے برہنہ سینے تھے۔ ایک طرف وحشت اور بربریت سے بھری ہوئی نگاہوں کی خون آشامیاں تھیں اور ایک طرف توکل علی اللہ اور نور ایمان سے دمکتی ہوئی پیشانیوں کی خیرہ کر دینے والی تابناکیاں تھیں۔

ایسے حوصلہ شکن اور روح فرسا ماحول میں فرنگی اقتدار کو چیلنج دینے کے لئے وہی لوگ آگے بڑھ سکتے تھے جن کے ارادوں میں پہاڑوں کا استقلال، دریاؤں کا خروش اور میدانوں کی سی وسعت تھی جن کے کرداروں میں بلندی و پاکیزگی اور فولاد کی قوت پنہاں تھی۔ جنہیں رواداری، روشن خیالی، وسعتِ نظر، قلب پر سوز، مُحبت اور انسان دوستی ورثہ میں ملی تھی۔

مولانا حَبیب الرحمٰن لدھیانوی ؒ ایک ایسے ہی خانوادۂ علم و فضل کے چشم و چراغ تھے۔ جس کے کردار اور فکر و عمل سے تاریخ نے جنم لیا ہے اُن کے پردادا حضرت مولانا شاہ عبد القادر ؒ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وہ مجاہد تھے جنہوں نے انگریز کے خلاف فتویٰ دے کر مع اہل و عیال لڑائی میں شرکت تھی اور ایک بار شہر لدھیانہ میں متوازی حکومت قائم کر دی تھی۔ پھر آپ کے دادا حضرت مولانا محمد صاحب ؒ بھی زندگی بھر جہادِ حریت کی عَلم برداری کرتے رہے۔ آپ کے والد مولانا محمد زکریا صاحب ؒ نے بھی تادمِ آخر اسی شمع کو فروزاں رکھا۔ گویا آزادی کا یہ جذبہ گھر کی پرانی روایت بن گیا تھا۔

مولانا حَبیب الرحمٰن لدھیانوی جس دور میں پیدا ہوئے تھے اس نے مہاتما گاندھی، لالہ لاجپت رائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی، آصف علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں صاحب، مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا احمد سعید صاحب اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد ؒ وغیرہ ہم کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، اور یہ پوری کی پوری صف ایسے ہی ''دیوزاد انسانوں'' کی صف تھی، جس نے نفی سے اثبات کے عظیم ہیکل اور تہی دامنوں سے عظمتوں کے محیرّ العقول گنبد تعمیر کر دیئے تھے۔

مولانا ۱۹۱۲ء میں کانگریس میں شامل ہوئے اور پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:

''وہ ایک جانباز سپاہی کی حیثیت سے ہماری جنگ آزادی کی تحریک میں یاد کئے جانے کے قابل ہیں۔''

اگست ۱۹۲۲ء میں مولانا کے گھر کے تمام سامان کی نیلامی' ۱۹۲۹ء میں لدھیانہ شہر میں گورنر پنجاب کے گورنری دربار کا بائیکاٹ۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۲۹ء کو ڈپٹی کمشنر کارنر سے فون پر گفتگو۔ ۱۹۳۱ء کے کانگرس اجلاس میں کامل آزادی کی تحریک پر بحث بم مارنے والوں کی حمایت میں گاندھی جی سے شدید تکرار اور پنڈت نہرو کے خیال کی تائید''

۱۹۳۸ء میں عدالت کے روبرو بیان۔' نہرو حَبیب خط و کتابت۔'' کرپس، مہاتما گاندھی، سوبھاش چندر بوس، مولانا ابوالکلام آزاد اور

محمد علی جناح جیسی ہستیوں سے مولانا کی خط و کتابت اور ملاقاتیں ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہیں اور یہ وہ کارنامے ہیں جنہیں آنے والا مورخ یقینا فراموش نہیں کر سکے گا۔ مہاشہ کرشن ایڈیٹر روزنامہ پرتاپ رقم طراز ہیں:

"بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جنوری ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی جی نے مرن برت کیوں رکھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے مجھے سنایا کہ وہ مہاتما جی کے پاس گئے اور کہا ہمارے ودیش جانے کا انتظام کر دیں، میرے جیسے لوگ پاکستان میں رہیں یہ خارج از بحث ہے اور ہندوستان میں ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ ہمارا رہنا مشکل ہے۔ مہاتما جی نے کہا آپ کے سوال کا جواب کل دوں گا۔ دوسرے دن انہوں نے بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔"

لیکن اتنی عظمت اور اتنی رفعت کے باوجود مولانا کی ذات سوس عزو جاہ سے ہمیشہ بے نیاز رہی۔ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں ان کو کتنے ہی جاں سوز مراحل سے گزرنا پڑا۔ پے بہ پے قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ مگر انہوں نے ہر جاوٗہ دشوار کو نہایت خندہ پیشانی سے عبور کیا۔ مصائب و آلام کی زبردست سے زبردست یورشیں بھی ان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ کر سکیں۔ ۱۹۴۷ئ کی فرقہ وارانہ آگ کی لپٹوں نے جب لدھیانہ شہر کو گھیر ا تو مولانا کو بھی اپنا آبائی وطن اور گھربار سبھی کچھ چھوڑنا پڑا۔ لیکن ان کی زبان پر کبھی "بے مہری یاران وطن کا شکوہ نہیں آیا۔ ان کی زندگی صبر و رضا اور جواں مردی کا مکمل نمونہ تھی۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو:

"میں نے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی ہمیشہ اس لئے عزت و تعریف کی کہ ان میں اپنے عقیدے پر مستقل مزاجی اور مضبوطی سے قائم رہنے کی جرأت تھی۔"

مولانا بیک لمحہ ایک مفکر ایک سیاسی رہنما اور ایک عظیم انسان تھے۔ انہوں نے مئے غفلت کے سرشاروں کو اتنی طاقت سے جھنجوڑا کہ ان میں سویا ہوا حب الوطنی کا لہلہاتا ہوا جذبہ جاگ اٹھا۔

آخر میں مولانا کے فرزندِ جلیل جناب عزیز الرحمٰن صاحب جامعی لدھیانوی ڈائریکٹر تعلیمی سماجی مرکز بارہ دری شیر افگن مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے والا کی سوانح "رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی" مرتب کر کے نہ صرف ان کی زندگی کو روشن اور واضح طور پر پیش کیا ہے بلکہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کے ایک سالار کے کارناموں کو یکجا کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی بہت سی تاریخی ضرورتوں کو بھی پورا کیا ہے اور آنے والے دور میں تاریخ جنگِ آزادی کے مورخ کی زبردست مدد کی ہے۔ اس کو اس کتاب سے بہت سے دستاویزی ثبوت مل سکیں گے جن سے مسلمانوں پر ہندوستان کو تقسیم کرانے کے بیہودہ اور یکطرفہ الزام کی نفی و تردید ہوتی ہے۔

اطہر صدیقی دیوبند
۳۱/ اگست ۱۹۶۱ء

تری خاک میں ہے اگر شرر

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فکرِ غنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری
نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللٰہی، وہی مرحبی وہی عنتری
کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

حبیب دوست کی پیشین گوئی

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے مجھے نیاز حاصل ہوا۔ نیو سنٹرل جیل ملتان میں ۱۹۳۲ء میں میں تو چھ ماہ کی قید کاٹ کر رہا ہو گیا مگر مولانا صاحب کی قید لمبی تھی۔ پھر ایک دفعہ گجرات جیل میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا۔

ان دنوں کی جب یاد آتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ہماری زندگی کے وہ سنہرے دن تھے۔ ایسی ہستیوں کا ساتھ جیل میں ہی نصیب ہو جاتا تھا جن کی صحبت باہر مشکل سے ملتی تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ چونکہ بزرگ تھے اور جیل کے سپرنٹنڈنٹ وغیرہ ان کی عزت کرتے تھے، ہم لوگوں کے کام میں دل چسپی لیتے تھے اس لئے ہم لوگ اپنی کوئی دقت ہوتی تو ان کے ذریعے دور کرا لیتے۔ اکثر جیل میں سیاسی مسئلوں پر بحث چھڑ جاتی تو مولانا اتنی وضاحت کرتے کہ ہم مطمئن ہو جاتے۔ جہاں تک اصولوں کا تعلق تھا شاید مولانا ان چند لیڈروں میں سے تھے جن کے اصول بدلتے نہیں تھے۔ ہاں ہاں وہ موقع پرستی اور موقع پرستوں سے نفرت کرتے تھے۔ ملک کی آزادی کے لئے کسی قربانی کو کم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ایک سچے مسلمان اور پکّے ہندوستانی تھے۔ ملک کی آزادی کا مولانا کو پکا یقین تھا، وہ کبھی ڈگمگائے نہیں۔ کہتے تھے ہماری زندگی میں ہی ملک آزاد ہو گا، ایسا ہی ہوا بھی، مگر افسوس ملک کے جو ٹکڑے ہوئے اس نے آزادی کے مزے کو کرکرا ہی کر دیا۔ پارٹیشن کے بعد مولانا صاحب اپنا وطن چھوڑ کر دہلی آ گئے تھے۔ اس کا ان کے دل پر بڑا صدمہ تھا۔ یہاں جب بھی ملاقات ہوتی تو صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یہاں آ کر خوش نہیں تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ آزادی کے بعد جب یہاں ان کو مجبوراً آنا پڑا تو ان کو وہ مقام نہیں ملا جو ان کا تھا۔ موقع پرستوں کا زور ہو گیا اور حقیقی وطن پرست لوگوں کو پیچھے دھکیل دیا گیا۔

خیر مگر ان کو شکوہ نہ تھا۔ گو ان کے دل پر گہرا اثر تھا ان سب باتوں کا۔

یہاں آنے کے کا اکثر میرے پاس آ جاتے اور کچھ اپنے دل کی کہہ جاتے کچھ سن جاتے۔ مگر ماحول ان کے موافق نہ رہا۔ جب بھی ملتے تو مجھے گلے لگا لیتے۔ کہتے تم نہیں بدلے ڈاکٹر بہت لوگ بدل گئے۔ میں کہتا کہ آپ کے قدموں کی برکت ہے۔ میں نہ بدلوں یہ ہی خدا سے دعا مانگتا ہوں۔

بھائی عزیز الرحمٰن بھی مجھ پر عنایت رکھتے ہیں۔ یہ ان کی مہربانی ہے مگر میں ہمیشہ اپنے کو اور جماعت کو قصوروار تصور کرتا ہوں کہ ہم بہت غلط راستے میں چلے گئے اور اپنے اصولوں کو بھی بھول گئے اور ان اصولوں پر چلنے والوں کو بھی بھول گئے۔

آج جو ملک کی حالت ہے وہ دیکھنے سے پہلے ہی مولانا چلے گئے۔ اگر آج وہ ہوتے تو یقیناً ملک کی بدقسمتی پر چار آنسو بہاتے، خدا ان کو جنّت نصیب کرے۔ کاش ہم لوگ ان کے نقش قدم پر چلنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔

خادم یدھ ویر سنگھ۔ دہلی
۲۵ر جنوری ۱۹۷۵ء

دیدہ ور پیدا

جہانبانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
(اقبال)

رئیس الاحرار

از ضیاءالحسن فاروقی

دیکھنے میں تو یہ ایک مضمون کا عنوان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن در حقیقت یہ ایک کتاب ہے جسے مولوی عزیز الرحمٰن جامعی نے مرتب کیا ہے جس کی قیمت پانچ روپے ہے اور جو تعلیمی سماجی مرکز بارہ دری شیر افگن دہلی ۶ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن میں اسے ایک مضمون کا عنوان ہی تصور کرتا ہوں اور اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کی شخصیت، تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ہماری قومی زندگی کے ایک ممتاز فرد تھے۔ فکر وعمل کی بیباکی ان کا خاص وصف تھا، حیات ملی کی تاریخ میں ان کے گفتار و کردار کی جرأت آموزی نے اپنے لئے جگہ بنالی ہے۔ مولوی عزیز الرحمٰن نے ان کی سوانح کا خاکہ پیش کر کے آنے والے مورخ کے لئے بڑی آسانی پیدا کر دی ہے۔

یہ کتاب جس کا عنوان اس مضمون کا عنوان ہے بعض لحاظ سے دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے عُلماء لدھیانہ کی راست بازی اور حق پرستی کی داستان جریدہ عالم پر ثبت ہوگئی ہے۔ انہیں عُلماء کے خانوادہ سے مولانائے مرحوم کا تعلق تھا اور مولانا نے اپنے خاندان کی شان دار روایات کو بڑی بے جگری کے ساتھ زندہ رکھا فتویٰ نصرۃ الابرار کی تاریخی اہمیت کا اندازہ بھی اس کتاب کے مطالعہ سے خوب ہوتا ہے اور عُلماء لدھیانہ کا وہ موقف بھی بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے جو علی گڑھ کے سیاسی موقف کی ضد تھا۔

اس کتاب میں ایک ضمنی عنوان ہے، موازنہ سیّدین، اس کے تحت کسی مفکر کے قلم سے سرسید احمد خاں اور سیّد جمال الدین افغانی کی نظریاتی آویزش کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ جائزہ مرتب کتاب کے قلم کا مرہون منت نہیں ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ مرتب کو کتاب میں اسے شامل کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی اور خاص طور سے اس لئے بھی کہ جب مرتب اور مفکر دونوں کی معلومات [1] جمال الدین افغانی کے متعلق صحیح نہیں ہیں۔ بے شک افغانی نے ہندوستانی نیچریوں کے متعلق اپنے اخبار میں مضمون لکھا اور ردِ نیچریت کے عنوان سے فارسی میں ایک رسالہ بھی تصنیف کیا جس کا عربی ترجمہ بعد میں مُفتی محمد عبدہٗ نے شائع کیا۔ لیکن افغانی نے جو کچھ لکھا تھا وہ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر لکھا تھا۔ سرسیّد کی تحریریں پڑھیں۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران میں سرسید کی مخالف پارٹی کے کچھ لوگوں سے افغانی کو سرسیّد کے بارے میں کچھ معلوم ہوا، اور اسی کو بنیاد بنا کر انہوں نے ان کے خلاف کچھ سطحی باتیں لکھ دیں۔ علی گڑھ کی سیاسی پالیسی کے خلاف عُلمائے لدھیانہ کے طرز عمل کو افغانی کی تحریروں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا فعل عبث ہے۔ اس لئے ان کی حق پرستی اور اصابت رائے کی توہین ہوتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں سوامی شردھانند کے شدھی اور سنگھٹن پروگرام کا جو دلچسپ سبب بتایا گیا ہے وہ بہت سے لوگوں کے سامنے پہلے پہل آیا ہوگا۔ مسلمانوں کے دستر خوان کی وسعت کس طرح اتنی اہم تخریبی تحریک کا سبب بن سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ دلچسپ واقعہ ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس واقعہ کی ایک لطیفہ سے زیادہ حیثیت نہیں۔ اس لئے کہ خلافت تحریک اور ترک موالات کے زمانے میں ہندوؤں اور مُسلمانوں میں جو اتحاد نظر آتا تھا وہ محض عارضی تھا۔ اس کی بنیاد ایک طرح کا منفی نقطۂ نظر تھا، جسے انگریز دشمنی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] علی گڑھ اسکول کی ناراضگی سے بچنے کے لئے پیراگراف ۲ لکھ دیا۔ ورنہ علامہ جمال الدین افغانی کو سرسید اور ان کی افتادِ طبع اور سازشوں کا پورا علم تھا۔

اس اتحاد کے پیچھے کوئی مثبت قومی نظریہ نہیں تھا۔ قومی آہنگی کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے سر رضا علی کا اعمال نامہ اس کا ثبوت ہے، سر سید جو کچھ کر رہے تھے اسکے محسن الملک اور حالی بے حد دل بر داشتہ تھے۔ دیکھئے! مسلمانوں کا روشن مستقبل کوئی تحریک نہیں شروع کی گئی تھی۔ دونوں تہذیبوں کا بنیادی اختلاف اپنی جگہ بر قرار تھا۔ سیاست کے نشیب وفراز کے ساتھ یہ اختلاف کبھی دب جاتا تھا اور کبھی ابھر آتا تھا اور اس طرح اختلاف و اتحاد کا نشیب و فراز قائم رہتا۔ ہندوستان کے قوم پرست (ان قوم پرستوں میں خالص سیکولر نقطۂ نظر کے حامل محض چند افراد ہی رہے ہوں گے) اس بلندی اور پستی پر کبھی خوش ہوتے تھے اور کبھی ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔ سیاسی ہنگاموں میں اس کی فرصت کسی ملتی تھی کہ وہ اس مرض کا سبب تلاش کرے اور اسے دور کرنے کے لئے قومی پیمانے پر کوئی سوچی سمجھی تحریک چلائے، نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کا بنیادی اختلاف قائم رہا اور جب اہم فیصلہ کا وقت آیا تو ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی۔

اس کتاب میں تقسیم ہند کا سیاسی پس منظر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، مگر اس کی نوعیت واقعاتی ہے۔ فکری و ذہنی کم ہے اور ظاہر ہے کہ کسی کی سوانح حیات واقعات ہی کا ذخیرہ ہوتی ہے۔ لیکن تعجّب ہے کہ مولانائے مرحوم جیسا صاحب فہم و فراست کیسے اس اہم مسئلہ کو نظر انداز کر گیا اور مرتب نے کس طرح اسے گوارا کیا کہ اس بنیادی مسئلہ کو فراموش کر دے۔ خاص طور سے اس لئے بھی کہ آج تقسیم ہند کے تیرہ سال بعد بھی کم و بیش وہی صورت حال ہے جو تقسیم سے پہلے تھی۔ کانگرس پہلے بھی قومی ہم آہنگی کے میدان میں ناکام رہی تھی اور آج بھی وہ اسی صورت حال سے دوچار ہے۔

افغانستان میں غازی امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت کرائی گئی اور عاقبت نا اندیش ملاؤں نے جب مذہب کے نام پر غازی کے خلاف جہاد بول دیا تو مرکزی خلافت کمیٹی بھی اس رو میں بہہ گئی اور اس کے رہنماؤں نے اپنی سادہ لوحی کے سبب انگریزی سیاست کے ہاتھ میں کھیلنا شروع کیا تو مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مرحوم کی فراست نے معاملہ کی اصل نوعیت کو سمجھ کر مرکزی خلافت کمیٹی کی گرہی کا پردہ فاش کیا۔ اس وقت مولانا مرحوم پنجاب خلافت کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ اس طرح مرکزی خلافت کمیٹی اور پنجاب خلافت کمیٹی میں کش مکش شروع ہوگئی، یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء تک نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر یہ کشمکش اتنی شدید ہوگئی کہ پنجاب کمیٹی ختم ہوگئی۔ اس پورے ہنگامے کے دو پہلو بہت اہم ہیں (۱) مولانا آزاد اور علی برادران کا اختلاف مسئلہ افغانستان کے سلسلہ میں اور (۲) مولانا حبیب الرحمٰن کا موقف غازی امان اللہ کی حمایت میں، اس سے متعلق کتاب مذکور میں چند خطوط ہیں جو دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ خطوط چونکہ پہلی بار سامنے آئے ہیں اس لئے کتاب کی اہمیت و افادیت تاریخی نقطہ نظر سے بڑھ گئی ہے۔

الغرض رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، اگر ایک طرف مولانائے مرحوم کی سوانح حیات اور ان کے مجاہدانہ کارناموں کی داستان ہے تو دوسری طرف ہماری قومی تحریک کے بعض ایسے گوشوں کو سامنے لاتی ہے جو تاریخی لحاظ سے دل چسپ اور سبق آموز ہیں، خاص طور سے پہلی گول میز کانفرس کے موقع پر ہمارے ملک کے بعض قومی و نیم قومی لیڈروں کا سیاسی دیوالیہ پن اور ان کی عبرت ناک تنگ نظری اتنے واضح طور پر پیش کی گئی ہے کہ وطن دوستی اور قوم پرستی کے جذبہ کو شرم آتی ہے۔

مولانا آزاد نے اپنی کتاب "ہماری آزادی" میں بعض اہم واقعات اور ان سے پیدا ہونے والے تاریخی نتائج کی طرف محض اشارے کر دیئے ہیں۔ اس کتاب میں بعض تفصیلات ایسی ہیں جن سے ان اشاروں پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی
پرنسپل جامعہ کالج۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ اوکھلا نئی دہلی
۱۹ر جولائی ۱۹۶۲ء

رئیس الاحرار منٹگمری جیل میں

از شورش کشمیری

دسمبر ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے۔ راقم اور کچھ دوست منٹگمری سنٹرل جیل میں قید کے دن گزار رہے تھے کہ ایک اخلاقی قیدی جو ہماری خدمت پر مامور تھا، کمرہ میں دوڑا دوڑا آیا اور کہا لیجیے افغانستان کے ایک بڑے وزیر بھی قیدی بن کر آ گئے ہیں انہیں شاہی قیدیوں کے وارڈ میں رکھا گیا ہے۔ ہم میں سے تقریباً سب نے اس کی بات سنی ان سنی ایک کر دی۔ کیونکہ ایک تو اس کے متعلق ہمارا خیال یہ تھا کہ دہلوی ہونے کے باعث رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتا ہے اور دوسرے ہم اس وقت بھوک ہڑتال کی اسکیم بنانے میں اس قدر محو تھے کہ ہمارے لئے کسی وزیر کا اسیر بن جانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، اور یوں بھی یہ بات کچھ جچتی نہیں تھی کہ افغانستان کا وزیر یہاں کیوں؟ بہر حال ایک بات تھی، ہو گئی۔ کچھ دن گزرے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ بھئی آپ لوگوں کو مولانا حبیب الرحمٰن سلام کہتے ہیں۔ احسن عثمانی نے جلدی میں پوچھا کیا ملاقات کے لئے تشریف لائے ہیں؟ کہا نہیں وہ تو ہفتہ عشرہ سے سرکاری مہمان ہیں۔

سرکاری مہمان ہیں؟

جی ہاں!

یہیں سے یہ عقدہ کھلا کہ افغانستان کے وزیر ہونے کا اشتباہ بھی آپ ہی پر کیا گیا تھا، مولانا کی دراز قامتی، درازریش بارونق چہرہ، چال میں تمکنت اور حجازی عبا کے پہناوے نے اخلاقی قیدیوں کو مغالطے میں ڈال دیا اور کچھ انہوں نے اپنی خاص قسم کی نفسیات کے تحت بنالیا کہ افغانستان کا وزیر قیدی بنایا گیا ہے۔ جن لوگوں کو جیل خانے میں سی کلاس کے قیدیوں سے ملی جلی زندگی بسر کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس طبقہ کی نفسیات کیا ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں رائی کا پہاڑ بنالینا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو افسانوی رنگت دینا، دن رات کا مشغلہ سمجھا جاتا ہے۔ مولانا کے متعلق وزیر افغانستان ہونے کی ”تہمت“ نے سر پیر نکالے، تو پھر طرح طرح کی باتیں بھی ساتھ ہی ٹانک دی گئیں۔

خود ہمارے مشقتی (قیدی خدمت گزار) نے ہم سے بیان کیا،

”صاحب کیا پوچھتے ہو، جرمنی کے ساتھ سمجھوتہ کیا تھا، بھید کھل گیا اور اب دھر لیئے گئے ہیں۔“

گویا اس بے چارے کے خیال میں، افغانستان بھی برطانوی ہند کا ایک صوبہ تھا اور وزیر افغانستان قومی رہنما، جو قانون دفاع ہند کے ماتحت ماخوذ تھے!۔۔۔ مولانا کو منٹگمری جیل میں آئے ہوئے پانچ چھ ہفتہ گزر گئے۔ لیکن ہمارے اور ان کے درمیان سنگ وخشت کی دیواروں کے علاوہ قانونی دیواریں بھی مزاحم تھیں، اور حکام نے سکندر حیات آنجہانی کی وزارت کے احکام کی متابعت میں ہمارے اور ان کے میل جول کی تمام راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔!

چند ہی دنوں میں مولانا کے رعب داب، ٹھاٹھ باٹھ، سج دھج اور چال ڈھال نے طلسم ہوش ربا کے بعض پُر اسرار کرداروں کی طرح قیدیوں میں ایک خاص مُعمہ کی صورت اختیار کرلی اور وہ عموماً آپ کا ذکر عقیدت واحترام، خوف وہراس اور ہیبت وحیرت سے کیا کرتے۔

ہم نے بھی اس میں اضافہ ہی مناسب سمجھا اور اپنی طرف سے، زیب داستان کی سرخیاں مہیا کر دیں۔۔۔!

دو اڑھائی ماہ کی تگ ودو کے بعد چوری چھپے ملاقات کا موقع پیدا ہو گیا اور جیل خانے کے عقبی حصہ میں راقم سے ملاقات ہو گئی۔ نہایت

مُحبّت سے معانقہ کیا۔ پوچھا کہو، لکھا پڑھی کا حال کیسا ہے۔ عرض کیا، شاعری پڑھتا ہوں، نثر لکھتا ہوں۔ فرمایا کیا لکھ رہے ہو؟

"احرار راہنماؤں کے سوانح زندگی۔"

"تمہیں کیا معلوم"

"بہت کچھ معلوم ہے، کچھ آپ مدد فرمایئے۔ اور ہاں آپ کے ابتدائی حالات کی تفصیلات درکار ہیں۔"

"میرے حالات؟"

"جی ہاں"

اتنے میں جمعدار نے کہا، ذرا جلدی فرمایئے داروغہ جی آرہے ہیں، مصافحہ کیا، اور ہم ایک ہی جیل میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے الگ ہوگئے اور وہ لمبی لمبی دیواریں ہمارے درمیان حائل ہوگئیں جو سنٹرل جیل منٹگمری میں ایوان انصاف کی سنگ دلی کا پتہ دیتی ہیں۔۔۔!

کوئی پندرہ۱۵ روز کے بعد ہمیں ایک کاپی ملی، جس میں آپ کے لکھوائے ہوئے حالات زندگی کا ایک دلآویز خاکہ تھا۔ پیشانی پر مرقوم تھا، میں کیا اور میرے حالات زندگی کیا، چند واقعات ہیں، جو اس لئے لکھوائے دیتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو عبرت ہو۔۔۔!

یہ صحیح ہے کہ انسان کو بہت سی چیزیں سماج میں تجربہ و تعلیم سے ملتی ہیں۔ لیکن بعض خصائص طبعی طور پر ایسے بھی ہوتے ہیں جو خاندان سے ورثہ میں ملتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لُطفِ عمومی سے طبیعت کا حسن بن کر، فطرت ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن کے پردادا حضرت مولانا عبد القادر اور صاحب رحمۃ اللہ علیہ پنجاب میں تنہا بزرگ تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف لدھیانہ میں فتویٰ دیا اور چند روز کے لئے شہر میں متوازی گورنمنٹ قائم کی۔

آپ کے دادا حضرت مولانا محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس علَم کو بلند رکھا۔ اور جب کانگریس نے اپنا ابتدائی ڈھانچہ تیار کیا تو ہندوستان و حجاز کے عُلماء سے بھی ان کے حق میں فتویٰ لیا اور خود بھی اپنی بصیرت کی روشنی میں فرمایا کہ مسلمانوں کے لئے کانگرس کی شرکت جائز ہے۔ دراصل مرحوم ان بزرگوں میں سے تھے جنہیں مشیّت ایزدی اپنی شمع نور سے اطاعت و بندگی کے صلہ میں اجالا کرتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ صفحۂ ہستی پر برطانیہ سے بڑھ کر مسلمانوں کا کوئی دشمن نہیں اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں جو حالات پیدا ہوگئے ہیں ان کے پیش نظر ہندو مسلم کے اشتراک ہی سے برطانوی نظم و نسق میں خلل ڈالا جاسکتا ہے۔۔۔!

انگریز دشمنی کا یہ جذبہ مولانا حبیب الرحمٰن کو ورثہ میں ملا ہے، اور یوں کہنا چاہئے کہ ان کی زندگی کے عناصر کا ایک جزو ہے حتیٰ کہ ان کے خون کی گردش ہی اس سے قائم ہے اور طبیعت کا حسن بن کر فطرت کی نیو بن گیا ہے اور یہی جذبہ آپ کی اولاد کے رَگ و پے میں بھی جاری ہے۔

قدرت نے آپ میں بہت سے خصائص جمع کر دیئے ہیں۔ وہ عُلماء کی محفل میں بیٹھ جاتے ہیں تو خنک لفظوں سے چشمہ صافی کی موجوں سے ایسے معانی ٹپکے پڑتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ، ایک درویش مدرسہ دل سے پڑھے ہوئے اسرار و رموز بیان کر رہا ہے۔

سیاست کے یورپی جوڑ توڑ سمجھنا سہل نہیں۔ ہمارے عُلماء کی ایک کوتاہی ہے کہ وہ جہاں انگریزی زبان سے نابلد ہیں وہاں انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس سیاست کے داؤ پیچ سے کیونکر نپٹا جاسکتا ہے۔ وہ دراصل چودھویں صدی کے اس زمانے میں قرن اول کے معاشری تصور کی فضا میں گھوم پھر رہے ہیں اور راقم کا عقیدہ ہے کہ جو پانی بہہ چکا ہو اسے واپس لانا محال ہے، محال کیا بلکہ جلتی ہوئی زندگی کی طرح اس کا کوئی نقش بھی واپس نہیں لایا جاسکتا۔

مولانا ابو الکلام آزاد کو تو چھوڑیئے کہ وہ جامع کمالات ہونے کے باعث عُلماء میں ایک استثنائی مرتبہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی زبان کو سیکھا۔ اور پھر اس کے علم و نظر کے ہر گوشہ پر قابو پالیا۔ دوسرے راقم کے نزدیک وہ اس دور میں اسلام کے واضح تصور کا صحیح

فکری مظہر ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ان کے برابر نہیں عُلماء کی صف میں جو شخص راقم کے خیال میں جدید وقدیم تصورات کے درمیان سنگم بن سکتا ہے وہ مولانا حبیب الرحمٰن ہیں اور راقم نے بارہا دیکھا کہ ان میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر دیکھنے کا جوہر فکری استعداد کے طور پر موجود ہے۔

وہ معاملہ کی تھاہ کو پالیتے اور گفتگو کے انداز سے معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا پس منظر کیا ہے؟ اور پھر ہلکے پھلکے انداز میں اس کا تجزیہ کر کے سمجھانا چاہتے ہیں۔ گو انہیں ابوالکلام کی شستہ زبان نہیں ملی اور نہ بخاری کی طرح بیان کی افسانوی شوخی ان کا شیوۂ گفتار ہے، لیکن چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑی بڑی باتیں ادا کر جاتے ہیں اور ادیب نہ ہونے کے باوجود ادب کا وقار و متانت ہاتھ سے (جانے) نہیں دیتے۔ سنجیدگی آپ کے کلام کا زیور ہے اور بہادری آپ کے دامان گرد کی سنہری جھالر۔۔۔!

کرپس جب پہلی دفعہ ہندوستان آیا تو میاں افتخار الدین کے مکان پر آپ سے ملاقات ہوئی۔ ہندوستان کی سیاست پر ایک گھنٹہ گفتگو ہوئی، اور جب رخصت ہونے لگے تو اس نے کہا۔ آپ مجھے ایک مرتبہ پھر ملئے گا۔ میں پروگرام کے مطابق آج کلکتہ جارہا ہوں۔ اگر آپ وہاں پہنچ جائیں تو مجھے اپنے مقصد کے لئے کئی گم شدہ راہیں مل سکتی ہیں اور پھر اس نے بعض صحافی حضرات کو ملاقات میں بتایا کہ مجھے مولانا کی گفتگو نے نہایت متاثر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں ہوں کہ اس وقت تک میں جن ذہین ہندوستانی سیاست دانوں سے ملا ہوں ان میں مولانا ایک سربرآوردہ سیاست داں ہیں۔

مولانا میں ذاتی محاسن بے شمار ہیں۔ مثلاً وہ جماعت کے لئے اپنی ذات اور اس کی ہر بلندی کو تیاگ (چھوڑ) دینے کے قائل ہیں اور ان کی زندگی میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے جماعت کے لئے بڑے سے بڑے ایثار کو بھی گوارا کر لیا۔ دوستوں کے دوست ہی نہیں بلکہ ان پر جی جان سے نچھاور بھی ہوتے ہیں۔ آپ کی تنظیمی صلاحیت بے پناہ ہے لیکن اب وقت کے صدموں نے انہیں کسی حد تک "تن آسان" بنادیا ہے۔ سوچتے ہیں، کرنا بھی چاہتے ہیں اور من میں آرزوئیں بھی شعلہ بن کر لہراتی ہیں لیکن پھر مُسلمان کی سیاست کے مزرعۂ ویران پر نظر ڈالتے ہیں تو اقبال کی زبان میں یہ کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ

مراچہ حاصلے کشت خرابے

اقبالؔ کی زبان میں۔۔۔ نہیں بلکہ اپنے تصور کی زبان میں۔۔۔؟ کیوں کہ آپ اور شاعری دو مختلف چیزیں ہیں اور نہ معلوم قدرت نے آپ سے اس ذوق کو کیوں سلب کر لیا ہے۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری ہیں کہ ان کی طبیعت چہروں کی رعنائی سے لے کر ادب کی خوبصورتی تک کی والہ و شیدا ہے اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ شعر و نغمہ کی مجلس آرائی میں صرف ہوتا ہے۔ مگر مولانا حبیب الرحمٰن سرتاپا، شاہ جی کا تضاد ہیں نہ شعر سے دل چسپی نہ حسن سے لگاؤ نہ نغمہ سے اٹکاؤ اور نہ زندگی کے جمالیاتی "دھاروں" سے رغبت۔ ایک خشک انسان جس کا نغمہ بانگ صلوٰۃ، جس کا حُسنِ چہرہ محراب اور جس کی معراج رسن و دار کی تماشا آرائی ہے۔

سالہاسال آل انڈیا مجلس احرار کے صدر رہے اور نہایت طنطنہ سے کام کیا۔ جب صدر تھے تو بول چال کے تیور بھی صدارتی تھے۔ اب صدر نہیں تو صدر کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ یعنی یہ آپ کی فطری خوبی ہے کہ آپ تابع رکھ بھی سکتے ہیں اور تابع رہ بھی سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی طرح نہیں جو اقتدار کے منصب سے ہٹ خلقی افتاد کی نقش آرائی پر اتر آتے ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں میں دیکھا گیا اور ابھی پچھلے دنوں احرار کو ایک ایسا مہلک صدمہ سہنا پڑا ہے۔

آپ نے ۵۴ برس کی عُمر میں دس سال چھ مہینے، قید خانے میں گزارے ہیں اور یہ زندگی کا پانچواں حصہ ہے۔ لُطف یہ کہ ہندوستانی بھی کائنات انسانی کی کھیپ کا پانچواں حصہ ہے۔

عام حسابی قاعدے کی رو سے دیکھا جائے تو ہفتہ میں ڈیڑھ دن آپ نے جیل خانہ کی نذر کیا ہے اور دن رات کے چوبیس گھنٹہ میں پانچ گھنٹے

ایسے ہوتے ہیں جو زنجیر و سلاسل کی بستگی میں کٹے ہیں۔

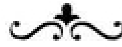
آپ کی طویل قید پانچ برس کا وہ زمانہ ہے جو آپ نے اس دفعہ قانون دفاع ہند کے تحت بسر کیا اور استقلال کے ماتھے پر شکن تک نہ ابھری۔۔۔ لیکن اس قید نے جہاں آپ کی صحت پر برا اثر ڈالا ہے وہاں دماغ میں عفو و درگذر کا خانہ بھی قدرے مشتعل ہو گیا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شبنم کی جگہ انگارہ نے لے لی ہے۔ مولانا۔۔۔ شروع شروع میں احرار کا دل سمجھے جاتے تھے۔۔۔ لیکن اب انہیں دماغ بھی کہا جاتا ہے۔

اقبال نے درست ہی کہا ہے

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری

شورش کاشمیری

۲۱ر نومبر ۴۶ء



رئیس الاحرار کا قلمی چہرا

از ناز انصاری

سیاست ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ اور اگرچہ آج وہ عملاً سیاسیات سے بے تعلق ہیں، مگر سیاست کئی پشتوں سے ان کا عنوان حیات رہی ہے اور دہلی کے کوچہ رحمن میں گوشہ نشین ہونے کے باوجود ان کا ماغ وہی سوچتا ہے جو ایک حریت پسند اور مجاہد کے دماغ کو سوچنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک ہندوستان و پاکستان کے لیڈروں میں ان کا شمار آج بھی اگلی صف کے لیڈروں میں ہونا چاہئے۔ اور ان کے تاریخی وصف سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ان ممتاز افراد میں ہیں جن کے خاندان نے چار پانچ پشتوں تک برطانوی اقتدار کا جم کر مقابلہ کیا اور یہ ایک عبرت ناک حقیقت ہے کہ کوچہ رحمن میں ان کی زندگی ایک بڑے اور تاریخی ہنگامے کی ایک کمزور آواز بن کر رہ گئی۔ بڑا سر، لمبی سفید داڑھی، لمبا کرتا، بھاری بھر کم مرعوب کن آواز، ان کی عظمت اور بزرگی کا پتہ دیتی ہے اور خاص طور پر ان کی آواز تو آج بھی ایک خطیب شہیر کی بنی بنائی آواز معلوم ہوتی ہے، جو پھیلتی ہے، چھا جاتی ہے اور ماحول کو مغلوب کر لیتی ہے۔ پنجاب نے بہت سے خطیب پیدا کئے اور بلاشبہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری ایک بے مثل مقرر ہیں، لیکن مولانا حبیب الرحمٰن کی آواز نے ان کی خطابت میں خطابت کی جو شان پیدا کی وہ کسی میں پیدا نہ ہو سکی۔ ایک زمانے میں مشہور تھا کہ مولانا کا رنگ اگر کسی جلسہ پر ایک بار جم جائے تو کبھی پھیکا نہیں پڑ سکتا تھا، مولانا، نہرو رپورٹ کے حامی تھے۔ مخالفین کی کوشش ہوتی تھی کہ مولانا کی تقریر سے پہلے جلسہ درہم برہم کر دیا جائے۔ اس لئے کہ اگر وہ بولے تو بس ان کا طوطی یا طوطا بولنے لگے گا۔ مولانا کی زندگی بجائے خود مجاہدۂ حریت کی ایک تاریخ ہے۔ اور اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مولانا ظفر علی اور ان کے "زمیندار" نے پنجاب میں مشاہیر اور اکابر کا جو گروہ پیدا کیا۔ اس میں مولانا حبیب الرحمٰن کا مقام بہت بلند تھا۔ مولانا میں بلاشبہ بہت سی خوبیاں تھیں۔ لیکن 'زمیندار' کے جلی عنوانات نے مولانا کو پنجاب کی عوامی زندگی کا ایک جلی عنوان بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ سوء اتفاق تھا کہ پرانے ساتھیوں کا اتحاد قائم نہ رہ سکا اور مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے رفقاء مجلس احرار کے قیام پر مجبور ہوئے۔ مجلس احرار کے قیام کے بعد اگر چودھری افضل حق اور مولانا مظہر علی اظہر اس کے دل و دماغ تھے اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اگر اس کی زبان تھے، تو ہمارا خیال ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن اس کے ضمیر تھے اور مجلس احرار کو وطنی مقاصد کا ہم آہنگ بنانے میں مولانا کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔ مجلس احرار کبھی کانگرس کے قریب آئی کبھی اس سے دور گئی لیکن وطن کو جب اور جس دور میں قربان ہو جانے والوں کی ضرورت پیش آئی مولانا حبیب الرحمٰن اپنے ساتھیوں سمیت کبھی راہ حق سے پیچھے نہ ہٹے۔ خیال ہو سکتا تھا کہ تقسیم کے بعد مولانا شاید پاکستان میں رہتے اور حق بات بھی یہ ہے کہ بھاول پور نے ان کے لئے اپنی آغوش وا بھی کر تھی، مگر کچھ بات ہی ایسی تھی کہ مولانا دہلی آ گئے اور جو راہ ان کے بزرگوں نے اور انہوں نے اختیار کی تھی اس پر پورے توازن اور یکسانی کے ساتھ قائم رہے۔ دہلی میں اب ان کی صحت اچھی نہیں رہتی اور ان کے مشاغل بھی زیادہ روحانی اور مذہبی ہیں۔ پھر بھی اب جو وہ اپنی نج کی صحبتوں میں فرماتے ہیں وہ ان کے تجربات کا عطر اور جوہر ہوتا ہے۔ مولانا کا وطن لدھیانہ ہے اور حالات کی اسے ستم ظریفی ہی کہئے کہ وہ ہندوستان میں رہ کر بے وطن ہیں اور اپنے آبائی وطن سے دور ہیں۔

ناز انصاری

۲۸ / جون ۱۹۷۵ء

ہوا کا رخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے

مولانا حبیب الرحمٰن کی تاریخ ہماری جدوجہد آزادی کی پوری تاریخ ہے جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ ان کے بزرگوں کی تاریخ کا جو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا وہ حصہ جو مولانا کی اپنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اس میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تاریخ آتی ہے۔

آج مولانا کے انتقال کے بعد جب میں پلٹ کر ماضی کی طرف دیکھتا ہوں اور اس میں مولانا کی تصویر ان سے پہلی ملاقات اور تعلقات کی ابتداء کو تلاش کرتا ہوں اور پھر اس وقت سے اب تک کے واقعات کا جائزہ لیتا ہوں تو وہ مجھے ایک اچھی خاصی کتاب کا مواد نظر آتا ہے۔

مولانا کو سب سے پہلے میں نے ایک احرار لیڈر کی حیثیت سے جانا اور ابھی میرے سیاسی شعور کا آغاز ہوا تھا کہ میں نے ان کو احرار کے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے سنا مولانا کے جلسوں میں بے پناہ ہجوم ہوا کرتا تھا۔ وہ جلسوں میں چھا جاتے تھے اور حاضرین میں سے کوئی جلسے کو درمیان چھوڑ کر نہ جاسکتا تھا، جلسوں میں جو کچھ کہا جاتا اسے سمجھنے کی مجھے تمیز نہ تھی لیکن اتنا جانتا تھا کہ یہ جلسے اس لئے ہوتے ہیں کہ انگریز کو ہندوستان سے نکالنا ہے یہی میری دل چسپی کا موجب اور جلسوں میں شرکت کا سبب تھا۔

جلسوں میں شرکت کا یہ سلسلہ جاری رہا اور رفتہ رفتہ جلسوں کی تقریر سمجھ میں آنے لگیں۔ مولانا کی تقریریں سننے کا اکثر موقع ملا اور میں نے محسوس کیا کہ ان کا انداز خطابت احرار اور جمعیتی لیڈروں میں منفرد تھا، چھوٹے چھوٹے جملے۔ نشتر کی طرح نوکیلے، دل کی گہرائیوں تک اترنے والے۔ صاف وشستہ زبان۔ آواز گرج دار۔ الفاظ کے مفہوم کے مطابق تقریر میں نشیب وفراز۔ لہجہ عموماً پرجوش ہوتا۔ ایک ایک جملہ اس طرح ادا کرتے کہ جیسے سامعین کو سمجھا رہے ہوں۔

جب طالب علمانہ زندگی کا خاتمہ اور عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ ذوق کی تسکین کے لئے سیاسی لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا تو یو، پی کی مجلس احرار کے صدر نواب زادہ محمود علی خاں کے یہاں مولانا کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور جلسوں کے بعد ان کی محفلوں اور عوامی اسٹیج میں کوئی فرق نہیں وہ جو باتیں وہاں کہتے تھے وہی محفلوں میں کہتے تھے اور یہ چیز بعد کو میں نے محسوس کی اور اب گزشتہ چند سالوں تو میرا یہ احساس بالکل پایہ تصدیق کو پہنچ کر اپنی جگہ مستحکم ہو گیا کہ مولانا کا ظاہر وباطن ایک رہا۔ ان کی سیاست اور نظریات سے کسی کو ایک لاکھ اختلافات ہوسکتے، لیکن یہ بات شاید ان کا بدترین مخالف بھی نہ کہہ سکے گا کہ مولانا نے اپنے ضمیر کو دھوکہ دیا، یعنی انہوں نے کبھی بھی کوئی ایسا کام کیا جس کو وہ غلط خصوصاً مسلم عوام کے لئے مضرت رساں جانتے تھے۔

یوں تو انہیں مسلمانوں کی اکثریت کی سیاست سے اختلاف رہا۔ لیکن انہوں نے دیانت داری کے ساتھ اختلاف کیا، جس راہ کو انہوں نے اپنے نزدیک درست سمجھا اس پر چلتے رہے کسی کو اگر وہ ناپسند تھی تو ہوا کرے۔ انہوں نے کسی کی پسند یا ناپسند کی کبھی پروا نہیں کی اور مولانا کی زندگی میں ایک آدھ نہیں متعدد موڑ ایسے آئے کہ جب انہوں نے انسانوں کی بھیڑ سے الگ راستہ اختیار کیا اور یہی نہیں مولانا نے اپنے قریبی دوستوں اور ہر وقت کے ساتھیوں سے اختلاف کیا، مگر صدق دلی اور سچائی کے ساتھ۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ سننے کے لئے پورا ملک بے چین تھا۔ میں سہارن پور میں مرزا اوصاف بیگ کے مکان پر رات کو سوا نو بجے ہندوستانی میں خبریں سننے کے لئے بیٹھا تھا کہ مولانا بھی تشریف لے آئے۔ وہ بھی خبریں سننے کے لئے آئے تھے۔

جب ریڈیو پر یہ خبر سنائی گئی کہ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے پنجاب کی تقسیم کی تجویز پیش کی ہے تو مولانا کے منھ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے "کانگریس نے اپنی تاریخ کا سب سے غلط فیصلہ کیا ہے۔" سب حیرانی سے مولانا کا منھ تکنے لگے۔ مولانا نے کہا میں صحیح کہہ رہا ہوں، آپ لوگ دیکھیں گے کہ اب اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بنگال کی تقسیم کا بھی مطالبہ کیا جائے گا اور کانگرس کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پورا ملک تقسیم ہو جائے گا۔ کانگرس نے اپنے ہاتھوں اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ چنانچہ دنیا نے دیکھ کہ اس کے بعد ملک کس طرح تقسیم ہوا اور تقسیم کے کس قدر تباہ کن اثرات رونما ہوئے آج جب مولانا کی یہ بات مجھے یاد آتی ہے تو میں ان کی سیاست دانی اور دور بینی کا قائل ہو جاتا ہوں۔

چونکہ میں نظریاتی اعتبار سے مولانا کا ہم خیال تھا، اس لئے مجھے دن بدن مولانا سے قربت حاصل ہوتی گئی اور میں بالواسطہ طور پر مولانا کے نظریات کا ترجمان بن گیا اور اس کے بعد مولانا کے انتقال تک مولانا سے تعلقات رہے۔ وفات سے دو روز قبل ملاقات ہوئی تو اس میں بھی اس دور کا ذکر آ گیا۔ مولانا ہمیشہ مجھ سے اسی قدر محبّت سے پیش آئے جیسے اپنے بچوں سے آتے تھے۔ حالاں کہ اس دوران میں کئی ایسے مواقع آئے کہ نجی گفتگو اور پرائیویٹ محفلوں ہی میں نہیں بلکہ سر اخبار میں نے مولانا سے اختلاف کیا۔ لیکن کیا مجال ہے کہ مولانا کی پیشانی پر کبھی بل آیا ہو ہمیشہ خندہ پیشانی سے ملے، بلکہ مجھے ہی الٹی شرمندگی ہوتی رہی، خصوصاً اس وقت جب مولانا کہتے بھئی! تم تو آج کل ہم سے ناراض ہو۔ کبھی مولانا سے ملے ہوئے دیر ہو جاتی اور راستے میں ملاقات ہوتی تو بڑی محبّت سے شکایت کیا کرتے۔

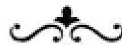
مولانا کی عمر اس وقت سنہ ہجری کے مطابق ۶۵ برس کی تھی۔ اس میں سے لگ بھگ تیرہ ۱۳ برس یعنی عمر کا پانچواں حصہ انگریز کی جیلوں میں گزرا تقریباً بیس ۲۰ برس کی عمر سے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور پھر ہندوستان کی جنگِ آزادی کے اُس دور میں جو ہماری جد و جہد کا فیصلہ کن دور تھا وہ آزادی خواہوں کی صف اول میں تھے۔ مولانا کے مقام اور پنجاب کی سیاست میں انہیں جو دخل حاصل تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جب ۴۵ء میں شملہ میں ویل کانفرنس ہوئی تو مولانا آزاد کے کہنے پر وزیر اعظم پنجاب ملک حضر حیات نے بذریعہ تار ان کو رہا کیا اور وہ فوراً شملہ پہنچے اور مولانا آزاد کے مشوروں میں شریک رہے۔ مولانا آزاد پر بہت بھروسہ کرتے تھے اور انہیں پنجاب میں مولانا آزاد کی پالیسی کا عَلم بردار کہا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کو آزادی ملی اور ان کے آباؤ اجداد کی قربانیاں رنگ تولائیں، مگر ہندوستان تقسیم بھی ہو گیا اور واقعات کی سب سے بڑی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ آزادی اس طرح آئی کہ مولانا کو گھر بار تک چھوڑنا پڑا۔ ملک تقسیم ہو گیا اور جس تقسیم کے مولانا مخالف تھے ایک بار انہیں گھر بار چھوڑ کر لدھیانہ سے اسی تقسیم شدہ حصہ میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ بھاول پور میں قیام کیا۔ لیکن وہاں زیادہ عرصہ نہیں ٹھہرے اور دہلی تشریف لے آئے پھر مرتے دم تک دلّی میں رہے۔

مولانا کی بہادرانہ اور وطن پرورانہ زندگی کا ایک مضمون نہیں ایک کتاب کا موضوع ہے۔ کاش میرے لئے کبھی یہ ممکن ہوسکے۔

نازانصاری

۲۱/ستمبر ۱۹۷۵ء



ذہین رہنما

از مولانا محمد میاں

مجاہد جلیل، رئیس الاحرار حضرت مولانا حَبیب الرحمٰن کو لدھیانوی کہا جاتا ہے کیونکہ لدھیانہ ان کا آبائی وطن تھا، جہاں ان کا جدی مکان تھا اور خود ان کا بنایا ہوا مکان بھی۔ مگر جو سب کے لئے ہوتا ہے وہ سب کا ہوتا ہے کسی خاص شہر کی طرف اس کی نسبت کسی تاریخی تقاضے کی بنا پر ہوتی ہے۔ ورنہ ہر شہر اس کا اپنا شہر ہوتا ہے اور وہ آگے بڑھے تو کہنے لگتا ہے۔ ع

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خداء ماست

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی شخصیت اسی طرح کی تھی، مولانا حَبیب الرحمٰن کا وطن اگرچہ لدھیانہ تھا مگر ان کی بود وباش زمانۂ طالب علمی میں درس گاہوں میں اور آخر میں دار العلوم دیوبند میں رہی۔ مولانا کا طالب علمی کا دور ختم ہوا تو وہ ملک وملت کے لئے اسٹیج پر نظر آتے تھے یا جیل خانہ میں بسیرا کرتے تھے۔

۱۹۴۷ء تک مولانا حَبیب الرحمٰن کی عُمر کا جتنا حصہ گزرا اسی طرح گزرا، احقر نے دار العلوم دیوبند میں عربی شروع کی اس وقت مولانا فارغ ہو چکے تھے۔ مولانا دار العلوم دیوبند سے چلے آتے تھے مگر ان کے نام کی شہرت دار العلوم میں باقی رہی اور وہ برابر بڑھتی ہی رہی، یہاں تک کہ مولانا کسی مخصوص حلقے کے نہیں، بلکہ پورے ہندوستان کے مسلّمہ رہنما ہو گئے۔

دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد احقر کی عمر کے چند سال آرہ۔ شاہ آباد صوبہ بہار میں گزرے اور عمر کا قیمتی حصہ مراد آباد میں ختم ہوا۔ اس پورے عرصہ میں مولانا موصوف کا قرب میسر نہیں آیا۔ مولانا آسمانِ شہرت کے آفتاب ماہتاب تھے اور احقر مولانا کو اسی طرح دیکھا کرتا تھا جیسے زمین کے بسنے والے چاند ستاروں کو دیکھتے ہیں۔

مجھے مولانا کا قُرب دسمبر ۱۹۴۷ء کی آخری تاریخوں میں میسر آیا۔ جب مولانا کو بذریعہ ہوائی جہاز مغربی پاکستان (غالباً بھاول پور) سے لکھنؤ بلایا گیا۔ جہاں ہندو یونین کے مُسلمانوں کی وہ مشہور تاریخی کانفرنس ہو رہی تھی جس کو "آزاد کانفرنس" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے محرّک حضرت مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ رحمۃ اللہ علیہ

لکھنؤ سے مولانا دہلی تشریف لائے اور جمعیۃ العلماء کے دفتر کی پشت پر اس مکان میں قیام فرمایا جو آج کل حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا زنان خانہ ہے۔ حاجی محمد فاروق صاحب سوداگر لیڈر کو مولانا سے تعلق پہلے سے تھا۔ اس زمانے میں اور خصوصیت پیدا ہو گئی۔ احقر کو بھی مولانا کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا اتفاق اسی وقت سے ہوا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا۔ مغربی اور مشرقی پنجاب کی آبادیوں کا تبادلہ ہوا۔ مشرقی پنجاب کے تقریباً تمام ہی رہنماؤں کو جو تقسیم کے مخالف تھے، مغربی پنجاب جانا پڑا۔ ان میں سے بہت سے ذہنی طور پر پاکستانی سانچے میں ڈھل گئے اور جو ذہنی طور پر نہیں ڈھل سکے وہ عملاً اس سانچے میں کھپ گئے۔ مگر مولانا حَبیب الرحمٰن کی شخصیت وہ تھی جو آخر تک اپنے عقیدہ اور خیال پر قائم رہے۔ ان میں مستقل مزاجی کے ساتھ قائم رہنے کی بڑی جرأت تھی اور یہی ایک رہنما کی وہ پختگی ہے جو تاریخ جاوید کا نقشِ حیات بنا کرتی ہے۔ حضرت مولانا کی سوانح حیات مرتب کرنا تو حضرت موصوف کے صالح اور رشید اخلاف کا کام ہے جن کو واقفیت بھی احقر سے زیادہ ہے، اور خدا نے قوت تحریر بھی احقر

سے زیادہ عطا فرمائی ہے۔ احقر کے سامنے تو چند بنیادی اوصاف ہیں جن میں مولانا کو امتیاز حاصل تھا۔

۱۔ ذہانت۔ مولانا کا مخصوص وصف تھا جس نے آپ کو پوری جماعت میں سب سے زیادہ ممتاز کر دیا تھا۔ ذہانت کے ساتھ فراست اور سیاسی بصیرت بھی ممتاز خصوصیت تھی اور کوئی بھی سمجھ دار شخص پہلی ہی مجلس میں مولانا کی ان خصوصیتوں سے متاثر ہو جاتا تھا۔

سیاسی بصیرت کو مولانا دن بدن ترقی بھی دیتے رہتے تھے چنانچہ نہ صرف مولانا کا معمول تھا بلکہ احقر جیسے کاہل اور مطالعہ اخبار کے بارے میں جان چور خدام کو تنبیہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص مخالف اخبارات کو پابندی سے نہیں پڑھتا وہ کبھی قوم کی خدمت بیدار مغزی سے نہیں کر سکتا۔

مولانا فرمایا کرتے تھے ایک سیاسی رہنما کا نماز صبح کے بعد سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ مخالف اخباروں کو دیکھے۔

۲۔ جس وصف نے مولانا کی ذہانت و بصیرت کو جوہری شان بخش دی تھی، وہ جرأت، دلیری اور بہادری تھی جو عالم کی سخاوت کی طرح مولانا کے نام نامی کے ساتھ لازوال خصوصیت بن گئی ہے جس نے مولانا کی زندگی کو ہمیشہ مصائب کے شکنجے میں گرفتار کیا۔

اے روشنی طبع کہ تو برمن بلاشدی

۳۔ مولانا کے تصور کے ساتھ جس چیز کا تصور دماغ پر چھاجاتا ہے وہ آپ کی فراخ حوصلگی، مدارات اور تواضع ہے جو ہر اس شخص کے لئے عام ہوتی تھی، جس کے متعلق وہم ہو جاتا تھا کہ وہ کسی حیثیت میں مولانا کا مہمان ہے پھر یہ مدارات عام بھی تھیں۔

بریں خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست

حضرت مولانا کے ان اوصاف کی برکت یہ تھی کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب مولانا نے دہلی میں قیام فرمایا تو یہاں ہر فرقہ اور ہر طبقہ میں وہ ایسے ہی معروف تھے۔ جیسے کوئی مدت بامدت سے دہلی میں رہتا ہو۔ پھر جب کچھ عرصہ بعد وہ لدھیانہ تشریف لے گئے۔ جس کے متعلق محض خارزار ہونے کا تصور ہی نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے دہشت زار ہے وہ لدھیانہ میں ایسے ہی مقبول تھے جیسے تحریک کے اس دور میں جب مولانا لدھیانہ کے فرماں روا مانے جاتے تھے۔

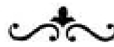
دو ماہ ہوئے نومبر کے دوسرے ہفتہ میں احقر لدھیانہ گیا، جہاں مولانا کے فرزندانِ ارجمند مولانا محمد احمد رحمانی فاضل دیوبند اور مولانا سعید الرحمٰن صاحب حضرت مولانا کی جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں تو مجھے محسوس ہوا کہ رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی یاد اسی طرح تازہ ہے جس طرح ان کی زندگی میں تھی۔ بلکہ مولانا کے صاحبزادگان کے پاس قیام کرکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کی وفات نہیں ہوئی بلکہ وہ زندہ جاوید ہیں۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش کہ زندہ شد بہ عشق

دعا ہے اللہ تعالیٰ مولانا کے ان اخلاف کو بھی ایسی زندگی کی توفیق بخشے جو ہمیشہ فنا سے ناآشنا رہتی ہے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

(مولانا) محمد میاں ناظم جمعیۃ علماء ہند

۱۶/ مئی ۱۹۶۲ء



حبیبِ قوم کے لختِ جگر عزیز و خلیل
مری نگاہ میں شورش برہنہ شمشیریں

اس جماعت کے تھے سردار حبیب الرحمٰن

ازغازی

یہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کی بات ہے کہ عروس آزادی کو پنجہ افرنگ سے نجات دلانے میں جس جماعت نے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کی تھی۔ اس جماعت کا نام "مجلس احرار اسلام ہند" تھا۔ جو افضل حق، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا مظہر علی اظہر ہی سے عبارت تھی۔

آج ہندوستان عروس آزادی سے ہم کنار ہے لیکن سردار بھگت سنگھ کو دار پر لٹکانے اور محبان وطن پر لاٹھیوں سے مشق ستم کرنے والے دندنا رہے ہیں۔ غدار بنگلوں میں داد عیش دے رہے ہیں اور ؎

"جس جماعت کے تھے سردار حبیب الرحمٰن"

اس کے رضاکاروں اور فداکاروں کے لئے سر چھپانے کے لئے بھی جگہ نہیں۔ اور وہ بحالی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہیں۔ اللہ رے نتیجہ پیکار انقلاب ؎

جو لوگ آشنائے وقار بشر نہ تھے
منزل انہیں ملی جو رفیق سفر نہ تھے

افسوس! "مجلس احرار ہند" کی یاد ایک خوش گوار عہد کی خوش گوار یاد بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے "مجاہدانہ" کارنامے پرانے اخبارات کی فائلوں میں دفن ہو کر محو ہو گئے ہیں اور اس کے سردار مولانا حبیب الرحمٰن "شاہجہاں آباد" دہلی) کی جامع کے پہلو میں خاک میں پنہاں ہیں۔ آہ!

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

سردار احرار مولانا حبیب الرحمٰن کا خاندانی تعلق افغانوں سے "شاہ زماں خاں" کے عہد زوال سے چلا آرہا ہے اور شاہ زماں وہی افغان غازی بادشاہ تھے جو انگریز کو ہندوستان سے نکالنے کی قسم کھائے ہوئے تھے اور جب سلطان ٹیپو کی امداد کے لئے عازم ہند ہو کر لاہور پہنچے تو ان کے خلاف "ولزلی" کے ایجنٹ میر مہندی علی مراد آبادی نے ایران کو اکسایا اور قلب ایشیا میں شیعہ وسنی منافرت کی آگ روشن کی تھی۔ جس کے نتیجے میں احمد شاہ درانی کے اس بہادر اور انگریز دشمن پوتے کو نہ صرف تاج و تخت سے بلکہ بصارت سے بھی محروم ہونا پڑا۔ آہ

آپ کہتے ہیں ہمیں غیروں نے برباد کیا
بندہ پرور یہ کہیں اپنوں کا ہی کام نہ ہو

"غازی" سردار احرار مولانا حبیب الرحمٰن سے اس وقت سے متعارف ہے جب کہ مولانا تحریک خلافت میں انگریز سے برسر جنگ تھے اور ان کے والد حضرت مولانا محمد زکریا صاحب ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ہر وقت فکر مند رہتے تھے۔

سردار احرار مولانا حبیب الرحمٰن ایک نہایت پاکباز اور پابند صوم صلوٰۃ متین و سنجیدہ بزرگ تھے اور ان کے برعکس "غازی" نہایت

رنگین مزاج واقع ہوئے تھے۔ اس لئے کبھی کبھی کسی الجھے ہوئے جماعتی مسئلے کو سلجھانے کے لئے چند گھنٹوں کے لئے باہم بیٹھ جانے کا موقع مل جایا کرتا تھا لیکن مسلسل ان کی محفل میں غازی کو بیٹھنے کا کبھی شرف حاصل نہ تھا۔ تاہم سیاسی خیالات میں غازی ہمیشہ ہی سردار احرار مولانا حَبیب الرحمٰن کے ہم فکر اور ہم خیال ہی رہے ہیں۔ ایک مرتبہ پٹیالہ میں احرار ورکروں کی کانفرنس کانگریس میں شمولیت کے مسئلہ پر ہو رہی تھی۔ اس پر تمام احرار کارکن کانگرس کے خلاف اور اس سے قطع تعلق کرنے پر بضد تھے۔ لیکن سردار احرار مولانا حَبیب الرحمٰن کا فرمانا تھا کہ احرار وہی ہو سکتا ہے جو کانگرسی بھی ہو۔ اگر احراری کانگرسی نہیں تو پھر اس میں اور مُسلم لیگی اور ایک فرقہ پرست میں باقی کیا فرق رہ جاتا ہے۔ اس کانفرنس میں سردار احرار مولانا حَبیب الرحمٰن کے ہم نوا غازی کے علاوہ دوسرے بزرگ ملک نصر اللہ خاں عزیز آف ایڈیٹر مدینہ تھے اور آخر کار تمام کانفرنس نے مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے چند ساتھیوں کے دلائل کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور کانگریس میں شمولیت کا فیصلہ کیا گیا۔

سردار احرار مولانا حَبیب الرحمٰن کی ایک خوبی تو معاصرین میں امتیازی شان رکھتی تھی۔ جس کے حضرت مولانا مُفتی مُحمد کفایت اللہ اور تمام حریت پرست پارٹیوں کے رہنما قائل تھے۔ وہ یہ تھی کہ خدا کی مخلوق کی خدمت کو وہ ہر حالت میں انجام دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جیل میں اپنے قیدی دوستوں کی خدمت میں مسرت محسوس کرتے تھے اور جیل سے باہر اپنے غریب نادار اور مخلص رضاکاروں کی خدمت کو اور سردار احرار کی خدمات اور خوبیوں کے بیان کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے اور "غازی" کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس مختصر مکتوب میں ان کی خدمات اور خوبیوں کو قلم بند کر سکے۔ ؎

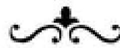
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

اور یہ چند سطور بھی وہ اس لئے سپرد قلم کر رہے ہیں کہ وہ اپنے مرحوم رہنما کے ذکرِ "حَبیب" کے ثواب سے محروم نہ رہ جائیں۔ ورنہ "غازی" ان تمام حالات کو کتابی صورت میں قلم بند کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خدا توفیق دے۔ آمین

سردارِ احرار کے فرزندِ رشید مولانا عزیز الرحمٰن نے ضرور ایک کتاب "رئیس احرار" کے لئے شائع کی ہے لیکن وہ سردار احرار کی عوامی زندگی پر کماحقہ، روشنی نہیں ڈالتی۔ ان کی عوامی خدمات اور عوامی زندگی پر ان کے کسی احراری دوست کا لکھنا زیادہ ضروری اور مناسب تھا۔ اور انشاء اللہ تعالےٰ یہ خدمت "غازی" انجام دینے کی کوشش کرے گا۔ خدا سردار احرار مولانا حَبیب الرحمٰن کی مغفرت کرے اور ان کے صدقے میں غازی جیسے گنہگاروں کی بھی خدا مغفرت کرے۔ آمین

غازی

۱۶ر مئی ۱۹۶۲ء



جس نے تاریخِ عالم سے سلطنت برطانیہ کو مٹا دیا

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو ہم سے جدا ہوئے کچھ دن اوپر انیس ۱۹ برس بیت چکے ہیں۔ ہر سال اس مدت میں اضافہ ہوتا چلا جائے تا آنکہ صدیاں بیت جائیں گی اور مولانا مرحوم کی لحد کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔ مٹی کے نقش و نگار کے تمام گھروندے زمانے کی بے اعتنائی اس طرح روند ڈالے گی، گویا یہاں کبھی کسی کا مزار ہی نہیں تھا۔

لیکن دہلی کی سرزمین ہمیشہ گواہی دیتی رہے گی کہ میرے دامن پر ہنوز ایک ایسا انسان آرام کر رہا ہے جس نے انگریزی سامراج سے ٹکرا کر اپنا سر نہیں پھوڑا بلکہ تاریخ عالم سے سلطنتِ برطانیہ کے نشان تک مٹا دیئے۔

جب وہ گرج کر برستے تو باطل کی صفوں میں انتشار پھیل جاتا۔ جب وہ احکام شرعیہ پر اپنا فیصلہ دیتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے عمر فاروق ہیں کہ دین سے انحراف کرنے والوں کو تنبیہ کر رہے ہیں۔ ان کی پیشانی کی شکنوں سے برطانوی سامراج پر سیکڑوں شکن پڑ جاتے اور جب وہ مسکراتے تو سُنتِ نبوی کی روشن قندیلیں اور چمک اٹھتیں۔

یہ تھے مولانا حبیب الرحمٰن، ان سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۹ئ میں جالندھر کے ایک گاؤں نکودر میں ہوئی۔ یہاں ان دنوں مدرسۂ عربیہ کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا اس ملاقات کی تفصیل زیر طبع کتاب تاریخ امیر شریعت میں آئے گی۔

سیاسی اعتبار سے یہ دن پاک و ہند کی آزادی کی جد وجہد کے دن تھے۔ انگریزی سامراج سے ٹکر لینے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہی ٹکر آگے چل کر نمکین ستیہ گرہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

مجلس احرار اسلام کا قیام

۱۹۳۱ء کے آخر میں جب میں جیل سے واپس آیا تو ملک کے حالات اور خاص کر ریاست کشمیر میں ڈوگرہ شاہی مظالم سے تنگ آئے ہوئے مُسلمانوں کی چیخ و پکار سے پاک و ہند کے مسلمان آپے سے باہر ہو رہے تھے اور غیر مُسلم اخبارات کی بے ہنگم فرقہ پرستی نے حریت پسند طبقے کو اپنی جگہ سے ہلا دیا تھا۔ دوسری طرف ہندوستان کا نیشنلسٹ ہندو کشمیر کی آزادی کے لئے مرنے والے عوام کو احترام کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ ایسے ہی حالات تھے کہ جولائی ۱۹۳۱ء میں لاہور اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں مجلس احرار اسلام کا پہلا اجتماع ہوا۔

راقم الحروف خواجہ عبدالرحیم عاجز کی معیت میں اس تاریخی اجلاس میں شامل ہوا یہ دوسرا واقعہ تھا کہ مولانا مرحوم سے میری ملاقات ہوئی جو اس اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے۔ اس اجلاس کے اختتام پر وہ مجلس احرار اسلام کے صدر منتخب ہوئے۔

ان کی صدارت میں مجلس احرار اسلام نے کشمیر کی آزادی کے لئے جو خدمات انجام دیں تاریخ اسے کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

لاہور بورسٹل جیل

ریاستی حکام اور مجلس احرار اسلام کے درمیان لڑائی نے طول کھینچا تو ڈوگرہ شاہی اپنے انگریز آقاؤں کے در پر سربسجود ہوئی۔ چنانچہ فرنگی قانون اپنی سنگینوں سے لیس ہو کر احرار رضاکاروں کے سینوں پر چڑھ دوڑا۔ اور جب مُسلمانوں کے سینوں نے انگریز سنگینوں کے منہ موڑ دیئے تو دونوں حکومتیں احرار رہنماؤں کے سامنے سپر انداز ہو گئیں اور صلح کے لئے تمام احرار رہنماؤں کو پنجاب کی مختلف جیلوں سے بورسٹل جیل لاہور میں اکٹھا کیا گیا۔ ان میں امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم۔ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم۔ مولانا مظہر علی اظہر،

شیخ حسام الدین، مولانا احمد علی مرحوم، مولانا محمد چراغ گوجراں والا ماسٹر محمد شفیق مرحوم قابل ذکر ہیں۔ باہر سے حکومت کے ایماء پر مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ صلح کی بات چیت کے لئے تشریف لائے۔ ایک پندرھواڑے کی مسلسل ملاقاتوں کے باوجود کشتی کنارے سے دور رہی۔ راقم چونکہ ورکنگ کمیٹی کا ممبر نہیں تھا لہٰذا ان لوگوں سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ صلح کی گفتگو کی ناکامی کے بعد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن حکام جیل کی اجازت سے مجھے اپنے پاس لے آئے۔

ان دنوں کافی دیر تک مولانا مرحوم کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا۔ انہیں قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا بھی یہ سنہری موقع ملا جسے میں نے کسی طرح ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مولانا مرحوم جس طرح باہر سے اجلے تھے۔ ان کا اندر بھی ویسے ہی صاف ستھرا تھا۔ وہ فرقہ پرست ہندو مُسلم کے بھی ویسے ہی دشمن تھے جتنا کہ انہیں انگریز سے بیر تھا۔ وہ اپنے رضا کاروں سے اسی قدر محبّت کرتے جس طرح ایک جرنیل کو اپنی فوج سے ہونی چاہیئے۔ ان کی سادگی ان کے وقار کی طنابیں تھامے رہتی تھی۔ سماج کے مصنوعی رسم و رواج نے انہیں ہمیشہ اپنا دشمن قرار دیا اور یہی وجہ تھی کہ کسی نئے سورج کی روشنی انہیں راس نہ آئی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے

میں ناخوش و بیزار ہوں مَرمَر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

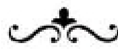
خیالات کے ہجوم سے اگر ان واقعات کا انتخاب کرنے بیٹھوں جن کے مجتمع کرنے سے تاریخ احرار اور داستانِ حبیب الرحمٰن مرتب ہو سکتی ہے تو مجھے ڈر ہے قانون مجھ سے بھی ناراض ہو جائے گا۔ تاہم ان ایسے بہادروں کو خراجِ عقیدت پیش نہ کرنا ان کی وفاؤں سے مذاق کرنا ہے جو ہمیشہ جفاؤں سے مذاق کرتے رہے ہیں۔

اور یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے غیر ملکی سامراج کے خلاف علَمِ بغاوت بلند کیا اور پھر دار و رسن کو دعوت دی۔ جیل خانوں کو عمر بھر آباد کئے رکھا۔ فرنگی رائفلوں کی گولیاں دیوار بن کر ان بزرگانِ دین کے راستے میں حائل ہوئیں۔ مگر ان محب وطن لوگوں کے قدم اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ان کی موت اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے سنگ میل بن کر آج بھی راستہ دکھا رہی ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

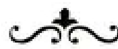
مؤرخ کا قلم، زمانے کا دل اور اپنے پرائے، قانون مولانا حبیب الرحمٰن ایسے ہزاروں محب وطن لوگوں کو بھول سکتے ہیں لیکن پروردگار اپنے بندوں کو جنہوں نے بندگی کی اپنے پروردگار کی اور حاجت روا جانا اپنے پالن ہار کو۔ ان کی گردنیں صرف اسی کے سامنے جھکیں انہوں نے قانون مانا صرف اپنے رب کا۔ یقیناً قیامت کے دن بلند درجات کے مالک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اور ہم سب کے حال پر رحم فرمائے!

جاں باز مرزا۔ لاہور
۱۶/ مئی ۱۹۷۵ء



دار و رسن

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
(غالب)



سیّد الاحرار

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

لوگ جنہیں رئیس الاحرار رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میں انہیں سید الاحرار کہا کرتا تھا۔ مجھے فخر ہے کہ ان کی صحبت کیمیا اثر در شفقت کے سایہ تلے دیر پا مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ ان کی پُر خلوص رہنمائی میرے لئے ہر گام پر ہدایت و سلامتی کا موجب ہوئی اور انشاء اللہ تعالیٰ تا زندگی یہی امید درخشاں ہے۔ میں دلی مسرت اور فخر و وقار کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ ہر حال میں ان کا خلوص و اعتماد حاصل تھا، جو کسی دوسرے خوش نصیب کو شاید ہی حاصل ہوا ہو۔ مولانا کی زندگی کا ہر گوشہ مجھ پر بے نقاب تھا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا صرف سیاسی قائد مجاہد ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک بہت ہی عظیم المرتبت روحانی پیشوا بھی تھے۔ دماغی لحاظ سے وہ اعلیٰ پایہ کے صاحبِ بصیرت سیاست داں تھے۔ عملی لحاظ سے بے مثل صاحبِ ایثار اور جلیل القدر مجاہد تھے۔ قلبی لحاظ سے وہ بہت ہی بلند مقام صوفی اور درویش کامل تھے۔ ان کی ساری زندگی اور جدوجہد خدمت خلق اور رضائے الٰہی کے لئے تھی۔ ایک بار نزدیک سے جس کسی نے آپ کو دیکھ لیا ہمیشہ کے لئے آپ کا غلام بے دام ہو کر رہتا تھا۔ آپ نے اپنی قربانیوں اور خدماتِ جلیلہ کا صلہ کبھی بھی کسی حالت میں لینا پسند نہ کیا۔ ہم نے بارہا دیکھا کہ صاحبانِ اقتدار اور مسند نشینانِ تخت و تاج نے حسن عقیدت سے مجبور ہو کر ان کی حق گوئی و بے باکی اور ملکی و ملی خدمات کے صلہ میں مسند ہائے اعزاز اور خلعت ہائے زرنگار پیش کیں لیکن اس درویش کامل نے ان کو ہمیشہ پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ علامہ اقبال مرحوم نے شاید آپ ہی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ لکھا:

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

آپ فرمایا کرتے تھے کہ میری ہر کارگزاری پروردگار عالم کی خوشنودی اور اس کی مخلوق کی خدمت کے لئے ہے۔ اس کی عبادت میں سے سب سے اعلیٰ عبادت خدمتِ خلق ہے۔

برطانوی سامراج کے سینے پر سب سے بڑی چوٹ دوسری جنگ عظیم کے میدانوں میں پڑی جس کے بعد برعظیم ہندو پاکستان سے اس کا کوچ ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس چوٹ کا پلان مولانا کے ذہن رسا کا نتیجہ تھا جو ان کے دماغ سے نکل کر میرے سینے میں آیا اور میں نے اسے نیتاجی سبھاش چندر بوس کے دل و دماغ میں نقش کیا جسے انہوں نے محاذِ جنگ میں پہنچ کر پورا کیا۔ نیتاجی سبھاش چندر بوس جب تک زندہ رہے مولانا کے عاشق صادق بن کر رہے۔ ۱۹۴۲ء میں اگرچہ مولانا دھرمسالہ جیل میں نظر بند تھے لیکن ان کے افکار کی لائن کو میں ری پبلکن سوشلسٹ آرمی کے ساتھ مل کر پورا کر رہا تھا۔

مولانا نے فرنگی سامراج کو اس برعظیم سے نکالنے کے لئے ہر طبقہ کے لوگوں سے حیرت انگیز اور عظیم ترین کام لئے۔ حتیٰ کہ کوئی مجذوب اور صوفی، کوئی درویش عابد وزاہد ایسا نہیں مولانا نے جس کے پاس پہنچ کر ملک کی آزادی کی بھیک نہ مانگی ہو۔ اور ان کو اپنی کارگزاریوں کی کامیابی کے لئے دعا گو نہ بنایا ہو۔ میں ان میں سے اکثر کو جانتا ہوں۔ کچھ ان میں سے آج بھی زندہ ہیں۔ مولانا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر دیہات کے اہل قبور بزرگوں کے مزارات پر بیٹھ کر مراقبہ کے ذریعے ان کی ارواح سے بھی ملک کی آزادی کے لئے دعاؤں کی بات کرتے تھے۔ بالآخر مولانا کی زندگی کا بہت ہی بڑا مشن ان کی نظروں کے سامنے ہی کامیاب ہوا۔ ملک آزاد ہونے کے بعد ان کے سامنے امن عامہ اور انسانیت کی سلامتی اور ترقی کے ساتھ ساتھ مُسلمانوں کو سچا مسلمان بنانے اور دعوتِ اسلام کو عام کرنے کا مشن تھا۔

تقسیم ملک کے بعد مولانا بھاول پور میں تھے۔ میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو فرمانے لگے۔ شاہ جی! خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ کون تھے؟ اور ان کے کون سے ایسے کارنامے تھے جن کے باعث وہ سلطان الہند مشہور ہوئے؟ میں اس سوال کا مطلب بھانپ گیا۔ عرض کیا۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ فرمانے لگے کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو کارنامہ اس ملک میں آکر انجام دیا۔ اگر ہم آپ اس کو دہرا نہیں سکتے تو پھر مُسلمان کہلانا فضول ہے۔ چلو چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے جس سرزمین پر پیغام حق سنایا اور ذات پات کو چھوڑا اور چھوت چھات کو توڑا۔ اور انسانیت کو اونچا کرکے اسلام کا نام روشن کیا۔ ہم بھی ان کے مشن امن وسلامتی کو آج کے ہند میں روشن کریں۔ میں اس دعوت پر سوچتا رہ گیا۔ اور مولانا سرزمین دعوت سلطان الہند میں چلے گئے۔ میں سمجھا ؎

ایں سعادت بزرو بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا کی مظہر عجائب پُر غرائب شخصیت نے سچ مچ حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی راہ پر سعادت اختیار کرکے دکھادی جس کا ایک مظہر آج انجمن اسلامیہ پنجاب وہند ہے۔

ادھر حضرت سید الاحرار اس عالم ناپیدار سے عالم بقا کی جانب تیاریوں میں مشغول تھے۔ اُدھر میں قلب ودماغ کے اضطراب مین بے چین تھا، اور اپنے ارادتمندوں کے دیہاتی دورہ میں سفر پر تھا۔ تحصیل جڑانوالہ کے ایک دیہات میں مولانا کی آخری شب کے آخر حصہ میں محو خواب تھا کہ حضرت موچپورہ ٹانچی کے میدان میں ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کے بعد اپنے گھر شفاعت منزل کو آرہے تھے۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے نئے اور پرانے احباب ساتھ ساتھ تھے۔ میں بہت عرصہ کے بعد شفاعت منزل کی جانب جارہا تھا۔ شفاعت منزل کے احاطے میں ہم داخل ہوئے تو اس میں ایک خوبصورت باغیچہ کے اندر ایک مختصر سا خوبصورت بنگلہ جو بالکل نیا تھا نظر آیا۔ مولانا کھٹ سے اس بنگلہ کے ایک کمرے میں داخل ہو کر آرام فرمانے لگے اور مجھ سے فرمایا۔ شاہ جی! بی بی (حضرت مولانا کی اہلیہ صاحبہ) سے مل آؤ۔ میں حضرت کا ارشاد پاکر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں، شفاعت منزل کے ساتھ ایک اور چہار منزلہ وسیع مگر پرانی عمارت بھی کھڑی ہے اور اس کے اردگرد ایک وسیع باغ ہے۔ میں اس کی دوسری منزل میں داخل ہوا تو مرحومہ بی بی صاحبہ درویشانہ کھدر کے لباس میں ملبوس ذکر اللہ میں مصروف ہیں۔ میں نے بصد آداب ونیاز سلام کیا۔ انہوں نے دعائیں دیں اور میرے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے بڑے جذب کے ساتھ فرمایا: شاہ جی دیکھو تمہارے مولانا صاحب وہاں رہتے ہیں۔ یہاں نہیں آتے۔ بات ختم ہوتے ہی اس عمارت کی دو منزلیں بڑے زور اور گرج سے نیچے گریں اور خوف سے میری آنکھ کھل گئی۔ اس کے بعد میں پانچ روز تک سفر میں رہا۔ لیکن دل کی دنیا میں ایک سخت کرب واضطراب تھا۔ آخر میں دیہات سے نکل کر لائل پور آیا تو وہاں ایک دوست نے درویش کامل، مجاہد جلیل سید الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر ملال کی خبر سنائی۔ اپنے اضطراب بے پایاں کی ساری وجہ سمجھ میں آگئی۔

مجھے اپنے عزیز القدر برادر جنرل سکریٹری انجمن اسلامیہ پنجاب مولانا محمد احمد رحمانی کی جواں ہمتی اور سعادت مندانہ طبیعت سے

امید ہے کہ مولانا کے انتقال سے ان کے عظیم مشن کی جو منزلیں گر گئی تھیں وہ انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیں گے۔

"ہمّتِ مرداں مددِ خدا" کے مصداق قدرت میرے اس بھائی اور عزیز کی حیرت انگیز مدد کرے گی۔ ہمّت و استقامت کی دولت بے پایاں مولا کریم اس عزیز کے ہمرکاب فرمائے۔

اپنی حالت تو اس شعر کے مصداق بن کر رہ گئی ہے ؎

نہ وہ دنیا ہے، نہ دل ہے، نہ وہ بادہ نہ ہے ساقی
فقط اِک درد ہے زندہ فقط اک یاد ہے باقی

سیّد محمد سلیمان احمد سلیم برکتی۔ علاؤالدین پوری مرحوم
۱۶/ مئی ۱۹۶۲ء



رئیس الاحرار کی دو باتیں

دسمبر ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد مرحوم نے زیر صدارت مُسلمانانِ ہند کی ایک عظیم الشان کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ یہ تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والے خونی ہنگاموں کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی پہلی بڑی کانفرنس تھی اور اپنے موضوع و مقصد کے لحاظ سے بھی بہت اہم تھی۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب جواب مرکزی کابینہ کے رکن ہیں اور اس وقت ہماری ریاست اتر پردیش کے وزیر تھے۔ وہ اس کانفرنس کی استقبالیہ کے صدر تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اور حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اس کے خاص داعیوں میں تھے۔ آپ کے والد ماجد (مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی مرحوم) اور آپ کے سب گھر والے مشرقی پنجاب کے لاکھوں مُسلمانوں کے ساتھ پاکستان دھکیل دیئے گئے تھے۔ اس لئے اس کانفرنس میں مولانا مرحوم کی شرکت کی کوئی توقع ہی ہم لوگ نہیں کر سکتے تھے، بلکہ کانفرنس کے دفتر سے رابطہ کے باوجود میں نے یہ سنا بھی نہیں تھا کہ مولانا کو بلانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ کانفرنس شروع ہو چکی تھی اور ایک کام اور پروگرام کے تحت ہم چند دوستوں نے کانفرنس کے قریب ہی ایک جگہ ڈیرہ ڈال لیا تھا اور پورا وقت ہمارا وہیں گزر تا تھا۔ غالباً کانفرنس کا پہلا دن تھا۔ میں کسی ضرورت سے ظہر کے وقت مکان پر آیا۔ اس زمانہ میں میری رہائش احاطہ سُلیمان قدر میں تھی جب میں کانفرنس کی طرف جانے کے لئے اپنے مکان سے چل کر برہانے والی سڑک پر آیا (جو لکھنؤ کے اسٹیشن چار باغ سے رکاب گنج ہوتی ہوئی گول دروازہ اور اس کمپنی باغ تک چلی جاتی ہے جہاں کانفرنس ہو رہی تھی) تو میں نے سنا کہ کوئی میرا نام لے کر زور زور سے آوازیں دے رہا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک تانگہ میں ہمارے مولانا مرحوم آ رہے تھے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور سوچنے لگا۔

ایں کہ مے بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

میں شوق میں بے تابانہ تانگہ کی طرف بڑھا۔ مولانا نے تانگہ رکوایا اور اُتر کے پہلے بغل گیر ہوئے۔ اللہ نے ان کو بڑا مضبوط دل دیا تھا۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے میں بھی ساتھ ہی تانگہ میں سوار ہو گیا۔ مولانا نے بتایا کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دو تین تار دیئے تھے۔ کسی طرح آ گیا ہوں۔ ہوائی جہاز سے میں کل دہلی پہنچ گیا تھا۔ بہت کوشش کی کہ اس وقت لکھنؤ کے لئے ہوائی جہاز مل جائے۔ لیکن انتظام نہ ہو سکا۔ مجبوراً ٹرین سے آنا پڑا۔ اور اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔ اس سلسلۂ گفتگو میں فرمایا بھئی مولوی منظور صاحب! ہندوستان و پاکستان میں ان دنوں جو کچھ ہوا۔ اُس سے مجھے بس یہ ملا ہے کہ شرک کی ساری رگیں کٹ گئیں اور الحمدللہ اب دل کے کسی گوشہ میں۔۔۔ کسی سے کوئی امید اور کوئی اندیشہ نہیں رہا ہے۔ سب کو دیکھ لیا۔ پھر جب کانفرنس میں تقریر فرمائی، تو اگر چہ اس کا موضوع دوسرا تھا۔ لیکن اس میں بھی یہ بات بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی۔

۴۹-۱۹۴۸ء میں ایک دفعہ لکھنؤ تشریف لائے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات اور ہندوستانی مُسلمانوں کے مسائل و مشکلات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ کانگرس اگر مسلمانوں کو نہیں اپنائے گی اور ان کا خوش دلانہ تعاون حاصل نہیں کرے گی تو ہندو فرقہ پرست طاقتیں اس کو فنا کر دیں گی۔ اب وہ صرف مسلمانوں کو اپنا کر بچ سکتی ہے۔ اس کے لئے صرف یہی راہ ہے۔ اسی طرح مُسلمانوں کے لئے صرف یہ راستہ ہے کہ وہ کانگرس کو اپنائیں اور اس کے نظام میں داخل ہوں۔

منظور احمد نعمانی۔ لکھنؤ۔ یوپی

۱۶ر مئی ۱۹۶۲ء دفتر الفرقان لکھنؤ

حَبیب قوم

قِفَــا نَبــکِ مِــنْ ذِکْــرٰیٰ حَبِیْــبٍ وَّمَــنْزِلِ

بِــسَقْطِ اللّــوٰی بَــیْنَ الــدخول فحومَــلِ

یوں تو میں حضرت مولانا مرحوم کو اپنی طالب علمی کے زمانے سے جانتا تھا اور کون پڑھا لکھا مُسلمان ایسا ہے جس نے اس شیر نیستاں حریت کی گرج نہ سنی ہو۔ مگر حضرت مولانا سے تعلقات کی نوعیت ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہوئی۔

ہاپوڑ ضلع میرٹھ کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ وہاں کسی مدرسہ کا سالانہ جلسہ تھا مولانا وہاں تقریر کے لئے مدعو تھے۔ میں بھی جلسہ کی شرکت کے لئے گیا ہوا تھا۔ صبح کی چائے کا انتظام وہاں کے ایک بڑے مُسلمان تاجر کے مکان پر تھا۔ اتفاق سے مجھے مولانا کے بہت قریب نشست ملی۔ مولانا نے مجھ سے میرا نام اور وطن پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ مولانا نے سنجیدگی کے ساتھ فرمایا "آپ کھڑے ہو جایئے۔"

میں ڈرا کہ کہیں مجھ سے بے ادبی تو نہیں ہوگئی ہے کہ میں مولانا کے اتنے قریب آ بیٹھا ہوں۔ مگر جب دیکھا کہ مولانا اپنا عربی عباء سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ان کے حسین چہرے پر تبسّم کی بجلیاں چمک رہی ہیں تو جان میں جان آگئی اور کھڑا ہو گیا۔۔۔ حضرت مولانا نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ فرمایا اور پھر فرمانے لگے "تم سے ملنے کو بہت جی چاہتا تھا۔ میں نے تمہاری "خلافت راشدہ" اور "خلافت بنو امیہ" کا مطالعہ جیل میں کیا تھا" پھر دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور جب میں رخصت ہونے لگا تو وعدہ لے لیا کہ ان کے دولت کدہ پر دہلی آکر ملوں، بلکہ وہیں قیام کروں۔

میرا دہلی آنا جانا "الحرام" اور اس کے مکتبہ کی کتابوں کی طباعت کے سلسلے میں رہتا ہی تھا۔ مولانا سے برابر ملاقات ہونے لگی۔ بلکہ مولانا کا دولت کدہ ہماری مستقل قیام گاہ بن گیا۔

مہماں نوازی

دہلی میں مہمانی کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ دہلی والے بڑے خشک ہوتے ہیں۔ مہمانوں سے گھبراتے ہیں۔ مگر ایمان داری کی بات یہ ہے کہ وہ بیچارے بھی معذور ہیں۔ اول تو دہلی والوں کے مکان عام طور پر (رؤسا سے قطع نظر) مختصر ہی ہوتے ہیں۔ پھر دہلی میں آنے والے مختلف اغراض سے بکثرت آتے ہیں۔ آخر کس کس کی مہمان داری کریں؟

مگر مولانا کا مردانہ مکان ماشاءاللہ بڑا وسیع تھا اور جتنا ان کا مکان وسیع تھا اس سے زیادہ ان کا قلب وسیع تھا۔ ان کے ہاں مہمانوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ بعض لوگ رات کے ایک اور دو بجے آن درآمد ہوتے تھے۔ مگر میں نے کبھی ان کی پیشانی پر شِکن پڑتے نہیں دیکھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مہمان کو دیکھ کر ان کا چہرہ چمک اٹھتا تھا اگر کوئی دوست آجاتا تو پھر تو پھولے نہ سماتے۔ کھڑے ہو کر مصافحہ کرتے اور اپنے برابر مین مند پر جگہ دیتے۔ کھانے پینے کے معاملہ میں ان کے ہاں تکلّف کو دخل نہ تھا۔ جو کچھ گھر میں موجود ہوتا سامنے رکھ دیتے۔ گھر میں کھانا ختم ہو چکا ہوتا تو بازار سے منگا لیتے۔ اگر مہمان کھانے سے انکار کرتا تو اس انکار کو واقعیت پر محمول کر کے اصرار بھی نہ کرتے۔

اس بے تکلّفی پر مولانا کی پنجابیت کو بھی دخل تھا۔ ہم یوپی والے تکلّف کے عادی۔ مہمان بھی تکلّف کرے گا اور بھوکا ہوتے ہوئے بھی کہے گا کہ کھا کر آیا ہوں اور میزبان بھی اصرار کرے گا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کھاؤ۔ خواہ بے چارہ مہمان کھا کر ہی آیا ہو۔

میں نے ابتداء میں جب مولانا کے ہاں قیام کرنا شروع کیا تو حسبِ عادت تکلّف برتا۔ ایک دن کھانا کھا کر گھر سے نہیں چلا تھا۔ مگر مولانا کے اِستفسار پر کہہ دیا کہ بھوک نہیں ہے۔ خیال یہ تھا کہ مولانا اصرار فرمائیں گے۔ مگر وہ خاموش ہوگئے۔ مجھے اس رات بھوکا ہی رہنا پڑا۔ پھر میں نے کبھی ایسی غلطی نہ کی۔ بھوک ہوتی تو صاف کہہ دیتا کہ کھانا منگوا لیجئے۔

مولانا کے ہاں کھانے کی نوعیت میں بھی تکلّف نہ ہوتا تھا۔ ایک روز ان کے ہاں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر مسٹر ڈھیبر کی دعوت تھی۔ میں بھی اس میں شریک کیا گیا۔ کھانے پر دو یا تین قسم کی ترکاریاں تھیں اور گرم گرم روٹی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتا ہوں اس دن دستر خوان پر مولانا نے مسٹر ڈھیبر سے سیاسیات حاضرہ پر ایسی عمدہ گفتگو کی کہ وہ مولانا سے بے حد متاثر ہوئے۔ اور دوران گفتگو میں کہا کہ ”آپ جیسے آدمی کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں ضرور ہونا چاہئے۔“ مگر مولانا جلد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور مسٹر ڈھیبر اس خیال کو عمل میں نہ لاسکے۔

ذہانت وفطانت

مولانا بے حد ذہین تھے۔ مخاطب کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی اس کے صفحۂ دل کی تحریر پڑھ لیتے تھے۔ گفتگو بڑی تُلی ہوئی اور مدلل کرتے تھے۔ مختصر لفظوں میں اپنا مضمون سننے والے کے دل میں پیوست کر دیتے تھے۔

۱۹۵۵ء میں مولانا نے جو سفر حج کیا۔ اس میں مولانا کی عالم اسلام کی ممتاز علمی و سیاسی شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مولانا کی گفتگو سے سب کو میں نے متاثر دیکھا۔ ان کے دلائل کے سامنے سب پر افگندہ نظر آتے تھے۔ جہاں گفتگو سے کام نہ چلتا وہاں ٹیکٹ سے کام نکالتے تھے۔ حج سے فراغت کے بعد جدّہ کو واپسی ہوئی تو پروانہ راہداری میں کوئی قانونی نقص رہ گیا تھا۔ جب تمام سامان لاد کر مکہ معظمہ سے باہر نکل آئے تو راستہ میں پولیس چوکی پر کار روک لی گئی۔ مولوی محمد احمد کاظمی صاحب ایم۔ پی نے جو رفیق سفر تھے بہت کچھ سنا۔ مگر پولیس افسر نہ مانا اور واپس لوٹنے پر اصرار کیا آخر مولانا اترے۔ پولیس افسر کی ٹھوری میں ہاتھ ڈالا۔ دو تین لفظ معذرت کے کہے اور معاملہ ختم کر دیا۔

عربوں کی دولت مندی کا خطرہ

عرب کے دوسرے علاقوں کی طرح سعودی عرب میں بھی تیل کے چشموں کے انکشاف نے جو زر و سیم کے دریا بہا دیئے ہیں عرب حکومتیں ان پر کتنا ہی فخر کریں مگر اہل نظر اس پر فکر مند ہیں۔ یہ تیل کی کمپنیاں نہیں ہیں بلکہ مغربی استعمار کے قلعے ہیں جو جزائر عرب میں ہر جگہ قائم کر دیئے گئے ہیں ”آرامکو“ نے سعودی عرب کے سینکڑوں میل کے علاقے کو فیکٹریوں اور دفتروں کے نام سے اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے۔ صرف غوار کی فیکٹری سوا سو میل کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس تیل کو مغربی ملکوں میں پہنچانے کے لئے ایک طویل پائپ لائن و مام سے لبنان کی بندر گاہ صیدا تک بچھی ہوئی ہے جو ایک برٹش کمپنی کی ملکیت ہے۔ ان کمپنیوں میں لاکھوں مزدور کام کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل اقتدار ملک میں ان کمپنیوں کا ہے۔ کویت کے معاملہ پر یہ حقیقت حال ہی میں واضح ہو کر سامنے آچکی ہے۔ مغربی پنجہ استعمار میں گرفتار ہونے کے علاوہ دولت کی اس ریل پیل نے باشندگانِ عرب کو عیاش اور آرام طَلب بنا دیا ہے۔ بہتر سے بہتر سمان تعیّش جہازوں میں لدا ہوا مغربی ملکوں سے چلا آرہا ہے۔ بمبئی اور دہلی کے بازاروں میں آپ کو جو سامان نہ ملے گا۔ وہ جدہ اور مکہ معظمہ کے بازاروں میں مل جائے گا۔ جب بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے راحت و فراغت میسر آجائے تو پھر ملک میں کارخانے قائم کرنے اور سامان تیار کرنے کی مُصیبت کون مول لے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اندرون ملک کوئی صنعت موجود نہیں۔ نشہ عشرت کی اس مدہوشی کو جاوداں بنانے کے لئے ناولوں اور افسانوں اور دوسرے فحش لٹریچر کی اشاعت سے بھی کام لیا جارہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ جدہ میں اس کے کئی مراکز قائم ہیں۔ ایک ادیب و صحافی جدہ میں ہم لوگوں سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات کا ایک سیٹ اس خاکسار کو بھی عطا کیا۔ ان کے تشریف لے جانے کے بعد جب کتابیں دیکھیں تو ان میں ان کے لکھے ہوئے مختصر افسانوں کا مجموعہ بھی تھا۔ جس میں جابجا نیم برہنہ تصویریں موجود تھیں (یہ مجموعہ

میرے پاس پڑا ہوا ہے) بے اختیار یہ مصرعہ زبان پر آگیا۔ ع

چوں کفر از کعبہ برخیز دکجا ماند مُسلمانی!

مولانا جیسا بالغ نظر سیاست داں اور مغربی استعمار کی مشینری کے کل پرزوں کا ماہر انجنیئر اس صورت حال سے جس قدر دلگیر ہو تا کم تھا۔

مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ کے قیام کے دوران بلاد عربیہ کے بہت سے سیاست داں اخبار نویس اور عُلماء مولانا سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے رہے۔ مولانا بھی ان لوگوں سے ملاقات کے لئے تشریف لے جاتے۔ مولانا بڑی دردمندی اور بے قراری کے ساتھ عرب ملکوں کے موجودہ حالات کے خطرناک نتائج سے آگاہ فرماتے۔ مغربی ملکوں کے استعماری داؤ پیچ کو بے نقاب کرتے اور تین امور کی طرف ان کی توجہ خصوصیت کے ساتھ منعطف کراتے۔

(۱) اتحاد ممالک عربیہ (۲) ملک میں صنعتی اداروں کا قیام اور مغربی مصنوعات سے احتراز (۳) جدید و قدیم علم کے تعلیمی اداروں کا اجراء

اتحادِ عربؐ کی دعوت

ایک روز دمشق کے ممتاز عالم شیخ احمد کفتارہ نقشبندی ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ گفتگو عرب ممالک کی سیاست پر ہونے لگی۔ مولانا نے فرمایا۔ اگر آپ بلاد عربیہ کو مغربی استعمار کے جال کے پھندوں سے نجات دلا سکیں اور چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کا جنہیں برطانیہ۔ امریکہ اور فرانس نے اپنی مصلحتوں سے تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک عرب فیڈریشن بنا سکیں تو یہ اسلام کی بڑی خدمت ہو گی۔ اسلام دنیا کے لئے آزادی کا پیغام لایا۔ یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ وہ ملک جہاں سب سے پہلے اسلام کا نور پھیلا۔ برطانوی اور امریکی اقتدار کے سایہ میں ہیں۔

شیخ نے بڑی توجہ سے مولانا کی باتوں کو سنا، پھر فرمانے لگے۔ ہونا تو یہی چاہئے جو آپ فرمار ہے ہیں۔ مگر عملاً اس میں بڑی مشکلات ہیں۔ عرب ریاستوں میں اسلام پر وطنیت غالب ہو چکی ہے اور اس جذبے نے شامی، عراقی اور حجازی کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔

مولانا نے فرمایا ہندوستان کے مختلف صوبوں کے باشندے رنگ روپ میں، زبان میں، تمدن و معاشرت میں اور مذہب میں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ مگر آزاد ہندوستان میں سب ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان میں چار سو ریاستیں تھیں مگر ان سب کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ انگریز نے اپنے مقاصد کے لئے ان کے درمیان جو حدیں قائم کر دی تھیں ان کو توڑ ڈالا گیا ہے اور اب یہ سب ایک گھرانا بن گئے ہیں۔ آپ کا ملک تو در حقیقت ایک ہے۔ تمدن و معاشرت ایک ہے۔ زبان ایک ہے۔ مذہب ایک ہے۔ پھر آپ کی سیاست ایک کیوں نہیں ہو سکتی؟

شیخ خاموش ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔

کارخانے کھولو

مدینہ منورہ کے دوران قیام میں ایک روز وہاں کے مشہور اخبار "المدینة المنورہ" کے مدیران محترم نے مولانا اور ان کے رفقاء کی دعوت کی۔ میز پر مشروب کی حیثیت سے وہی "کوکا کولا" رکھا گیا، جو حجاز کا مقبول عام اور دل پسند شربت ہے۔

مولانا نے فرمایا۔ افسوس آپ ہمیں شربت بھی مغربی ملکوں سے آیا ہوا پلا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو روحانی برکتوں کے ساتھ ساتھ کھجور جیسی لذیذ مادی نعمت سے نوازا ہے۔ ہمارے ہاں ایسی پھلوں میں وہ شیرینی اور لطافت نہیں ہوتی جو مدینہ منورہ کی کھجوروں میں ہے۔ کیا آپ کا خیال کبھی اس طرف منعطف نہیں ہوا کہ آپ کھجوروں کا شربت تیار کریں۔ یہ آپ کے ملک کی ایک بہترین صنعت ہو سکتی ہے۔ پھر مولانا نے فرمایا۔ آپ کے ملک میں آنے والے حاجی ہر سال لاکھوں رومال اور جانمازیں یہاں سے خرید کر لے جاتے ہیں۔ یہ سب اٹلی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں بلکہ تسبیحیں تک اٹلی سے آتی ہیں۔ کیا سعودی حکومت یہاں جانمازوں اور رومالوں کے بنانے کے کارخانے نہیں کھول

سکتی۔ اگر ایسے کارخانے ملک میں کھل جائیں تو ایک طرف حاجیوں کو اصلی تبرک مل سکے اور دوسری طرف ان ہزاروں گداگروں کے لئے روزگار مہیا ہو سکے جو خانہ کعبہ اور مسجدِ نبوی کے دروازوں پر پرے جمائے کھڑے رہتے ہیں۔

مدیران محترم مولانا کی اس تقریر سے بے حد متاثر ہوئے اور اخبار کی اگلی اشاعت میں مولانا کی اس تجویز پر ایک پُرزور اداریہ لکھا۔

مدینہ یونیورسٹی

مدینہ یونیورسٹی کا آج کل بہت چرچا ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے سفر حجاز میں یہ تجویز بھی وہاں کے عمائد کے سامنے رکھی تھی۔ چنانچہ مکہ معظمہ میں مجلہ "الحج" کے مدیر اعلیٰ شیخ محمد سعید العامودی جب ملاقات کے لئے تشریف لائے تو مولانا نے مفصل طور پر ان سے اس موضوع پر گفتگو کی اور ایک ایسی مرکزی دینی درس گاہ کے قیام پر زور دیا جہاں تمام بلاد اسلامیہ کے طلباء اپنے اپنے فقہی مسلک کے مطابق علوم دینیہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ مدیر موصوف نے مولانا سے فرمایا کہ وہ اپنی تجویز کو تحریری صورت میں حکومت کے سامنے پیش کریں۔ مجھے یاد نہیں کہ مولانا نے حکومت سعودیہ کو اس سلسلہ میں مخاطب کیا یا نہیں۔

موجودہ "مدینہ یونیورسٹی" کہاں تک مذکورہ بالا مقصد کو پورا کر سکتی ہے اس پر گفتگو کرنے کے لئے انتظار کی ضرورت ہے۔

ردِّ قادیانیت

ان مباحث کے علاوہ دوؔ اور موضوع تھے۔ جن پر مولانا اکثر تبادلۂ خیالات فرمایا کرتے تھے۔ ایک "رد قادیانیت" اور دوسرا دیوبند کی تعلیمی تحریک۔

قادیانیت کو مولانا دینی نہیں قطعاً ایک سیاسی تحریک سمجھتے تھے۔ مولانا کی رائے تھی کہ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں میں انگریزوں کی مخالفت اور ان سے نفرت کا جولاوا ابلتا رہا۔ اور جو کبھی تحریک سید شہید رحمۃ اللہ علیہ اور کبھی انقلاب ۱۸۵۷ء اور کبھی انبالہ کیس کی صورت میں نمودار ہوا اس کو سرد کرنے کی بہترین صورت یہ تھی کہ "قادیانی نبی" کو مسلمانوں کا پیشوا بنا دیا جائے جس نے جہاد کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اور انگریزی حکومت کی تائید میں پچاس الماری کتابیں تصنیف کی تھیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ مسلمانانِ ہند توجہات بلاد عربیہ کی طرف سے ہٹ جاتی تھیں اور حرمین اور بیت المقدس کی بجائے ان کی عقیدتوں کا مرکز "قادیان" بن جاتا تھا۔

اصل میں مولانا کے جد بزرگوار مولانا مفتی شاہ محمد صاحب نے جس طرح تمام علماء ہند سے پہلے ۱۸۸۸ء میں مسلمانوں کو شرکت کانگرس کا فتویٰ دیا تھا۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی کے مرتد اور انگریز کے ایجنٹ ہونے کا بھی فتویٰ دیا تھا۔

پھر حضرت الاستاد علامہ مولانا سیّد انور شاہ کشمیری کی صحبت میں مولانا کی اس خاندانی بصیرت میں مزید چمک پیدا ہوئی آخر "تحریکِ کشمیر" میں مولانا نے قادیانیت سے جماعتی حیثیت سے ٹکر لی اور کشمیر کو قادیانیت کی آغوش میں جانے سے بچا لیا۔



رئیس الاحرار کے قادیان میں سب سے پہلے خطاب پر منظوم خراجِ عقیدتؒ

ایک نظم جو کہ رئیس الاحرار مولانا حَبیب الرحمٰن لدھیانوی کو قادیان میں سب سے پہلے خطاب سے واپسی پر موصول ہوئی۔ (بعض حضرات شاعر کے طور پر مولانا ظفر علی خاں کا نام لیتے ہیں اور بعض علامہ انور صابری کا)

ہے تو بطلِ حریت اور شیر ہے احرار کا
تو ہے دشمن دین کے اور قم کی غدار کا

تو حَبیبِ قوم ہے اور قوم ہے تجھ کو حبیب
تجھ پہ چل سکتا نہیں جادو کبھی اغیار کا

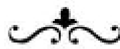
تیری دروشی کے قصے ہیں زباں زد عام اب
تیری استغناء بھی ہے اک سلسلہ ایثار کا

تو نے ختم المرسلین کے نام کو اونچا کیا
تو بنا ہے ترجماں صدیق کے افکار کا

برملا تو نے کہا جو کچھ کہا ہاں سچ کہا
ہے سب زمانہ معترف اس جرأتِ اظہار کا

لرزہ بر اندام ہیں ختمِ نبوت کے رقیب
ہے بنا جب سے تو قائد مجلس احرار کا

قادیاں میں جا کے توڑا جبر تو نے جھوٹ کا
ہر طرف شہرہ ہے تیرا اور تری للکار کا



قادیان میں رئیس الاحرار کی طرف سے احرار کانفرنس کا اعلان

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے قادیان میں جرات مندانہ داخلے اور جلسہ و جلوس کے بعد قادیان میں سہمے ہوئے مسلمانوں کو حوصلہ ملا۔ پھر اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو جلسے قادیان میں اور منعقد کیے گئے۔ ایک جلسہ مولانا عبد الغفار غزنوی کی زیر صدارت ہوا۔ دوسرا جلسہ مولانا بہاء الحق قاسمی کی زیر قیادت ہوا۔ اس کے بعد مجلس احرار اسلام نے پروگرام بنایا کہ قادیان میں ایک بہت بڑی کانفرنس منعقد کی جائے۔ یہ وہی کانفرنس ہے کہ جس میں امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ اس سلسلہ میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ہندوستان کے عُلماء کو ایک خط لکھا جس میں اس کانفرنس کو کامیاب کرانے میں مدد کی اپیل کی۔

رئیس الاحرار کی مرزائیت کے تعاقب کے لئے عُلماء اسلام سے اپیل

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ میں سے ہر شخص پورے اخلاص اور دیانت داری کے ساتھ عقائد مرزائیہ کی تردید کے لئے پوری پوری کوشش کر رہا ہے۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ آپ حضرات اپنے سامنے یہ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت مسلمانوں کے حقوق کے نام پر مرزائیوں کو بڑی بڑی ملازمتیں دے رہی ہے لیکن آپ حضرات نے کبھی اس طرف توجہ نہیں فرمائی۔

مرزائیت عوام کے اندر فنا ہو چکی ہے اور اس کی مذہبی تبلیغ تحریک احرار اور زمیندار کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے یہ میدان میں شکست کھا چکی ہے۔ اب مرزائیت کی تبلیغ اور ترویج کا ذریعہ حکومت مرزائیوں کو بلند سے بلند عہدے دے کر مسلمانوں پر یہ ثابت کر رہی ہے کہ جو مسلمان اس زمانہ میں ملازمت چاہتا ہے وہ مرزائی مذاہب اختیار کرے۔ اس سلسلہ میں یہ وحشت ناک خبر سنی گئی ہے کہ عنقریب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں میاں سر فضل حسین کی جگہ چودھری ظفر اللہ قادیانی کو ممبر بنایا جائے گا۔

مجھے معاف فرمایا جائے۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ حضرات کے نزدیک کسی مسجد میں ایک مرزائی کا امام ہونا خطر کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن کسی مرزائی کا حکومت میں عہدہ حاصل کر لینا اتنا خطرناک نہیں۔ حالانکہ اس زمانہ میں مسجد کے امام کی آواز حکومت کے عہدیدار کے مقابلہ میں کوئی اثر نہیں رکھتی۔ آپ صاحبان یقین رکھئے کہ اگر خدانخواستہ ظفر اللہ مرزائی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بن گیا تو ہزاروں تعلیم یافتہ مُسلمان صرف اس کی خوشنودی مزاج کے لئے ہی مرزائی ہو جائیں گے۔ جس کے خوفناک نتائج کا مقابلہ کرنا آپ کے بس کی بات نہ ہو گی۔

اندریں حالات آپ کا فرض ہے کہ آپ پوری قوت کے ساتھ حکومت پر یہ واضح کر دیں کہ تمام مرزائی دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ اور حکومت کا کسی مرزائی کو مُسلمانوں کے نام پر کسی قسم کا عہدہ یا ملازمت دینا اسلامی حقوق کے ساتھ انتہائی بے انصافی اور ظلم ہے۔

آپ حضرات کو صاف طور سے حکومت پر یہ واضح کر دینا چاہیے کہ اگر ظفر اللہ ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بنایا گیا تو ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ حکومت درپردہ مرزائی مذہب کو فروغ دے کر مُسلمانوں کے عقائد کو فنا کرنا چاہتی ہے۔

سنئے! مرزائیت کیوں زندہ ہے؟ اس لئے نہیں کہ مسلمان انہیں کافر سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ جو جماعتیں مسلمانوں کی نمائندہ جماعتیں ہونے کی دعویدار ہیں۔ ان میں مرزائیوں کو نہ صرف ممبر بنایا گیا بلکہ عہدے بھی دیئے گئے۔ چنانچہ مختلف مقامات کی انجمن ہائے اسلامیہ میں ان کو بطور ممبر یا عہدیدار کی جگہ دی گئی۔ یہی ظفر اللہ قادیانی ضلع سیالکوٹ کی طرف سے بلا مقابلہ مسلمانوں کے ووٹ پر

پنجاب کونسل کا ممبر منتخب ہوتا رہا جس کی وجہ سے یہ سمجھا گیا کہ صرف چند صوفیاء اور عُلماء مرزائیوں کو کافر کہتے ہیں ورنہ اگر مرزائی حقیقتاً کافر ہوتے تو کوئی مُسلمان جماعت نہ تو ان کو اپنا ممبر بناتی اور نہ کوئی عہدہ دیتی اور نہ ہی کوئی مرزائی مُسلمانوں کے ووٹ پر کونسل میں جاتا۔

ان حالات کے ذکر کے بعد مزید تفصیل کو چھوڑتے ہوئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک آپ حضرات حسب ذیل طریقوں سے مرزائیت کی علانیہ مخالفت نہ کریں گے۔ اس وقت تک حکومت ان کا ساتھ نہ چھوڑے گی۔

۱۔ آپ اعلان کریں کہ کسی سوشل مذہبی سیاسی انجمن میں کسی مرزائی کو نہ تو ممبر بنایا جائے اور نہ کوئی عہدہ دیا جائے۔

۲۔ کسی مرزائی کو میونسپل کمیٹی' ڈسٹرکٹ بورڈ' کونسل' اسمبلی میں مسلمانوں کی طرف سے نمائندہ منتخب نہ ہونے دیا جائے اور جو مسلمان جماعت کسی مرزائی کو اپنا ممبر یا عہدہ دار بنائے اس جماعت کا تمام مسلمان بائیکاٹ کر دیں اور اس کو ایک پائی کی امداد نہ دیں۔ میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ ان دو طریقوں سے مرزائیت کو شکست دینے کی کوشش کریں گے تو مرزائیت آپ کے سامنے ہی فنا ہو جائے گی۔

کسی جماعت کے خلاف صرف فتویٰ دینے اور کافر کافر کہنے سے اس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی جب تک عملی زندگی میں اس کو شکست نہ دی جائے۔

۳۔ آپ حضرات کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ مجلس احرار اسلام ہند نے اپنے ماتحت شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام ہند (جس کا صدر دفتر امرتسر میں ہے) قائم کر دیا ہے۔ جس کو سیاسیات ملکی سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ تاکہ ہر خیال کا مُسلمان اس میں شریک ہو سکے۔ اس شعبہ تبلیغ کے ماتحت قادیان میں مجلس احرار اسلام قائم کرائی گئی ہے۔ خاص قادیان میں مسلمانوں کے اس تبلیغی مشن کو قائم ہوئے تقریباً ایک سال گذر چکا ہے چونکہ شعبہ تبلیغ کی سالانہ رپورٹ شائع ہونے والی ہے۔ اس لئے میں اختصاراً اُن خدمات کا ذکر کرتا ہوں جو اس قلیل عرصہ میں بفضلہ تعالیٰ انجام دی گئیں:

۱۔ قادیان کی اسلامی مسجد میں درس قرآن کریم۔

۲۔ مبلغین کلاس جس میں ۱۴ طلباء ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔

۳۔ جامعہ محمدیہ جس میں مُسلمانوں کے بچوں کو فی الحال پرائمری تک تعلیم دی جاتی ہے تعداد طلباء ۵۸ ہے۔

۴۔ مسجد احرار تیار کی گئی۔

۵۔ متعدد مرزائی تائب ہوئے اور بہتوں کو مرزائیت کا شکار ہونے سے بچایا گیا۔

۶۔ ملحقہ دیہات میں تبلیغی دورے کئے گئے۔

۷۔ جامع مسجد میں اہل سُنت والجماعت اب ڈیڑھ ہزار مسلمان نماز جمعہ میں شریک ہونے کے لئے مضافات قادیان سے تشریف لاتے ہیں۔

۸۔ مجلس احرار قادیان کے دفتر میں جھنڈا لگایا گیا۔

۹۔ اس عرصہ میں تین۳ جلسے ہو چکے ہیں۔ پہلی مرتبہ میں خود قادیان گیا۔ دوسرے جلسہ میں مولانا عبد الغفار صاحب غزنوی اور تیسرے میں مولانا محمد بہاؤالحق صاحب قاسمی۔ ہر جلسہ میں ہزارہا کی تعداد میں مُسلمان شریک ہوتے رہے۔

۱۰۔ تین عُلماء خاص قادیان میں مستقل طور پر متعین ہیں۔ شعبہ تبلیغ نے مسلمانوں کے تبلیغی نظام کو منظم کرنے کے لئے متعدد عُلماء کرام کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ تاکہ ہر جگہ کے مسلمانوں کو تبلیغی جلسوں کے لئے کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ بلکہ مسلمانوں کے لئے مبلغین کا ایک مرکز موجود ہو۔ نیز اب یہ سن کر اور زیادہ خوش ہوں گے کہ عنقریب بتاریخ ۲۱، ۲۲، ۲۳ ماہ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو

خاص قادیان میں شعبہ تبلیغ کی طرف سے مُسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ ہونے والا ہے۔ جس میں آپ صاحبان کی شرکت ضروری ہے تاکہ ہم یہ ثابت کر سکیں کہ باوجود اختلاف عقائد ہندوستان کے تمام عُلماء و مشائخ مرزائیوں کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں اور حکومت یہ سمجھ لے کہ مرزائیوں کی حمایت کرنا تمام مُسلمانوں کو چیلنج کرنا ہے۔

مجھے پوری توقع ہے کہ آپ اس تبلیغ نظام کی رکنیت خود قبول فرمائیں گے اور اپنے متعلقین کو ہر قسم کی امداد دینے کی تلقین فرمائیں گے۔ وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ظفر اللہ قادیانی کے وائسرائے کی ایگزیٹو کونسل میں تقرر کے خلاف پبلک جلسے کر کے قرار داد پاس کرائی جائے اور وائسرائے ہند کو شملہ اور وزیر ہند کو لندن کے پتہ پر تار مختصر مضمون کے دیئے جائیں۔

کہ ظفر اللہ قادیانی کے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تقرر کی خبر پر مُسلمانوں نے انتہائی رنج کا اظہار کیا۔ مفصل کارروائی جلسہ بذریعہ ڈاک ارسال کی جاتی ہے۔

یہ الفاظ تار میں جائیں اور باقی مفصل کارروائی ڈاک میں روانہ کریں۔ مگر یہ خیال کریں کہ لندن کو ہوائی ڈاک میں خط جانا چاہیے۔ امید ہے کہ آپ حضرات فی الفور خود بھی اس کام کو انجام دیں گے اور اپنے متعلقین کو اس کام کے انجام دینے کی تاکید کریں گے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس وقت تساہل یا سستی سے کام لیا گیا تو اس کے نتائج ناقابل برداشت ہوں گے۔

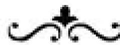
اسی سلسلہ میں ایک ضروری کام یہ بھی ہے کہ حسب ذیل مضمون کا ایک مسودہ لکھیے اور مُسلمانوں کے دستخط کروا کر وزیر ہند اور وائسرائے کو فوراً ارسال کیجئے۔ مسودہ اردو میں لکھتا ہوں مگر اس کو انگریزی میں کر لیا جائے۔ نیچے دستخط انگریزی اور نشان انگوٹھا جیسے دستخط کنندہ کرے کروائے جائیں۔

چودھری ظفر اللہ قادیانی مرزا غلام احمد کا مرید ہے۔ مرزائی مذہب کے نزدیک ہر وہ شخص دائرہ اسلام سے خارج ہے جو مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا اقرار نہ کرے۔ اس لئے مرزائی نہ کسی مسلمان کا جنازہ پڑھتے ہیں نہ کسی مسلمان امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ مرزائی خود بھی اپنے آپ کو مُسلمانوں میں شامل نہیں سمجھتے۔ تمام دنیا کے عُلماء ان کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔ اس لئے چودھری ظفر اللہ کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بنانا مسلمانوں کے حقوق پر صریحاً ظلم ہے۔ ہم دستخط کنندگان گورنمنٹ سے پُرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ کسی مرزائی کو مسلمانوں کے نام پر کوئی عہدہ اور ملازمت نہ دے۔

مجھے توقع ہے کہ آپ حضرات میری اس کمزور اور بے ربط آواز پر عمل فرما کر ملتِ اسلامیہ کی بہت بڑی خدمت سرانجام دیں گے۔

نوٹ: قادیان کے جلسہ میں شرکت فرمانے والے اصحاب فوراً دفتر شعبہ تبلیغ مجلس احرار اسلام ہند امرتسر کے پتہ پر اطلاع دیں۔ جملہ خط و کتابت بھی اسی پتہ پر کریں۔

حَبیب الرحمٰن لدھیانوی
صدر مجلس احرار اسلام ہند لاہور
۲۹/ اگست ۱۹۳۴ء



مادرِ علمی کی محبّت

جہاں تک دیوبند کا تعلق ہے۔ دیوبند مولانا کا علمی گہوارہ تھا۔ مولانا نے جو کچھ حاصل کیا وہیں سے حاصل کیا۔ مولانا اپنی سعادت مندی، نیک طبعی، زکاوت و فطانت اور طلاقت لسانی کی وجہ سے بہت جلد اس وقت کے اکابر دیوبند کے منظورِ نظر بن گئے تھے۔ انھیں مُفتی اعظم حضرت مولانا مُفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا میاں اصغر حسین جیسے مرشدین کامل۔ حضرت مولانا محمد احمد ؒ اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عُثمانی ؒ جیسے اصحاب تدبیر و سیاست۔ علامہ حضرت مولانا اور انور شاہ کشمیری جیسے صاحبِ علم و فضل اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عُثمانی جیسے متکلم و خطیب بزرگ علمی و عملی رہنمائی کے لئے مل گئے تھے۔ مولانا نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا اور انھوں نے بھی ان کو سینہ سے لگایا۔

مگر یہ واقعہ ہے کہ مولانا کو طبعاً مدرسہ کی خاموش فضا کے مقابلہ میں جلسوں اور کانفرنسوں کے ہنگامے زیادہ پسند تھے۔ پھر ۱۹۱۹ء کا طوفان اور آغوش زمانہ تھا۔ جب کہ مغربی حکومتوں نے خلافت عُثمانیہ کو پارہ پارہ کر کے مصر، شام، فلسطین و عراق کو اپنے دہانِ حرص و آز کا لقمہ بنالیا تھا اور اسلامی ہندوستان میں پشاور سے راس کماری تک صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ بھلا مولانا کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ اپنے استاد حضرت مولانا بشیر احمد کے ساتھ جلسوں میں شریک ہونے لگے اور جلد ہی سیاست کے میدان میں اپنا ایک مستقل مقام پیدا کرلیا۔

اپنے ان دینی و علمی۔ سیاسی بزرگوں کا مولانا کے دل میں بڑا احترام تھا، جس کا ذکر کرتے، بڑے ادب کے ساتھ کرتے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عُثمانی ؒ کے بعد کے زمانے میں سیاسی اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا عُثمانی جمعیۃ عُلماء اسلام کے صدر الصدور تھے۔ جو مسلم لیگ کی پُشت پناہ تھی اور ہمارے مولانا مجلس احرار اسلام کے صدر تھے جو کانگرس کا بازو سمجھی جاتی تھی۔ مگر ذاتی مُخلصانہ تعلقات میں کبھی فرق نہ آیا اور خط و کتابت بھی برابر جاری رہی۔ فہم قرآن کریم میں مولانا علامہ عُثمانی ؒ کو بے مثل قرار دیتے تھے اور ان کے فوائد القرآن کا اکثر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

ملک کی سیاسیات اور دیوبند کے انتظامی معاملات میں اختلاف آراء کی وجہ سے اکابر دیوبند کے حلقوں میں پہلی سی وحدت و جمعیّت باقی نہ رہی تھی۔ مولانا کو اس سے بڑی دُکھن ہوئی۔ وہ سب کی خدمت میں جاتے اور جس سے جس درجہ کے تعلقات تھے ان کو نبھاتے۔

ایک دن یوبند سے واپسی پر مجھ سے فرمانے لگے :

"قاضی صاحب، جس طرح برہمن مندر میں جا کر ہر چھوٹے اور بڑے بُت کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور پھول چڑھاتا ہے۔ اسی طرح میں تو دیوبند میں سب بزرگوں کی خدمت میں جاتا ہوں اور ان کی دعائیں لیتا ہوں۔ میرے تو سب بزرگ ہیں۔ سب مجھ سے محبّت کرتے ہیں۔ میں کسی گروہ بندی میں کیوں شریک ہوں؟"

"شیخین" سے محبّت

حضرت مولانا، علامہ انور شاہ کشمیری ؒ کے عاشق صادق تھے۔ ان کے فضائل و مناقب کا ذکر کر کے وجد کیا کرتے۔ کہا کرتے کہ مجھے قرآن فہمی کا ذوق حضرت شاہ صاحب کی صُحبت میں حاصل ہوا ہے۔ حضرتِ شاہ صاحب بھی ان سے بڑی مُحبّت کرتے تھے اور ان کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے تھے۔ ایک بار مولانا جیل میں تھے۔ حضرت شاہ صاحب ان کے مکان پر لدھیانہ پہنچ گئے۔ بیٹھک صاف نہ تھی۔ جھاڑو لے کر حضرت شاہ صاحب نے خود اس کی صفائی کر ڈالی۔ گھر والوں نے حضرت شاہ صاحب کو روکا، تو آپ نے فرمایا۔ یہ میرا گھر ہے۔ گھر والے اپنے گھر

کی صفائی کیا ہی کرتے ہیں۔

بہر حال ایک طرف حضرت شاہ صاحب سے اس قدر گہرے تعلقات تھے، دوسری طرف حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی مُحبّت وعقیدت میں کسی سے کم نہ تھے۔ حضرت شیخ کو اپنا سیاسی رہنما سمجھتے تھے۔ حضرت شیخ بھی مولانا سے بڑی شفقت فرماتے تھے۔ دہلی میں حضرت کا قیام دفترِ جمعیۃ عُلماء ہند میں ہوتا اور اکثر صبح کی چائے مولانا کے ہاں نوش فرماتے۔

"امیرِ ملّت" سے عقیدت

زندہ بزرگوں میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ حضرت امیرِ ملّت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری مدظلہ العالی سے بڑی عقیدت وارادت تھی۔ مولانا اور ان کے فرزند حضرت رائے پوری سے بیعت بھی تھے۔ ہر دوسرے تیسرے ماہ مولانا رائے پور تشریف لے جاتے اور کئی کئی روز حضرت کے ہاں قیام کرتے۔ حضرت بھی دہلی تشریف لاتے تو اگرچہ مستقل قیام باڑہ کی ایک مسجد میں ہوتا، مگر مولانا کے ہاں بھی ایک دو روز ٹھہرتے۔ حضرت رائے پوری سے نسبت کی سعادت اس خاکسار کو بھی مولانا ہی کے دولت کدہ پر ان ہی کی سفارش سے حاصل ہوئی اور یہ مولانا کا مجھ پر ایسا احسان ہے جسے میں تاقیامت نہیں بھول سکتا۔ اور قیامت کے بعد بھی کیوں بھولوں گا کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس تعلق کے ثمرات سے متمتع ہونے کا اصل وقت وہی ہوگا۔

ایک روز مولانا کی مجلس میں ۱۹۴۷ء کے حوادث کا ذکر تھا، مجھ سے خطاب کر کے مولانا نے فرمایا۔ تمھیں معلوم ہے کہ فسادات کے یہ شعلے جنھوں نے پنجاب کو بھسم کر کے رکھ دیا تھا جمنا کے کنارے آ کر کیوں بجھ گئے۔ تین بزرگ تھے جن کے گریۂ نیم شبی نے اس آگ کو ٹھنڈا کیا ہے۔ حضرت مدنی، حضرت رائے پوری اور تیسرے ایک اور بزرگ کا نام لیا۔ میں ان کا نام بتانا نہیں چاہتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں ان کا نام لکھ دوں تو وہ مجھ سے سخت ناراض ہو جائیں گے اور ان کے فقیرانہ دستر خوان پر مجھے جو شاہانہ نعمتیں سفرِ رائے پور کے راستے میں ملتی ہیں بند ہو جائیں گی۔

حبیب آغوشِ محبوب میں

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقات کا آغاز جس طرح ناگہانی طور پر ہوا۔ قدرت کو اس کا اختتام بھی اسی انداز پر کرنا تھا۔ اب ذرا جگر تھام کر اس کا ذکر بھی سن لیجئے۔

مشرقی پنجاب سے مُسلمانوں کے انخلاء کا حضرت مولانا کو بڑا غم تھا۔ یہ ایک طرف مولانا کے سینے کا زخم تھا جو برابر رستا رہتا تھا، تو دوسری طرف وہ اسے ہندوستان کی سیکولر حکومت کی روشن پیشانی کا داغ بھی سمجھتے تھے۔ آخر حضرت رائے پوری مدظلہ العالی کی سرپرستی میں مولانا مرحوم نے ۱۹۵۶ء کے وسط میں "انجمن حمایت اسلام" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور منظم طریقے پر مشرقی پنجاب میں مساجد ومقابر کے انخلاء اور وطن میں رہتے ہوئے بے وطن مُسلمانوں کی آباد کاری کا کام شروع کر دیا۔

اس انجمن کا پہلا باضابطہ جلسہ مولانا نے یکم ستمبر ۱۹۵۶ء کو اپنے دولت کدہ پر بلایا۔ مشرقی پنجاب۔ دہلی اور یوپی سے مولانا کے وہ احباب جو اس کام میں دلچسپی رکھتے تھے جمع ہوئے۔ جلسہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کی صدارت میں صبح سے شام تک جاری رہا۔ اور اس میں کام کا ایک واضح نقشہ بنالیا گیا۔ جلسہ ختم ہو جانے کے بعد مولانا نے اطمینان کا سانس لیا اور فرمایا کہ آج میرے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

اکثر شرکاء جلسہ اسی روز شام کو رخصت ہو گئے۔ میں نے چاہا کہ حضرت مہتمم صاحب کے ساتھ جو اپنی کار کے ذریعے دیوبند روانہ ہو رہے تھے، میں بھی سوار ہو جاؤں اور راستہ میں میرٹھ اتر جاؤں۔ مگر اجازت نہ ملی اور مجھے روک لیا گیا۔

بعد نماز مغرب دار العلوم دیوبند کے مصری استاد تشریف لے آئے۔ ان سے دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ پھر نماز عشاء کے بعد کاظمی صاحب سے مجھ سے انجمن کے کام کے متعلق سونے کے وقت تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس رات گرمی زیادہ تھی۔ مولانا کو اطمینان کی نیند نہ

آئی۔ میری آنکھ بھی تھوڑی دیر بعد کھلتی رہی۔ صبح چار بجے کے قریب مولانا بستر سے اٹھے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر وضو کیا۔ پھر جانماز بچھا کر اپنے مولا کے سامنے سر بسجود ہو گئے۔ میں مکان کے برابر والی مسجد میں چلا گیا۔ علی الصباح مولانا کا معمول کمپنی باغ تک ٹہلنے کے لئے جانے کا تھا۔ مگر آپریشن کے بعد سے جسے دو ماہ گزرے تھے رکشا میں آتے جاتے تھے۔ اس روز خلاف معمول پیدل واپس ہوئے اور راستہ بھر دوکان داروں اور محلہ والوں سے سلام و مصافحہ کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا کے ہاں صبح کا ناشتہ بہت سویرے ہوتا تھا۔ مولانا کے تشریف لاتے ہی دستر خوان بچھا دیا گیا۔ حضرت مولانا پیشاب سے فارغ ہو کر تشریف لائے تو میں تعظیماً کھڑا ہونے لگا۔ مولانا نے محبّت کے ساتھ کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا اور ہنس کر فرمایا۔ میں تو پنجابی ہوں پھر آپ میرے ساتھ یوپی کی تہذیب کیوں چلاتے ہیں؟ میں نے عرض کیا جب میرے اور آپ کے تعلقات ہیں تو تہذیب بھی ملی جلی چلنے دیجئے۔ گفتگو کے دوران میں ہی مولانا محمد احمد کاظمی ایم۔ پی (مرحوم) تشریف لے آئے۔ مولانا نے فرمایا لیجئے۔ اب مشرقی یوپی اور بہار کی تہذیبوں کے نمائندے بھی آگئے۔ الغرض ناشتہ کے دوران حضرت مولانا اپنی شیرینی گفتار سے کام ودہن کے ساتھ دل ودماغ کی ضیافت کا سامان بھی فرماتے رہے۔

ناشتہ سے فراغت کے بعد مولانا زنان خانہ میں تشریف لے گئے.....وہیں بیت الخلا جانے کی ضرورت پیش آئی۔ اسی دوران میں اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ لڑکھڑاتے ہوئے نکلے اور چارپائی پر گر گئے۔ کلمۂ طیبہ پڑھا اور رحمان کا حبیب اپنے محبوب کی آغوش رحمت میں پہنچ گیا۔

گھر میں آہ وبکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔ دوسروں کے ساتھ میں بھی افتاں وخیزاں گھر میں پہنچا۔ حضرت مولانا بستر مرگ پر دراز تھے۔ نورانی پیشانی پر پسینہ کے موتی لرزاں تھے اور خاموش ہونٹوں پر تبسّم کی موجیں رقصاں تھیں۔

"حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شُد"

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَام

زین العابدین۔ شیخ التفسیر جامعہ ملیہ۔ نئی دلّی
۱۶ر مئی ۱۹۷۵ء



رئیسؒ الاحرار اب بھی زندہ ہیں

محترم رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کی یاد آتے ہی ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اب بھی زندہ ہیں۔ اب بھی کچھ ہی دیر بعد آئیں گے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کہیں گے۔

"کہو بھائی۔ ملک کے لئے کچھ کام بھی کرتے ہو یا صرف مضمون ہی لکھتے رہتے ہو؟" اور میں جلدی سے اٹھ کر آداب بجالا کر کہوں گا "آپ حکم کیجئے، جو بھی آپ کہیں گے وہ میں کروں گا ضرور" ۔ ایسی تھی ان کی شخصیت۔ کچھ لوگ زندہ ہونے پر بھی مرے سے لگتے ہیں۔ وہ رحلت فرمانے کے بعد بھی زندہ معلوم ہوتے ہیں۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ایسا یقین ہی نہیں ہوتا۔

اور اوپر جو فقرہ میں نے ان کی طرف سے لکھا۔۔۔ "کہو بھائی ملک کے لئے کچھ کام بھی کرتے ہو یا مضمون ہی لکھتے رہتے ہو" جیسے ان کے جیون کے مشن کا آئینہ ہے۔ اس میں تین الفاظ ہیں۔ "بھائی" ۔ "ملک" ۔ اور "کام" ۔ اور ان کے جہان جیون کو دیکھتے ہوئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین الفاظ ہی ان کے سارے جیون کی بنیاد تھے۔ ملک کا ہر آدمی ان کے لئے "بھائی" تھا۔ اپنا تھا۔ کوئی پرایا نہیں۔ ہر وقت وہ "ملک" کے لئے سوچتے تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی نیتا تھے وہ لیکن ان کا پیار صرف مُسلمانوں کے لئے تو نہیں تھا۔ انھیں چنتا صرف ان کے لئے نہیں تھی، جو اسلام میں عقیدت رکھتے ہیں بلکہ سب کے لئے تھی۔ سارے ملک کے لئے۔ ان کا مذہب ان کی دیش بھگتی کے راستہ میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ بلکہ اسی مذہب کی وجہ سے انھوں نے ملک کو پیار کرنا سیکھا۔ ملک کے ہر آدمی کو پیار کرنا سیکھا اور اس کی آزادی کے لئے جدوجہد۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا، اپنے سارے جیون کی قربانی دینا سیکھا۔ تفاصیل میں جائے بغیر کہنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اپنی دیش بھگتی کے ذریعے اور اپنے پیار بھرے جیون کے ذریعے اسلام کا سچا اور عملی روپ سب کے سامنے رکھا۔ ایسا روپ رکھا جس کے لئے من میں عزّت پیدا ہوتی ہے۔ احترام پیدا ہوتا ہے جس کے لئے پرائے پن کا جذبہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ کاش! کہ نہ صرف دوسرے مُسلمان، بلکہ اپنے اپنے دھرم میں وشواس رکھنے والے دوسرے لوگ بھی محترم مولانا کی طرح اپنے دھرم کو اس پیار بھرے حریت پسندانہ اور ہمدردانہ روپ میں عملی جیون سے پیش کر سکیں۔ تو پھر مذاہب کی اپنی اپنی ہستی کے باوجود آپسی کش مکش ختم ہو جائے۔ وہ زہر ختم ہو جائے جو انگریز نے ہمارے ملک میں پیدا کیا۔ لیکن ملک کے لئے محض سوچنے سے تو کام نہیں چلتا۔ آزادی سے پہلے ہمیں آزادی کے لئے لڑنا پڑتا تھا۔ آزادی کے بعد ہمیں اس کو مضبوط اور مستحکم بنانا ہے یہ سب کچھ باتوں سے نہیں ہوتا۔ "مضمون لکھنے" سے نہیں ہوتا۔ اس کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ لگاتار، بنا تھکے، بنا رُکے، بنا ڈگمگائے۔ اور محترم مولانا کا سارا جیون اس "کام" سے بھرپور تھا۔ وہ خود کام کرتے تھے، دوسروں سے کراتے تھے۔ جب بھی میں نے ان کے درشن کئے تبھی معلوم ہوا کہ وہ ایک نئی مہم چلا رہے ہیں آج غلامی کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ آج آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے مصیبتیں برداشت کرنی ہیں۔ آج اتحاد کو مضبوط بنانے کے لئے ملک بھر میں ایک آندولن چلانا ہے۔ یہی کچھ وہ کرتے رہتے تھے۔ وہ "گفتار کے غازی" تھے ضرور۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اور اس سے بہت زیادہ "کردار کے غازی" بھی تھے۔ اس طرح کام کرتے تھے کہ ان کے بڑھاپے میں بھی جوانی کا گماں ہوتا تھا۔ آج ہم ان کی یاد مناتے ہیں تو اچھا ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟ مجھے اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں گئے نہیں، ہمارے درمیان ہیں۔ زندہ ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ "بھائی ..... ملک اور قوم ......" ان تین الفاظ کو یاد رکھو۔ ان میں تمہارے دیش کے بھوشیہ کی روشنی چھپی بیٹھی ہے۔ رنبیر۔ ایڈیٹر روزانہ "ملاپ" ۔ ۱۶/ مئی ۱۹۶۲ء

رئیس الاحرار کی شخصیتؒ

وجود اور عدم کو سمجھ کے ہستی میں
تعینات سے گزرا وہ مرد آفاقی

بطل حریت رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا انتقال ہوگیا اور وہ کتاب زندگی ختم ہوئی جو چونسٹھ برسوں تک، جہد مسلسل اور عزم مستقیم کی ایک ضخیم کتاب تھی۔ ابھی پرسوں کی بات ہے کہ مولانا سے ٹیلیفون پر گفتگو ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ پرسوں کئی گھنٹے تک اہم مسائل پر احباب سے تبادلۂ خیالات کرتے رہے اور حسب عادت مفید مشورے بھی دیتے رہے اور کل جب ان کا انتقال ہوا وہ نماز فجر کے بعد سیر کو بھی گئے۔ وہاں سے آکر چائے پی اور دفعتہً ان کی طبیعت بگڑی اور سیاسی و مذہبی انجمنوں کا دھڑکتا ہوا دل یکایک خاموش ہوگیا۔

آج کہ مولانا ہم میں نہیں ہیں ایک حقیقت کے اظہار میں ہمیں تامل نہ ہونا چاہیے "پیام وطن" سے مولانا کے جو تعلقات تھے اس کے بارے میں بعض حلقوں نے بہت کچھ کہا، کیا کہا؟ اس پر ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اگر ہم اپنی دیانت اور صداقت کو گواہ بناسکتے ہیں تو ہمیں کہنا چاہیے کہ مولانا کو پیام وطن والوں سے بے انتہا محبّت تھی اور پیام وطن والے انھیں اپنا بزرگ اور مخلص سمجھتے تھے اور اس کے سوا ہمارے اور ان کے درمیان مادی دنیا کا کبھی کوئی رشتہ نہیں رہا۔ ۱۹۲۹ء میں پنجاب "پیام وطن" کے ایک خادم کی عملی زندگی کا محور بنا۔ ہم نوجوان تھے اور مولانا ابھی جوان تھے اور بڑھاپے کی منزل ان سے دور تھی۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ مولانا ایک مجاہد ہیں اور اگر ان کا ذہن استوار ہو جائے اور شباب کی ہنگامہ آرائیاں ختم ہوں تو وہ اُفق سیاست پر آفتاب بن کر چمکیں گے۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی تو مولانا کا ذہن وہ تھا جو ہم چاہتے تھے۔ جوش و خروش اب بھی تھا جو ۱۹۲۹ء میں تھا اور ذہن آئینہ کی طرح صاف تھا۔ سیاسی و مذہبی مسائل کی الجھنیں سلجھ چکی تھیں۔ مرنا سب کو ہے لیکن مولانا کی موت ان کی مسلسل علالت کے باوجود ہمارے نزدیک بے وقت موت ہے اسلئے کہ زمانہ کا نشیبؒ و فراز دیکھنے کے بعد ان کے کردار اور فکر میں جو پختگی آئی تھی اس پر شباب اب آتا۔ مولانا جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے تو یہ ان کے لئے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن ہمارے لئے ایک خاص بات ضرور تھی۔ اسلئے کہ ہم نے سمجھا تھا کہ ایک شاندار ابتدا کی نتیجہ خیز انتہا یہ ہونی چاہئے کہ مولانا ایک دن آل انڈیا کانگرس کے صدر منتخب ہوں اور یہ محض خوش فہمی نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک واقعات کی سیدھی رفتار تھی۔ پنڈت نہرو نے ان کی موت پر جو یہ فرمایا ہے کہ "مولانا کی موت ایک قومی نقصان تو ضرور ہے۔ مگر میرا ذاتی نقصان بھی ہے تو یہ بے سبب نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نئے ہندوستان کا اعتماد حاصل کر رہے تھے۔

ہمیں مولانا کو جاننے کا شرف چھبیسؔ ستائیس سال سے حاصل ہے۔ اس لمبی مدت میں مولانا ہم سے بیزار بھی رہے۔ لیکن ہماری زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ مولانا کا حُبِ وطن، حُبِ اسلام، ان کی مجاہدانہ عزیمت، ان کا ایمان محکم۔ ان کا اخلاص ہماری رائے میں مسلمات کا درجہ نہ رکھتا ہو۔ تقسیم ملک سے پہلے مجلس احرار اسلام سے بعض معاملات میں ہمیں اختلاف تھا۔ لیکن اختلافات کی حدیں مولانا نے باندھیں۔ اس لئے کہ وہ وطن پرور تھے۔ مفاد وطن اور مسلمانوں کے مفاد میں مطابقت پیدا کرنا چاہتے تھے اور صحیح الفکر جوانوں کی قدر

کرتے تھے۔ مجلس احرار اسلام کی مولانا نے وقتاً فوقتاً جو صحیح رہنمائی کی اسے جو لوگ جانتے ہیں جو احرار کی داخلی سیاست سے بے خبر نہیں ہیں۔ وہ حالات سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور اپنے ان رفقاء کی انھوں نے برہمی خریدی، جن سے زندگی کے معاہدے تھے۔ اور یہ اس کے باوجود تھا کہ مولانا اپنے رفقاء کے وفادار تھے اور اس وفاداری کی وجہ سے انھوں نے حالات سے بہت سی مفاہمتیں کیں۔ اپنے رفقاء سے جیسی وفاداری ہم نے مولانا میں دیکھی، ہندوستان میں کم ہی دیکھی۔ مولانا چاہتے تو اپنے لئے ایک الگ راہ بھی پیدا کر سکتے تھے اور سیاسی میدان میں بہت آگے ہوتے۔ لیکن رفقاء کے ساتھ چلنا۔ انھیں اپنے خیالوں کے سانچے میں ڈھالنا، کچھ ان کی ماننا کچھ اپنی منوانا اور اس طور پر سعی و عمل کی ایک ملی جلی راہ پیدا کرنا، مولانا ہی کا حصہ تھا۔ کم سے کم ہندی مُسلمانوں میں یہ بات ہم نے کم ہی دیکھی۔ کبھی مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری روٹھ رہے ہیں، کبھی چودھری افضل حق مرحوم تن رہے ہیں۔ کبھی مولانا مظہر علی اظہر بگڑ رہے ہیں۔ کبھی نوجوان کا طبقہ اینٹھ رہا ہے اور ان مشکل حالات میں مولانا اپنی لیڈری اور قیادت کو داؤ پر لگا کے ایک راہ پیدا کیا کرتے تھے جس پر سب ہی چلتے تھے۔ انگریزی نہ جاننے کے باوجود مولانا حبیب الرحمٰن کا شمار ہماری رائے میں ان اکابرین میں ہونا چاہیے جو مولانا محمد علی مرحوم کے بعد ہندوستان کی سیاست پر چھا سکتے تھے۔ مولانا محمد علی میں اخلاص کا جو ہنگامہ سرور وخروش تھا وہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی میں بھی تھا۔

ایک مقامی معاصر نے لکھا ہے کہ "مولانا سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے پھر بھی ان کا دم غنیمت تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ اپنی زندگی کے آخری دور میں مولانا نے کبھی خاموشی سے کبھی علانیہ نئے ہندوستان کی جو خدمت کی وہ انہی کا حصہ تھا۔ کوچہ رحمن میں ان کا گھر ایک یونیورسٹی تھا۔ ایک مکتب خیال تھا۔ جہاں ہندو۔ مُسلمان، سکھ، شرنارتھی، کمیونسٹ، سوشلسٹ، کانگرسی، ملحد۔ مومن سب ہی آتے تھے اور مولانا کے منجھے دھلے افکار سے استفادہ کرتے تھے۔ ان کے ماننے والے کمیونسٹوں میں بھی تھے، کانگرسیوں میں بھی تھے۔ وہ بجائے خود ایک انجمن اور افادہ گاہ تھے اور ان کا دم غنیمت ہی نہیں تھا بلکہ نئے ہندوستان کی ایک بہت بڑی ضرورت تھا۔ سیاست پر ان کی رائے معلوم تھی۔ لیکن تبلیغ دین کا بھی جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا وہ بالکل اچھوتا اور نرالا تھا اور یہ بات ہم کہنی چاہتے ہیں کہ تبلیغ دین سے زندگی کی آخری ساعت تک انھیں غیر معمولی دل چسپی رہی لیکن یہ تبلیغ دکھاوے کے لئے نہیں تھی۔ سستے قسم کے مناظروں کے لئے نہیں تھی۔ بلکہ اس مقصد عظیم کے لئے تھی جو انھیں جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اپنے زندگی کے آخری ایام میں رسالہ "معارف" اور دوسرے رسالوں میں انھوں نے جو مضامین لکھے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینی و تاریخی مسائل پر انھیں پورا عبور تھا اور سیاست کے متعلق تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے اتنی صاف بات کہی جو ۱۹۴۷ء کے بعد نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے ان کی ذہنی دیانت کے بارے میں تو دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔

خدا کا شکر ہے کہ انھوں نے اپنے پیچھے کچھ ہم خیال بھی چھوڑے ہیں اور اپنے صاحبزادوں کو قوم اور سماج کی خدمت کے لئے تیار کیا ہے اور یہ حضرات ان کی زندگی ہی میں بہت سے معرکے سر کر چکے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ مولانا کے پیش نظر سو سال یا ڈیڑھ سو سال کی جو عظیم الشان خاندانی روایات تھیں۔ وہ ان کے صاحبزادہ اور صاحبزادیوں کے پیش نظر بھی ہوں گی۔

چہچہوں سے یوں تو ہے معمور بزم رنگ و بو
چاہیۓ وہ ایک نالہ جو شرح آرزو
جو نہ آساں ہو سکے اور ایسی کوئی منزل نہیں
عزم پیہم زندگی میں سعی لاحاصل نہیں

(مولانا) عبدالباقی

۱۶ر مئی ۱۹۶۲ء

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ہندوستان اور مسلمانؒ

شخصی وفاداری، ملی وفاداری، قومی وفاداری، وطنی وفاداری کا پیکر خاکی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تھے۔ شخصی وفاداری کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ شاید بابائے کانگریس مولانا عبدالقادر قصوری کے بعد پنجاب کانگرس کے صدر ہوتے۔ اگر شخصی وفاداری یا گروہ کی وفاداری نے انھیں مجلس احرار اسلام سے وابستہ کر دیا۔ ملی وفاداری ایسی تھی کہ ہندی مسلمانوں کو انھوں نے مجاہدہ وطن کا ہمیشہ قائد بنانا چاہا۔ قومی وفاداری ایسی تھی کہ انگریز سامراج کو اس وقت بھی تگنی کا ناچ نچایا جب مُسلمان کے لئے دولت پانی کی طرح بہائی جارہی تھی اور وطنی وفاداری ایسی تھی کہ شخصی وفاداریوں اور پرانی وابستگیوں کو تقسیم ملک کے بعد قربان کر کے دلی میں آباد ہو گئے۔

مولانا لدھیانہ کے رہنے والے تھے۔ ایسے عالم دین کی اولاد تھے جنھوں نے انیسویں صدی میں مُسلمانوں کا رشتہ کانگرس سے قائم کرنا چاہا تھا جو ہندو جماعت سمجھی جاتی تھی ان کی کم و بیش ۳۵ سال کی سیاسی قومی زندگی کا گہرا مطالعہ گواہ ہے کہ وہ مجلس خلافت میں ہوں۔ یا مجلس احراء میں، وہ وطن پرور تھے اور اس زمانے میں چونکہ کانگریس ہی وطن پرور تنظیم سمجھی جاتی تھی اسلئے کانگریس ان کی تحریک ان کا نظریہ ان کی طریق کار تھی۔

مجلس احرار کے لئے مولانا نے اپنی عُمر کا عزیز ترین حصہ صرف کیا۔ مجلس احرار کا قیام عجیب حالت میں عمل میں آیا۔ نہرو رپورٹ نے انتخاب جداگانہ اور انتخاب مخلوط کے سوال پر دو زبردست محاذ قائم کر دیئے تھے۔ انتخاب جداگانہ کے حامیوں کا پلڑا بھاری تھا اور کانگرس کا وہ گروہ جو بعد کو مجلس احرار کا معمار بنا سمجھنے لگا کہ انتخاب مخلوط اور انتخاب جداگانہ کے سوال نے ایسی شکل اختیار کر لی ہے کہ مُسلمانوں میں کام کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ اسلئے بیچ کی راہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ ترمیم کی گئی، کچھ اضافہ کیا گیا اور بیچ کی راہ جو اختیار کی گئی۔ اس کا نام تھا مجلس احرار اسلام جس کے لیڈر تھے چودھری افضل خاں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور شیخ حسام الدین۔ شعراء کرام محبوب کا سراپا لکھتے ہیں۔ ہم شاعر تو نہیں ہیں لیکن مجلس احرار اسلام کا سراپا لکھیں تو چودھری افضل حق کو جسم، مولانا حبیب الرحمٰن کو دماغ مولانا مظہر علی اظہر کو روح اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو زبان کہیں گے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے یہ دماغ جس کا نام مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تھا۔ کانگرس سے دور رہ کر مجلس احرار اسلام کے قیام کو مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ مگر وہ جو کہا ہے کہ گروہ سے وابستگی یا شخصی وفاداری، تو اس کا کیا کیا جائے گا۔

مجلس احرار کے قیام کا ایک دلچسپ پس منظر بھی ہے۔ مجلس خلافت ہی میں ایک پنجابی ٹولی قائم ہو گئی تھی اور جو افراد بعد کو مجلس احرار کے رواں بنے، وہ پنجابی ٹولی کے بھی روح رواں تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کو پنجابی ٹولی (یہ بہ سبیل طنز نہیں، بہ سبیل واقعہ لکھا گیا ہے) کا روحانی باپ کہنا چاہئے۔ مولانا عبدالقادر قصوری بھی اس گروہ کے بزرگ تھے، لیکن روحانی باپ مولانا ظفر علی خاں ہی تھے۔ جن کا قلم ہر طلوع صبح کے ساتھ ایک نئی سیاست کی تخلیق کرتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی اہمیت یہ بھی تھی کہ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی انھیں اپنا حریف سمجھتے تھے۔ حالات کا اتار چڑھاؤ ایسا تھا کہ مولانا ظفر علی خاں کی گھریلو مجبوریوں نے کچھ بدگمانیاں، کچھ کھچاؤ، کچھ تناؤ پیدا کیا۔ اتنے میں کراچی میں آل انڈیا کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اور کانگرس کی جو مجلس عاملہ بنی اس کے ایک ممبر ڈاکٹر شیخ محمد عالم موجود تھے۔ خیال تھا کہ چودھری افضل حق مجلس عاملہ کے ممبر بنیں گے یا کوئی ایسے صاحب ممبر بنیں گے۔ جنھیں پنجاب کے کانگریسی مُسلمانوں کی اکثریت کی تائید ہو گی۔ یہ واقعہ بہر حال مجلس احرار کا ایک فوری سبب تھا۔ بنیادی سبب تو یہ تھا کہ پنجاب کا ایک فعال گروہ ہندوستان کی انقلابی جدوجہد میں

ایک خاص انداز سے حصہ لینا چاہتا تھا۔ اور جب وہ اپنی منشاء کے مطابق حصہ نہ لے سکا تو مجلس احرار کا قیام عمل میں آگیا۔

یہ کم و بیش بتیس[32] سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد مجلس احرار کی سیاست میں توازن پیدا کرنا۔ اسے افراط و تفریط سے بچانا۔ ہندی مُسلمانوں کی بھی خدمت کرنا مولانا حَبیب الرحمٰن کا کام تھا۔ نہایت نازک مقامات سے مجلس احرار گزری۔ لیکن چودھری افضل حق کی وفات کے بعد مجلس کو تلوار کی دھار پر لے چلنا مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا مظہر علی اظہر کا مخصوص حصہ تھا۔

دنیا جانتی تھی کہ مولانا حَبیب الرحمٰن مولوی ہیں۔ پابند شریعت ہیں۔ لیکن ان کے تعلقات غیر مسلموں سے اتنے وسیع تھے کہ شاید اس دور میں رفیع احمد قدوائی ہی کے ہوں جو مولوی نہیں تھے۔ انقلاب پسند ان کے ارادت مند، دہشت پسند ان کے گرویدہ، کمیونسٹ اور سوشلسٹ ان کے مداح، سکھ ان کے نام لیوا۔ ان کی نجی صحبتوں میں ایسے ایسے لوگ دیکھے جن کی شان نزول معمولاً سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کسی کا مقدمہ سازش ہے کسی کی جائداد قرق ہو رہی ہے۔ کسی کی جوان بہن گھر میں بیٹھی ہے۔ کسی کو جاسوس تنگ کر رہے ہیں۔ کسی کو مقدمہ کی پیروی کے لئے وکیل نہیں ملتا۔ اور تقسیم ملک کے بعد شرنارتھیوں کو مکان نہیں ملتا۔ مولانا حَبیب الرحمٰن سب کی سنتے تھے۔ تسلی دیتے تھے۔ بہت کچھ کرتے بھی تھے۔ ان کی باتیں ہرے زخموں کے لئے بجائے خود مرہم ہوتی تھیں۔

بات یہ نہیں ہے کہ مولانا کے سیاسی حریف نہیں تھے، یا خود مولانا ایسے مہاتما یا درویش تھے کہ سیاسی حریف نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ لیکن ان کا انداز اس قدر نیاز مندانہ اور مخلصانہ تھا کہ مخالفتیں ہوئیں بھی تو حد اعتدال میں رہیں۔ تقسیم ملک کے بعد دوران قیام دلی میں سیاسی و نیم سیاسی گروہوں سے اختلاف تو تھے۔ مولانا کے پیچھے کارکنوں اور رضاکاروں کی کوئی فوج نہیں تھی۔ سرمایہ بھی نہیں تھا لیکن کام کرنے کا ایک سلیقہ ضرور تھا کہ جہاں بڑے بڑے لیڈر ناکام رہتے ان کے حصہ میں کامیابی آتی تھی۔ حالانکہ وہ دلی میں گوشہ نشین تھے۔ کوچہ رحمان تھا اور ان کا مکان۔ ملا کی دوڑ مسجد تک تھی۔ مولانا کی سیاست اور طریقہ کار سے سو فیصدی اتفاق کرنا ضروری نہیں ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ کام کرنے کا ایک ڈھنگ تھے۔

مجلس احرار کی تحریک کشمیر کو بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا بھی اس تحریک کے رہنماؤں میں تھے۔ کم و بیش ساٹھ ہزار انسانوں کو انھوں نے جیل بھی بھجوا دیا تھا۔ اس زمانہ میں شیخ عبداللہ کا بڑا نام تھا۔ جموں و کشمیر میں ان کے صرف ایک حریف تھے۔ جن کا نام میرواعظ تھا۔ لیکن وہ بھی برائے نام ہی تھے، اس زمانے میں مولانا نے لاہور کے دو چار ممتاز ایڈیٹروں کے سامنے ایک رائے ظاہر کی تھی۔ اس رائے سے صرف ایک ایڈیٹر نے اتفاق کیا تھا۔ باقی ایڈیٹر سخت بیزار اور برہم تھے۔ اس کے بعد شیخ صاحب کی قیادت نے آسمانوں سے باتیں کیں۔ وہ پنڈت نہرو کے ہمسفر بھی ہوئے۔ ہندوستان سے الحاق کشمیر کی انھوں نے تحریک بھی کی لیکن مولانا نے تیس پنتیس سال پہلے جو رائے ظاہر کی تھی اس پر سختی سے قائم رہے۔ یہ ان کی بصیرت تھی کہ معاملات کے بارے میں وہ برسوں پہلے ایک رائے قائم کر لیتے تھے اور وہ صحیح ثابت ہوتی تھی۔ سیاست دانوں میں ایسی بے خطا بصیرت ہم نے کم ہی دیکھی ہے۔ آزادیٔ کامل کے سوال پر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو میں جب اختلافات پیدا ہونے لگے تو ۱۹۲۹ء میں مولانا نے پیش گوئی کی تھی کہ گاندھی جی کو یا تو پنڈت نہرو سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا یا پنڈت نہرو کی قیادت میں ایک متوازی کانگرس قائم ہوگی۔ گاندھی جی نے واقعی پنڈت نہرو سے سمجھوتہ کیا، بلکہ رہنمائی کی لگام پنڈت نہرو کے ہاتھوں میں دے دی۔

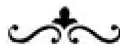
خاص بات یہ تھی کہ مولانا کی سیاست نئے زمانہ کی سطحی سیاست نہیں تھی۔ بلکہ اس کی جڑیں ان کی روحانیت اور مذہبیت میں پیوست تھیں۔ حالات نے مساعدت نہ کی، ورنہ شری اروند اگھوش اگر پانڈیچری میں آشرم قائم کر سکتے تھے تو مولانا بھی لدھیانہ لاہور یا دلی میں ایک روحانی مرکز قائم کر سکتے تھے۔ روحانیت یا مذہبیت کو زندگی کا مرکزی نقطہ مان کر ایک نظام کی تشکیل کرنا امام الہند اور شیخ الاسلام کے بعد ہم نے مولانا حَبیب الرحمٰن میں دیکھا۔ جب اواخر زندگی میں دلّی ان کے لئے کوئی روحانی ماحول پیدا نہ کر سکی تو انھیں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے تسکین ملی۔

تقسیم ملک مولانا کے لئے ایک صبر آزما امتحان تھا۔ ان کا آبائی وطن اگرچہ لدھیانہ تھا۔ لیکن سیاسی اور سماجی وطن لاہور تھا۔ زندگی کے ساتھی لاہور میں تھے جن کے لئے مولانا نے اپنے عزیز ترین مقاصد زندگی میں ترمیم کی تھی۔ ان کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لاہور کو اپنا وطن بنا لیتے۔ آخر شیخ حسام الدین امرت سر سے مغربی پاکستان میں منتقل ہو ہی گئے تھے لیکن مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے یہ نہ ہو سکا اور وہ دلی آ گئے۔ ملی جلی زندگی کے جو خواب انھوں نے دیکھے تھے وہ پاکستان میں کیا پورے ہوتے، اس خواب کی تعبیر اگر ہو سکتی تھی تو ہندوستان ہی میں ہو سکتی تھی۔ اس لئے وہ دلّی آ گئے اور کوچہ رحمان کے ایک مکان میں رہنے لگے۔ مجلس احرار کے خون کی گرمی ان کی بوڑھی رگوں میں بھی دوڑتی رہی۔ لیکن اب آزادی کے بعد ترقی و تعمیر کا زمانہ تھا۔ اسلئے گرمی میں ٹھنڈک آنے لگی، خون کی گردش امتزاج پانے لگی۔

حق گو بہت ہیں۔ لیکن مولانا حبیب الرحمٰن کی حق گوئی اپنی مثال آپ تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہوں یا مولانا ابوالکلام آزاد یا ملک خضر حیات کا ٹوانہ یا سر سکندر حیات یا میاں سر فضل حسین، جہاں حق بات کہنے کی ضرورت ہوتی بے تامل کہتے۔ پیری میں ناصح مشفق بن جانا آسان ہے، اسلئے کہ سن و سال کا سب ہی احترام کرتے ہیں۔ لیکن مولانا نے بڑے بڑے لیڈروں، بڑے بڑے سرکاری منصب داروں کو اس وقت ٹوکا اور تنبیہہ کی جب وہ بوڑھے نہیں تھے اور ان کے مخاطب بھی بوڑھے نہیں تھے۔ موت سے پہلے پنڈت نہرو سے مسلمانوں کے مسائل پر انھوں نے جو بے باکانہ گفتگو کی شاید ہی کوئی کر سکتا۔ اور پنڈت جی نے اپنے روایتی غصہ کے باوجود ان کی باتیں ٹھنڈے دل سے سنیں۔

ایک بات ہم نے ہمیشہ محسوس کی۔ پنجابیوں کی انفرادیت پسندی کا شاید ہندوستان میں تو جواب نہیں ہے۔ اس حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کے باوجود اور جزوی دنیاوی اختلافات کے باوجود احراری دوستوں سے جس طرح برتاؤ کیا وہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ پھر یہ کہ ان کے احراری دوستوں سے جس طرح برتاؤ کیا وہ ایک غیر معمولی بات ہے۔ پھر یہ کہ ان کے احراری دوست کوئی ایسے ویسے نہیں تھے۔ اپنے اپنے وقت کے خطیب شہیر اور دنیا کو تگنی کا ناچ نچانے والے تھے۔ کمال یہ تھا کہ خود مولانا میں غضب کی انفرادیت تھی۔ پھر بھی دوستوں سے ان کی نبھ گئی کہ انھیں اپنے ساتھیوں سے اکثر موقعوں پر اختلاف کرنا پڑا۔ اپنے ساتھیوں کا ساتھی اور مخلص نکتہ چین بن کر گزارنا کوئی مولانا حبیب الرحمٰن الدھیانوی سے سیکھتا۔

دنیا کا کوئی باپ ایسا نہیں ہے جو اپنے بچوں سے مانوس نہ ہو۔ مولانا بھی اپنے صاحبزادوں سے مانوس تھے۔ ان کے صاحب زادوں کی تربیت بھی ان کے ماحول میں ہوئی۔ مولوی عزیز الرحمٰن جامعی آج ایک کامیاب مؤلف اور ایک کامیاب تعلیمی ادارہ کے نگران ’ول ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولوی خلیل الرحمٰن ایک اور صاحبزادے جو دیوبندی عالم میں پنجاب میں مفید کام کر رہے ہیں۔ ایک صاحبزادے سرکاری محکمہ سے وابستہ ہیں۔ عام طور پر لیڈروں کا خاندان لیڈر کی موت کے بعد بکھر جاتا ہے یا منتشر ہو جاتا ہے لیکن مولانا کا خاندان ان کے بعد بھی مفید زندگی بسر کر رہا ہے اور جسے دیکھئے وہ مولانا حبیب الرحمٰن کا جیتا جاگتا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی لب و لہجہ جو مولانا کا تھا، وہی انداز بیان جو مولانا کا تھا اور کردار بھی مولانا سے ملتا جلتا ہے۔ مولانا کا انتقال دلی میں ہوا۔ لاہور سے دوران کا انتقال ہوا جہاں لاکھوں کے مجمع کو بار بار انھوں نے مخاطب کیا جہاں رجعت پسندوں کو خم ٹھوک کر للکارا۔ جہاں باطل کو پیہم شکستیں دیں۔ لاہور یا لدھیانہ میں بھی جانے پہچانے قائد کے قدردانوں کی کمی نہ تھی۔ لاکھوں نہیں تو ہزاروں ہندو، مسلمان اور سکھ ان کے جنازے میں شریک ہوئے۔ (مولانا عبد الباقی مرحوم)



مردِ مومنؒ

باسمہ سبحانہٗ

برادر عزیز۔ عزیز داری کی صبر گزاری اور رنج و قلق کی اشکباری میں ایک دور افتادہ بھائی کو بھی شریک کر لیجئے۔ دہلی کی طرف کشش کے بہت کم رشتے باقی رہ گئے تھے ان میں سے ایک اہم رشتہ مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن بھی تھے۔ وہ رشتہ بھی میری صدہا امیدوں کی طرح ٹوٹ گیا اور وہ محبوب وجود اب ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں پہنچنے کے لئے موت کے دروازے سے گزرے بغیر چارہ نہیں۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"

میں نے یہ دلفگار خبر کل کے اخبارات میں پڑھی تھی! پڑھ تو لی لیکن منٹوں تک اس کی صحت پر یقین نہ آیا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میر احمد حسین یہاں آئے تھے تو مجھے اپنڈکس کے آپریشن کی تفصیلات بتا گئے تھے۔ میں اپنے ذہن میں یہ تصور لئے بیٹھا تھا کہ اب کے سردیوں میں جاؤں گا تو خوب باتیں ہوں گی، جن داستانوں کی شُنید کے لئے میں نے گزشتہ سفر میں اصرار کیا تھا وہ اس مرتبہ دل کھول کر سنوں گا۔ میر صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ ڈاکٹر نے آپریشن کے بعد مولانا کو مبارک باد دی اور کہا کہ اگر تھوڑی دیر اور گزر جاتی تو موت یقینی تھی اس لئے کہ اپنڈکس کی نالی پھٹ چکی تھی! لیکن ...... لیکن کیا معلوم تھا کہ جو ملاقات ۹۲ جنوری ۶۵ئ کی شام کو ہوئی تھی وہ اس دنیا میں آخری ملاقات تھی؟

گر نہ قضا بود کہ باہم ودیم
می رسد آں وقت کہ باہم دویم

مرحوم کی وجہ سے دوستوں کی ایک بہت بڑی دنیا آپ کے گرد و پیش پھر رہی تھی۔ وہ انسانیت اور اسلامیات کے اعلیٰ خصائص کا ایک روشن چراغ تھے کہ جہاں بیٹھ جاتے تھے۔ محفل روشن ہو جاتی تھی۔ خود آپ بھائیوں کے لئے بھی دنیاوی نقطہ نگاہ سے اطمینان و دلجمعی کا ایک سہارا تھے۔ میں ۱۹۲۲ء میں اخبار نویسی کے لئے لاہور آیا تھا۔ اس کے تھوڑے دن بعد ان سے روابط پیدا ہوئے۔ چونتیس سال کی مدت ایک عمر ہوتی ہے اس میں اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ سیاسی ہنگاموں میں فکر و نظر کا اختلاف ایک طبعی امر ہے۔ تاہم جو مُحبّت اور دلی ربط و تعلق پہلے دن سے باہم پیدا ہو چکا تھا وہ آخری دم تک بدستور قائم رہا۔ ایسے رفیق پہلے ہی بہت کم رہ گئے تھے۔ اب اس چراغ کے بجھ جانے سے زندگی کی محفل افسردہ ہو کر رہ گئی۔

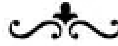
وہ بہادر تھے جوانمرد تھے۔ میرے سامنے ان کی زندگی میں ابتلاء کے بیسیوں مرحلے آئے۔ کسی میں بھی انہیں ہراساں یا خوف زدہ یا پریشان نہ دیکھا۔ وہ میدان عمل کے شہسوار تھے۔ خدا نے انہیں نازک سے نازک ماحول میں سچی بات سلیقے سے کہنے کی خاص صلاحیت عطا کی تھی اور جو کچھ ان کی زبان پر جاری ہوتا تھا۔ خلوص و صداقت کے باعث اس میں زندگی کی ایک خاص روح جلوہ گر رہتی تھی۔ ان کی عظمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے دور ترک موالات میں حکومت برطانیہ کی قاہری کے مناظر دیکھے ہیں اور جو جانتے ہیں کہ حکومت کے طوفان تشدد اور خود اپنوں کی بے یقینی یا کہہ لیجئے دانش مندانہ عاقبت اندیشی کے مناظر کس درجہ روح فرسا اور حوصلہ سوز تھے ان کے سامنے ہمیشہ یقین کی روشنی رہی اور وہی روشنی ان کے تمام افکار و اعمال کے لئے مشعل راہ تھی!

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنّت الفردوس میں جگہ دے۔ آپ لوگوں کو صبر ضبط کی توفیق سے مشرف رکھے۔ آپ کا حامی و ناصر

رہے (آمین ثم آمین) ایسے نازک وقت میں آپ سے کوئی درخواست کرنا بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کیا کروں دل نہیں مانتا اور اپنے محترم بھائی کی زندگی کے آخری اوقات میں بیماری کی تفصیلات وغیرہ سے آگاہی کے لئے حد درجہ اضطراب ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ مکانی دیواروں کو پھاند کر فوراً آسکوں، اس کے سوا چارہ نہیں کہ ہر تفصیل کے لئے بے قراری کا اظہار آپ حضرات کے سامنے کروں۔ اگر موقع ملے تو میری اس عاجزانہ درخواست کو پورا کر دیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کا رفیق و یار ہو۔ والسّلام

دل شکستہ۔ (مولانا) غلام رسول مہرؔ

ایڈیٹر "انقلاب"۔ مرحوم



صدر ناصر اور رئیس الاحرار

مرحوم نے مجھے ملاقات کے لئے دہلی آنے کی دعوت دی۔ اس سے قبل مجھ سے مولانا کو کوئی تعارف نہ تھا، بجز اس کے انہوں نے محض اخبارات میں میرے چند مقالات پڑھے تھے اس طرح میں نے بھی مولانا مرحوم کے وہ مقالات دیکھے تھے جن میں مصر کی زبردست حمایت کرتے ہوئے ان تمام شبہوں کو دور کیا گیا تھا جو ہندوستان میں بعض لوگوں نے مصر اور مصر کے قائد جمال عبد الناصر کے خلاف مُسلمانوں میں پیدا کر دیئے تھے اور قائد مصر و شرق جمال عبد الناصر کے موجودہ اقدام کو زبردست خراج تحسین ادا کیا گیا تھا۔

مولانا مرحوم کی تحریر میں جذبۂ ایمانی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے دور تھے لیکن ان مقالات کے ذریعہ ہمارے درمیان ایک رابطہ پیدا ہو گیا۔ مرحوم کے مقالات پڑھنے کے بعد میرے دل میں ملاقات کا شوق بڑھا، اسی وقت دہلی حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ لیکن لکھنؤ اور مراد آباد کے سفر در پیش تھے۔ اس لئے یہ ارادہ مؤخر کر دینا پڑا۔ لکھنؤ کے سفر سے واپسی پر میں فوراً ہی دہلی آیا اور اس مرد مومن سے ملاقات کی۔ جب میں مولانا مرحوم کے مختلف مراحل میں ساتھ رہ چکے ہیں۔ زمانہ کے واقعات سنے۔ مولانا مرحوم کے فکر و عمل میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ انھوں نے اپنے تجربات اور فکر و عمل سے ان میں مزید اضافہ کیا اور ہر مسئلہ پر قوت ایمانی اور اولوالعزمی سے کام لیا۔ مولانا کی قوت گویائی سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایک چونسٹھ[۶۴] سالہ بزرگ ہیں جن کی زندگی کا تابناک حصہ جیل کی اندھیری کوٹھریوں میں گذرا ہے اور جس نے مجاہدین وطن کے ساتھ جہاد حریت میں زبردست حصہ لیا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک نوجوان ہے جس کی رگوں میں جوانی کا خون کھول رہا ہے۔ انہوں نے اپنی گفتگو میں جس جوش کے ساتھ مصر اور مصر کے قائد جمال عبد الناصر کی تائید کی۔ اس سے مجھے کبھی کبھی ان کے کمزور بدن کا خون ہونے لگتا تھا۔

مولانا نے بڑے جوش کے ساتھ فرمایا کہ جمال عبد الناصر اس وقت مشرق کو بیدار کر دینے میں جو پارٹ ادا کر رہے ہیں وہ ان کا زبردست کارنامہ ہے۔ مشرقی اقوام کا فرض ہے کہ وہ مصر کے ساتھ ہو کر اس کی آزادی اور خود مختاری کے لئے پوری جد و جہد کریں۔ مولانا نے ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان آزادی کا عقیدہ رکھتا ہے اپنی آزادی کے ساتھ دوسروں کی آزادی چاہتا ہے۔ اس لئے وہ مصر کے اس باعزت اقدام کا زبردست حامی ہے۔

مولانا نے ایسے لوگوں پر بڑے افسوس کا اظہار کیا جو ہندوستان آکر مصر اور اس کے قائد جمال الدین عبد الناصر کے خلاف غلط افواہیں پھیلاتے ہیں اور ان سے مُسلمانانِ ہند بُرا اثر لیتے ہیں۔ نیز فرمایا کہ ایسی غلط افواہوں کی تردید اور صحیح حالات سے باخبر کرنے کے لئے مناسب اقدام کی ضرورت کا احساس دلایا۔ نہر سویز پر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے مولانا ابو الاعلیٰ مودی کے اس طرز عمل پر انتہائی برہمی کا اظہار کیا جو انہوں نے جمال عبد الناصر اور مسئلہ سویز پر اختیار کیا۔

ابو الاعلیٰ مودودی کو جب لاہور کے اس جلسہ میں جو مصر کی تائید کے سلسلہ میں کیا گیا تھا تقریر کرنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس مرد مجاہد کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں بھی بہت دل برداشتہ ہوا اور ایسے لوگوں کے طرز عمل پر سخت غصہ آیا جو خود اسلام کے دعوے دار ہیں اور دوسروں کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں لیکن خود یہ نہیں جانتے کہ جو لوگ اس وقت مصر کے ساتھ تعاون کرنے سے گریز کر رہے ہیں جو مغرب کے مظالم کا شکار ہو رہا ہے اور مغربی ظلم واستبداد کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے۔ ان کے بارے میں اسلام کیا حکم رکھتا ہے کہ یہ لوگ، مصر جو ایک اسلامی اور مشرقی ملک ہے اس کے مقابلہ میں مغربی ممالک کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔

مولانا مرحوم نے ان امور کی طرف بھی توجہ دلائی جو مصری سفارت خانہ کی طرف سے انجام پانے چاہئیں اور جن سے مُسلمانانِ ہند کے دلوں میں بیٹھے ہوئے غلط شبہات دور ہوں، اور وہ صحیح صورت حال سے باخبر ہوسکیں۔ یعنی مصری سفارت خانہ کو اردو زبان میں ایسا لٹریچر شائع کرنا چاہئے جسے ہندوستان کے عوام ہندو مُسلم جو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں۔ پڑھ سکیں۔ اسی طرح تعلیمی اداروں اور دیہات وقصبات میں بھی لوگوں کو صحیح معلومات بہم پہنچانی چاہئے۔ مولانا نے اس پر انتہائی تعجّب کا اظہار فرمایا کہ امریکہ، برطانیہ حتیٰ کہ اسرائیل کی نظر میں اردو دانوں کی اس قدر اہمیت ہے کہ وہ ان کے لئے اردو زبان میں پروپیگنڈا کرنے کے لئے رسالے اور مختلف قسم کے پمفلٹ وغیرہ شائع کرتے ہیں۔ لیکن تعجّب ہے کہ مصر اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اس غیور مردِ مجاہد کے خیالات میں میں نے اپنے خیالات سے پوری مطابقت پائی اور مجھے اس جواں ہمّت بزرگ میں مصر کے لئے زبردست جد وجہد واخلاص نظر آیا۔ میرے ل میں ان کے احترام ومحبّت نے جگہ کرلی۔ اور معاً مولانا کے وہ خیالات بھی میرے ذہن میں گھومنے لگے جو انہوں نے اخبارات ورسائل میں کسی مصری کو جتانے کے لئے نہیں، بلکہ محض اپنے سچے جذبات کے تحت تحریر فرمائے تھے۔ ان میں نہ کسی داد ودہش کی تمنا تھی۔ اور نہ کسی سے داد وتحسین کی خواہش تھی۔

موصوف نے ہندوستان کے متعلق اظہار خیال فرماتے ہوئے کہا کہ ان کا نظریہ یہ ہے کہ ہندوستان میں تمام لوگ بغیر تفریق مذہب وملّت صرف اس بنیاد پر کام کریں کہ وہ ہندوستانی ہیں اور ہندوستانی ہونے کی حَیثیّت سے وطن کی تعمیر کریں۔ مذہبی بنیادوں پر ملکی مسائل کا حل نہ ہو۔ مولانا کی گفتگو میں مجھے ایک پختہ کار اور پُر مغز آزمودہ شخص کی سچی تصویر نظر آرہی تھی۔ اس پُر مغز سیاست داں اور مبصر کی رائے تھی کہ ملک کی قسمت صرف اسی صورت میں جاگ سکتی ہے جب کہ مذہبی تفریق کو ملکی مسائل اور باشندگان ملک کے باہمی تعلقات میں دخل نہ ہو۔ کیونکہ ہندوستان میں مذہبی بنیادوں پر متحد ہونا ملک کی وحدت کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ اس طرح سے یہ وحدت اختلافات کی آگ ذرّے بن کر اڑ جائے گی یا خون کی ندیوں میں بہہ جائے گی۔ اس لئے کہ ہندوستان میں ایک مذہب نہیں ہے۔ بلکہ یہاں مختلف عقائد وخیالات کے لوگ رہتے ہیں۔ ان کے اتحاد میں مذہبی تفریق کا دخل ملک کے لئے خطرناک ہے۔

دورانِ گفتگو اس جواں ہمّت بوڑھے کا جوش باوجود بیماری اور کمزوری کے برابر بڑھ رہا تھا اور وہ جذبہ کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ جمال عبد الناصر پر اس وقت علاوہ سامراجی طاقتوں کے پورا مشرق بلکہ پوری آزادی پسند قوم فخر کر رہی ہیں۔ درحقیقت یہ خداوند کریم کی قدرت کا ایک مظہر ہے کہ اس عظیم کام کا بیڑا ایک نوجوان نے اٹھایا ہے۔ جس کی عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔

مولانا کے ان پرجوش الفاظ نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ اب مجھے ایک زبردست انسان کی رفاقت حاصل ہوگئی ہے۔ مولانا نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں مصر کے لئے بہت کچھ کرنا چاہئے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ آپ ہر ہفتہ دہلی آئیں تاکہ اس سلسلہ میں مناسب اور ضروری اقدام کیا جائے۔ کیونکہ مسئلہ سوئز صرف مصر ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ہر آزادی پسند کا مسئلہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس راہ کا سپاہی بن کر کام کرنا چاہئے۔ اس مجاہد کی یہ باتیں سن کر میرے دل میں انشراح پیدا ہوا۔ اور میرے ذہن میں اسکیموں کا ایک لمبا سا خاکہ آیا کہ ہم ایک ساتھ مل کر مُصر کے لئے موجودہ حالات میں کس طرح کام کریں۔

کیا خبر تھی کہ موت سامنے کھڑی ہماری گفتگو اور مستقبل کی امیدوں اور پروگراموں کا مذاق اڑا رہی ہے۔ نہیں معلوم تھا کہ اس مرد مجاہد کی ملاقات پہلی بھی اور آخری بھی یہی ہے۔ میں تو ایسے مستقبل کا خواب دیکھ رہا تھا جس میں بہت سے اہم اور ضروری کام انجام دینے تھے۔ جد وجہد کا ایک نیا باب شروع کرنا تھا۔ مگر کیا خبر تھی کہ اس خواب پر ایک رات ہی گزرنے پائے گی کہ مولانا حبیب الرحمٰن ہمیں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس مجاہد جلیل سے ملاقات کا موقع عطا فرمائیں گے اور جب اس کی باتوں سے دل کو سرور حاصل ہوگا اور دل میں گہری محبّت ہو جائے گی۔ اس وقت کیا ہمیں اس کی یاد میں تڑپتا ہوا چھوڑ کر اپنے جوار رحمت میں بلائیں گے۔ ایک خزانہ جسے ہم نے

حاصل کیا اور فوراً ہی کھو دیا۔ اس پر ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ یہ دل جس میں آج وطن اور مصر کی محبت ہے اور نیکی کا جذبہ موجزن ہے۔ کل اچانک اس کی حرکتیں بند ہو جائیں گی اور ہم آنسو بہاتے رہ جائیں گے۔ اور اس کی مہک سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانا پڑے گا۔

میں کیا کہوں میرا دل صدمہ سے بیٹھا جا رہا ہے۔ کیا یہ کہوں کہ کاش میں اس شخص کو نہ جانتا تا کہ آج یہ صدمہ نہ اٹھانا پڑتا اور نہ اس کی رفاقت سے محروم ہونے کی نوبت آتی۔ نہیں! یہ ممکن نہیں۔ اس لئے کہ میں نے۔ س شخص کے ساتھ بیٹھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ اس کی ایمان سے بھرپور گفتگو کو سُنا ہے اور یہ ایک ایسی یادگار ہے جو میرے دل میں محفوظ رہے گی اور میں تازیست اس مرد مجاہد کو ہر مجلس میں اور ان قابل یادگار شخصیتوں کے ساتھ یاد کرتا رہوں گا۔

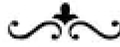
اگر میں اس مرد مجاہد کی موت پر نجیدہ ہوں تو یہ میرے دل کی آواز ہے۔ کیوں کہ ایسی شخصیتوں کی جدائی پر غم کے آنسو بہانا ایک فطری امر ہے۔ خاص کر ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں ایسے مجاہدین کی قدر و قیمت ہے۔

برادر من! دپسرانِ محترم میں آپ ہی میں کا ایک فرد ہوں۔ اگر آپ کے والد مرحوم کی تعزیت کروں تو یہ ایک بھائی کی دوسرے بھائی سے تعزیت ہے۔ اس حادثہ جانکاہ کے احساس میں ہم سب برابر ہیں۔ والد مرحوم نے اپنی پوری زندگی عزت و خودداری اور ہر دل عزیزی کے ساتھ گزاری اور جد و جہد میں پورا وقت صرف کیا۔ ان کے حوصلوں اور ارادوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ بیماری میں بھی اور اس وقت بھی جب کہ وہ داعی اجل کو لبیک کہہ رہے تھے۔

آپ کے والد مرحوم نے آپ کے لئے عمل کی ایک زبردست دولت چھوڑی ہے اور آپ نے ان کے ساتھ رہ کر ان کے طریقہ کار کو بھی دیکھ لیا ہے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ آپ ان کے سچے جانشین بنیں اور خدا کی راہ میں اور وطن کے کاموں میں پوری پوری جد و جہد کریں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس نے اپنے پیچھے آپ جیسے افراد چھوڑے ہوں، اس کی موت موت نہیں۔

اللہ تعالیٰ ان پر ہزار نعمتیں نازل فرمائے اور ہمیں، ملک اور مُسلمانوں کو نعم البدل عطا فرمائیں۔ آمین۔

غمگین (الشیخ) عبدالمنعم النمر
نمائندہ مصری عُلماء برائے دیوبند
(حال مقیم دارالعلوم دیوبند)
۶/ ستمبر ۱۹۵۶ء



راسخ الاعتقاد مُسلمانؒ

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی چل بسے۔ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی موت سے ہمیں کس قدر صدمہ ہے۔ ان سے میرے تعلقات دیرینہ اور خوشگوار تھے۔ وہ مجھے دوسرے کانگرسیوں کی طرح فرقہ پرست سمجھ کر مجھ سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ وہ جتنے راسخ الاعتقاد مُسلمان تھے اتنے ہی سچے نیشنلسٹ۔ ان کی قوم پرستی حقیقی تھی نمائشی نہیں۔ ہر سوال کو وہ قوم پرستی کے زاویہ سے دیکھتے تھے کہ سننے والے عش عش کر اٹھتے تھے! آزمائش کے کئی مواقع آئے لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ ۱۹۴۷ء میں جہاں میاں افتخار الدین اور مولانا داؤد غزنوی جیسے مومن مسلم لیگ میں شامل ہونے کی کافرانہ حرکت کر بیٹھے وہاں مولانا حبیب الرحمٰن ثابت قدم رہے۔ تقسیم کے وقت لدھیانہ سے لاہور جانا پڑا۔ وہ وہاں رہ سکتے تھے۔ مگر نہ رہے اور دہلی آ گئے۔

وہ نہایت خوددار تھے۔ اور کسی کی مروت کا بار نہیں لے سکتے تھے۔ ان پر کڑے وقت بھی آئے لیکن توکل خدا پر رہے اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پسارا۔ دو تین سال ہوئے دل کا دورہ پڑا۔ میں ان کی بیمار پرسی کو جایا کرتا تھا وہ کئی ماہ کی علالت کے بعد اچھے ہو گئے۔ آخری بار میں نے ان کے درشن دو ماہ ہوئے سر گنگارام ہسپتال میں کئے، وہاں ڈاکٹر درشن لال کھیڑا نے ان کا اپنڈے سائیٹس کا آپریشن کیا تھا۔ جب میں ان سے ملا تو وہ صحت یاب ہو کر گھر لوٹنے والے تھے۔ میں ان کو وعدہ دے کر آیا کہ میں آپ کے گھر پر آپ سے ملوں گا! لیکن اتفاق کہ میں خود بیمار پڑ گیا اور اپنا وعدہ وفا نہ کر سکا!

اب جب کہ وہ اس سنسار میں نہیں ہیں کئی باتیں لکھ سکتا ہوں جن کا ان کی زندگی میں نوکِ قلم پر لانا مشکل تھا۔

نومبر ۱۹۴۶ء میں شری دیریندر کے اخبار جے ہند کا اور گھاٹن بھارت بلڈنگ لاہور میں ہو رہا تھا، مولانا افتتاحی تقریر کر رہے تھے۔ روز نامہ انقلاب کے ایڈیٹر غلام رسول مہر اور میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ مولانا نے ہم دونوں کی طرف اشارہ کر کے کہا وہ دیکھو دو پاپی کھڑے ہیں اس وقت س طرح گھل مل کر باتیں کر رہے ہیں گویا ایک ماں جائی ہوں۔ مگر کل دفتر میں بیٹھ کر زہر بکھیرنے لگیں گے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جنوری ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی نے برت کیوں رکھا تھا۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے مجھے سنایا کہ وہ مہاتما جی کے پاس گئے اور کہا کہ میرے لئے وودیش جانے کا انتظام کر دیں میرے جیسے لوگ پاکستان میں رہیں یہ خارج از بحث ہے اور ہندوستان میں حالات ایسے ہو رہے ہیں کہ ہمارا رہنا مشکل ہو رہا ہے۔

مہاتما جی نے کہا کہ آپ کے سوال کا جواب کل دوں گا۔ دوسرے دن انہوں نے بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔

جب میں ان سے سر گنگارام ہسپتال میں ملا تو باتوں میں انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم کبھی پنڈت نہرو سے ملے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ تقسیم کے بعد نو برسوں میں میں ایک بار بھی ان کے درشن نہ کر سکا۔ یہ کیوں؟ ان کے اس سوال پر میں نے کہا کہ میں اپنے کو اتنا چھوٹا نہیں سمجھتا کہ ملاقات کی درخواست کروں اور جواب ملے کہ پنڈت جی کو فرصت نہیں۔ اور میں اتنا بڑا بھی نہیں کہ پنڈت جی کو مجھ سے ملنے کی خواہش ہو۔ اس پر مولانا نے کہا کہ مجھے اچھا ہو لینے دو میں پنڈت جی سے تمہاری ملاقات کراؤں گا اور اس پر میں نے یہ شعر پڑھا

عمر تو ساری کٹی عشقِ بُتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مُسلماں ہوں گے

اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ مولانا کے آخری درشن ہیں۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

مہاشہ کرشن

ایڈیٹر روزنامہ "پرتاپ"

۵/ستمبر ۱۹۵۶ء

رئیس الاحرار

برادر عزیز مولوی عزیز الرحمٰن جامعی نے اپنے والد مرحوم رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی قلم بند کر کے ایک بلند فریضہ انجام دیا ہے۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے مقتدر رفیقوں میں تھے وہ اپنے سیاسی شعور، جوش عمل، اولوالعزمی، اور جدوجہد کے اعتبار سے ہمیشہ نمایاں رہے۔ تحریک آزادی میں سرگرم حصہ لیا اور اس راہ میں کئی بار قید و بند کی شدید صعوبتیں برداشت کیں۔

کتاب "رئیس الاحرار" میں مولانا مرحوم کی سیاسی بصیرت، قول و عمل کی ہم آہنگی اور فکر و نظر کی دور رسی کو جس تاریخی پس منظر کے ساتھ واضح کیا گیا ہے اس سے کتاب کی سیاسی اہمیت کافی وزنی ہوگئی ہے اور واقعاتی طور پر یہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک ایسا باب بن گئی ہے جس کا مطالعہ سیاسیات کے طالب علموں کے لئے بہت مفید ہوگا۔!

واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہماری سیاسی تاریخ بڑی پہلو دار ہے۔ یہ دور سیاسی کش مکش کا ہی نہیں بلکہ مذہبی افکار، تہذیبی روایات، تمدنی فکر اور اجتماعی عمل کے میدانوں میں بھی ایک نئے شعور، انقلابی بیداری اور رنگارنگ توانائی کا ہے۔ مشرق و مغرب کی متصادم اقدارِ حیات کا ہے۔ جب تک بھرپور بصیرت اور ہوشمند نظر کے ساتھ اس دور کا مطالعہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ہم برٹش عہد کے گوناگوں مسائل کی روح تک نہیں پہنچ سکتے "رئیس الاحرار" میں اس دور کا تجزیہ کیا گیا ہے اور فکر کی ایک نئی نہج قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے گو یہ نقطہ نظر لائق بحث و تمحیص ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کے بعض اجزاء سے اختلاف بھی ہو تاہم یہ تعمیری اور کافی حد تک ایک ذہنی سفر کی نشان دہی کرتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ کتاب کا ہر حلقہ میں خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس کتاب میں جو خطوط ہیں وہ سیاسی حالات کا پس منظر ہیں۔ **خادم ملّت**

حفظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ مرحوم

۲۶ / فروری ۱۹۶۱ء

انہی کی خاک میں پوشیدہ ہے یہ چنگاری

کتاب رئیس الاحرار، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے مسودہ کو نہایت غور و فکر اور دل چسپی کے ساتھ پڑھا۔ مولانا مرحوم کی زندگی ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم کردار رہی ہے اور ابتدائے تحریک آزادی سے لے کر حصول آزادی تک ملک میں جو بھی سیاسی اور فکری نشیب و فراز درپیش آئے۔ ان میں مولانا مرحوم کا رول ہمیشہ انفرادی عظمت، ایمان کی حرارت، حب الوطنی، فکر کی پختگی، ذہن کی صفائی اور جوشِ عمل کے مضبوط عزائم سے لبریز رہا۔ وہ چالیس سال تک بھرپور سیاسی بصیرت اور عظیم منفرد شعور کے ساتھ وطن عزیز کی جدوجہد آزادی اور اس کے عروج و ترقی کی تحریک میں جانباز، سرفروش اور بے غرض حوصلہ مند کی حیثیت سے ممتاز قومی رہنماؤں کی صف میں شریک رہے یہی وجہ ہے کہ رئیس الاحرار کی حیات افروز داستان، ہندوستان کی جنگِ آزادی کی ایسی تاریخ بن گئی ہے جس کے مطالعہ سے نہ صرف غور و فکر کی نئی راہیں کھلتی ہیں بلکہ ان میں ان مسلم رہنماؤں کی جدوجہد کے وہ خطوط بھی ملتے ہیں جن کی بنیاد پر مُسلم قوم کے روشن مستقبل کو تعمیر کرنے کے لئے مستقل سو سال تک سرفروشانہ جدوجہد کی گئی۔ اس اعتبار سے یہ کتاب سیاسی حقائق کی ایک اہم تاریخی

دستاویز ہے جسے آج سے بہت پہلے شائع ہونا جانا چاہئے تھا۔ لیکن اب بھی اس کی اشاعت تاریخی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور ہندوستان کے سیاسی مفکرین کو ایک نئے اور غیر جانبدارانہ غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے پردادا حضرت مولانا شاہ عبد القادر ؒ، سید احمد شہید ؒ۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی ؒ وغیرہم کے ممتاز معاصرین میں تھے جنہوں نے پنجاب میں قومی اور انقلابی افواج کی رہنمائی کی اور دلّی پہنچ کر انگریزی افواج سے فتح پوری مسجد سے لے کر لال قلعہ کی دیواروں تک دست بدست لڑے۔ بے شک انہیں اس مہم میں ناکامی ہوئی لیکن وہ اپنے خاندان میں ایسی روح آزادی چھوڑ گئے جسے انگریزی دور کا بہیمانہ تشدد بھی ختم نہ کر سکا۔

۱۸۵۷ء کی پہلی ناکام جنگِ آزادی کے بعد ۱۸۸۰ء میں عُلمائے لدھیانہ پھر نئے حوصلوں اور جرأت کے ساتھ میدان سیاست میں داخل ہوئے اور کانگریس کے قیام کے ساتھ ہی انہوں نے کانگریس کے حق میں فتویٰ دے کر ہندوستان کی آزادی کے لئے پہلے سیاسی مکتب خیال کی ابتداء کرنے میں نمایاں حصہ لیا اور اس طرح سیاسی تدبر اور فکر کی دور رسی کی شاندار مثال قائم کی۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے خاندان کی اس فکری اور انقلابی روایت کو نہ صرف اپنایا بلکہ اسے آگے بھی بڑھایا۔ وہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں پورے چالیس سال تک شریک رہے اور ہمیشہ ایک سیاسی مفکر کی حیثیت سے منفرد رہے اور ایک سچے مجاہد کی طرح مصائب و آلام جھیلتے رہے۔ سامراجی تشدد کا نشانہ بنتے رہے۔ جیل جاتے رہے، اپنوں اور غیروں کی ستم رانیوں کا شکار ہوئے۔ آخر کار گھر سے بے گھر ہوئے اور اعلان آزادی کے ساتھ ہی انہیں لدھیانہ چھوڑ کر دہلی قیام کرنا پڑا۔ لیکن اس پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہوئے بلکہ اسی بلند ہمتی اور استقلال کے ساتھ ہندوستان کی جمہوری اور سیکولر ریاست میں مُسلمانوں کے باثر وجود کے لئے کام کرتے رہے۔

رئیس الاحرار کا دور عظیم ملّی رہنماؤں کا دور ہے۔ امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد صاحب مدنی ؒ۔ مفتی اعظم حضرت علامہ کفایت اللہ صاحب ؒ، حکیم اجمل خاں ؒ، ڈاکٹر انصاری ؒ۔ نقیب انقلاب سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری ؒ اور مجاہد ملّت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ان میں سے ہر ایک انفرادی عظمت کا حامل ہے۔ ان حریت پسندوں نے بے دریغ قربانیاں کر کے شدید مخالف ہواؤں میں بھی شمع آزادی کو روشن کئے رکھا۔ ہمہ رنگی میں بنیادی وحدت کے لحاظ سے رئیس الاحرار کا شمار بلاشبہ مذکورہ بالا حضرات کے ممتاز رفیقوں میں ہوتا ہے۔

میں اپنے طالب علمی کے دور سے ہی مولانا کی سیاسی بصیرت اور ان کی فکری عظمت سے متاثر رہا۔ آزادی سے قبل جب وہ ایک مرتبہ دیوبند تشریف لائے تو مجھے ان سے ذاتی تعارف کا شرف حاصل ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب ہمارے ملک کا سیاسی ماحول کشیدگی، ہیجان اور امید و بیم کے نقطہ عروج (CLIMAX) پر تھا۔ اور فرقہ پرست رہنماؤں نے ملک کو تشدد اور نفرت کے آتش فشاں کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ مولانا نے تقسیم ملک کے اعلان کو ٹائم بم (TIME BOMB) سے تشبیہ دے کر مُسلمانوں کو اس کے ہولناک نتائج سے آگاہ کیا تھا۔ اس مختصر سی صحبت کا نقش آج بھی میری بزم فکر کو روشن کئے ہوئے ہے۔ جب مولانا دہلی میں قیام پذیر ہوئے تو احقر کو بارہا ان کے در دولت پر حاضر ہونے اور فکر و نظر کے گوشوں کو منور کرنے کے مواقع ملے۔ یونیورسٹی کے دوران قیام میرا اصرار کئی بار ان کو علی گڑھ کھینچ کر لایا اور ہر بار طلباء نے ان کی تقاریر میں ایک نئی روشنی کا احساس کیا۔ طلباء علی گڑھ سے وہ بڑی شفقت اور مُحبّت کرتے تھے۔ طلباء بھی ہجوم در ہجوم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور گھنٹوں ان کے ارشادات سے محظوظ و مستفیض ہوتے۔ مولانا علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے وجود کو زبردست اہمیت دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں دعا کرتا رہتا ہوں کہ ذاکر صاحب کی رہنمائی میں علی گڑھ نئے ہندوستان کی تعمیر میں نمایاں کردار ادا کرے اور ایک بار پھر یہاں زندگی کے نئے اور صحت مند روابط کی بنیاد پڑے۔

محب محترم مولانا عزیز الرحمٰن، جامعی اپنے والد صاحب کی یاد داشتوں اور خطوط کو ایک عرصہ سے محفوظ کرتے رہے ہیں۔ یہی

یادداشتیں اور دستاویزیں ہیں جو مولانا مرحوم کے سیاسی اندازِ فکر کو اجاگر کرتی ہیں اور ان کے سیاسی مرتبہ کو متعین کرتی ہیں اور تحریک آزادی کا فکری پس منظر پیش کرتی ہیں۔ تاریخی نقطہ نظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتاب میں صدہا سالہ بکھرے ہوئے حالات کو جس مُستند اور مفصل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے رئیس الاحرار کا درجہ مولانا آزادی کی تصنیف کے بعد دوسرا ہے۔ اس میں مجموعی حیثیت سے ہماری قومی تاریخ کی ٹھوس مگر غبار زدہ حقیقتیں پیش کی گئی ہیں اور تاریخی ثبوت کے ساتھ ان کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

سیاسی پسِ منظر کی تاریخی نوعیت اس خط وکتابت سے معلوم ہو جائے گی، جو رئیس الاحرار اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان مختلف مواقع پر ہوئی۔ ان خطوط کے علاوہ مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر راجندر شاد کے مراسلات نیز دیگر رہنماؤں کے خطوط بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو ابھی تک غیر مطبوعہ تھے۔ اُن کی شمولیت سے اس کتاب نے ہندوستان کے سیاسی منظر و پس منظر میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

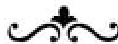
حقیقت یہ ہے کہ وطن عزیز کی آزادی کے لئے جو عظیم اور سرفروشانہ کارنامے مُسلمانوں نے انجام دیئے ہیں۔ ان کی فراہمی اور شیرازہ بندی قوم میں ایثار و قربانی کے جذبات کو زندہ رکھنے اور ابھارنے کے لئے اشد ضروری ہے۔ اسی لئے موضوع اور مواد کے اعتبار سے یہ کتاب ایک ضخیم اور طویل سلسلے کی پہلی اور جاندار کڑی ہے جو AUTHERTIC بھی ہے اور (INSHIRING) بھی۔

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی نے اپنے والد محترم کی زندگی کے بارے میں واقعات کو جس تفصیل کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ وہ انہیں کا حق تھا کیوں کہ وہ ملکی سیاست میں ۱۹۳۹ء سے اپنے والد کے رفیق سفر رہے ہیں اور تحریک آزادی میں بذاتِ خود بھی پُر جوش حصہ لیا ہے۔ ان کا شمار پنجاب کے چوٹی کے سرگرم قوم پرور مسلم نوجوانوں میں رہا ہے۔ بطور اخبار نویس کے بھی آپ نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور آج بھی ملک کی ترقی اور قوم کے سیاسی، سماجی اور تعلیمی میدان میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں۔

کتاب کی زبان ادبی بھی ہے اور عوامی بھی۔ فاضل مصنف نے سیاسی تاریخ کو بڑے دل چسپ اور مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے اور ہر مقام پر ادبی حسن کو قائم رکھا ہے۔

سیاسی اصطلاحات میں ادبی رچاؤ ہے اور اختلافی مسائل میں ادب و احترام کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ نیز تاریخی واقعات کی ترتیب میں فن تاریخ اور غیر جانب داری کے جذبے سے کام لے کر عزیز صاحب نے سیاسی لٹریچر میں ایک پاکیزہ روایت کو قائم کیا ہے جس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ خدا ان کو ہمّت عطا کرے کہ وہ اسی محنت اور شغف کے ساتھ اپنے علمی و تاریخی جستجو کے ذوق کو جاری رکھیں۔ آمین

ظہیر الدین صدیقی ایم اے ایل ایل بی علیگ
نائب سیکرٹری وقف بورڈ دہلی
پائی بلڈنگ حویلی حسام الدین حیدر
بلیماران۔ دہلی ۶
۲۶/ اگست ۱۹۷۵ء



مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی:

چند نقوش و تاثرات

حافظے پر زور ڈالنے سے یاد آتا ہے کہ مولانا کی سب سے پہلی زیارت ۲۹ء یا ۳۰ء کو لاہور کے ایک جلسہ عام میں ہوئی تھی جو مجلس احرار کے زیر اہتمام بیرون دہلی دروازہ یا موچی دروازہ منعقد ہوا تھا، غالباً مجلس احرار کی بنیاد بھی اس وقت نئی نئی پڑی تھی۔

پہلے روز جلسے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر ہوئی، انہوں نے حاضرین جلسہ کو جو ہزاروں کی تعداد میں تھے یہ مثردہ سنایا کہ کل فلاں گاڑی سے صدر مجلس احرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی آرہے ہیں۔ آپ لوگ اسٹیشن پر ان کا استقبال کریں۔ یاد نہیں کہ اس سے پہلے یہ نام کانوں میں پڑ چکا تھا یا نہیں؟ قرینہ ہے کہ ضرور پڑ چکا ہوگا، اس لئے کہ ۲۶ء، ۲۷ء ہی سے زمیندار نظر سے گزرتا تھا اور ہم لوگ لکھنؤ میں اس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ یہ بات بہت بعید از قیاس ہے کہ اس کے صفحات پر اس مجاہد جنگ آزادی و سرخیلِ احرار کا نام بار بار نہ آیا ہو۔

ٹھیک یاد نہیں غالباً ۳۶ء یا ۳۷ء ہوگا میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی فرائض انجام دیتا تھا، اسی زمانے میں سیرت سیّد احمد شہید لکھنے کا خیال پیدا ہوا میں اپنے ایک عزیز شاگرد کے ساتھ لکھنؤ سے ہر دوئی کے لئے پنجاب میل میں سوار ہوا، اسی درجہ میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب بھی سفر کر رہے تھے، کشیدہ قامت، چہرہ سرخ و سفید، پیشانی اور آنکھوں سے ذہانت اور اعتماد کا اظہار، غالباً میرے بھائی صاحب (ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب) سے لکھنؤ میں وہ بار بار مل چکے تھے۔ اسی تقرب سے میری طرف متوجہ ہوئے۔ حضرت سیّد احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آیا، فرمایا

کہ "ہمارے بزرگ مولانا عبد القادر صاحب اور ان کے شیخ و مرشد حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب جن کی رائے پور میں خانقاہ ہے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے معتقد تھے" ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق دلایا، پوری گفتگو یاد نہیں۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ جب میرا رائے پور سے خصوصی تعلق پیدا ہوا اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد حاضری کی سعادت حاصل ہونے لگی۔ میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حبیب الرحمٰن کے آنے سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں جس میں محبّت و احترام دونوں شامل ہیں۔ لیکن محبت کا پلہ بھاری ہے۔ اپنی چارپائی کے سامنے ان کے لئے چارپائی بچھواتے ہیں، تکئے رکھواتے ہیں، حضرت کی مجلس میں کم لوگ اتنی بے تکلّفی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں جتنی مولانا۔ حضرت ان کی باتیں بغور سنتے ہیں، وہ بھی حضرت کا احترام شیخ و مرشد کی طرح کرتے ہیں لیکن اس میں بھی محبّت اور ناز کی ایک امیزش ہوتی ہے جو نتیجہ ہے قدیم نیاز مندی، بڑے حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے براہ راست تعلق، اور بزرگان لدھیانہ، خصوصاً مولانا عبد القادر صاحب لدھیانوی کی دینی خدمات، مجاہدانہ جذبات، حمیت دینی اور ایثار و قربانی کا۔۔۔ جس کا حضرت کے یہاں بڑا درجہ، اور اعتراف تھا۔

بعض مرتبہ مولانا کی گفتگو، ان کا نقطہ نظر اور ان کے تبصرے بہت سے حاضرین مجلس کے لئے نامانوس، اور بعض اوقات وجہ آزمائش بن جاتے، لیکن حضرت کا ان کے ساتھ طرز عمل دیکھ کر کسی کو تردید یا مناظرہ و مباحثہ کی جرات نہ ہوتی۔ البتہ بعض بے تکلّف شرکاء جن کا بڑے حضرت سے قربت کا تعلق تھا اور حضرت بھی ان کی دلداری فرماتے تھے کچھ سوال و جواب کر لیتے اور کبھی کچھ سخن گسترانہ باتیں بھی ہو

جاتیں۔ لیکن سب احتیاط واعتدال کے ساتھ۔

دوایک بار اس کا بھی موقع آیا کہ حضرت کا قیام خاص مولانا کے مکان واقع کوچہ رحمن بلیماران میں ہوا۔ یہاں ہفتے ہفتے، عشرے عشرے قیام رہتا۔ راقم السطور کو بھی دوایک بار معیت کا شرف اور مولانا کا مہمان بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

مولانا، حضرت کے معمولات، ضروریات اور مزاج ومذاق سے پورے طور پر واقف تھے اور اس کی رعایت فرماتے تھے، حضرت بھی اس قیام پر خصوصی یگانگت کی بنا پر بہت منشرح اور بے تکلّف ہوتے۔ بڑی پُرلطف مجلسیں رہتیں جن میں حالات حاضرہ، دینی وملی سیاست، پرانے تجربات وحقائق اور اصلاحِ نفس واصلاحِ باطن کی لطیف آمیزش ہوتی تھی۔

حضرت کا قیام جب قصاب پورہ (نواب والی مسجد) میں ہوتا اور وہ اکثر طویل ہوتا تو صبح ہواخوری کے وقت (جو اکثر پرانی عیدگاہ کی طرف ہوتی) مولانا ساتھ ہوتے اور بے تکلّف گفتگو فرماتے رہتے۔ حضرت بھی اس سے لُطف لیتے۔ بعض خدام جن میں یہ راقم آثم بھی شریک ہے مولانا کے بعض خیالات سے اتفاق نہ کرسکتا، ادب کے ساتھ اس سے اختلاف کرتا۔ واپسی تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ لیکن کسی تلخی اور تجاوز عن الحدود کی نوبت نہ آتی۔ حضرت کی گفتگو اکثر قول فیصل کا کام دیتی اور احباب وخدام کے اس شیرازے کو مجتمع رکھتی۔ دہلی کے قیام کے زمانے میں مولانا زیادہ سے زیادہ وقت حضرت کی خدمت میں گزارنے کی کوشش کرتے اور حضرت کو بھی گویا ان کا انتظار ہی رہتا۔

حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ جب لکھنؤ تشریف لاتے اور طویل قیام فرماتے اور ایسا ۳، ۴ بار ہوا، تو اکثر مولانا ساتھ ہوتے یا بعد میں آکر شامل ہوجاتے۔ ایسا ایک دوبار دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں اور دوتین مرتبہ تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں ہوا۔ اس وقت مجالس کا لُطف دوبالا ہوجاتا۔

حضرت کا مولانا اور ان کے خاندان سے کیا تعلق تھا کس طرح ان کو اس خاندان کا بچہ بچہ عزیز تھا۔ کس خوشی سے لدھیانہ تشریف لے جاتے اور ان کے یہاں قیام کرتے، مجلس احرار کے ساتھ آپ کا کیا مربیانہ وسرپرستانہ تعلق تھا، مولانا کے جیل جانے سے (جس کی نوبت اکثر پیش آتی تھی) حضرت کو کس قدر فکر اور تعلق خاطر پیدا ہوجاتا اس سب کی تفصیل سوانح حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری میں آگئی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مولانا کے سیاسی خیالات ونظریات سے پورا اتفاق نہ ممکن تھا نہ ضروری۔ ان کے خیالات ورجحانات سے بھی جو ان کے ذاتی تجربوں اور خاص طرح کی تربیت وماحول سے پیدا ہوئے تھے، ہم آہنگی بھی کسی معاصر کے لئے خواہ وہ خرد ونیاز مند ہو ضروری نہیں۔ لیکن جس چیز میں زیادہ قیل وقال کی گنجائش نہیں وہ ان کا جذبہ حریت، انگریز دشمنی، وطن دوستی، اخلاقی بلندی، شخصیت کی دلآویزی اور ایک خاص طرح کا قائدانہ بانک پن ہے جو خوداعتمادی، پاکیزہ زندگی اور خلوص کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

ان چند سطروں کو لکھ کر یہ نیاز مند بھی اس جرم میں شرکت کی سعادت حاصل کرتا ہے جو مولانا کے ذکر خیر کے لئے سجائی گئی ہے۔
غفر اللّٰہ لہٗ والحقہٗ بآبائہ الاصالحین وشیوخہ المقبولین

ابوالحسن علی
ناظم ندوۃ العلماء وصدر مدرس ندوۃ العلماء لکھنؤ
۱۰/ شعبان ۹۵ھ ۔ ۱۸/ اگست ۱۹۷۵ء



قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید

یہ کہنے میں مبالغہ نہیں کہ برصغیر کی صحیح تاریخ اب تک ضابطہ تحریر میں نہیں آئی۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے سیاسی حالات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سے اکثر کسی ایک نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ آزادی وطن تقسیم ہندوستان کی شکل میں عالم وجود میں آئی۔ بدقسمتی سے تقسیم ہند کی تمام تر ذمہ داری برادران وطن نے مُسلم لیگ کے لاہور رزولیوشن ۱۹۴۰ء کے سبب مسلمانوں پر ڈال دی۔ پاکستان کے رہنماؤں اور مورخین نے اس واقعہ کو اپنی سات سالہ جدوجہد کا حاصل سمجھا۔ ہندوستان کا مُسلمان جس نے بے سوچے سمجھے پاکستان کی تجویز کا ساتھ دیا تھا، وہ سیاسی محرکات کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا، اس طرح حالات سے مرعوب ہوا کہ وہ خود اپنی نگاہ میں مجرم بن گیا۔ اس سیاسی فضا میں کسی کو یہ مہلت نہ ملی کہ وہ صحیح طریقہ پر انیسویں اور بیسویں صدی کی سیاسی اور سماجی اصلاح کی تحریکوں پر غور کرکے حالات کا تجزیہ کر سکے اور انصاف کے ساتھ یہ بتائے کہ آخر مُسلمانوں نے ۴۰ء تک کسی علیحٰدہ وطن کا مطالبہ کیوں نہیں کیا۔ اور اگر پاکستان کا مطالبہ در حقیقت ایک آئیڈیولوجیکل اسٹیٹ کا مسئلہ تھا تو جناح صاحب نے کیوں کینٹ مشن کی تجاویز کو قبول کیا اور کانگریس کیوں ان تجاویز کو قبول کرنے کے بعد منحرف ہوئی؟ پھر یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ اس پُر آشوب دور میں جن کہ ہندو مُسلمان کی تفریق برصغیر کی سیاست میں واضح ہوتی جارہی تھی آخر کیوں عُلماء اور قوم پرست مُسلمانوں کے گروہ نے کانگرس کا ساتھ دیا۔ یہی سرفروشانِ وطن کا گروہ تھا جس نے آخر تک تقسیم وطن کو ماننے سے انکار کیا اور ہندو کانگریسی رہنماؤں سے جن سے ان کے پرانے روابط اور علائق تھے عین صبح آزادی طلوع ہونے کے وقت برسرپیکار ہو گیا۔

در حقیقت برصغیر کی تاریخ کے صحیح رخ کا قوم پرست مسلمانوں کے نقطہ نظر کو سمجھے بغیر تعین کرنا ممکن نہیں یہ مُسلمان جو عزت کے طالب نہ تھے کہ اپنی ملی قیادت کی ساکھ کو قربان کرکے آزادی وطن اور اتحاد ہندوستان کی خاطر انہوں نے ہندو رہنماؤں سے اشتراک عمل کیا تھا۔ یہ لوگ عہدوں کا لالچ بھی نہ رکھتے تھے کہ ان کا سرمایہ اپنا زاویہ اور بوریہ تھا جس پر یہ آخر تک قائم رہے۔ مولانا آزاد نے پارلیمنٹ میں فرقہ پرستوں کے جواب میں ایک بار فرمایا تھا کہ "جو شخص لالچ نہیں رکھتا وہ بے پناہ ہو جاتا ہے اور بے پناہ شخص کو تلوار بھی نہیں قتل کر سکتی" قوم پرست مُسلمانوں کی آواز ضمیر کی آواز تھی۔ ملک و ملت کے مفادات کا تحفّظ ان کا بنیادی فرض تھا۔ اس فرض کو انہوں نے کٹھن حالات اور پر آشوب دور میں جس طریقہ سے نباہا اس کو سمجھنا آسان کام نہیں۔

افسوس کہ ان بلا کشانِ صادق کی طبعی منکسر المزاجی نے کبھی انہیں اپنی سوانح تک لکھنے پر نہ اکسایا۔ اور اگر کبھی کچھ لکھا تو اس میں اپنی ذاتی عظمت پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کی۔ ان حضرات نے تاریخ کے ہر موڑ پر صدق بیانی کے جادہ سے منہ نہ موڑا۔ مجھے وہ شام یاد ہے جب میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی خدمت میں مسلم یونیورسٹی کے طلباء کا ایک وفد لے کر حاضر ہوا کہ ان کو علی گڑھ تشریف آوری کی دعوت دے سکوں۔ مولانا سے یوں تو مدتوں سے خاندانی طور پر نیاز تھا لیکن اس دن ہم نوجوانوں کو دیکھ کر مولانا کو ایسا شرح صدر ہوا کہ وہ گھنٹوں اپنے سیاسی کوائف پر اظہار خیال فرماتے رہے۔ دوران گفتگو انہوں نے بار بار تقسیم وطن کی بڑی ذمہ داری ہنود کی روش اور کانگریسی لیڈروں کی بے اعتدالی اور مصلحت پسندی پر ڈالی۔ مولانا ایک ڈاکٹر کی طرح حالات کا تجزیہ فرماتے رہے اور بتاتے رہے کہ کس طرح وہ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر کانگریسی رہنماؤں کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کرتے رہے۔ لیکن سیاسی مصلحت نے آخرہ کو عاجلہ پر قربان کیا اور اصولوں کو نظر انداز کرکے مصالح وقت کے آگے سر جھکایا۔

حضرت مولانا کے خیالات کو کوئی ایسا شخص جو ان کی شخصیت کی عظمت سے واقف نہیں ہے ایک بوڑھے ناکام سیاست داں کی حسرتوں کا حساب کہہ سکتا تھا۔ لیکن ہماری خوش نصیبی سے مولانا عزیز الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے مولانا کے خطوط مرتب کر کے ہمیں اس عظیم شخصیت کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے کا موقع دیا ہے۔ جو کچھ میں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے سنا ان کو من وعن میں ان خطوط میں پاتا ہوں۔ یہ خطوط صرف مولانا کی شخصیت کے ہی ترجمان نہیں ہیں بلکہ اس آزاد ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں جس نے مصالح وقت سے بے پرواہ ہو کر اپنے فرائض کو ادا کیا۔ مورخ کے لئے ان خطوط میں عظیم اور نادر خزانہ ہے۔ ان خطوط کے بغیر ہماری تاریخی معلومات ہندوستان کی تاریخ کے اہم دور کے متعلق ادھوری تھیں۔ افسوس ہے کہ اس طرح کے خطوط اور اکابر کی زندگی سے متعلق مرتب نہیں ہوئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کام پر ہماری نوجوان نسل فوری توجہ دے تاکہ تاریخ اپنے اصلی رنگ میں ہمارے سامنے آسکے۔

یہ خطوط محض ایک ماضی کا آئینہ نہیں ہیں بلکہ مستقبل کے لئے ایک سبق بھی ہیں۔ یہ سبق خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی بھی تھی اور اب یہ خطوط بھی ہیں کہ حق کی آواز مصلحت وقت کی پابند نہیں ہوتی اگر تدبر وحکمت کے مشوروں کو کوئی قوم یا جماعت نظر انداز کرے تو اس کا مستقبل انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ یوں محض حق گوئی بھی کوئی بڑا کمال نہیں، حق کی آواز تدبر وحکمت کی آواز بھی ہونی چاہئے اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کی آواز ایسی ہی آواز تھی۔

علامہ انور صابری نے ۴۲ء میں فرمایا تھا:

کوئی سُنے نہ سنے انقلاب کی آواز
پکارنے کی حدوں تک تو ہم پکار آئے

مُسلمانوں کا مزاج جو سیاسی ہنگامی زندگی سے متاثر رہا اور نعرہ بازی سے مرعوب۔ مولانا کی آواز کو نہ سن سکا، لیکن اس کے ساتھ ہی مصالح وقت نے ہندو رہنماؤں کو اس طرح متاثر کیا کہ وہ بھی ان سچے، بے باک ہمدردوں کی زبان نہ سمجھ سکے۔ ان بزرگوں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اگرچہ اُس وقت کی آواز سنی ان سنی کر دی گئی۔ میں نے اس قومی محرومی کو ایک شعر میں یوں کہا ہے۔

آخر کار جو ہونا تھا وہی ہو کے رہا
مدتوں ہم نے جو ہونا تھا وہ ہونے نہ دیا

(عابد اللہ غازی)

ہر ماضی مستقبل کے لئے ایک سبق ہے۔ مولانا کے افکار ہمارے لئے ماضی کا ایک ایک سبق بھی ہیں اور مستقبل کے لئے شمع راہ بھی۔

مولانا کی شخصیت پر مجھ جیسا مبتدی کچھ کہنے کے قابل نہیں۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں نے مولانا کی آنکھیں دیکھی ہیں اور ان کی شفقت کا مرہون منت رہا ہوں، ان کے بارے میں مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند کا یہ قول درست ہے۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۶ء تک

"ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے تری محفل میں ہو"

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ جو حکومت ہند کے مشہور مورخ، ادیب اور سفیر حکومت ہند ڈاکٹر تاراچند نے مرتب کی ہے اور اس کی اشاعت حکومت کے پبلی کیشن ڈویژن نے کی ہے۔ جنگِ آزادی کی تاریخ حصہ سوئم میں ہندوستان کا مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند رئیس

الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے بارے میں پوری فراخ دلی سے اس طرح ان کا تذکرہ کرتا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حروف ہیں۔

عابد اللہ غازی ایم،اے، پی،ایچ، ڈی، ہاورڈ یونیورسٹی امریکہ۔

مولانا شاہ عبد القادر رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے جد امجد تھے انہوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریز کمپنی کی حکومت کے خلاف کھلم کھلا فوجی اور جنگی بغاوت کی" اور ہندوستان کی آخری جنگ آزادی لڑنے کے لئے فوجی کمان سنبھالی۔ ان کی کمان میں لدھیانے سے جنگ آزادی کی فوج نے دلّی کی طرف رخ کیا۔ دلّی پہنچ کر وہ اور ان کی فوج بہادر شاہ ظفر کی کمان کے ماتحت مسجد فتح پوری سے لے کر فوارہ تک مسلح انگریزی افواج سے لڑتے رہے۔ ان کے ساتھ توپ خانہ بھی تھا (اور پوربی فوج سفر مینا بٹالین تھی، اور ریاست ٹونک فوجی دستے بھی)

بہادر شاہ ظفر کے بعد مولانا شاہ عبد القادر پنجاب کی جنگ آزادی کی فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے اپنی فوجی صلاحیت کی بنا پر اپنے خاندان اور اپنی فوج کو دلّی سے لے کر پٹیالہ کے جنگلات میں روپوش ہوگئے اور اسی دوران ان کا انتقال ہو گیا۔ اور مولانا شاہ عبد القادر قصبہ ستر ارنہ میں دفن ہوئے اور ان کے صاحب زادے لدھیانہ چلے گئے۔

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے جد امجد مولانا شاہ عبد القادر کے صاحبزادوں نے اپنے مشن کو قائم اور جاری رکھا۔ مولانا شاہ محمد جو رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے دادا تھے۔ انہوں نے سید کی قائم کردہ جماعت پیرو پیٹک ایسوسی ایشن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور سر سیّد کی اس جماعت کو ہندوستانیوں کے لئے زہر قاتل قرار دیا گیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی راہ میں اس تحریک سے آنے والے خطرناک نتائج سے ہندوستانی مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ کیونکہ سر سیّد کی تحریک ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت کا پہلا بیج بونے کے مترادف تھی۔

مولانا شاہ محمد نے کانگرس کے ابتدائی اسٹیج میں جس کی سر سیّد سرگرمی اور پر جوش طریقے سے مخالفت کر رہے تھے ان کی مخالفت کے جواب میں مولانا شاہ محمد نے کانگریس کے حق میں اور ہندوؤں کے ساتھ بھائی چارہ قائم کرنے کے لئے ایک فتویٰ نصرۃ الابرار کے نام سے شائع کیا اور اس پر ہندوستان اور (حجاز مقدس) اور دیگر اسلامی ممالک کے ہزاروں علماء کے دستخط کرا کے یہ فتویٰ مولانا شاہ محمد نے ۱۸۸۶ء میں مرتب کیا اور ۱۸۸ء کانگرس کے اجلاس الہ آباد کے موقع پر تقسیم کیا۔ اس فتویٰ میں تفصیل کے ساتھ سر سید کی آزادی کش تحریک اور جماعت پیٹری اڈک ایسوسی ایشن کو ناجائز قرار دے کر ہندوستانی عوام کے سامنے شرعی اور اسلامی نقطہ نظر پیش کیا (ڈاکٹر تارا چند کی تاریخ کے علاوہ مولانا طفیل احمد صاحب مصنف مسلمانوں کا روشن مستقبل نے اور ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند نے اپنی کتاب ہندوستان کے مستقبل میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے جد امجد مولانا شاہ عبد القادر اور ان کے دادا مولانا شاہ محمد رئیس الاحرار کے خسر مولانا شاہ عبد العزیز کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور ان کی کتابوں میں یہ تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں اور نصرت الابرار عنقریب دوبارہ مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی جو کہ مولانا عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کی ساتویں پشت میں ہیں تیسری دفعہ شائع کر رہے ہیں۔ نصرت الابرار میں بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں مولانا رشید احمد گنگوہی نے علماء لدھیانہ شاہ محمد اور شاہ عبد العزیز سے معافی مانگ کر نصرت الابرار کے اس فتویٰ پر دستخط کئے جو کہ شاہ محمد نے مرتب کیا تھا جس کی ابتدائی مخالفت مولانا رشید احمد گنگوہی نے غلط فہمی کی بنا پر کی تھی اور یہ بات ایک کھلا ہوا جھوٹ اور غلط ہے کہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے یا علماء دیوبند نے کوئی فتویٰ کانگرس کے حق میں دیا تھا[1])

رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کے دادا مولانا شاہ محمد اور ان کے خسر مولانا شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے علم و فضل، تقویٰ و

[1] جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد حضرت مولانا گنگوہی نے سیاسی رخ بدل دیا تھا۔ وہ سر سیّد کے ساتھ ہو گئے تھے لیکن یار لوگوں نے حضرت گنگوہی کے نام سے علماء لدھیانہ مولانا شاہ محمد رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف سر سیّد کے حق میں حضرت گنگوہی کا فتویٰ شائع کرا دیا۔ جس کے بعد علماء لدھیانہ نے حضرت گنگوہی کو خط لکھا۔ اس خط پر حضرت گنگوہی نے طویل معذرت نامہ لکھ کر کانگرس کے حق میں فتویٰ دینے والے علماء کی تائید میں دستخط کر دیئے۔ عابد اللہ غازی۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

سخاوت، تدبر و حکمت عملی، فراست، ذہانت، فطانت، بے باکی اور عوام میں ایک پاکیزہ مقبولیت کی بنا پر لدھیانے کو پنجاب میں جنگ آزادی کا مرکزی شہر بنا دیا۔ پنجاب کے عوام و خواص، ہندو مسلمان صاحبِ حیثیت اور مالدار دانش ور اور وکلاء غرضیکہ پنجاب کے ہر طبقہ خیال کے لوگ عُلماء لدھیانہ کی زیر نگرانی وزیر سرپرستی اور ان کے وعظ و نصیحت کی بنا پر ہندوستان کی آزادی کے رضاکار اور صحیح معنوں میں نیشنلسٹ بن گئے اور انگریز کی آرکائز میں لدھیانہ کے عُلماء اور عوام و خواص کے بارے میں یہ فتویٰ صادر کر دیا گیا کہ عُلماء کے ساتھ لدھیانہ کے شہری بھی انگریز کے باغی ہیں (اس تحریک کا ذکر لدھیانہ کے عام شہریوں کا نقطہ خیال اور عُلماء لدھیانہ کی جد و جہد آزادی کے بارے میں مسٹر ساور کرنے اپنی کتاب ہندوستان کی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں تفصیل سے لکھا ہے)

جنگ آزادی کی تحریک کو دن بہ دن لحہ بہ لحہ آگے بڑھانے کے لئے مولانا شاہ محمد رحمۃ اللہ علیہ کی تجویز اور اشارے پر ۱۸۹۶ء میں ایک انگریزی اخبار آبزرور کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اس اخبار میں انگریزی حکومت پر شدید نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ اس اخبار نے یہ سلسلہ ۱۹۱۲ء کی جنگ بلقان تک جاری رکھا۔ بلقان دار کے فوری بعد پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں اس اخبار کو بند کر دیا گیا (اس کے ایڈیٹر پر جس کا نام خواجہ احد شاہ تھا چار سال تک انگریزی حکومت کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ مگر اسی عرصہ میں اخبار آبزرور کا پریس جو کہ لاہور میں تھا اس کی ساری مشینری برباد ہو چکی تھی اور وہ اس قابل نہ رہ گیا تھا کہ اس سے دوبارہ آبزرور شائع کیا جائے۔ آبزرور کے پہلے ایڈیٹر علی الترتیب سر فضل حسین جو اس وقت کانگرس کمیٹی پنجاب کے صدر تھے اور دوسرے ڈاکٹر سر عبد القادر جو اس زمانے کے آزاد خیال بیرسٹروں میں تھے اور تیسرے ملک برکت علی جج کے عہدے سے استعفادے کر عُلماء لدھیانہ کی ہدایت پر اس اخبار کے ایڈیٹر بنے تھے، ان تینوں آدمیوں کو بلقان دار سے لے کر ۱۹۱۴ء کی جنگ کے آخر تک بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۱۹ء میں جونہی گاندھی جی نے تحریک خلافت کی رہنمائی کا اعلان کیا، کانگریس اور تحریک خلافت کو ایک ہی جماعت قرار دے کر ایک ہی کاز اور ایک ہی نصب العین کے ماتحت ہندوستان کی جنگِ آزادی کے لئے تحریک عدم تعاون یالاتعاون شروع کی جس کا مطلب انگریزی اشیاء کا بائیکاٹ، ترکوں کی مدد ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ تھا۔

اس اعلان کے ہوتے ہی پنجاب کے جنگ آزادی کے مرکز لدھیانہ سے مولانا شاہ عبد القادر کے پوتے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، گاندھی جی کی چلائی ہوئی تحریک میں شامل ہو گئے اور یہ واحد شخصیت تھی جس نے خلافت مومنٹ اور گاندھی جی کی تحریک ستیہ گرہ کو ایک ساتھ چلایا۔ اس وقت رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کی عُمر ستائیس سال تھی۔ وہ پہلے دن سے کانگریس میں شامل ہوئے اور آخری دن ۲، ستمبر ۱۹۵۶ء کی صبح اتوار کے دن آٹھ بجے تک کانگریس کے ساتھ رہے۔

کانگریس میں ان کا کردار ایک انفرادی کردار تھا وہ نہایت فہیم اور اپنے اصولوں کے پکے تھے اور دوسروں کے نظریات پر اصولی اور بادلیل تنقید کرتے تھے۔ اس ضمن میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے بارہا گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال کے نظریات کو رد کیا اور ان کی جگہ نہایت ہی سلجھے ہوئے اور نتائج خیز نظریات پیش کئے۔ گاندھی جی اور پنڈت جی نے ہمیشہ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کی قدر کی۔ مجلس احرار اسلام ہند، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن کا دوسرا نام تھا۔

۱۹۲۹ء میں جب کہ راوی کے کنارے پہلی دفعہ کانگریس نے مکمل آزادی کا ریزولیشن پاس کر کے نہرو رپورٹ کو گاندھی جی کے ہاتھوں دریائے راوی میں غرق کر دیا، اس وقت مولانا ابو الکلام آزاد کی رہنمائی اور ارشاد و ہدایت پر لاہور میں رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں نے مجلس احرار اسلام ہند قائم کی، جس کا مرکزی نصب العین ہندوستان کی آزادی اور کانگرس کے ساتھ تعاون قرار دیا گیا۔ مجلس احرار کے اصول و قواعد کے تحت نصب العین کی تشریح ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ، اقوام ہند میں میل جول پیدا کرنا قرار دیا گیا۔ مجلس احرار اسلام ہند کے چیدہ چیدہ اصول یہ تھے۔

(۱) ہندوستان کی کامل آزادی (۲) ہندوستان کی جنگِ آزادی میں تہذیبی، تمدنی، تعلیمی آزادی کا اقوام ہند کے لئے پورا خیال رکھا جائے گا اور یہ بات بنیادی قرار دی جائے گی کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد اقتصادی، تعلیمی اور تمدنی آزادی لازمی جز ہے اور چھوت چھات کو پورے طور پر ختم کیا جائے گا (۳) ہندوستان کی کامل آزادی کے بعد صوبائی آزادی کی ضمانت دی جائے گی اور صوبوں کے اختیارات تہذیبی، تمدنی اور تعلیمی اعتبار سے مکمل اختیارات ہوں گے اور اس میں مرکز مداخلت نہیں کرے گا۔ یعنی صوبوں کی مکمل آزادی فیڈرل گورنمنٹ کے ماتحت ایک تسلیم شدہ حقیقت ہوگی (۴) (الف) مرکزی فیڈرل حکومت کے تحت صوبوں کو جو آزادی حاصل ہوگی اس میں اقلیتوں کو دس فیصدی تعلیمی، تہذیبی، تمدنی اور اقتصادی حقوق دیئے جائیں گے۔ (ب) اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کے مذہبی قوانین ۳۰ فیصدی ووٹوں کے بغیر طے نہیں کئے جائیں گے اور مُسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور تہذیبی آزادی کو تسلیم کیا جائے گا اور اس میں صوبائی حکومتوں کی طرف سے کوئی دخل نہیں دیا جائے گا۔ (ج) مرکزی فیڈرل گورنمنٹ میں جو سپریم کورٹ بنایا جائے گا اس میں ہندو مسلم عیسائی برابر کے جج شریک ہوں گے۔ (د) ہندوستان کے مسلم اوقاف میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے گی اور مسلمانوں کو اپنے ٹرسٹ قائم کرنے کی کھلی آزادی ہوگی۔ (ہ) ہندوستان کی مرکزی فوج میں مسلمان اور دوسری اقلیتوں کے افراد بلا کسی تعصب کے برابر کے بھرتی کئے جائیں گے۔ (و) ہندوستان کے پس ماندہ اور اقتصادی لحاظ سے کمزور صوبوں کی فیڈرل گورنمنٹ بھرپور مدد کرے گی اور صوبوں میں امتیاز قائم نہ کیا جائے گا۔ (ز) اکثریتی صوبوں میں مُسلمانوں کی اسمبلی اور دوسرے نمائندہ اداروں میں ایک ایسی تعداد منتخب ہونے کے لئے منظور کی جائے گی جس پر اقلیت کا اعتماد قائم رہ سکے۔ اکثریتی صوبوں میں مُسلمانوں کو کم سے کم تیس فی صد ویٹیج دیا جائے گا۔ (ح) ہندوستان کی مرکزی حکومت اقلیتوں کی مذہبی، تہذیبی، تمدنی، روحانی، اقتصادی روایات میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی، بلکہ اقلیتیں اس بارے میں جو فیصلہ کریں گی انہیں مرکزی فیڈرل گورنمنٹ کو منظور کرنا ہوگا۔ (ط) ہندوستان کی اسلامی زندگی اور مسلم پرسنل لا جو کہ مسلمانوں کے بنیادی مذہبی حق میں اور ان کے بغیر مُسلمانوں کی بنیادی حقیقتیں ختم ہو جاتی ہیں اس لئے مسلم پرسنل لا میں مرکزی فیڈرل گورنمنٹ مداخلت نہ کرے گی اور نہ ہی صوبے اس میں مداخلت کریں گے۔ (ی) مذہبی مقدمات مسلمان ججوں کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔

یہ وہ زندگی ہے جو رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن سے لے کر مولانا شاہ عبد القادر تک تاریخ کے سنہری حروف ہیں۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن دس سال تک احرار کے صدر رہے۔ ۱۹۱۹ء سے ۵ جولائی ۱۹۴۵ء تک چھ دفعہ جیلوں میں گئے اور نظر بند رہے۔ مولانا کل مدت اسیری اور نظر بندی ۱۳ سال چھ ماہ ہے۔ مولانا کی زیر صدارت مُسلمانوں کے لئے جن حقوق کا مطالبہ کیا گیا ہے ان حقوق کا اور ان کی زندگی کا ڈاکٹر تاراچند کی تحریر کردہ یادداشتوں سے بامحاورہ ترجمہ کیا گیا۔ ڈاکٹر تاراچند کی تحریری گونمنٹ کی مُستند کتاب ہسٹری آف دی فریڈیم مومنٹ ان انڈیا بائی تاراچند میں صفحہ ۲۸۲، ۲۸۳ پر تحریر ہیں۔

مُسلم لیگ کے نظریہ پاکستان کے برخلاف مجلس احرار اسلام ہند نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں جو قربانیاں دی ہیں، مصائب، مشکلات اور پریشانیاں اٹھائی ہیں، ان کی خدمات ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ کرتی ہے۔

رئیس الاحرار اور ان کی جماعت مجلس احرار کا ہندوستان کی آزادی اور ہندوستانی اقوام کے بارے میں یہ پختہ خیال تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و تمدن کا ساتھ دیں۔ ہندوستان جو کہ رنگا رنگ تہذیبوں کا مرکز ہے اس میں مُسلمانوں کی تہذیب و تمدن، تعلیم و سیاست، مذہب اور خاص قسم کی انفرادیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے اسی مکتب خیال کے مطابق مجلس

احرار نے ہندوستان کی آزادی میں ہمیشہ حصہ لیا اور قربانیاں دیں۔۔۔(ڈاکٹر تاراچند مصنف ہسٹری فریڈیم مونٹ آف انڈیا)۔

خود پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا کے بارے میں یہ اعتراف فرمایا ہے کہ جس پر میں اس تاثر کا اختتام کرتا ہوں۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے میں بہت برسوں سے واقف ہوں۔ جدوجہد آزادی کے دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

مولانا موصوف جس عقیدہ میں یقین رکھتے تھے اور جس جرأت اور آہنی استقامت کے ساتھ وہ اس پر قائم رہے اس کے سبب میں ہمیشہ ان کا مداح رہا اور ان کا احترام کرتا رہا۔ آزادی سے قبل اور اس کے بعد بھی انہوں نے بہت سی تکالیف اٹھائیں۔ حتیٰ کہ آزادی کے فوراً بعد ہی پاکستان اور شمالی ہندو میں جو المیہ رونما ہوا اور جس کی لپیٹ میں وہ شدید طور پر آئے مگر اس سے ان میں تلخی نہیں آئی اور انہوں نے ہمّت نہ ہاری۔۔۔وہ اپنے شہر لدھیانہ میں ہندو مُسلمان اور سکھ سب کے ہی محترم رہے۔

ان کے انتقال سے مجھے گہرا صدمہ ہوا۔۔۔وہ ایک جواں مرد سپاہی کی حیثیت سے ہماری آزادی کی تحریک میں یاد کئے جانے کے قابل ہیں۔

جواہر لال نہرو

عابد اللہ غازی ایم۔اے، پی، ایچ، ڈی ہاورڈ یونی ورسٹی امریکہ

۲۲/ اگست ۱۹۷۵ء

حال مقیم ۵۲۹۶۔ کوچہ رحمان چاندنی چوک۔ دہلی نمبر ۱۱۰۰۰۶



حَبیب

اچھا ہوا کہ آپ بھی ہم سے بچھڑ گئے

اچھا ہوا کہ آپ بھی ہم سے بچھڑ گئے
ورنہ اُمید و یاس کا قصہ دراز تھا
تھے لوگ بے حسی کے سمندر میں غوطہ زن
اور اس پہ یہ ستم کہ خدا بے نیاز تھا
تیرے دل و دماغ تھے قدرت کا معجزہ
سینہ ترا مدینۂ سوز و گداز تھا
ہر مرحلہ میں جبر و تشدد کا سامنا
ہر معرکہ میں فضلِ خدا کارساز تھا
القصہ ایک عہدِ صحابہ کی یادگار
جس کا وجود نغمہ طرازِ حجاز تھا
شورش وہ آج عازم فردوس ہوگیا
داردرسن کے خوف سے جو بے نیاز تھا

اے وائے! داستانِ وفا ختم ہوگئی
صَرصَر کی چوٹ کھا کے صبا ختم ہو گئی

جو کچھ ہوا درست ہوا، خوب تر ہوا
نوکِ قلم پہ آہ و فغاں آگئی تو کیا؟
برہم رہا ہے نقشۂ عالم اسی طرح
آندھی اُفق سے تابہ اُفق چھا گئی تو کیا
نالہ بلب ہیں نغمہ سرایانِ فصل گل
بوئے چمن کو باد خزاں کھا گئی تو کیا
وہ لوگ جو قفس میں رہے ہیں تمام عمر
ان کے چمن میں برق، ستم ڈھا گئی تو کیا
جن کا وجود برق جہاں تاب کا جواب
اک مرگِ ناگہاں انہیں تڑپا گئی تو کیا
کوثر پہ آملیں گے حریفان بادہ نوش
اے مرگ، شکریہ ترا، تو آگئی تو کیا

"لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے"

دِل انقلابِ حال سے نالاں ہے دوستو!
شیرازۂ حیات پریشاں ہے دوستو
ناساز گار آب و ہوا ہے کہاں چلیں
صَر صَر کی زَد میں نظم گلستان ہے دوستو
جو کچھ سلوک ہم سے چمن میں کیا گیا
تاریخ اُس پہ ششدر رو حیراں ہے دوستو
اپنے لہو سے لالہ و گل کو نکھار دو
یہ بھی علاج گردش دوراں ہے دوستو
کچھ دوستوں کے غم ہیں تو کچھ ساتھیوں کی یاد
ان پر مدار دیدہ گریاں ہے دوستو
آخر کہاں چلا گیا سالار کارواں؟
کس سے کہیں کہ حشر کا ساماں ہے دوستو
اک زد پڑی ہے زندگی مستعار پر
اور سچ کہوں تو موت کا احساں ہے دوستو

چکمہ دیا اجل نے غریب الدیار کو
لوٹا ہے فصلِ گل میں خزاں نے بہار کو

شورش کاشمیری مرحوم

سید الاحرار

ایک مردِ باخدا جرنیل ہمّت کا دھنی
قوم کی خدمت میں گزری جس کی ساری زندگی

ہند کا باسی تھا وہ پنجاب کا لختِ جگر
دشمنوں کے ہوش گم ہوتے تھے جس کو دیکھ کر

رعب جس کے چہرہ پر نور کی ادنیٰ صفت
جس نے پائی قوم کی خدمت کے بدلے میں رفعت

قوم کی خدمت گزاری شغل تھا جس کا مدام
جنگِ آزادی میں گزری جس کی صبح جس کی شام

سرزمینِ ہند پر چمکا جو بن کر آفتاب
جس نے پایا ہر قدم پر حق پسندی کا خطاب

ملک و ملّت کے فدائی تھے حبیب خوش بیاں
یاد رکھے گا ہمیشہ جن کو اپنا گلستاں

شہر لدھیانہ کو جس کی برتری پر ناز ہے
آج بھی گونجی ہوئی اس شیر کی آواز ہے

جس کی عزت قوم کے باپو سدا کرتے رہے
جس کا دم پیارے جواہر لال بھی بھرتے رہے

لیڈرانِ قوم ہوں لدھیانوی جیسے اگر
شام کی تاریکیاں بن جائی گی نورِ سحر

التجا حق جس کو چمکائے چمکتا ہے وہی
اپنی منزل کی طرف بے خوف بڑھتا ہے وہی

التجا امروہوی دہلی
یکم ستمبر ۱۹۷۵ء

بسلسلہ تاریخ جنگِ آزادی کے مُسلم مجاھدین۔ حصہ چہارم

رئیس الاحرار

درحدیثِ دیگراں

خوش تر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید درحدیثِ دیگراں

مرتب

عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ثم دہلوی ۵۲۹۶ کوچہ رحمان۔

بابُ دوم

۲۵ر جنوری ۱۹۷۵ء

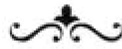
"ایسی چنگاری بھی یارَب اپنے خاکستر میں تھی"

جن کے خطوط والد صاحب کے نام ہیں

نمبر وار تاریخ کے مطابق ہیں

نمبر شمار		خط نمبر	
1	ڈاکٹر راندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند کا خط	ا	1961ء
2	ڈاکٹر ذاکر حسین کا خط	ب	1968ء
3	اختر عزیز صاحب سابق ناظم ریاست بھوپال وزیر مالیات عزیز الرحمٰن جامعی کا خط	ج	1966ء
1	مولانا ابوالکلام آزاد	۱	1939ء سے 1947ء
2	سید انور شاہ صاحب	۲	1928ء
3	مفتی کفایت اللہ کے نام خط	۳	1931ء
4	ڈاکٹر انصاری مرحوم	۴	1931ء
5	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۵	1934ء
6	حبیب، پنڈت خط وکتابت	۶	1936ء
7	چودھری شیر جنگ	۷	1930ء
8	گاندھی حبیب خط وکتابت	۸	1945ء
9	لارڈ کرپس	۹	1945ء
10	حضرت مدنی کا خاص خط اور اس کا جواب	۱۰	1954ء
11	حبیب، شبیر خط وکتابت	۱۱	1940ء سے 1945ء
12A	حبیب، احمد سعید خط وکتابت	12A	1936ء سے 1938ء
12B	نہرو رپورٹ اور خلافت کمیٹی کی خط وکتابت	12B	1928ء
14	ملک برکت علی سکریٹری مسلم لیگ	14	1934ء
15	مولانا محمد احمد کاظمی ایم، پی	15	1956ء
16	خطوط مولانا حفظ الرحمٰن	16	1952ء سے 1954ء
17	مولانا داؤد غزنوی کے خطوط	17	1941ء
18	خواجہ محمد یوسف صاحب کا خط	18	1947ء
19	ڈاکٹر سید محمود کا خط	19	1946ء
20	صوفی اللہ داد خاں کا خط	20	1948ء

21 مولانا مدنی کے خطوط	21	1938ء
22 عبدالمجید قریشی کا خط	22	1939ء
23 خط و کتابت کا سلسلہ افغانستان	23	1933ء
24 سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام خط	24	1947ء
25 مسٹر سچر وزیر اعظم پنجاب کے خط	25	1946ء سے 1954ء
26 قصہ کشمیر از قلم مولانا حبیب الرحمٰن	26	1955ء
27 خان لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کے نام خط	27	1950ء
28 مولانا حبیب الرحمٰن کے متعلق مجلس احرار ہند کے دو سرکلر	28	1947ء



راشٹر پتی بھون

۱، فروری ۱۹۶۱ء

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا شمار ہمارے نامی سماجی اور سیاسی کارکنوں میں ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں کئی موقعوں پر میری ان سے ملاقات بھی ہوئی۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ ان کے فرزند مولانا عزیز الرحمٰن نے اپنے والد محترم کی سوانح عمری لکھی ہے۔ جو اس وقت زیر طبع ہے۔ مجھے امید ہے کہ مولانا صاحب کی زندگی کے مفصل حالات عام پبلک کے لئے سبق آموز ہوں گے اور اس کتاب کو مقبولیت ملے گی۔ راجندر پرشاد (یہ خط و کتابت رئیس الاحرار کے بارے میں ہے جو یکم فروری ۱۹۶۱ء کو ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ نے لکھا اور کتاب رئیس الاحرار میں شائع ہوا)

عزیزم عزیز صاحب۔ السلام علیکم

تین ہفتہ سے اوپر ہوگئے کہ آپ کی کتاب "رئیس الاحرار" ملی تھی۔ سوچا کہ پڑھ لوں تو رسید اور شکریہ بھیجوں۔ پڑھنے کا موقع ملنے سے پہلے ایک سفر پیش آگیا۔ اب پڑھ پایا ہوں۔ آپ نے بیٹا ہونے کا حق ہی ادا نہیں کیا بلکہ آزادی ہند کے ایک ممتاز مجاہد اور حیات ملی کے ایک اہم معمار کی زندگی پیش کر کے ایک قومی فریضہ بھی پورا کیا ہے۔ مبارک ہو۔ جو چیزیں آپ نے اس سلسلہ میں یک جا کر دی ہیں ان سے تحریک قومی کے مورخ کو بڑی مدد ملے گی۔ اس سلسلہ میں آپ نے مجھے یاد فرمایا اور کتاب کا ایک نسخہ مجھے بھیجا اس کے لئے دل سے شکر گزار ہوں خدا آپ کی عمر میں برکت دے اور آپ کے نیک ارادوں کو کامیاب فرمائے۔ خیر طلب

۹، مئی ۶۸ء ذاکر حسین گورنر بہار

(صدر جمہوریہ ہند)

۷۸۶۔ گلی ناظم صاحب۔ اندرون بدھوارہ۔ بھوپال

عزیز محترم! السلام علیکم۔ مزاج شریف؟

آپ کو شاید رنج اور ملال ہوگا کہ میں آپ کے مرسلہ بیش بہا اور روح افزا تحفہ 'رئیس الاحرار' کو دبا کر خاموش بیٹھ گیا ہوں اور اپنی قلم سے شکریہ اور تعریف کے دو لفظ لکھے جانے کی توفیق بھی مجھے نہ ہوئی۔ اگرچہ اپنی اس کوتاہی کے متعلق میرا کوئی عذر 'عذر گناہ بدتر از گناہ' تصور کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی مجھ امید ہے کہ میرے اس عذر کو آپ ضرور درست تسلیم کرلیں گے۔ کہ میری یہ کوتاہی صرف اس لئے دانستہ عمل میں آئی ہے کہ میں رئیس الاحرار کو 'الف سے ے' تک پڑھ لینے سے قبل آپ کی اس بے پایاں عنایت کا محض رسمی شکریہ ادا کر دینا بالکل بے معنی اور غیر ضروری سمجھتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ گزشتہ تین دنوں میں 'رئیس الاحرار' کے 'الف سے ے' تک مطالعہ سے پورے طور پر مستفید اور مستفیض ہو چکا ہوں۔ اور اس کے بعض بصیرت افروز حصوں کو تو مکرر اور سہ کرر پڑھنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ رئیس الاحرار کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادی کے انتقال پر ملال اور خود رئیس الاحرار کی دائمی مفارقت کے حسرت ناک حالات پڑھ کر بے اختیار آنسو بھی بہا چکا ہوں۔

آپ نے 'رئیس الاحرار' کی ترتیب وتنظیم میں جس محنت اور کوشش وکاوش سے کام لیا ہے اس کی الفاظ میں داد دینا ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کی جزآئے خیر آپ کو دے گا۔ آپ کا یہ کارنامہ ہندوستان وپاکستان کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے، خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔ گذشتہ سوا دوصدی کے حالات ماضی کو ہی محفوظ نہیں کرے گا، بلکہ ہر آنے والے مستقبل کے لئے بھی شمع ہدایت کا کام کرے گا۔ آپ کے اس احسان عظیم کے بارے حق شناس لوگ کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتے۔ مجھے یہ کہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ آپ کی رئیس الاحرار، مولانا آزاد ﷫ کی انڈیا ونس فریڈم کے درجہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ؎

ایں سعادت بہ زور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

ہندوستان میں آئندہ اردو رسم الخط کے انجام کے پیش نظر میری ناچیز رائے تو یہ ہے کہ "رئیس الاحرار" کو اگر دیوناگری رسم الخط مُں بھی شائع کرا دیا جائے تو آنے والی صرف ہندو ہی نہیں بلکہ مُسلمان نسلوں کو بھی اس کے مطالعہ سے بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اردو رسم الخط کی طرف سے مایوسی میرے دل میں ان مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کو جو اس وقت اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں، دیکھ پر پیدا ہوئی ہے۔ باوجود اردو بطور اختیاری مضمون پڑھنے کے بھی وہ ناگری رسم الخط میں ہر چیز لکھنا اور ناگری رسم الخط کے رسائل واخبارات پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اردو اِملا کی ایک سطر بھی صحیح نہیں لکھ سکتے اور نہ روانی سے اردو کا کوئی رسالہ یا کتاب پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ اس پر ہمیں افسوس بھی نہ کرنا چاہیئے۔ جب ہر مضمون کا ذریعہ تعلیم لازماً ہندی اور دیوناگری رسم الخط کی کتابیں ہوں گی۔ نیز حصول معاش کے تمام ذرائع کا انحصار دیوناگری رسم الخط پر ہوگا تو مُسلمان والدین سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنے بچوں پر اردو جیسے مشکل رسم الخط کا بھی بار ڈالتے رہیں، کہاں تک مناسب ہوسکتا ہے۔ مسلمان گھرانوں کی آئندہ آنے والی نسل کو تو شاید اردو خط پڑھوانے کے لئے بھی کسی بڑے بوڑھے کی تلاش میں سرگرداں رہنا پڑے گا۔ اردو اسلامی زبان تو ہے نہیں۔ بنگال، جنوبی ہند وغیرہ صوبوں میں بھی تو کثیر تعداد ایسے مسلمان دینداروں کی موجود ہے جو نہ اردو لکھ سکتی نہ پڑھ سکتی ہے۔ بلاد اسلامیہ ترکی، مصر، شام، عراق، انڈونیشیا، سعودی عرب وغیرہ میں کون اردو لکھ پڑھ سکتا ہے۔ وہاں کی تو عام بول چال کی زبان بھی اردو نہیں ہے۔ ہندوستان میں تو خدا کا شکر ہے کہ جس زبان کو قومی اور سرکاری درجہ دیا جارہا ہے۔ وہ اسی ۸۰، پچاسی ۸۵ فیصدی اردو سے ملتی جلتی ہے۔ سوال رسم الخط کا رہ جاتا ہے۔ اس کے بارے میں مولانا رئیس الاحرار کا مشورہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اکثریت کا منشاء ناگری رسم الخط کو ہی تمام ہندوستان میں رائج کرنا ہے تو مُسلمانوں کو اس بارے میں یہاں کوئی جھگڑا مول نہ لینا چاہیئے۔ اور تمام قسم کا اسلامی لٹریچر عُلماء اور صوفیا کا اور خصوصاً سیرت رسول اللہ ﷺ ہندی رسم الخط میں منتقل کر دینا چاہیئے۔ تاکہ اسلام کی سچی تعلیم برادرانِ وطن کے سامنے بخوبی آجائے اور مسلم لیگ کے زہریلے پراپگنڈا نے ان کے دماغوں میں جو مستقل بدظنی پیدا کر رکھی ہے۔ جلد زائل ہو جائے" (رئیس الاحرار صفحہ ۳۵۱) بھیٔ معاف کرنا۔ میں کہاں سے کہاں بھٹک گیا ہوں۔ ہاں تو اگر پوری کتاب 'رئیس الاحرار' کی منتقلی دیوناگری رسم الخط میں نہ ہوسکے تو کم از کم مولانا رئیس الاحرار کی سیاسی زندگی از ابتدا تا انتہا کے تمام ابواب۔ سیاسی تقاریر وخطبات اور لیڈران ہند وپاک سے مراسلت اور بحث مباحثوں پر مشتمل کل مضامین ہندی میں منتقل ہونے چاہئیں۔ اور میں تو یہ بھی چاہوں گا کہ انگریزی میں بھی 'رئیس الاحرار' کا ترجمہ ہو جائے۔ تاکہ مولانا رئیس الاحرار کی حب الوطنی۔ صبر وتحمل، استقلال اور استقامت، حق کی راہ میں بے خوفی اور بے باکی، قید وبند کی صعوبتوں۔ مال واسباب کی تباہیوں، بربادیوں خانہ ویرانیوں اور سب سے زیادہ ملک وقوم کی آزادی کے لئے وفادارانہ اور جاں نثارانہ مسلسل جد وجہد کی صحیح تصویر ان تینوں زبانوں میں سے کسی ایک زبان بھی جاننے والے ہر فرد کے سامنے آکر ہر شخص کے دل ودماغ کو گرما اور تڑپا سکے اور اس مشعل آزادی کی روشنی میں جس کو اس بطل حریت نے اپنا سب کچھ نچھاور کر کے روشن کیا ہے۔ ہر مذہب وملت کے لوگ اپنے پیارے وطن کی آزادی کے راستہ پر مل جل کر قدم بڑھاتے چلے جائیں۔

اب کچھ اپنی محرومیٔ قسمت کی نسبت

آپ نے اپنی وسعت نظری اور وسیع الاخلاقی سے کام لے کر مجھے اپنے والد مرحوم کے "نہایت عزیز دوست اور ساتھی" کے قابل رشک اعزاز سے معزز و مفتخر فرمایا ہے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ "چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

اگست ۱۹۱۶ء میں جب لدھیانہ کو میں نے مستقل طور پر خیرباد کہا ہے (۱۹۱۶ء کے بعد میں صرف ایک مرتبہ لدھیانہ ۱۹۲۰ء میں چار چھ دن کے لئے گیا ہوں۔ اور یہ چار چھ دن بھی میں نے بستر علالت پر گزارے تھے اور سوائے گھر والوں کے کسی کو نہ تو میرے لدھیانہ پہنچنے کی اطلاع ہوئی تھی اور نہ میں خود کسی سے مل سکا تھا) اس وقت تک تو آپ عالم وجود میں بھی نہیں آئے ہوں گے۔ کیونکہ میں نے آپ کا سن پیدائش ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء اخذ کیا ہے۔ اس ۱۹۱۶ء سے ۱۹۵۶ء (سنّ وصال رئیس الاحرار) تک کے درمیانی چالیس سال کے طویل عرصے میں میری محرومیٔ قسمت یہ رہی کہ میں نہ تو مولانا مرحوم کی زیارت پُر سعادت کا شرف حاصل کر سکا اور نہ خط و کتابت یا کسی اور ذریعے سے اپنے حالات یہاں تک کہ اپنے پتہ اور قیام کی بھی اطلاع مولانا مرحوم کے سمع مبارک تک پہنچا سکا، اور نہ مولانا مرحوم کی سیاسی یا نجی زندگی کے ان شاندار تفصیلی کارناموں سے جن کا انکشاف اب 'رئیس الاحرار' کے مطالعہ کے بعد مجھ پر ہوا ہے مطلع و آگاہ ہو سکا۔ کوئی اردو اخبار الجمعیۃ، وغیرہ بھی میرے پاس نہیں آتا تھا۔ البتہ انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا میں گاہے گاہے مولانا کا نام نامی کسی خبر کے سلسلہ میں پڑھ کر مولانا کی یاد تازہ کر لیا کرتا تھا۔

والد صاحب مرحوم کے پنشن پر ریٹائر ہو جانے کے بعد ۱۹۰۸ء میں ہم لوگوں نے لدھیانہ کی مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ اس وقت میری عمر ۱۵ سال کی ہوگی۔ میں آٹھویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ آٹھواں اور نواں درجہ میں نے مشن ہائی اسکول اور خالصہ ہائی اسکول لدھیانہ سے پاس کیا۔ میٹرک ۱۹۱۱ء میں ایم۔ اے، او ہائی اسکول امرت سر سے پاس کیا اور بی، اے ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے۔ مولانا غلام رسول مہر چار سال تک میرے روم فیلو اور کالج فیلو رہے۔ ۱۹۱۵ء میں لدھیانہ واپس ہو کر ایک سال کے لئے اسلامیہ اسکول لدھیانہ کا ہیڈ ماسٹر ہو گیا اور ۱۹۱۶ء میں بھوپال آجانے پر میری لدھیانہ کی سکونت اور قیام کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس طرح لدھیانہ کے قیام کے آٹھ سال میں سے بھی امرت سر اور لاہور کے قیام کی ۵ سالہ مدت کو نکال کر میرا مستقل قیام لدھیانہ میں صرف تین سال رہا۔ ابتدائی دو سال تو ۱۵ اور ۱۶ سال کی عمر کے اور آخری ایک سال ۲۲ برس کی عمر کا۔ مولانا مرحوم سے کب اور کس ذریعے سے ملاقات ہوئی۔ یہ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ صرف مولانا مرحوم ہی نہیں، بلکہ آپ کے دادا مولانا محمد زکریا علیہ الرحمہ اور آپ کے دادا کے برادران مولانا مفتی محمد نعیم صاحب اور مولانا مفتی محمد رمضان صاحب بھی مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے رہے ہیں۔ مفتی محمد نعیم صاحب یا مفتی محمد رمضان صاحب مجھے یاد پڑتا ہے کہ خالصہ ہائی اسکول کے نویں درجے میں میرے اردو۔ فارسی کے استاد بھی رہے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم سے میرے اتنے عارضی اور رواداری کے ایسے واقعات کے باوجود جن کی آپ کی پوری عمر میں تجدید بھی کبھی نہیں ہوئی آپ نے مولانا مرحوم کے "نہایت عزیز دوست اور ساتھی" کے گراں قدر خطاب سے مجھے کیوں اور کس بناء پر نوازا؟

اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ مولانا اپنی زندگی میں صرف آسمان سیاست کا ستارہ بن کر ہی نہیں چمکے، بلکہ رموزِ باطنی اور انوار روحانی سے بھی ان کا دل منور رہا۔ اس کا ثبوت وہ پر خلوص شفقت نامہ تھا جس سے مرحوم نے اپنے وصال سے کچھ عرصہ قبل مجھ ایسی ناچیز گمنام، دور افتادہ اور چالیس سال سے لاپتہ ہستی کو نوازا تھا۔ دوسرا ثبوت جنرل الیکشن کے سلسلے میں بھوپال آنے پر آپ کا خاص کوشش سے میرا سراغ اور پتہ لگا کر مجھ سے ملنا تھا۔ تیسرا بین ثبوت یہی ہے کہ آپ نے مجھے مولانا مرحوم کے "نہایت عزیز دوست اور ساتھی" کے زمرہ میں داخل کر دیا ہے۔ اور وہ چیز مجھے عطیہ کر دی ہے جو میری بقیہ زندگی میں ہر وقت میرے زیر مطالعہ رہ کر مولانا مرحوم کی یاد میرے دل میں تازہ کرتی رہے گی۔ مولانا مرحوم کے مجھ ایسی حقیر ہستی کے ساتھ اس باطنی اور روحانی تعلق پر میں جس قدر بھی فخر اور ناز کروں وہ کم ہے۔ کاش کہ مولانا مرحوم کے اول و آخر شفقت نامہ کے موصول ہونے پر میں کشاں کشاں مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر ایسی

بزرگ اور شفیق ہستی کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرلیتا۔ میری کور باطنی کا یہ نتیجہ تھا، کہ میں نے شفقت نامہ کے جواب میں خود مولانا کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے بھوپال کو عزت بخشنے کی دعوت دے دی۔ اپنی اس بدنصیبی پر میں اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک پشیمان رہوں گا۔ مولانا ملک وقوم کی خدمت بجالاتے ہوئے شہید ہوئے ہیں اور چوں کہ شہید تاابد زندہ رہتے ہیں، اس لئے آپ جب مزار مبارک پر حاضر ہوں تو مولانا کے حضور میں میرا عاجزانہ سلام اور دعاء خیر کی درخواست پیش کر دیجئے گا۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگرچہ میں نے کبھی پبلک پلیٹ فارم پر تقریر یا اخبارات میں تحریری بیانات کے ذریعے کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن میرے اور مولانا کے سیاسی خیالات اور عقائد میں جو مجھ 'رئیس الاحرار' کے مطالعہ سے واضح ہیں ایک نقطہ کا بھی فرق نظر نہیں آتا۔ نوابی دور کے مُسلم لیگی ماحول میں اپنے ان ہی سیاسی عقائد اور تقسیم ہند کی مخالفت کی بنا پر کچھ تھوڑا سا خمیازہ مجھے بھی بھگتنا پڑا ہے۔ یعنی یہ کہ میری عمر کے لحاظ سے اڑھائی سال قبل مجھے ۱۹۴۶ء میں پنشن پر ریٹائر ہونا پڑا۔ حالاں کہ میرے حسن کارگزاری کے صلے میں مجھے دوبار 'بہادر' اور 'ناظم' الانشا" کے خطابات بھی مل چکے تھے۔ اور نظامت یعنی کلکٹری سے ریونیو سکریٹری کے عہدہ پر ترقی بھی دی جاچکی تھی سی اسٹیٹ بننے پر کانگریس منسٹری نے بلا میری درخواست اور تکمیل عہد نامہ کے میرے اس نقصان کی تلافی ۱۵ئ کے الیکشن میں مجھے کانگریس کا ٹکٹ دے کر کرنی چاہی تھی لیکن اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کے پیش نظر میں نے ہائی کمانڈ کی منظوری ہو جانے کے بعد بھی الیکشن میں کھڑے ہونے سے انکار کر دیا اور میرے انکار کے بعد مُسلمانوں میں طرزی مشرقی صاحب کو یہ موقع دیا گیا۔

آپ سے اور مولانا مرحوم سے باوجود اتنی دوری اور اجنبیت کے میری اتنی قربت کا باعث غالباً سیاسی عقائد کی ہم آہنگی اور یکسانیت ہی ہے جس سے باطنی اور روحانی طور پر مولانا مرحوم مطلع رہے ہوں گے۔ آپ کا 'رئیس الاحرار' کا اس خلوص اور مُحبّت کے ساتھ مجھے بھیجنا۔ اور میرا یہ عریضہ سب مولانا مرحوم کے باطنی اور روحانی فیوض اور تصرفات کے کرشمے سمجھنے چاہئیں۔ 'رئیس الاحرار' کے مطالعہ نے کچھ فراموش شدہ ہستیوں کی بھی جن سے پچاس سال پہلے دوستی، شناسائی یا معمولی واقفیت رہ چکی ہے یاد تازہ کر دی۔ مثلاً غلام رسول مہر، مولانا ظفر علی خاں، سر فضل حسین، میاں مُحمد شفیع، میاں مُحمد عبدالحیٔ، مولانا مظہر علی اظہر، ڈاکٹر اقبال، خواجہ احد شاہ، مولانا مُحمد زکریا صاحب، مولانا مُفتی مُحمد نعیم صاحب۔ مولانا مُحمد رمضان صاحب وغیرہ وغیرہ۔

میں بھی اب چراغ سحری ہوں، عمر کی ۷۲ منزلیں طے کر چکا ہوں۔ آپ کے قبلہ والد صاحب مرحوم کا سنِ پیدائش ۱۸۹۲ء معلوم ہوا اور میرا سن ولادت ۱۸۹۳ء ہے لیکن میں نے بمصداق "بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال" مولانا مرحوم کو بھی اپنا بزرگ سمجھا۔ اور آپ کو بھی اپنا بزرگ ہی سمجھتا ہوں اگرچہ عمر میں آپ مجھ سے ۲۵ سال چھوٹے ہوں گے۔ اپنا ۹، جولائی ۶۵ء کا فوٹو پیش کر رہا ہوں تا کہ اگر کبھی حکیم علی کوثر صاحب مجھے گھسیٹ کر دہلی لے جائیں تو آپ کو مجھے پہچاننے میں دقت پیش نہ آئے۔ حکیم صاحب سے ملاقات ہو تو میرا سلام عرض کر دیا جائے۔ وہ بہت عدیم الفرصت ہیں اسی لئے میں نے ان کے آخری عنایت نامہ کا جواب بھی نہیں دیا۔ بہت سمع خراشی کر چکا ہوں۔ اب اجازت دیجئے۔

از دہلی ۲۷، اکتوبر ۱۹۵۶ء

محترمی مکرمی قبلہ اختر عزیز صاحب مدظلہ'! سلام مسنون

آپ نے جس تعلق خاطر، مُحبّت اور شفقت کا اپنے خط میں اظہار فرمایا ہے وہ میری توقعات کے عین مطابق ہے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ قبلہ والد صاحب نے آپ کا پتہ کہاں سے معلوم کیا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ آپ کا جواب آنے پر مسلسل کئی روز تک آپ کا ذکر فرماتے رہے، جو جملہ میں نے کتاب پر لکھا ہے وہ دراصل قبلہ والد صاحب کا ارشاد فرمایا ہوا تھا۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ قبلہ والد صاحب کا آپ سے روحانی اور مُخلصانہ ذہنی تعلق رہا ہے۔ مجھے انہوں نے اپنی زندگی میں ہدایت فرمائی تھی کہ اگر تم کبھی بھوپال جاؤ تو اختر عزیز صاحب سے ضرور ملنا۔ اسی بنا پر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے 'رئیس الاحرار' کا انگریزی ترجمہ کرالیا اور میں اب اس کوشش میں ہوں کہ کتاب کو ہندی رسم الخط میں تبدیل کراؤں۔ لیکن اس سلسلہ میں ابھی تک کوئی موزوں آدمی نہیں ملا جس پر میں ترجمہ کے بارے میں اعتماد کر سکوں۔ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جو آج سے ۲۵ سال قبل میرے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک انگریزی خط میں مجھے تحریر فرمایا ہے کہ انگریزی ترجمہ فوراً شائع ہو جائے تو بہت ہی اچھا ہے۔ اس خط کے بعد میں نے ہمایوں کبیر صاحب سے خط و کتابت کی تاکہ اگر اوقاف سے مدد مل جائے تو انگریزی کی کتاب شائع کرا سکوں لیکن محکمہ اوقاف نے باوجود کبیر صاحب کے توجہ دلانے کے کوئی امداد نہیں کی۔ مالی اعتبار سے میں خود اتنا صاحب حَیثیت نہیں ہوں کہ میں یہ بوجھ برداشت کر سکوں۔ آپ نے اپنے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اس زمانہ کے باشعور اور عالم نوجوانوں کا نقطہ نظر اور نقطہ نگاہ تقریباً ایک ہی تھا۔ مُسلمانوں کے علمی طبقوں میں ہم خیالی قدرِ مشترک تھی۔ کوئی بھی علم دوست آدمی خواہ کہیں بھی تھا وہ ملک کی بہبودی اور حیات ملی کے بارے میں اپنی فہم و فراست کے مطابق ایک ہی رائے رکھتا تھا جو لاریب تھی۔ مگر اس کے بعد ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۵ء تک ہندوستان کے اہل الرائے مسلمان مشکوک اور جذباتی افکار میں مبتلا ہو گئے۔ آج جو کچھ بھی رونما ہو رہا ہے وہ اسی مشکوک فکر اور جذبات کا نتیجہ ہے۔ ؎

یہ داستاں دراز بھی ہے دل گداز بھی

جناب قبلہ کوثر صاحب کا دہلی آنا بہت مبارک ہوا کہ آپ سے تعلقات کی تجدید ہوگئی۔ اور آپ تک میں اپنی کتاب پہنچا سکا۔

ڈاکٹر ذاکر صاحب کے بعد آپ کا دوسرا خط ہے جسے میں نے اور میرے بچوں نے بار بار پڑھا اور ایسا محسوس ہوا کہ خود آپ ہی سے باتیں ہو رہی ہیں۔ آپ نے یہ بھی عنایت فرمائی کہ اپنی تصویر بھیجی اور اس بندہ حقیر و ناچیز کو اپنی نوازش ہائے کرم سے نوازا ہے۔ مجھے آپ کے دلّی آنے سے بے حد خوشی ہوگی۔ کوثر صاحب کی موجودگی میں، میں یہ گزارش تو نہیں کر سکتا کہ آپ میرے ہاں قیام فرمائیں لیکن میں یہ درخواست ضرور کروں گا کہ ایک دو یوم آپ میرے غریب خانہ پر قیام فرما کر خدمت کا موقع عنایت فرمائیں۔

آپ کی دعاؤں کا بے حد محتاج ہوں۔ میری اہلیہ اور بچے آپ کی خدمت میں سلام گزار ہیں۔

عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی ثم دہلوی

کلکتہ۔ ۱۹ مارچ ۱۹۳۹ء

جہی فی اللہ

خواستگار معافی ہوں کہ آپ کے خط کا بروقت جواب نہ بھیج سکا، وہی چوبیس گھنٹے جو ہر انسان کے حصے میں آئے ہیں، میرے حصے میں بھی آئے ہیں۔ مگر کام اس سے زیادہ ہے جو ان گھنٹوں میں انجام دیا جا سکتا ہے۔

مسٹر راج گوپال آچاریہ نے غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔ جس مقصد کی حمایت کا وہ دعویٰ کر رہے ہیں۔ اسی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا لیکن انہیں کسی نہ کسی طرح منسٹری کے عہدوں پر واپس جانا اتنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور کسی بات پر غور کرنا ضروری نہیں چاہتے۔ والسّلام علیکم

ابوالکلام

سری نگر۔ ۴ ستمبر ۱۹۴۵ء

آل انڈیا کانگریس کمیٹی۔ سوراج بھول الہ آباد

جیؔ فی اللہ

خیال تھا کہ لاہور میں آپ سے ملاقات ہوگی لیکن سر دست لاہور کا پروگرام منسوخ کر دینا پڑا۔ اب ستمبر کے آخر میں قصد کروں گا اور

انشاءاللہ ملاقات ہوگی۔ جو بات اب طے کرنی ہے وہ یہ ہے کہ مصالح کا مقتضا کیا ہے۔ آپ جمعیت احرار کو بدستور مستقلاً الگ رکھیں یا کانگریس میں شامل ہو جائیں میں نے ابھی تک کوئی آخری رائے قائم نہیں کی ہے۔ مشورہ و ملاقات کے بعد اسے طے کیا جاوے گا۔ اس وقت تک میں نے مصلحتاً یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو پنجاب کانگرس کے حلقہ میں شامل نہ کروں۔ چنانچہ ایک سب کمیٹی جو کہ کل انتخابات کی تیاریوں کے لئے بنائی جارہی ہے اس میں مولانا غزنوی وغیرہ کا نام شامل کر دیا ہے، آپ کا نہیں کیا۔ اسی خیال سے کہ پہلے آپ سے مشورہ ہو جائے، اس کے بعد حسب مصالح وقت آپ طریق کار اختیار کریں۔

ابوالکلام

کلکتہ۔ ۱۳/ نومبر ۱۹۴۵ء

جی فی اللہ

خط پہنچا کیا کریں، دل مانتا نہیں کہ آدمی بیماری کے مقابلہ میں ہار جائے۔ بہر حال اب ارادہ کیا ہے چند دنوں کے لئے بندھیا چل کے ایک غیر آباد مقام میں چلا جاؤں اور سکون خاطر کی کوشش کروں۔

انشاءاللہ بوقت فرصت میں آپ کو بعض امور کی نسبت لکھوں گا جو پیش نہاد خاطر ہیں اپنے والد بزرگوار اور تمام احباب و مخلصین کو سلام و دعائے خیر پہنچادیں۔

ابوالکلام آزاد

بندھیا چل ضلع مرزاپور ۲۰، نومبر ۱۹۴۵ء

آل انڈیا کانگریس کمیٹی سوراج بھون الہ آباد

جی فی اللہ

آپ کا خط مورخہ ۱۲، نومبر وصول ہوا۔ بندھیا چل مرزاپور کے قریب ایک قصبہ ہے، اور اسی ریلوے لائن پر واقع ہے۔ خط و کتابت کے لئے بندھیا چل (ضلع مرزاپور) پتہ کافی ہوگا جب تک میری واپسی کی خبر نہ ملے، کلکتہ کے پتے سے خط نہ بھیجئے۔ دو دن کی تاخیر ہو جاتی ہے۔

پنجاب کانگریس کی جو حالت آپ نے لکھی ہے وہ میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن بحالت موجودہ اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ نئی کمیٹیوں کے بننے کا انتظار کیا جائے۔

آپ کا ایک تار ملا تھا جس مین رجسٹرڈ خط کی ترسیل کے لئے لکھا گیا تھا۔ میں نے اس کے جواب میں کسی قدر تفصیل بذریعہ خط طلب کی تھی۔ اس کا جواب مجھے ابھی تک نہیں ملا۔ اس بارے میں تامل نہ کیجئے، جو صورت حال ہو بلا تامل لکھئے۔ حتی الوسع کوشش عمل میں آئے گی۔

آپ نے لالہ تلک رام کی نسبت جو کچھ لکھا ہے میں نے اسے الکشن فائل میں رکھوا دیا ہے۔ تاکہ بروقت غور کیا جاسکے لیکن میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ سر دست آپ کوئی وعدہ ان سے نہ کریں۔ نہیں معلوم ضلع کانگریس کمیٹی اس حلقہ سے کس کی سفارش کرتی ہے اور کانگریس کے نقطہ خیال سے اس کے حقوق کس درجہ کے ہوتے ہیں۔ سنٹرل اسمبلی کے لئے بعض امیدواروں کے انتخاب میں اس طرح کی کوئی کمزوری رونما ہو۔ ہمیں یقیناً قابلیت اور اہلیت بھی چاہیئے لیکن ساتھ ہی حتی الامکان ان لوگوں کو آگے رکھنا ہے جنہوں نے ملکی تحریک کی راہ میں قربانیاں کی ہیں۔ والسّلام علیکم

ابوالکلام

۲۳، نومبر ۱۹۴۵ء

حضرت امیر الہند حضرت مولانا صاحب

السّلام علیکم۔ آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ہر وقت آپ کی صحت کا خیال رہتا ہے کل پرسوں کے اخبار میں پھر پڑھا کہ آپ

کو بخار آرہا ہے۔ اس خبر کو پڑھ کر طبیعت میں بہت بے چینی ہے۔ اور یہ بھی پڑھا کہ آپ ابھی تک وہاں کانگریس کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ میں اب ایک دوماہ آرام کروں گا۔ خدا کے لئے آپ اس بد نصیب قوم پر رحم کیجئے اور دو ایک ماہ مکمل آرام کیجئے تا کہ آپ کی صحت بالکل درست ہو جائے۔ کانگریس کو پریذیڈنٹ مل جائیں گے مگر عالم اسلام کو ابوالکلام نہیں ملے گا۔ میں اور میرے گھر والے تمام آپ کی صحت کے لئے ہر وقت دعا گو ہیں۔ ہم سب آپ سے بھی دعا کے خواستگار ہیں۔

والسّلام
حبیب الرحمٰن
حبیب روڈ، لدھیانہ

حبیب روڈ۔ شفاعت منزل لدھیانہ۔ یکم اگست ۱۹۴۶ء
بخدمت گرامی شیخ الاسلام حضرت مولانا ابوالکلام آزاد صاحب دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کی کامیابی پر آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میرے متعلق کوئی خدمت ہو تو اس کے لئے میں تیار ہوں۔ آزاد خیال مُسلمان خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں ان کی عزتیں خطرے میں پڑ چکی ہیں اور اپنے قتل کے انتظار میں ہیں، اس کی زیادہ تر ذمہ داری پنجاب کی وزارت پر ہے۔ کانگرسی وزراء اول تو ہم سے ملنا ہی پسند نہیں کرتے، اگر ملتے ہیں تو پرانے وزراء کی طرح۔

پنجاب میں رشوت ستانی پہلے سے زیادہ ہے۔ محکمہ سول سپلائی اور محکمہ راشننگ میں تو رشوت خاص طور پر بڑھ گئی ہے۔ جن شہروں میں راشننگ کی ضرورت نہ تھی ان شہروں میں راشننگ جاری کر کے وزراء نے عوام کو اور زیادہ مشکلات میں ڈال دیا۔

مولانا عبدالرحمٰن میانوی پر جو ظلم ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ ان پر ایک جھوٹا فرضی کیس بنا کر چلایا گیا۔ لیکن کسی کانگریسی وزیر نے ان کی شنوائی نہ کی کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ آخر جب گواہ ہی انہیں پہنچان نہ سکے، تو پولیس کو جھک مار کر مقدمہ واپس لینا پڑا۔ لیکن وزارت اس سلسلہ میں کسی کام نہ آسکی۔

اسی طرح جالندھر شہر میں آج کل تین مسجدوں کے درمیان سینما ہال بننے کی اجازت دی گئی ہے۔ سچر صاحب اس محکمہ کے انچارج ہیں۔ چونکہ سینما بنانے والے ایسے لیگی مسلمان ہیں جو بعض کانگریسی ہندوؤں کے ذاتی دوست ہیں اس لئے سچر صاحب اس تعمیر کو روکنے کی جازت نہیں دیں گے۔ مسلمان سینما ہال مسجدوں کے پاس بننے کی وجہ سے لڑیں گے اور پنجاب کی کانگریس وزارت کو مسلمانوں پر گولی چلانے کا اچھا موقع ملے گا۔

ان واقعات کے متعلق کچھ تفصیل برخوردار عزیز الرحمٰن بھی آپ کی خدمت میں بیان کر دے گا عوام کانگریسی مُسلمان جو ۳۵ء کی کانگرس تحریک میں شام ہو کر تباہ و برباد ہو چکے ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ پنجاب میں ایسے لوگوں کی تعداد ایک ہزار سے اوپر ہے۔ آزاد خیال متوسط الحال مُسلمان شملے اور لاہور اپنی کاروباری زندگی کے لئے کانگریسی وزراء کے درباروں پر ہفتہ کو روزانہ حاضری دیتے ہیں، نہ تو ان کو قطعی جواب دیا جاتا ہے نہ ہی ان کا کوئی کام کیا جاتا ہے وہ تھک ہار کر چار چار پانچ پانچ صد روپیہ خرچ کر کے مایوس ہو کر گھروں کو واپس لوٹ آتے ہیں جن سے کانگریس کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہے۔

یہاں لدھیانہ میں عید کے روز جو واقعہ پیش آیا ہے اگر یہ واقعہ دس برس قبل پیش آتا تو بغاوت ہو جاتی اور حکام قتل کر دیئے جاتے۔ سیاسی کام بلا تعاون کے چل نہیں سکتے۔ جب ایک دوسرے کی امداد حاصل نہ ہو آزاد خیال مُسلمان مطمئن نہ ہو سکیں گے۔ یونانسٹ وزراء پر کوئی گلہ نہیں، نہ وہ پہلے ہمارے تھے نہ اب ہیں۔ کانگریسی وزراء سمجھتے ہیں کہ حصولِ حکومت کے بعد ان کو اپنے پرانے سیاسی دوستوں کی ضرورت نہیں رہی نئے ٹوڈی ان کو مل گئے ہیں۔ حکومت کی مشینری پرائیویٹ طور پر مُسلم لیگی حلقوں کو خوش کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اسی کمزور سی دنیا پر ہماری جماعت کے لوگوں کو مسجدوں اور عید گاہوں سے نکالا جا رہا ہے۔ اگر سرحدی وزارت کی طرح حکومت میں

اپنے دوستوں سے مشورہ لیا جائے تو تمام مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے اور تمام کام آسانی سے ہو سکتے ہیں۔

لدھیانہ کے واقعہ عید اور جالندھر شہر کے سینما ہال کے متعلق آپ کی فوری مداخلت کی ضرورت ہے۔ اگر اس وقت آپ نے توجہ نہ فرمائی اور لدھیانہ کے افسران کو سزا نہ ملی تو آزاد خیال عُلماء بالخصوص اور آزاد خیال عوام کو بالعموم عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنا مشکل ہو جائے گا، اور نتیجہ بھی کانگریس کے حق میں بہتر نہیں آئے گا۔ یہ چند واقعات آپ کی خدمت میں اس لئے تحریر کر رہا ہوں کہ آپ صورت حال کو بہتر بنا سکیں۔

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

۹، اکتوبر ۱۹۴۶ء، حبیب روڈ، لدھیانہ

بخدمت حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا ابوالکلام آزاد دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ پنجاب کے کانگریسی وزیر جو سلوک کر رہے ہیں، ان کی بار بار شکایت کرنے سے بھی شرم آتی ہے۔ جالندھر میں یہ بات مشہور ہے کہ چودھری لہری سنگھ نے سینما کے سلسلے میں شیخ غلام دستگیر سے کچھ لین دین کیا ہے مگر میں ابھی اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ مگر حالات نہایت بد سے بدتر ہو گئے ہیں۔ لدھیانہ میں عید کی نماز کے سلسلے میں جو جھگڑا ہوا تھا اس کے متعلق گورنمنٹ پنجاب نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ نہ وہ آفیسر یہاں سے تبدیل کئے گئے اور نہ ہی ان کو کوئی سزا ملی۔ اور نہ آپ کے ارشاد کے مطابق ابھی تک یہ اعلان ہوا ہے کہ پرانے اماموں کی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اس خط کے لکھنے کا اصل مقصد میرا یہ ہے کہ کانگریس کے اندر اب آپ کی پالیسی کیا ہے عام خیال یہ کیا جاتا ہے کہ آپ سوشلسٹوں کے ساتھ ہیں۔ کانگریس کی صدارت کے لئے آپ کے نام کا پیش ہونا اور جے پرکاش نارائن سے اس کی تائید کرنا اور باقی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبران کا خاموش رہنا اور خصوصاً پنڈت جواہر لال کا۔ اس بارے میں لوگ بہت ہی مختلف الخیال ہو گئے ہیں۔ مجھے اس سلسلہ میں صاف اور صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ باہر اسلامی ممالک میں تشریف لے جانا چاہتے ہیں۔ یا یہ صحیح ہے کہ کانگریس والے آپ کو بھیجنا چاہتے ہیں۔

کشمیر کے سلسلے میں ہم کیا کریں۔ عبداللہ کی پارٹی والے دفتر امداد لاہور میں آئے ہوئے ہیں اور وہ مجلس امداد سے پوری پوری امداد چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہئے ان دونوں سلسلوں میں برخوردار عزیز الرحمٰن کچھ باتیں زبانی عرض کرے گا۔

والسّلام

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

حبیب روڈ، لدھیانہ۔ ۱۹ر نومبر ۴۵ء

حضرت امیر الہند شیخ اسلام دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا۔ امید ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ آپ کا تار ملا۔ جواب میں اس لئے تاخیر ہوئی کہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کون سا وقت مقرر کر کے آپ کی خدمت میں پہنچنے کی اطلاع دوں۔ یکایک مجھے اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ دو تین دن اس میں مبتلا رہا۔ اس کے بعد اچانک چھوٹا لڑکا بیمار ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ کام کی مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ اب کل بیس ۲۰ تاریخ کو کاظمی صاحب کے الیکشن میں جو لیاقت علی صاحب کے مقابلے میں لڑ رہے ہیں جا رہا ہوں۔ چوبیس تاریخ کو لدھیانہ واپس آجاؤں گا۔ ۲۷، نومبر کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ اگر اس وقت تک آپ کا قیام بندھیا چل میں رہے تو میں انشاءاللہ ۲۹، ۳۰ نومبر تک آپ کی خدمت میں پہنچ جاؤں گا۔

کل ۱۸ر نومبر کو پنڈت جواہر لال نہرو سنٹرل اسمبلی کے الیکشن کے سلسلے میں لدھیانہ تشریف لائے ان کے دوپہر کے کھانے کا انتظام

میرے محترم دوست خواجہ محمد اعظم صاحب کے مکان پر میرے علم اور مشورے کے بغیر ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کی طرف سے کیا گیا۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے اس مشورے سے اتفاق کیا۔ سٹی کانگریس کمیٹی کے صدر مسٹر عبدالغنی نے اس سے شدید اختلاف کیا۔ اختلاف ہی نہیں کیا بلکہ مخالفت کی اور جو تار مسٹر عبدالغنی نے مفتی محمد نعیم صاحب صدر ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کو دیا ہے اس کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس تار میں جو الفاظ میرے محترم دوست خواجہ محمد اعظم کے لئے استعمال کئے گئے ہیں ان کو پڑھ کر مجھے بے اندازہ دکھ ہوا ہے۔ جب تک مسٹر عبدالغنی کو کانگریس سے نہ نکال دیا جائے اس وقت تک کسی شریف مسلمان کے لئے کانگریس میں آنے کی جگہ نہیں ہے۔ خواجہ محمد اعظم صاحب خواجہ احد شاہ مر کے بڑے لڑکے ہیں۔ ان کا خاندان تمام ہندو مسلمانوں میں معزز سمجھا جاتا ہے۔ اس گھر سے زیادہ پنڈت جی کی عزت افزائی کے لئے اور ں سی جگہ تجویز ہو سکتی تھی۔ خواجہ اعظم صاحب ہمیشہ سے کھدر پہنتے ہیں اور کانگریس کے ممبر رہے ہیں۔

نہرو رپورٹ کے زمانے ، مسلمانوں کا جو اختلاف تھا وہ آپ کو معلوم ہے۔ جون ۱۹۲۶ء میں لدھیانہ میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کا اجلاس تھا۔ اس اجلاس کو چلانے والے خواجہ محمد اعظم اور ان کے بڑے بھائی خواجہ محمد یوسف تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے شدید اختلاف کے باوجود پنڈت موتی لال نہرو کو ہر مشورے سے کانفرنس میں شمولیت کے لئے دعوت دی اور ان کا لدھیانہ میں زبردست استقبال ہوا اور مسلمان کشمیری نوجوانوں نے خود ان کی گاڑی کو کھینچا۔ پنڈت جی کے اس وقت یہاں تشریف لانے سے بھی خوش ہوئے۔ کاش ان کی خط و کتابت میرے پاس محفوظ ہوتی تو میں آپ کی خدمت میں بھیجتا۔ جنگ سے پہلے لدھیانہ میں آل انڈیا یا اسٹیٹ کانفرنس ہوئی۔ پنڈت جواہر لال اس کے صدر تھے۔ اس وقت بھی خواجہ صاحبان نے پنڈت جی کو شاندار ڈنر دیا اور ایڈرس دیا۔

سب سے بڑا دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ جب عبدالغنی کو معلوم ہو گیا کہ پنڈت جی کے کھانے کا انتظام خواجہ صاحب کے یہاں ہوا ہے تو انہوں نے مسلم لیگیوں سے کہہ کر خواجہ صاحب کے مکان پر مسلم لیگیوں کا سخت قسم کا مظاہرہ کرایا۔ خدا کا شکر ہے کہ لیگی اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ کوئی شرارت نہیں ہو سکی۔ ان کے پرانے تعلقات لدھیانہ میں مسلم لیگیوں سے ہیں۔ مسٹر عبدالغنی نے ۴۵ء میں انہی تعلقات کی بنا پر مسلم لیگ ٹکٹ پر کامیاب ممبر کو جو لیگ کے ٹکٹ پر ایک ہی تھا، کانگریسی ممبروں کے ووٹوں سے میونسپل کمیٹی کا صدر بنایا۔ تار کے الفاظ ہی عبدالغنی کے خلاف باز پرس کرنے کے لئے کافی ہیں۔ باقی واقعات ثبوت کے لئے تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے تو سب چیزیں ثابت ہو سکتی ہیں۔ امید ہے کہ اس معاملے میں آپ خاص توجہ فرمائیں گے۔ مہربانی فرما کر آپ مجھے مطلع فرمائیں کہ آپ کا کب تک بندھیا چل قیام رہے گا۔

بخدمت مولانا ابوالکلام آزاد صدر آل انڈیا کانگریس۔ بندھیا چل

حبیب روڈ۔ لدھیانہ ۲۹، نومبر ۱۹۴۵ء

حضرت امیر الہند، شیخ الاسلام دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا گرامی نامہ ملا اور تار بھی موصول ہوا۔ میں کاظمی صاحب کے الیکشن سے کل ہی واپس آیا ہوں اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔ مسلم آزاد بورڈ کے الیکشن کے سلسلے میں شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر اور اپنے دوسرے عزیز کام کرنے کے لئے یو، پی میں گئے ہوئے تھے۔ میں انشاء اللہ العزیز ۲، ستمبر کو مرزا پور سے آپ کے ساتھ کلکتہ چلوں گا۔ وہاں دو تین دن آپ کی خدمت میں ٹھہروں گا۔ اور اگر مجھے یہاں کام سے فرصت مل گئی تو شاید یکم دسمبر کو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ مگر اس کے باوجود بھی کلکتہ چلوں گا انشاء اللہ۔ صحت خراب ہے، آپ کی دعا کا محتاج ہوں۔ کئی ایک پروگرام صحت کی خرابی کی وجہ سے اچانک ملتوی ہو جاتے ہیں۔ آپ کس ٹرین سے مرزا پور سے کلکتہ تشریف لے جائیں گے تاکہ میں اسی ٹرین سے دہلی سے چلوں۔ عزیز ضیاء الحسن نے ایک خط آپ کی خدمت میں آج ہی روانہ کیا ہے۔ وہ آپ کی توجہ کا بے حد محتاج ہے۔

والسلام

حبیب الرحمٰن

حبیب روڈ، شفاعت منزل، لدھیانہ۔ ۱۴؍ دسمبر ۱۹۴۵ء

حضرت امیر الہند شیخ الاسلام۔ دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ۳، نومبر کا لکھا ہوا گرامی نامہ ملا۔ اس خط کے آپ کے اس فقرے نے "کیا کروں دل مانتا نہیں کہ آدمی بیماری کے مقابلے میں ہار جائے" میری روح میں یقین اور جسم میں کام کرنے کی ہمّت پید کر دی ہے۔ اختلاج قلب کے مسلسل دورے پڑ رہے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ نہ کچھ کر رہا ہوں۔ آپ نے خط کے آخر میں تحریر فرمایا ہے انشاء اللہ تعالےٰ بوقت فرصت بعض امور کی نسبت لکھوں گا۔ جو پیش نہاد خاطر ہیں اس تحریر کا بے حد انتظار ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کو تندرستی عطا فرمائے اور آپ کے فیض کو عام کر دے۔ اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ آپ بندھیاچل تشریف لے گئے ہیں۔ بندھیاچل کا پتہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے خط کلکتہ کے پتے پر بھیج رہا ہوں۔

پنجاب کانگریس کے حالات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جو حالات پہلے تھے اب بھی ہیں۔ نہ کام کا ڈھنگ بدلا اور نہ مشورے کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ پنجاب کانگریس کی طرف سے جو اقرار نامہ سر گوکل چند نارنگ کو دیا گیا ہے اس نے حالات کو اور بھی خراب کر دیا ہے۔ اس کی کٹنگ بھیج رہا ہوں۔ ہندمُسلم سبھا کی پوزیشن اس اقرار نامے سے کسی قدر قوی ہو گئی ہے اور آزاد خیال مُسلمانوں کی نشستیں پہلے سے زیادہ خطرے میں پڑ گئیں۔ یہ کسی کی شکایت نہیں، حالت کی اطلاع ہے۔

ضروری گزارش، لدھیانہ۔ انبالہ۔ کرنال۔ شملہ کے شہری حلقے سے پہلے لالہ ویش بندھو اسمبلی کے ممبر ہیں۔ اب نئے اپنے دوست لالہ تلک رام اگروال جین[1] کی درخواست دلوائی ہے۔ ۱۹۱۴ء سے لے کر آج تک لالہ تلک رام جی نے جس دلیری سے کانگرس اور ملک کی خدمت کی ہے وہ اس بات کی سفارش ہے کہ ان کو پنجاب اسمبلی میں کام کرنے کا موقع دیا جائے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب بجٹ بنانے میں ان سے مفید آدمی پنجاب کانگرس کو نہیں ملے گا۔ لالہ جی نے اگرچہ جیل نہیں کاٹی لیکن وہ میونسپل کمیٹی میں ممبران سے کام اور حکومت کا مقابلہ کرتے رہے، اور دو دفعہ کانگریس کی طرف سے ممبر ہونے کی وجہ سے دس ممبر بھی قرار دیئے گئے۔ لالہ جی عملی طور سے غیر متعصب ہیں اور میونسپل کمیٹی میں کام کر کے اپنے شہر پر ثابت کر دیا ہے۔

حَبیب الرحمٰن لدھیانوی

۱۸؍ دسمبر ۱۹۴۶ء

بخدمت حضرت امیر الہند شیخ اسلام دامت برکاتہم

السّلام علیکم۔ مجھے کلکتہ کے سفر میں خونی بواسیر کا دورہ شروع ہو گیا تھا، جو ابھی تک جاری ہے۔ لیکن صحت اب پہلے سے اچھی ہے اور اب خون بھی کم آ رہا ہے۔ آپ کی دعا کا محتاج ہوں۔ آج اخبارات میں یہ خبر پڑھ کے بے حد تشویش ہوئی ہے کہ مسٹر رفیع احمد قدوائی کو موٹر سے سخت حادثہ پیش آیا اور وہ بے ہوش ہو گئے جس کی وجہ سے وہ ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔ ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے میں نے آج لکھنؤ تار بھی دیا ہے۔ برخوردار عزیز الرحمٰن یا خلیل الرحمٰن دونوں میں سے کسی کو آپ کی خدمت میں بھیجنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

والسّلام
حَبیب الرحمٰن

حبیب روڈ، لدھیانہ۔ ۲۷؍ دسمبر ۱۹۴۵ء

سیدی و مولائی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ۲۸؍ دسمبر کو سیٹیں ریزرو نہ ہو سکیں۔ اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ نہیں ہو سکا۔

[1] لالہ جی ۴۸ء میں کشمیر میل کے حادثہ میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کا لڑکا بھی۔

۲۹ر دسمبر کو روانہ ہونا اس لئے بے کار تھا کہ میں ۳۰ر دسمبر کو کلکتہ نہیں پہنچ سکتا۔ چونکہ آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ آپ ۳۰ر دسمبر تک کلکتہ میں قیام فرمائیں گے۔ اب جہاں آپ مستقل قیام فرمائیں اس کی اطلاع فرمائیں تا کہ میں جلد حاضر ہو سکوں۔ والسّلام

حبیب الرحمٰن

حبیب روڈ، لدھیانہ۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۴۵ء

سیدی و مولائی حضرت مولانا دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ۲۸ر دسمبر کو سیٹیں ریزرو نہ ہو سکیں اس لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے روانہ نہیں ہو سکا ۲۹ر دسمبر کو اس لئے روانہ نہیں ہوا کہ آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ ۳۰ر تک کلکتہ ٹھہروں گا۔ اگرچہ میری طبیعت خراب ہے اور سفر کے قابل نہیں ہوں مگر حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں مہربانی فرما کر مجھے مطلع فرمائیں کہ میں کہاں جلد از جلد حاضر ہو جاؤں۔

آپ کے ارشاد کے مطابق پنجاب میں کہیں بھی احرار اور کانگریس امیدوار کا مقابلہ نہیں ہو رہا تھا۔ قصور کے حلقہ سے احرار نے اپنا امیدوار بٹھا دیا۔ اگرچہ ان کو یقین تھا کہ ہمارا امیدوار کامیاب ہو گا۔ اب مولانا عبد الغفار صاحب غزنوی اس حلقے سے کانگریس کے امیدوار ہیں۔ تمام مل کر ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ لاہور کے سول حلقے سے میاں محمد رفیق صاحب احرار امیدوار اور ان کے مقابلے میں میاں عبد العزیز بیرسٹر امیدوار تھے۔ بابو محمد دین مزنگ کے رہنے والے پرانے مشہور کانگرسی نے لاہور کے اس حلقہ سے بطور سیکنڈ امیدوار درخواست دی تھی۔ اتفاقاً میاں عبد العزیز صاحب کی درخوست مسترد ہو گئی۔ اس وقت بابو محمد دین نے وعدہ کیا کہ وہ میاں محمد رفیق صاحب احرار امیداوار کے حق میں درخواست واپس لے لیگا۔ اب حالت یہ ہے کہ کبھی کوئی شخص ان کی طرف سے اعلان کر دیتا ہے کہ انہوں نے لیگ کا ٹکٹ لیا ہے۔ لالہ کدار ناتھ صاحب سہگل ایم، ایل، اے نے بیان دیا ہے کہ بابو محمد دین صاحب بدستو کانگرسی ہیں۔ اب بابو محمد دین کہتے ہیں کہ اگر حضرت مولانا ابو الکلام آزاد مجھے حکم دیں تو میں بیٹھ جاؤں گا۔ ان کی کامیابی کی وہاں کوئی امید نہیں۔ اول تو ضمانت ضبط ہو گی اور ہار جانا تو یقینی ہے۔ مہربانی فرما کر بہت جلدی اس بارے میں بذریعہ تار بابو محمد دین کو آپ حکم لکھیں کہ وہ بیٹھ جائیں۔ ان کو بیٹھنے کا حکم معرفت مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی دیں۔

والسّلام

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

دیوبند محلہ خانقاہ۔ ۱۳۵۱/۱۲ھ

عزیزم مولوی حبیب الرحمٰن

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ فرقہ قادیانی کے بارے میں، میں مسئلہ کو اس طرح سمجھتا ہوں

خور دن ازمن و لقمہ شمر دن از تو

اس کی تفسیر کے مقابل خواہ کل امت کا خلاف ہو وہ سب اس کے نزدیک گمراہ ہیں۔ حدیث پیغمبر اسلام کی جو اس کی وحی کے موافق نہ ہو اس کی نسبت اس کی تصریح ہے کہ ردی کے ٹوکرے میں پھینک دی جائے۔ ان دو اصول اسلام یعنی کتاب اور سُنت کی تو اس کے نزدیک یہ حاصلات ہے اور بحسب تصریح اس کے اس پر شریعت بھی نازل ہوتی ہے۔ اور بمقابلہ اسلامیہ کے بعد ختم نبوت کے آئندہ کوئی شریعت نہیں ہوگی، صریح دعاء شریعت کیا ہے اور نیز اس کا اعلان ہے کہ آئندہ حج قادیان کا ہوا کرے گا اور نیز جہاد شرعی اس کے آنے سے منسوخ ہو گیا۔ اور پیغمبر اسلام ﷺ کے معجزات تو تین ہزار ہی نقل ہوئے ہیں۔ منشی غلام احمد قادیانی کے تین لاکھ ہیں جن میں تحصیل چندہ کی کامیابی بھی شمار ہے اور اس کے اشعار ہیں۔

زندہ شد ہر نبی بآمد نم   ہر رسولے نہاں بہ پیرہنم

آنچہ داد رست ہر نبی را جام داد آں جام راہ مرا انجام

نیز اپنی مسحیت کی امید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جن پر ایمان جزو دین محمدی ہے ایسی توہین کی ہے جس سے دل اور جگر شق ہوتا ہے اور اس کے نزدیک تحقیقی توہین ہے۔ الزامی یا بقول نصاریٰ تو در کنار رہی توہین عیسیٰ علیہ السلام میں علاوہ اپنی اپنی تحقیق توہین کے ایک اور طریقہ بھی اختیار کیا ہے کہ نقل نصاریٰ کے سر رکھ کر توہین سے اپنا دل ٹھنڈا کرتا ہے۔ ع

گفتہ آید در حدیث دیگراں

یہ معاملہ بیشتر اسی پیغمبر برحق کے ساتھ کیا ہے تاکہ عظمت ان کی دلوں سے اتار دے اور خود مسیح بن بیٹھے۔ اس واسطے ہنود کے پیشواؤں کے ساتھ ایسا نہیں کیا ہے بلکہ توقیر کی ہے، اور ایسے ہی بزرگان اسلام امام حسین علیہ السلام وغیرہم کی تحقیر اور اپنی تعلی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ غرض یہ کہ اس دجال کی دعوت اس کے نزدیک سب انبیاء اور رسل صلوات اللہ علیہم سے بڑھ چڑھ کر اور افضل و اکمل ہے۔ علماء اسلام نے اس فتنہ کے استیصال میں خاصی خدمتیں کیں۔ مگر وہ خدمتیں انفرادی اور خصوصی تھیں، اس وقت ایک لطیفہ غیب نمودار اور نمایاں ہوا ہے کہ مجاہد ملت جناب ساقی القاب مولوی ظفر علی خاں صاحب دام ظلہٗ اس خدمت کا فرض ادا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے جناب ممدوح اور ان کے رفقاء جناب مولانا عبد الحنان صاحب اور مولوی لال حسین صاحب اختر اور احمد یار خاں صاحب سپرد حوالات ہیں۔ ہم کو کچھ حمیت اور حمایت اسلام سے کام لینا چاہئے۔ اہل خطہ کشمیر سمجھ اور بوجھ لیں کہ جو کچھ قادنی جماعت ان کی امداد کر رہی ہے وہ اہل خطہ کے ایمان کی قیمت ہے اور ناممکن ہے کہ کوئی امداد اور ہمدردی اس فرقہ کی ایمان فریدیا کے سوا ہو ؎

دانی کہ چنگ دعود چہ تقریر میکنند پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر میکنند

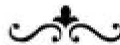
اور جن لوگوں نے اس فرقہ کے ساتھ کسی قسم کی رواداری برتی ہے وہ خطرہ میں ہیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ یہ کوئی معمولی بدعت ہے بلکہ ایک چھوٹی پیغمبر سے ایک بڑی پیغمبر قادیانی میں تحویل ہونا ہے۔ اور جس کا جی چاہے ان عقاید ملعونہ قادیانی کا ثبوت ہم سے لے اور اس شدید وقت میں کہ وطن کو بے ضمیر کر کے ایمان پر چھاپہ مارا گیا ہے کچھ غیرت ایمانی کا ثبوت دے۔

جن حضرات نے اس احقر سے حدیث شریف کے حرف پڑھے ہیں جو تقریباً دو ہزار ہوں گے وہ اس وقت کچھ ہمدردی اسلام کی کر جائیں۔ اور کلمہ حق کہہ جائیں اور انجمن دعوت وارشاد میں شرکت فرمائیں۔

اس فرقہ کی تکفیر میں توقف یا تو اس وجہ سے ہے کہ صحیح علم نصیب نہیں ہوا اور اب تک ایمان و کفر کا فرق ہی معلوم نہیں ہوا۔ اور نہ لوئی حقیقت فیصلہ ایمان کی ان کے ذہن میں ہے۔ اور نہ کوئی مصلحت دنیاوی دامن گیر ہے۔ ورنہ اسلام کوئی نسبی اور نسلی لقب نہیں ہے، جیسے یہود اور ہنود کا زائل نہ ہو اور جو کوئی بھی اپنے آپ کو مسلمان کہے بس وہ قومی نسبی لقب یا ملکی و شہری نسبت کی طرح لائیفک ہی رہے، بلکہ عقاید اور عمل کا نام ہے اور ضروریات قطعیہ اور مستورات شرعیہ میں کوئی تاویل و تحریف بھی کفر و الحاد ہے۔ (زندقہ) اور الحاد اس کو کہتے ہیں کہ سچے دین کو گڑبڑ کر دے، اور یہ کھلے کفر سے بدتر ہے، یہی اس دجال کی تسلیم کا حاصل۔ ۱۲ منہ)

جب کوئی حکم قطعی اور متواتر شرعی کا انکار کر دے وہ کافر ہے، خواہ اور بہت سے کام اسلام کے کرتا رہے۔

اِنّ اللہ لئیوید الدین بالرجل الفاجر اس میں وارد ہوا ہے۔ حق تعالیٰ صحیح علم اور سمجھ اور توفیق عمل نصیب کرے۔ آمین



انتباہ

آخر میں یہ عاجز بحیثیت رعیت ریاست کشمیر ہونے کے حکومت کشمیر کو متنبہ کرنا چاہتا ہے کہ قادیانی عقیدہ کا آدمی عالم اسلام کے نزدیک مسلمان نہیں ہے۔ لہذا حکومت کشمیر جمیع اہل اسلام اور مذہب قدیمی اہل کشمیر کی رعایت کرتے ہوئے کادیانیوں کی بھرتی اسکولوں اور محکموں میں نہ کرے ورنہ اختلال امن کا اندیشہ ہے۔ نقل مطابق اصل

(شیخ الاسلام علامہ) محمد انور شاہ کشمیری عفا اللہ عنہ از دیوبند محلہ خانقاہ ۱۲، ۱۳۵۱ھ

شیخ الاسلام حضرت انور شاہ کشمیری کے تحریری ملفوظات جو کہ حضرت نے خود اپنے قلم سے لکھ کر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو ارسال فرمائے۔۔۔ (عزیز الرحمٰن لدھیانوی)

نوٹ:۔ ۲۵/ ذی قعدہ کو ایک عظیم الشان جلسہ اہتمام انجمن امداد اسلام دیوبند منعقد ہوا۔ حضرت شاہد صاحب معظم نے تاریخ اسلام پر تبصرہ فرماتے ہوئے فتنہ قادیان پر مفصّل تقریر فرمائی۔ اس کے بعد تحریر پڑھ کر سنائی گئی اور تمام حاضرین جلسہ نے خواہش کی کہ اس طبع کو کرا کر شائع کیا جائے۔

۲/ فروری ۱۹۳۱ء

پیارے پنڈت جی

تسلیم! آپ کا گرامی نامہ پہنچا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ آپ نے اپنے خط میں مجھ سے یہ دریافت کیا ہے کہ میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے آپ کے کس طرز عمل سے شکایت ہے، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ البتہ جب آپ جیسے حضرات جو ہندوستان کی آزادی کے علم بردار ہیں بے ضرورت غلطیاں کرتے ہیں تو مجھے دکھ ضرور ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ غوغا مچایا جارہا ہے کہ مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں اگر چہ یہ بات سرے سے ہی غلط ہے مگر نیشنلسٹ ہندو اور انگریز اپنے اپنے مفاد کے لئے یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔ اس پروپیگنڈے سے مقصد دونوں کا جدا جدا ہے انگریز کا مقصد تو یہ ہے کہ وہ دنیا پر ظاہر کرے کہ صرف ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اس کے ساتھ مسلمان شریک نہیں اور ہندو اس لئے یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے کانگریس جھنڈے سے وطن کے لئے قربانی اور آزادی کا کام تو لیں، لیکن جب ملکی حقوق کی تقسیم کا وقت آئے تو ہم انہیں یہ کہہ کر محروم کر دیں کہ تم نے وطن کی آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا، ورنہ آج بھی مسلمان اس تعداد سے کانگریس میں شریک ہیں جو ہندوؤں کی تناسب آزادی سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ ننانوے فیصدی ہندو نیشنلسٹ زبان سے کہتے ہیں کہ مسلمان کانگریس میں آئیں مگر دل سے چاہتے ہیں کہ نہ آئیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ مولانا شفیع داؤدی، سیّد مرتضیٰ بہادر وغیرہ وغیرہ ۲۴ء تک پکے کانگریسی تھے، لیکن جب سوراج پارٹی نے اسمبلی میں سرحد کی اصلاحات کے متعلق ہندو ذہنیت کا ثبوت دیا اور واک آؤٹ کر گئے تو وہ الگ ہو گئے میں ان لوگوں میں ہوں کہ جس کا جذبہ یہ ہے کہ ہندوؤں کی تمام ان غلط کاریوں کے باوجود مُسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ کانگریس میں شریک رہنا چاہئے۔ میرے لئے وطن کی آزادی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔



فرقہ وارانہ تصفیہ اور کانگریسی لیڈر

فرقہ وارانہ تصفیہ کے خلاف جو پروپیگنڈہ ہندوستان میں ہوایا ہو رہا ہے اسے پڑھ کر مجھے بے حد حیرت ہوتی ہے اور میں گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ ہم کسی احمق دنیا میں آباد ہیں کہ یااللہ جو چیز ہمارے اپنے تصفیہ کرنے کی ہے اور جس کا تصفیہ ہم نے اپنے بعض خود غرض اور وطن دشمن ہندوستانیوں نے اپنی بد دیانتی سے خود نہیں ہونے دیا۔ اس کا الزام دوسروں پر کیوں دیتے ہیں لکھنؤ میں نہرو رپورٹ کی شکل میں فرقہ وارانہ تصفیہ ہوا۔ مگر گاندھی جی سکھوں کو خوش کرنے کے لئے اس کو دریائے راوی میں غرق کر گئے اور جن لوگوں نے اس تصفیہ کے لئے اپنی قوم سے بازاروں میں پتھر کھائے ان سے اس کے غرق کرنے کے وقت مشورہ تک بھی نہ لیا گیا۔ اس کے بعد وہ مکمل آزادی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لے لیے گئے ہیں۔ میں ان دنوں بمبئی میں موجود تھا اور میں نے ان سے مل کر کہا آپ لندن نہ جایئے جب تک آپ ہندوستانی قوموں میں باہمی تصفیہ نہ کرلیں۔ مگر وہ دنیا میں نہ کسی کی سننے والے ہیں اور نہ ماننے والے۔ بہر حال راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن گئے اور ملک کو جو اس سے نقصان پہنچنا تھا پہنچ گیا۔ ملک کے بدترین دشمن اس راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لئے گئے تھے جنہوں نے وزیر اعظم کو لکھ کر دے دیا کہ ہمارے فرقہ وارانہ معاملات کے متعلق جو تصفیہ کر دیں وہ ہمیں منظور ہوگا۔ جب وہ تصفیہ ان لوگوں کے ارادے کے خلاف آیا تو ان لوگوں نے اس کو مسئلہ بنا کر اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ سردار پٹیل لدھیانہ کی ایک کانفرنس میں ایک تقریر میں پچھلی اسمبلی کے انتخاب کے سلسلہ میں کی تھی کہا کہ مولوی جی خود وزیر اعظم سے فرقہ وارانہ تصفیہ لے کر آئے ہیں اور خود وہی اس کے خلاف پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ سردار نے سخت الفاظ کہے تھے مگر میں انہیں نقل کرنا نہیں چاہتا۔ کاش! یہ پارٹی اس تصفیہ کے خلاف اگر اس بنا پر پروپیگنڈا کرتی کہ یہ فیصلہ ہندوستانی قومیت کے منافی ہے۔۔۔ ان کا یہ کہنا کہ ہندو ذہنیت پر ایک خوبصورت غلاف ہوتا، مگر بات تو معقول ہوتی لیکن انہوں نے کیا کیا۔ پنڈت مالویہ جی سے لے کر ان کی پارٹی کے تمام ارکین اور اخبارات نے یہ کہا کہ پنجاب اور بنگال میں اسلامی راج قائم ہوگا۔ میرا یقین تھا کہ آپ اس خیال سے علیحدہ رہیں گے کیونکہ جو شخص ہندوستان کے لئے مکمل آزادی چاہتا ہے اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے کہ انگریز ہندوستان کو کیا دیتا ہے کیا نہیں۔ اس کا تو ایک ہی کام ہے کہ وہ بدیشی طاقت کو کہے کہ میرا گھر خالی کرکے اور بس۔ لالہ راجپت رائے آنجہانی نے مجھے دھرم سالہ جیل میں ۱۹۲۲ء میں یہ کہا تھا کہ اگر کانگریس نے ہندوستان کے لئے کوئی آئین تیار کیا، یا وہ کسی آئین کے رد و قبول کی بحث میں پڑ گئی تو تمام اقوام ہند آپس میں لڑنے لگ جائیں گی اور ہندوستان کی آزادی بہت دور ہو جائے گی یہ بات کتنی سچی نکلی۔

آپ سے یہ دکھ پہنچا ہے کہ آپ نے کمیونل ایوارڈ کے سلسلہ میں کانگریس میں تبدیلی پیدا کی اور آپ اس پارٹی کے سامنے جھکے جو وطن کی آزادی کے ساتھ ساتھ ہندو راج کے خواب دیکھ رہی ہے کیا آپ مجھے سمجھا سکتے ہیں کہ کمیونل ایوارڈ کے مسترد کرنے کے کیا معنیٰ ہیں؟ کہ ہم انگریز سے کہیں کہ وہ دوبارہ ہمارے لئے کوئی فیصلہ کر دے۔ اگر اس سے مراد یہ نہیں تو اس کے استرداد کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ قوم ہند کسی باہمی تصفیہ پر پہنچیں۔ یہ مطلب ہے کہ ہم ہندوستانی اقوام سے یہ کہہ رہے ہیں کہ آپس میں مل کر کوئی تصفیہ کر د۔ اگر پہلی بات ہے تو بدیشی حکومت جو فیصلہ کرے گی وہ ہندوستانی مفاد کے خلاف ہوگا۔ اور اگر ہم خود کوئی تصفیہ کرنا چاہتے ہیں تو وہ پہلے ہونا چاہیئے۔ جب ہم تصفیہ کریں گے تو یہ خود مسترد ہو جائے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پنجاب کے سکھ اور ہندو اور بنگال کے ہندو بھی کسی ایسے فیصلے کو ماننے کو تیار نہیں ہیں، خواہ وہ خالص قوم پرستی کی بنیادوں پر ہی کیوں نہ ہو۔ جس سے ان کو یہ خطرہ ہو جائے کہ اس تصفیہ سے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت ہو جائے گی۔ آپ کے موجودہ طرز عمل سے کانگریس کے وقار کو ایک صدمہ پہنچا ہے (مثلاً پنجاب میں)۔ اول تو پہلے ہی کانگریس کا

کوئی وقار نہیں کیونکہ پنجاب کی کانگریس آپ نے چار ڈاکٹروں کے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔ پندرہ برس سے میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ان کا سوائے آپس میں لڑنے کے کوئی کام نہیں ہے خیر دو ڈاکٹر تو اس وقت اعلانیہ کانگریس سے الگ ہو گئے ہیں۔ ایک تو مسجد شہید گنج کے ٹکٹ پر درکٹ کر رہا ہے اور دوسرا امرت سر کی مسجد حوض میں نماز تراویح کے بعد مسلمانوں سے یہ کہہ رہا ہے کہ میں پنجاب اسمبلی میں اس لئے جا رہا ہوں کہ مسلمانوں کو پنجاب میں چھپن ۵۶ فی صدی سیٹیں نہیں ملیں۔ ان کے اس حق کو میں لینے کے لئے اسمبلی میں جا رہا ہوں۔ باقی دو ڈاکٹر ہیں ان کو لڑنے سے فرصت نہیں۔ آپ کے اس سمجھوتے نے ایک کانگریسی ڈاکٹر کو خفا کر دیا ہے اور مالوی پارٹی بر سر اقتدار آگئی اور مجھے اندیشہ ہے کہ مالوی پارٹی ہی الیکشن میں کامیاب ہو گی۔

ان حالات میں میرا یہ مطلب نہیں کہ پنجاب میں کانگریس کا اثر نہیں۔ خدا کا شکر ہے میرے دوستوں نے کانگریس کے اثر کو پنجاب میں زیادہ پھیلایا ہے۔ مگر بر سر اقتدار پارٹی کی جنگ نے کانگریس کو پنجاب میں فنا کر رکھا ہے۔ مکمل آزادی کے ریزولیوشن کے بعد کانگریس کا کام یہ ہے کہ وہ حکومت کے ہر عطیہ سے بے نیاز رہے اور اس کو فرقہ پرستوں کے حوالے کر دے اور جو کانگریس واقعی کانگریسی ہے اس کا فرض ایک ہی ہے کہ عوام الناس میں سچی آزادی کی تڑپ پیدا کرے۔ اگر میرے بس میں ہو تو میں وطن کی آزادی کے لئے مسلمانوں کو ہندو راج پر بھی راضی کر لوں کیونکہ میرے نزدیک اب ہندوستان میں کون سی اسلام کی حکومت ہے جو ہندو راج کے ہونے سے چلی جائے گی۔ ہندو راج اپنوں کا توراج ہو گا یہ میرے بے ربط خیالات ہیں۔ امید ہے ان سے آپ میرا مافی الضمیر سمجھ گئے ہوں گے۔

نوٹ: میں چونکہ مسلسل سفر میں رہتا ہوں اس لئے آپ کا خط مجھے ۴، دسمبر کو ملا اور انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے پڑھوانے اور سمجھنے میں دیر ہوئی۔ کبھی ملاقات ہوئی اور آپ کو بات کرنے کی فرصت بھی ہوئی تو دل کھول کر باتیں کروں گا۔ فقط

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

شفاعت منزل۔ ۲ر فروری

پیارے پنڈت جی

تسلیم۔ چند ضروری امور کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

۱۔ آپ نے اپنی کتاب میں احرار پارٹی کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ یہ مسلمانوں کی ایک بہترین جماعت تھی۔ لیکن کراچی کانگریس میں ایک مسلمان کے ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنانے پر یہ جماعت کانگریس سے الگ ہو گئی اور بعد میں معلوم ہوا کہ اس کہ تہہ میں کچھ اور بھی تھا۔ جو کچھ بھی آپ نے ہماری پارٹی کے متعلق لکھا وہ غلط اطلاعات پر مبنی ہے۔ مجلس احرار ۱۹۲۹ء میں کانگریس کیمپ لاہور میں بنائی گئی تھی۔ ۱۹۳۰ء کی کانگریس تحریک میں تمام پارٹی کانگریس کے کام پر لگ گئی اور اپنے نام کو اچھالنے کی کوشش نہ کی۔ جس مُسلمان کی ورکنگ کمیٹی میں لئے جانے کی مخالفت کی گئی، وہ کسی ذاتی اغراض یا شخصی عداوت پر نہیں کی گئی تھی بلکہ پارٹی دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتی تھی کہ یہ شخص اس اعزاز کا اہل نہیں بلکہ یہاں پہنچ کر کانگریس کو بھی نقصان پہنچائے گا اور مُسلمانوں کی بدنامی کا باعث بھی ہو گا۔ چنانچہ جو کچھ ہم نے اس شخص کی نسبت سمجھا تھا آپ پر بھی ثابت ہو گیا۔ میں کراچی کانفرنس کے زمانے میں جیل میں تھا۔ کیونکہ مجھے عارضی صلح کے سلسلے میں رہا نہیں کیا گیا تھا۔ مگر آپ کو اس کی خبر تک نہیں ہوئی کہ کون کارکن کہاں ہے اور کیوں رہا نہ ہوا۔ کراچی کانگریس کے بعد ہی پنجاب میں کانگریس کے الیکشن ہوئے۔ اس میں جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ کسی شریف اور خوددار آدمی کے لئے قابل برداشت نہ تھا۔ اب کوئی چارہ نہ تھا کہ کوئی شریف اور خوددار آدمی وطن کے لئے چار آنے کا ممبر رہ کر کام کرے اور اس انتخاب بازی سے الگ ہو جائے۔ یہ وہ اسباب تھے جس کی وجہ سے ہم نے کسی ایسے کام میں حصہ نہ لیا جو ہمارے لئے شہرت کا باعث ہوتا، البتہ اپنی ہمّت کے مطابق کانگریس کا کام ضرور کیا اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ ہماری جماعت سے بڑھ کر کسی نے کام نہیں کیا۔

انتخاب کے سلسلے میں میں نے اور میری تمام جماعت نے مسلسل اور صاف طور پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف جانے کا مشورہ دیا۔ بلا کسی پرواہ کے میں نے ہر بیان اور ہر تقریر میں مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونے کی اپیل کی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہماری بدقسمتی کا دور پھر پنجاب میں شروع ہوگیا۔ پنجاب کانگریس میں ایسی پارٹی برسراقتدار آگئی جو ذاتی عداوت اور اسلام دشمنی کے اندر زیادہ پیش پیش ہے۔ خواجہ عبدالرحمٰن غازی بی۔ اے، ایل، ایل بی امرت سری میرے ان دوستوں میں ہیں جن کی سیاسی قابلیت کا آدمی پنجاب میں دوسرا مجھے تو نظر نہیں آتا۔ جس نے دیانت داری، جرأت اور دلیری سے پچھلے پندرہ سال میں سخت سے سخت آزمائش کے وقت کانگریس کا ساتھ دیا۔ جس شخص نے اپنے دوستوں کی ہلکی سی مخالفت کو کانگریس کے بارے میں برداشت نہیں کیا، آج فرضی اور بے قاعدہ انتخاب کر کے اس کو امرت سر کی کانگریس سے الگ کر دینے کا اعلان کیا جاتا ہے یہ الگ کرنے والے وہی لوگ ہیں جو بدقسمتی سے کانگریس کے نام پر پنجاب اسمبلی کے ممبر ہوگئے اور پارٹی کا لیڈر ڈاکٹر گچلو ہے، جس نے الیکشن کے زمانہ میں علانیہ کانگریس کی مخالفت کی اور کہا کہ میں مسلمانوں کو چھپن ۵۶ فی صدی حقوق دلانے کے لئے کونسل میں جارہا ہوں اور ہندوؤں کی وہی پارٹی آج کانگریسی ہے جس نے دو سال ہوئے اسمبلی کے انتخابات میں دیوان چمن لال کی جو اس وقت کانگریس ٹکٹ پر بھائی پرمانند کے مقابلے میں کھڑے ہوئے تھے علانیہ مخالفت کی اور ان کو شکست دلائی۔

لدھیانہ میں احرار پارٹی کے ممبر اور رکن افسروں سمیت پنڈت منی لال کالیہ، جو کانگریس ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے لئے منتخب ہوئے ہیں کے استقبال کے لئے گئے۔ مگر مقامی کانگریس کمیٹی کے متعصب عہدہ دار نے ان کے بے عزت کیا اور واپس کر دیا۔ دوسری طرف میری جماعت کی یہ پوزیشن ہے کہ ہم نے انتخاب کے زمانے میں کانگریس کا پروپیگنڈا کیا۔ مجھے ایک دوست نے کہا کہ تم ابھی ایک مصیبت سے نجات نہیں پاسکتے، تم کانگریس کے حق میں پروپیگنڈا نہ کرو، ورنہ مسلمان تمہارا ساتھ نہ دیں گے میں نے جواب میں یہی کہا کہ جب میں سول نافرمانی میں کانگریس کے لیے بند ہو سکتا ہوں تو اس وقت ملک کا کیسے ساتھ نہ دوں گا پنجاب میں آپ نے بھی اور کانگریسی لیڈروں نے بھی کہا کہ پنجاب سرکاری صوبہ ہے حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے عوام ہندو ہوں یا مسلمان کانگریس سے محبت کرتے ہیں۔ مگر یہاں کی عام آبادی اور مخلص کارکن کانگریسیوں سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ جماعتوں کی زندگی، انسانوں کی شرافت اور ان کی سمجھ پر موقوف ہے۔ پچھلے دو سال میں کس قدر محنت کر کے فضا کو درست کیا ہے مگر ڈر ہے کہ س فضا کو برباد نہ کر دیں۔

پنجاب میں جہاں لہیں کانگریس میٹی کا سالانہ انتخاب ہوتا ہے یا ممبر بنائے جاتے ہیں اس کی حقیقت یہ ہے کہ نہ اخباروں میں اعلان ہوتا ہے، نہ بذریعہ ڈھول شہروں میں اطلاع دی جاتی ہے کہ فلاں تاریخ تک ممبر بنیں گے ار ممبری کے یہ شرائط ہیں، بلکہ مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ گزشتہ سال میں نے یہاں کے بعض کانگریسی دوستوں سے ممبری کے فارم مانگے تو نہیں دیئے گئے۔ اگر پنجاب میں کانگریس کا انتخاب بھی اسی طرح ہو جس طرح گورنمنٹ نے کرایا ہے تو موجودہ پارٹیاں خود ہی ختم ہو جائیں۔ کانگریس کمیٹی کے کارکن، حکومت کے ارکان سے انتخاب کے سلسلے میں زیادہ تنگ دل ہیں۔ دنیا کو شکایت ہے کہ حکومت ووٹروں پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ پنجاب کی کانگریس کمیٹیاں سرے سے عوام کو کانگریس کا ممبر بنانا بھی نہیں چاہتیں تاکہ کانگریس کے عہدے فنا نہ ہو جائیں یہ حالات اس لئے لکھے گئے ہیں کہ آپ شاید کوئی اصلاح کر سکیں۔ شکایت نہیں اور نہ کوئی پروپیگنڈا ہے۔

۲۔ آپ کی ایک تقریر کا مقدمہ جو بمبئی میں آپ نے مسٹر جناح کے خلاف کئی اخبارات میں نکلا ہے جس پر ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور اسلامی پریس نے آپ کے خلاف ایڈیٹوریل لکھے ہیں۔ ہمیں خود مسٹر جناح سے بیسیوں باتوں میں اختلاف ہے۔ مگر ہم حتی الوسع احتیاط سے کام لیتے ہیں اور جھگڑا پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ مسٹر جناح کا ہندوستان میں کوئی مخالف ہو یا موافق، لیکن ہر شخص انہیں دیانت دار، ڈریٹ سمجھتا ہے۔ گورنمنٹ مسٹر جناح کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکتی اور مرکزی اسمبلی میں

کانگریس کی کامیابی مسٹر جناح کی رفاقت پر مبنی رہی ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پچھلے دنوں میں مسٹر جناح نے بار بار اعلان کئے کہ ان کی پارٹی کانگریس کے ساتھ کام کرے گی اور وہ مخلوط انتخاب کے حامی ہیں۔ مُسلم پریس نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ الیکشن سے پہلے آپ کو بھی علم تھا اور جناح کو بھی کہ مُسلمان کانگریس ٹکٹ پر کامیاب نہیں ہوں گے اور آپ کو یہ بھی علم تھا کہ سارے ہندو کانگریس کے ٹکٹ پر نہ آسکیں گے۔ اسی لئے اس وقت آپ مسٹر جناح کی انتخابی جدوجہد کو پسند کرتے تھے۔ لیکن چند صوبوں میں کانگریس کی فتح نے کانگریس لیڈروں میں غیر ضروری غرور پیدا کر دیا ہے۔ اب وہ سب کو ذلیل سمجھنے لگے ہیں جیسے کہ وہ ۱۹۳۰ء کی عارضی صلح کے بعد سے مسلمانوں کو سمجھنے لگے تھے۔ آپ اس وقت ہندوستان کے بڑے لیڈر ہیں۔ آپ کی زبان سے ایسی باتیں نکلیں جس سے اقوام میں تلخی پیدا ہو ملک کے لئے نقصان رساں ہے۔ ہم فتح کے بعد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انگریز ملک سے نکل گیا اور ہم مالک ہوگئے، حالاں کہ انگریز ابھی اسی ملک میں موجود ہے۔ میں اس کہنے میں حق بجانب ہوگیا کہ ملک میں فرقہ وارانہ فساد لیڈروں کی غیر ذمہ دارانہ تقریروں اور تحریروں سے شروع ہوئے ہیں۔ مسٹر جناح سے جس بات پر آپ کا جھگڑا شروع ہوا ہے وہ کوئی بات ہی نہ تھی، بلکہ اگر آپ ان کی تقریر کا جواب نہ دیتے تو البتہ زیادہ مؤثر جواب ہوتا یا جواب میں ایسے اچھے الفاظ استعمال کئے جا سکتے تھے جس سے تلخی پیدا نہ ہوتی۔ نہرو رپورٹ میں ہمیں کیوں ناکامی ہوئی، صرف اس لئے کہ کلکتہ کنونشن میں مسٹر جناح سے نازیبا سلوک کیا گیا اور آج اسی تاریخ کو پھر دوہرایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے یہ بات سچ کہی تھی کہ "ہندو مسلمان میں کوئی جنگ نہیں۔ لیڈروں کی ذاتی رنجشوں نے سارے کام کو تباہ کیا ہے۔ اگر مسٹر جناح اور پنڈت موتی لال نہرو اور جیکر اور مولانا شوکت علی میں ذاتی رنجش نہ ہوتی تو ملک کا یہ حال ہوتا" آپ کو معلوم ہے کہ کئی سال کے بعد ملک کی فضا پھر درست ہو رہی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اسے الفاظ کی تیزی سے بگڑنے نہ دیا جائے۔ مسٹر جناح کے متعلق جو تقریر آپ کی چھپی ہے اس پر ہندوستان کے کل اسلامی پریس نے لکھا ہے، مسٹر جناح خیالات کے اعتبار سے آپ کے بہت قریب ہیں اس سے بہتر اور آدمی نہیں ہے، آپ ان کو اور قریب لانے کی کوشش کریں۔

۳۔ جلد سے جلد آپ سے کسی قریب اسٹیشن پر ملنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ ایسی جگہ آپ کا دو تین دن قیام ہو تا کہ ملک کے اندر آنے والے حالات پر آپ سے تفصیلی گفتگو کر سکوں۔ یہ خط و کتابت آپ سے اس لئے کر تا ہوں کہ جی چاہتا ہے کہ ملک میں کانگریس کی وقعت ہو اور ملک کی آزادی قریب آجائے چونکہ آپ سے محبّت ہے اس لئے جو بات دل میں تھی آپ کو صاف صاف لکھ دی خواہ آپ اسے قبول کریں یا نہ کریں۔ احسان کا اڈیٹوریل جس میں آپ کی تقریر شامل ہے ہمراہ ارسال ہے۔

حبیب الرحمٰن لدھیانوی، صدر مجلس احرار اسلام ہند

مخدوم المکرم حضرت مُفتی صاحب

آج لاہور سے واپس آیا تو آپ کا گرامی نامہ ملا۔ جن الفاظ کے ساتھ آپ نے مجھ کو مخاطب فرمایا ہے۔ میں ان کا مستحق نہیں ہوں۔ آپ کی عزت اور احترام میرے دل میں پہلے سے زیادہ ہے مجھے جمعیۃ العلماء کے موجودہ طریقہ کار سے سخت اختلاف ہے لیکن باوجود اس کے میرے دل میں ایک سیکنڈ کے لئے بھی یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا کہ جو کچھ جمعیۃ العلماء نے اب تک کیا ہے اس میں کوئی بددیانتی ہے۔ ہر مُسلمان نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو شریف ہو، دوسروں کی عزت کرتا ہو اور اپنی عزت کی اس کو قدر ہو، اس سے ہر وقت ہر حالت میں تبادلہ خیالات کیا جاسکتا ہے۔ آپ کے والا نامہ کا قطعی اور آخری جواب میں اس مسئلہ کو اپنی جماعت کے سامنے پیش کر کے دے سکتا ہوں، لیکن علی برادران کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا حجاز وفد لے جانے کے وقت سے اب تک ان کا کوئی کام آپکے نزدیک اخلاص پر مبنی ہے کیا انہوں نے حرمتِ رسول کے مسئلہ میں غلطی نہیں کی مخلصین کو ذلیل کرنے اور فرقہ پرستوں کی امداد کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت کیا۔ اور کیا کوئی شخص اس بات کی تردید کر سکتا ہے کہ محمد علی اپنی رہنمائی کے زعم میں سرحد میں جا کر اسلامی تحریک کو فیل نہیں کیا نہرو رپورٹ کے متعلق جو کچھ شوکت علی نے کیا ہے کیا اس میں دیانت کا بھی کوئی دخل ہے میں یقین سے کہتا ہوں اگر محترم موتی لال نہرو

علی برادران کو اپنے جلوس میں دائیں اور بائیں بٹھالیتے تو علی برادران نہرو رپورٹ کو آسمانی صحیفہ بناتے۔ میری آنکھوں نے دیکھا ہے اور کانوں نے سنا ہے کہ انہوں نے سوامی[1] جی کے ساتھ مل کر کام کرنے کا پروگرام بنایا اور سوامی جی کے کہنے پر ہر قسم کا پروگرام منظور کرنے پر تیار ہوگئے۔ اس وقت کنہیالال بزاز اور گاندھی جی کی فرماں برداری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔۔۔ میں اور کیا عرض کروں اور کیا لکھوں۔ کلکتہ میں جو کچھ ان دو رام پوری شریف انسانوں نے کیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ اسے کوئی شریف آدمی نقل بھی کر سکے۔

سر شفیع سے ملا جا سکتا ہے۔ سر آغا خاں کی زبانی صحت کے لئے دعا ہو سکتی ہے مگر ابو الکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور مُخلصین کی جماعت اسقدر راندہ درگاہ ہو چکی ہے کہ رئیس الاحرار اور ضغیم اسلام ان سے بات کرنے کے روادار نہیں۔ ہمارے دشمنوں سے روپیہ لے کر ولایت کی سیر کرنے والے آج ہم پر سرمایہ داروں کے روپے کا الزام لگاتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے ان دونوں بھائیوں کے خود اپنے ہاتھوں سے بوٹ صاف کئے ہیں اور پہنائے ہیں۔ اس لئے کہ میں ان مُسلمانوں کا بہی خواہ سمجھتا تھا۔ لیکن حجاز کے واقعے سے لے کر اب تک جو حالات مشاہدہ میں آئے ہیں مجھے یہ دونوں بھائی[2] صرف اپنی لیڈری چاہتے ہیں ... ان کی طرف سے مسلمان چاہے تباہ برباد ہو جائیں آج انصاری کو بے ایمان کہا جاتا ہے (اس کی حقیقت سے بھی میں خوب آشنا ہوں۔ کاش ان کی باتوں کی وجہ سے وہ ان کی ہزاروں روپے کی مالی امداد بند کرنے پر مجبور نہ ہوتے۔ کیا انھوں نے افغانستان کے معاملہ میں باغیوں کی معاونت نہیں کی۔ حقیقت میں ہمارے ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ موجودہ اختلاف تب مٹ سکتا ہے کہ شوکت علی عہدہ معتمدی سے استعفیٰ دیں۔ اور سینٹرل خلافت کمیٹی کا دفتر دہلی میں لایا جائے اور چھوٹانی مل کے لئے رسیور مقرر ہوں جن سے علی برادران کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ میرے خیالات ہیں۔ مگر میں جماعت کے فیصلہ کا پابند ہوں۔ والسّلام

حبیب الرحمٰن
صدر خلافت کمیٹی پنجاب

۲۳/اگست ۱۹۴۵ء

محترم پنڈت جی

تسلیم۔ آپ نے اپنی کتاب 'میری کہانی' میں لکھا ہے کہ نیشنلسٹ مسلمان آہستہ آہستہ ختم ہوگئے۔ مگر آپ نے کبھی غور کیا کہ ان کو کس نے ختم کیا۔ میرے نزدیک مہاتما گاندھی اور آپ نے سب سے زیادہ خدمت انجام دی ہے اور راجہ جی نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ آپ نے مسلم لیگ اور جعت پسند طاقتوں کو مسلمانوں کا نمائندہ سمجھ کر ہمیشہ ان سے بات کی۔ آپ نے مُسلم لیگی لیڈروں کی پارٹیاں لیں، جس کی بنا پر عام مُسلمان اور حکومت یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ مسلمانوں کی نمائندہ مسلم لیگ ہے، جمعیۃ عُلماء، مجلس احرار اور آزاد خیال مسلمان نہیں ہیں۔

حافظ ابراہیم صاحب کے الیکشن میں آپ نے ہم سب کو بلایا اور کامیابی کے بعد نواب اسماعیل صاحب کے جواب میں آپ نے یہ لکھا کہ انتخاب میں جو سخت کلامی یا زیادتی ہوئی ہے وہ احرار اور جمعیۃ کے کارکنوں کی ہے۔ گویا کانگریس کی خدمت کرنے کا یہ سرٹیفکیٹ تھا جو آپ نے ہمیں دیا تھا اسی طرح جب لکھنؤ کا کانگریس کے مشورے سے حافظ ابراہیم صاحب کا جلوس کامیاب کرنے کے لئے احرار والینٹرز اور کارکن جس میں میں بھی شریک تھا، کان پور گئے تو وہاں پر مُسلم لیگ کی طرف سے حافظ ابراہیم کے جلوس پر پتھروں کی بارش اور لاٹھیاں برسائی گئیں اور حالات یہ ہوگئے کہ حافظ صاحب اور میں شاید قتل ہو جائیں۔ تب احرار والینٹرز نے حافظ صاحب کی اور میری جان بچائی، اور وہ خوب پٹے اور زخمی ہوئے مگر ہوا یہ کہ احرار والینٹرز اور لیگی والینٹرز دھر لئے گئے اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کان پور نے بیان دیا کہ احرار اور لیگ کا فساد ہو گیا

---

[1] سوامی جی سے مراد سوامی شردھانند جی ہیں۔

[2] خلافت کمیٹی پنجاب اور علی بھائیوں کا اختلاف ایسا ہی تھا جیسا کہ اقبال نے کہا ہے کلہ ہائے وفا و جفا ئما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے۔ کسی بت کدہ میں بیان کروں تو صنم بھی کہہ دے ہری ہری

اس لئے گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں لیگی والینٹرز کی ضمانت اسی دن سے لی گئی اور احرار کی آٹھ دن کے بعد۔ اس قسم کے دس بارہ مثالیں صرف، یو، پی گورنمنٹ کی آپ کو بتا سکتا ہوں۔

شملے میں تو آپ نے مُسلم لیگ کو پانچ سیٹیں دینا منظور نہ کیں۔ مگر وار دھا جا کر گاندھی جی نے بیان دے دیا کہ پاکستان سیکشن ابھی تک منظور ہے۔ اس کہنے کا شملہ کانفرنس کے بعد یہ مطلب ہے کہ کانگرس کے ہندو لیڈر پاکستان دینے کو تیار ہیں اور اگر رکاوٹ ہیں تو حبیب الرحمٰن سے لے کر ابوالکلام آزاد تک۔ آپ نے کشمیر پہنچتے ہی نواب ممدوٹ صدر مسلم لیگ پنجاب اور نواب دولتانہ سکریٹری مسلم لیگ پنجاب کی دعوت پر آپ نے پارٹی لی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے مولانا آزاد پر جوتوں اور پتھروں کی بارش کرائی۔ ان کو آپ نے عزت بخشی۔ آپ نے انکے اس کہنے کو سچا کر دیا کہ ہمارے دل میں کانگریس کے ہندو لیڈروں کی پوری عزت ہے البتہ کانگریسی مُسلمانوں کے لئے ہمارے دل میں کوئی عزت نہیں ہے۔ سینکڑوں مُسلمان میرے دوست یہ کہتے ہیں کہ جب پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی لیگی لیڈروں کی عزت کرتے ہیں تو آپ ان کے کیوں خلاف ہیں۔ معاف کریں آپ نے نیشنلسٹ مُسلمانوں اور آزاد خیال مُسلمانوں کو استعمال کرتے ہیں، اور بس۔ آپ میاں ممتاز دولتانہ کے یہاں ٹھہریں گے جو کمیونسٹ ہونے کے ساتھ مُسلم لیگی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے اس کے کہنے پر پارٹی بھی لی ہے۔ اس طریقۂ کار نے کانگریس اور ملک کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے۔

پنڈت جی آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کانگریس یا آپ لوگوں سے نہ کوئی لالچ ہے اور نہ کوئی غرض جو مُسلمان آج ہمارے مخالف ہیں وہ ہمارے پیر چومتے تھے اور پیر چومنے کو تیار ہیں اُن کو ہم سے ایک مطالبہ ہے کہ ہم کانگریس کے معاملہ میں صرف خاموش ہو جائیں۔ ہم نے جب تک کانگریس کا ساتھ دیا ہے یاد ہے رہے ہیں۔ وہ ہندوستان کی آزادی اور ملک کی عزت کے لئے ہے۔ ہم نے ملک کی آزادی کی محبّت میں عزت، آبرو اور مال سب کچھ قربان کر دیا ہے۔ کاش ہندو کانگریسی لیڈروں کے دل میں اس کا احساس ہوتا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا ہمارے ساتھ طریق کار ایک سیاست داں کا ہے ایک محب وطن کا نہیں ہے۔ آپ افتخار الدین جیسے مسلمانوں کے دوست ہیں جن کے مسلمان ڈرائیور بھی ان کے ساتھ نہیں ہیں اور یا مُسلم لیگ کے لیڈروں سے آپ ملے بغیر چل نہیں سکتے۔

میں یہ کہنا بھول گیا کہ جب ملک خضر حیات خاں نے پنجاب میں جناح اور مُسلم لیگ کو ختم کر دیا تو گاندھی جی نے بھائی جناح لکھ کر اس کو زندہ کر دیا۔ اگر ملک کی آزادی کی محبّت ہمارے دل میں نہ ہو تو سچ کہتا ہوں کہ آپ کا طرز عمل ایک منٹ کے لئے بھی کانگریس میں کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ کا فرض تو یہ تھا کہ کوئی مسلم لیگی لیڈر آپ کے پاس آتا تو آپ اس سے کہتے کہ جو بات کرنی ہے وہ مولانا داؤد غزنوی اور حبیب الرحمٰن سے کرو اور بس۔ اگر آپ لوگوں نے ایسا کیا ہوتا تو آج آپ کو یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے کہ کانگریس میں تلاش کرنے سے بھی مُسلمان نہیں ملتا۔ آپ کا جواب آنے پر آپ کی اجازت سے یہ خط پریس کو دیا جائے گا۔

آپ کا بھائی

(مولانا) حبیب الرحمٰن لدھیانوی

صدر مجلس احرار اسلام ہند

۵ مئی ۱۹۳۱ء

مولائے اکرم

میں نے آپ کی طرف سے مطمئن تھا اور نہ سب نے لاپرواہی برتی، بلکہ سعی رہائی کے بعد مایوس ہو کر اپنے اور آپ کے جذبہ خودداری پر بھروسہ کر گیا۔

ہوم سکریٹری اور دیگر ذمہ داروں سے جا کر تبادلۂ خیالات اکثر اوقات کرتا رہا۔ لیکن گورنمنٹ پنجاب کی رپورٹ پر "آپ کی تقریر تشدد

انگیز اور پر جوش ہوتی رہی" ہمارے لئے فوراً سوال خودداری کا پیدا ہو گیا اور اس کے بعد اب اس سے زیادہ گر گر التجا کو آپ کے ایثار کے منافی اور خودداری کی ضد سمجھا اور مناسب جانا کہ چند دنوں کی مدت پوری کر کے بے منت غیر آپ عنقریب آجائیں گے اور جلد از جلد مجھ سے ملاقات ہو گی۔

بعض اہم امور کے متعلق آپ سے جلد ملاقات ہونا ضروری ہے۔ آپ بعد آزادی آجائیں تو بہتر ہے۔

میں ۹ر تک تو دہلی میں مسلسل رہوں گا، اس کے بعد شاید بھوپال اور پھر ۱۷ر کو رام پور رہوں گا۔

فقط والسّلام

مخلص مختار احمد انصاری (ڈاکٹر انصاری مرحوم)

۳۱ مئی ۱۹۳۱ء

مکرمی جناب مولوی حبیب الرحمٰن صاحب

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ولی مبارک باد عرض ہے۔

اپنی مدت قید پوری ہی کر چھوڑی۔ ہاں کیوں کسی کا احسان لیجئے۔ مردان خوددار اسے ہی کہتے ہیں۔ ماشاء اللہ، سبحان اللہ

میں آج رام پور جا رہا ہوں۔ آپ کی ملاقات نہایت ضروری ہے۔ ایک وقت کے لئے آپ اگر ۴ جون کو آجائیں تو سب سے ملاقات بھی ہو سکے گی۔ باقی عند التلاقی

فقط والسّلام

مخلص مختار احمد انصاری

دہلی دریاگنج، دہلی

۵ر مئی ۱۹۳۱ء

جناب مولانا۔ وعلیکم السّلام رحمۃ اللہ

آپ کا خط ۲۵ جون ۱۹۳۱ء کا آج مجھ کو بعد واپسی ملا۔ اور یہ اتفاق ہے کہ بالکل اسی طرح کا خط شیخ صاحب کا بھی امرت سر سے آج ہی پہنچا۔ مضمون دونوں خطوط کے واحد ہیں اور صرف لفظی طور پر اقلیتوں کے لئے ۳۰ فیصدی پر ترمیم کا اصرار ہے، اسے توارد سمجھوں یا خیال کی یکسانیت بہر حال یہ واقعہ ہے کہ آپ لوگوں کا اصرار یکساں ہے۔

میں نے اپنی فرید پور کی تقریر میں علی الاعلان آپ لوگوں کی منشا کے مطابق ترمیم بجائے تیس فی صدی کے ۵۲ فیصدی کر دی۔ اور نہ صرف یہ بلکہ آپ دیکھئے گا کہ اقلیتوں کے تحفّظ کی تعداد بجائے ۳۰ فیصدی کے ۲۵ فیصدی کر دی گئی۔ بلکہ پنجاب اور بنگال میں اکثریتوں کے اگر بالغوں کو حق رائے دہی نہ دی جائے یا اگر ووٹروں کی فہرست پر مسلمانوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے نہ آسکے تو اس وقت تک جب تک کہ ان دونوں میں سے کوئی صورت پیدا نہ ہو ان دونوں صوبوں (پنجاب اور بنگال) میں مسلمان اکثریت کا کم سے کم ۱۵ فیصدی نشستوں کے تحفّظ کا مطالبہ کرے گی میں اپنی تقریر کی ایک کاپی شیخ حسام الدین کے پاس روانہ کر رہا ہوں اور ان سے استدعا کر دی ہے کہ وہ آپ کے پاس ترجمہ کر کے جلد بھیج دیں گے۔

اسی تقریر میں صفحہ ۵ کی دفعہ الف شامل ہے...... اس سوال کو کافی توضیح کے ساتھ حل کر دیا ہے جو آپ لوگوں کے اجلاس میں کمی رہ گئی ہے اور جس کی واپسی پر لوگوں کو اصرار ہے اور یہ کہ نہ صرف وہ دفعہ واپس ہو گئی ہے بلکہ بعض اور مفید تجاویز پر حاوی ہے۔

مولانا! میں نے کئی خطوط لکھے جن کے جواب میں آپ کی تشریف آوری کا مقرر جواب ممکن ہے آیا ہو لیکن آپ کے آنے کی اشد

ضرورت تھی۔ مجھ کو اپنے گجرات جیل کے احباب سے سخت گلہ ہے اور آپ سے تو سخت شکایت ہے۔ دیکھئے کہ سب نے نیشنلسٹ مُسلم پارٹی کے بعد لکھنؤ کے قریب قریب (کچھ دنوں سے یا کچھ دنوں بعد) چودھری صاحب شیخ حسام الدین صاحب۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور غازی عبدالرحمٰن صاحبان کو الگ الگ خطوط لکھے اور ان میں سے کسی نے بھی گوارانہ کیا کہ مجھ کو اس خط کی رسید ہی لکھ دیتے۔

چودھری صاحب نے ڈاکٹر سیّد محمود صاحب کو ایک خط لکھا اور اس کی نقل مجھ کو بھی بھیج دی۔ گویا میرے اس خط کا جس میں سیاست حاضرہ پر شرکت عمل کی دعوت تھی، اس طرح جواب دیا گیا۔ بہر حال میں نہیں سمجھتا کہ اب اس اعلان ترمیم کے بعد بھی آپ لوگوں کے لئے سعی اور جدوجہد میں خوئی عذر باقی ہوگا۔

مولانا! کہی ہوئی باتوں پر اعتماد نہ کرنا چاہئے۔ ہم کو ان دراندازیوں سے بالکل الگ رہ کر اپنے عزم واستقلال کا مظاہرہ کرنا ہے۔ پیشتر کوئی کون تھا یا اس کا نصب العین کیا تھا، اس بیکار مسئلہ پر گفتگو میں وقت ضائع نہ کرنا چاہئے اور نہ آپ کو اس میں وقت ضائع کرنا چاہئے۔ کہنے والے اس سے بھی زائد آئندہ کہیں گے۔ ہم کو اپنے کام سے کام ہونا چاہئے۔

آج میں جارہا ہوں اگر آپ کے یہاں کی تاریخیں ۱۱، ۱۲ کے بجائے تیسرے ہفتے جلسے کے لئے مقرر ہوتیں تو میں بھی کسی نہ کسی طرح شرکت کرتا اور تبادلۂ خیال سے فائدہ اٹھاتا۔ لیکن بمبئی سے ۱۰ کو روانہ ہو کر ۱۲ کو لاہور پہنچنا میرے لئے ناممکن ہے۔ ابھی ابھی فرید پور سے مارا مار چلا آرہا ہوں۔ تکان کے علاوہ اب طبیعت بھی اس قدر شدید محنت کی متحمل نہیں رہی۔ والسّلام

آپ کا مخلص

مختار احمد انصاری (دہلی دریا گنج)

رحمان منزل، لدھیانہ۔ ۲۴ جولائی ۱۹۳۱ء

محترمی ومکرمی جناب ڈاکٹر صاحب

السّلام علیکم۔ آپ سے رخصت ہو کر میں اور شاہ صاحب اور شیخ حسام الدین صاحب دو دن میرٹھ ٹھہرے اور ۱۲ جولائی ۱۳ئی کی شام کو لاہور پہنچے۔ ۲۲ اور ۲۳ دو دن تک مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کانگریس کے فارمولا پر غور کرتی رہی۔ بعض اختلافات کی وجہ سے فارمولا قابل قبول قرار دیا گیا۔ آج یا کل ایک بیان اس کے متعلق جماعت کی طرف سے شائع ہو جائے گا۔ جن وجوہات کی بنا پر فارمولے کو نامنظور کیا گیا ہے، میرے خیال میں وہ ایسے نہیں ہیں کہ اگر آپ کوشش فرمائیں تو ان کا حل ہو سکتا ہے۔ اس عریضہ لکھنے سے اصلی مقصد یہ ہے کہ ہماری جماعت کا کوئی فرد ایک منٹ کے لئے یہ نہیں چاہتا کہ وہ آپ سے یا حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے کسی مخالفت کا اظہار کرے۔ آپ نے دہلی میں کئی تقریریں فرمائی ہیں اس کا خلاصہ جو اخبارات میں شائع ہوا ہے وہ یہ ہے کہ "علیحدہ انتخاب کے حامی سب کے سب گورنمنٹ کے تنخواہ دار ہیں"۔

اس فقرہ سے ہم سب کو اذیت پہنچی ہے۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ اخبارات میں اس کا تردیدی بیان دے دیا جائے۔ پھر سب دوستوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ آپ کی خدمت میں لکھا جائے، آپ ہی تردید فرمادیں کیونکہ شاید اخبارات نے غلط رپورٹ شائع کی ہو۔ مجھ کو امید ہے اس معاملہ میں آپ ہماری امداد فرمائیں گے۔

وہی خواہش ہے کہ آپ نے بمبئی جانے سے پہلے آپ سے ایک دفعہ پھر مل سکوں۔ بشرطیکہ بذریعہ تار مجھے اطلاع مل جائے کہ آپ اس روز دہلی میں ہیں۔

والسّلام معہ الاکرام

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

صدر مجلس احرار ہند

صداقت آشرم پٹنہ۔ ۲۵/ مارچ ۱۹۳۶ء

مکرمی مولانا صاحب

بعد آداب تسلیم۔ میں بخیریت پٹنہ پہنچا۔ آپ کی خیریت چاہتا ہوں۔ آپ نے مہربانی کرکے جو الجمعیۃ کا پرچہ بھیج دیا تھا۔ اس کی نسبت میں نے یہاں ایسوسی اٹیڈ پریس کے مینجر کے پاس خط لکھا جو میرا بیان الجمعیۃ میں چھپا ہے، وہ میں نے نہیں دیا اور وہ کہاں سے ایسوسی اٹیڈ پریس نے الجمعیۃ کے پاس بھیجا۔ اس کے جواب میں جو خط آیا ہے اس کی نقل بھیج رہا ہوں اس سے صاف ظاہر ہوگا کہ میں نے یہ بیان دیا ہی نہیں۔ چونکہ آپ نے مہربانی کرکے میری توجہ اس طرف دلادی تھی۔ آپ کو اس کی نسبت عرض کردینا ضروری سمجھا اور شکریہ ادا کرتا ہوں۔ نہیں تو یہ غلط فہمی رہ جاتی اور مجھے کوئی موقع بھی اسے صاف کرنے کا نہیں ملتا۔ زیادہ آداب۔

نیاز مند

راجندر پرشاد

(صدر جمہوریہ ہند)

۱۶/ دسمبر ۱۹۳۶ء

آل انڈیا کانگریس کمیٹی، سوراج بھون الہ آباد

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب صدر مجلس احرار لاہور

مکرمی۔ آپ کا خط مجھے بمبئی سے واپسی پر کل ملا۔ اس کا جواب (انگریزی میں بھیجتا ہوں لیکن آپ کی آسانی کے لئے یہ مختصر جواب اردو میں بھیجتا ہوں۔ میں نے اپنے پہلے خط میں آپ کی توجہ چند سوالوں کی طرف دلائی تھی۔ ان سوالوں کا ذکر آپ نے اپنے جواب میں کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پر غور کریں اور اپنی صلاح مجھے دیں۔ مجھے اس بات سے مطلب نہیں ہے کہ ہندو مہاسبھا یا نیشنلسٹ پارٹی کی کیا اس مسئلہ میں رائے ہے۔ مجھے تو کانگریس کی رائے سے مطلب ہے اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو اس سے کیا شکایت ہے۔ کانگریس کی رائے یہ ہے۔

فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوستان کی آزادی کے لئے نقصان دہ ہے۔ وہ ہندوستان بھر کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے اور جو ہمارے اصلی سوال غربی اور بیکاری ہیں ان کو پیچھے کردیتا ہے۔ یاد رکھئے کہ یہ فیصلہ خالی ہندوؤں اور مسلمانوں کی نسبت نہیں ہے۔ اس میں سب قومیں اور فرقے شامل کئے گئے ہیں یہاں تک کہ انگریز بھی ہیں۔ اس کے ذریعے سے ہندوستان کے آٹھ نو ٹکڑے ہوگئے ہیں۔ بنگال میں جو یوروپین ہیں ان کی خاص اہمیت ہوگئی ہے اور ان کی رضامندی کے بغیر کسی گروہ کے لئے بھی کام کرنا مشکل ہوگا۔ اس لئے یہ فرقہ وارانہ فیصلہ مسلمانوں کا خالی نہیں ہے بلکہ اس میں اور بھی پیچیدگیاں ہیں جو ہمیں آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ ایک اور بات غور طلب ہے کہ اس فیصلہ سے اثر کچھ اوپری لوگوں پر آتا ہے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان یا کوئی اور عام لوگوں پر یا ان کے سوا کوئی اثر ہمیں غربی یا ہندوستان کی بڑھتی ہوئی بے کاری سے کوئی مطلب نہیں۔ جو شخص ملک کی آزادی چاہتا ہے یا جو شخص عام لوگوں کی غربی دور کرنا چاہتا ہے اس کو ان اوپری باتوں میں دلچسپی نہیں ہوسکتی ہے۔ اور جو جو رکاوٹیں اس کے راستہ میں آئیں ان کو ہٹانا چاہتا ہے۔ فرقہ وارانہ فیصلہ ایک بنیادی طور سے ہماری قومیت اور آزادی کے خلاف ہے چنانچہ اس کو ہٹانا ہی ہے۔ اگر ہم آزادی چاہتے ہیں کیوں کہ آزادی اور یہ فیصلہ ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔

یہ کانگریس کی رائے ہے، جہاں تک اصولی سوال ہے لیکن کانگریس کا یہ بھی پختہ یقین ہے کہ اس مسئلہ پر کوئی مناسب فیصلہ نہیں ہوسکتا جب تک کہ مختلف فرقے مل کر رضامندی کے فیصلے پر نہیں پہنچتے۔ اس لئے کانگریس کوئی قدم بغیر اس رضامندی کے نہیں اٹھانا چاہتی۔ علاوہ رائے دینے کے وہ کوشش اس بات کی کرنا چاہتی ہے کہ ہم سب آپس میں مل کر فیصلہ پر پہنچیں۔ آپ ان دونوں باتوں میں فرق دیکھئے گا۔ کانگریس کی رائے صاف ہے، وہ فرقہ وارانہ فیصلہ کے بالکل خلاف ہے لیکن عملی طور پر وہ کچھ کیا نہیں چاہتی جب تک کہ آپس کا فیصلہ

نہ ہو جائے اس کی رائے کہیں لی جائے تو وہ رائے ضرور دے گی۔ اگر نئی کونسلوں میں یہ بات پیش ہو (کانگریس والے نہیں ہیں کہ مگر) تب کانگریس اپنی رائے ضرور دے گی کہ فرقہ وارانہ فیصلہ غلط اور نقصان دہ ہے لیکن اس کے ساتھ اس بات کو صاف کرنا چاہے گی کہ اس میں ترمیم اس سمجھوتہ کے ساتھ ہونی چاہئے اس کے لئے ایسے مسئلہ پر کوئی رائے نہ رکھنا یا خاموش رہنا ایک فضول اور نکمی بات ہو جاتی ہے۔

مہربانی کرکے آپ مجھے بتائیے کہ اس کانگریس کی رائے سے آپ کو کیوں نااتفاقی ہے۔ آپ اور آحرار لوگ ہندوستان کی کامل آزادی چاہتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فیصلے کے ہوتے ہوئے ایسی آزادی ہم حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر آپ اس کو ایک رکاوٹ سمجھتے ہیں تو وہ ایک غلط چیز ہے اور اس کو ہٹانا چاہئے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ہندوؤں کو کیا ملے اور مسلمانوں کو کیا ملے جو بھی کچھ کسی کو ملے یہ فیصلہ غلامی کا فیصلہ ہے اور کوئی قوم جو آزادی چاہتی ہے اس کو منظور نہیں کرسکتی۔ یہ ممکن ہے کہ مسلمانوں کو جو کچھ اب ملا ہے وہ کسی اور ذریعے سے بھی محفوظ رہ سکے۔ لیکن اس فیصلہ کی بنیاد ہر صورت سے بدلنی پڑے گی۔ اور عام مُسلمانوں کو ملا ہی کیا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مسئلوں پر غور کرکے اپنی رائے بھیجیں۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کو اس فیصلہ سے زیادہ نقصان ہے بہ نسبت اوروں کے۔ اگر کسی کو فائدہ ہے تو وہ ایک مٹھی بھر اوپر کے آدمیوں کو، اور عام لوگوں کو نہیں۔

فقط نیاز مند

جواہر لال نہرو

۱۷/اپریل ۱۹۳۰ء

میرے نہایت ہی عزیز اور قابل تکریم دوست و بزرگ

آپ کا شفقت نامہ پڑھا۔ خود کو کھویا ہوا سا محسوس کرنے لگا۔ میں حیران ہوں اور افسوس کے ساتھ معرضِ خدمت ہوں کہ میری نسبت آپ کی معلومات سر تا پا غلط اور بے معنی ہیں۔ آپ کو یقین ہونا چاہئے کہ میں آپ سے مُحبّت کرتا ہوں اور صرف محبت کرتا ہوں۔ میں اس بات کا نہایت شرمندگی کے ساتھ اقبال کرتا ہوں کہ مجھے اپنے والد بزرگوار سے کبھی کوئی دل بستگی اور محبت نہیں ہوئی میری زندگی میں یہ سب سے پہلا موقع ہے کہ میں ان جذبات کو جو کہ ایک شریر بچہ کو اپنے شفیق باپ کے ساتھ ہوا کرتے ہیں آپ کے ساتھ اپنی طرف سے وابستہ دیکھتا ہوں۔

میری طرف سے آپ کے متعلق سوائے مُحبّت اور عقیدت کے اور کچھ بھی معرضِ تحریر اور بیان میں نہیں آسکتا۔ میں نے ہرگز کبھی اور کسی سے یہ نہیں کہا کہ آپ مجھے مُسلمان بنانا چاہتے ہیں بلکہ میں ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ آپ سدا ہی میرے دہریہ پن سے، اپنی گہری محبت کے باعث دکھی اور پریشان رہے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ اس نے اپنی کم فہمی اور بے وقوفی کی وجہ سے میرے لفظوں کو غلط شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا۔ کتابوں کے متعلق بھی کسی نے بالکل ہی غلط کہا کہ میں نے بالکل نہیں پڑھیں یہ بالکل ٹھیک ہے کہ میں نے سب نہیں پڑھیں لیکن ان کا بیشتر حصہ پڑھا جس میں سے ابھی تک بھی بہت کچھ میرے ذہن میں ہے۔ بوقت ضرورت اسے بیان بھی کرسکتا ہوں۔ پھر میں نہایت ادب سے اور نہایت افسوس کے ساتھ جناب کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ میری نسبت جو کچھ آپ سے کہا گیا وہ بالکل غلط لغو اور بیہودہ ہے۔ میں نہایت زور سے اس کے خلاف پروٹسٹ کرتا ہوں اور آپ سے نہایت عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ مجھ کو ہمیشہ ہی اپنا عزیز ایک بے وقوف اور ہیچمداں تصور فرماتے رہیں۔ مجھے یہ سب کچھ معلوم کرکے سخت تکلیف ہوئی ہے۔

مجھے آپ کے خطوط نہیں ملے ورنہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ میں ان کا جواب نہ لکھتا۔ میں حسب معمول نہایت ہشاش بشاش اور جوش و خرم ہوں اپنے ان ایام اسیری سے بہت کچھ فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ خوب ورزش کرتا ہوں اور روزانہ آٹھ نو گھنٹے نہایت غور سے مطالعہ کرتا ہوں۔ کم از کم میرے لئے تو کتابیں نہایت ہی مفید ثابت ہوئی۔ میں بہت کچھ سیکھ رہا ہوں جس کے لئے باہر رہ کر وقت نہیں مل سکتا تھا۔ کاش کہ لکھنے کی بھی اجازت ہوتی۔

نہایت افسوس ہے کہ آپ جیسا صلح جو انسان ایسا نہیں کہہ سکتا۔ اگر کبھی لدھیانہ خط تحریر فرمائیں تو اپنے بزرگوار کی خدمت میں میرا نہایت عاجزانہ سلام لکھ دیجئے گا مجھے ان کی وہ شفقت کیک اور بسکٹ کبھی نہیں بھولیں گے۔ مولانا عبدالغنی اور اسلم کو بھی سلام کہہ دیجئے گا۔

مجھے سخت افسوس ہے کہ ابھی تک خدا کے متعلق میرے وہی خیالات ہیں بلکہ کچھ زیادہ گہرے ہیں۔ میں شرمندہ ہوں اور جناب سے معافی کا خواستگار ہوں۔

مکرمی پنڈت جگت رام جی کی خدمت میں میری نہایت خلوص، عقیدت اور محبّت سے نمسکار عرض کر دیجئے گا۔ خواہش ہے کہ کبھی ان کے بھی درشن ہو جاتے۔ نصیحت کے لئے میں ان کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ سردار جوالا سنگھ جی پنڈت جی کو بہت یاد کرتے ہیں اور نمستے کہتے ہیں۔

آپ کا دہی جنگ[1]
ملتان سنٹرل جیل

۳۰/ اکتوبر ۱۹۳۰ء
ملتان جیل

قابل تعظیم بزرگ حضرت مولانا۔ تسلیم

واللہ، بہت کوشش کی کہ جذبات کے زیر و بم کو فکر حیات کی غاروں میں ہی خوابیدہ پڑا رہنے دوں۔ لیکن ڈرتا تھا کہ ذرا سے مس سے یہ کانپ کر جھنجھنا اٹھیں گی، سرسرائیں گی اور سر دھننا شروع کر دیں گی۔

بہ دل من فطرتِ خاموش می آمد موسم　　　　سازاز ذوق تو اخود ابمضرابی شب زندہ

آج کم بخت دل ایک عرصہ دراز کی جدوجہد کے بعد کشاں کشاں آپ کے قدموں کی طرف لئے جا رہا ہے۔ آج وہی پرانی باتیں سامنے آ رہی ہیں۔ آپ کی پدرانہ شفقت آنکھوں میں جھانک جھانک کر مسکراتی نظر آ رہی ہے۔ بعد میں اپنے وسیع الخیال کے آنے سے آپ کے قدموں کو چھو رہا ہوں میرا قلب ایک آواز کے لئے تڑپ رہا ہے۔ میں بولتا ہوں لیکن جواب نہیں سنتا، گاتا ہوں لیکن آواز ترنم نہیں پاتا۔ لاچار عاجز ہو کر چیخ رہا ہوں۔ آہ معلوم ہوتا ہے کہ دل کن کی باتوں میں الجھ کر اسیر ہو رہا ہے اور میں .....وہاں ہوں جہاں ایک کھوکھلی بانسری کی طرح چیخنے اور چلانے کے لئے رہ گیا ہے۔ ہوا کی لہریں میری خوشیوں کے ہمراہ کراہتی ہوئی پھر رہی ہیں۔ میری تنہائی اپنی جگہ سسکیوں کی تاب نہ لا کر بے حس و حرکت میرے چاروں طرف اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہے

آج ایک خیال آیا۔ اتنا عرصہ آپ کے ساتھ رہ کر پھر بھی میں آپ کو کیوں نہ دیکھ سکا اور کیوں نہ اپنے دل کی بات لکھ سکا۔ صرف اس لئے کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی حیثیّت بہت اونچی ہے میں اشارۃً بھی کسی پیغام کو راز دارانہ پیغام نہیں بنانا چاہتا۔ ایسے وسیع خیالات شاید آپ تک نہ پہنچے ہوں۔

محبّت! سوز و گداز کے سفید کھلے ہوئے کنول پر خاموش و باچشم پرنم بیٹھی کسی ایک سمت کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ محبّت! جذبات کے انتہائی عروج پر پہنچ کر تمام موجودات سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ لیکن محبت بے زبان ہوتی ہے۔

شہید　محبّت　نہ　کافر　نہ　غازی
محبّت　کی　رسمیں　نہ　ترکی　نہ　تازی

پھر بھی میں آپ کو لکھ رہا ہوں۔ جیسے بادلوں میں گھری ہوئی رات اپنی انتہائی تاریکی میں بھی بجلی کی کرن سے چمک اٹھتی ہے اور خوفناک بلاخیز

[1] اب چودھری کرنل شیر جنگ۔ ماڈل ٹاؤن دہلی میں قیام پذیر ہیں چودھری صاحب نے ۱۲سال جیل کاٹی ہے "مرتب"

طوفان جب اپنی پوری قوت سے سمندر کی چھاتی کو طوفان خیز موجوں میں تبدیل کر دیتا ہے تو اپنی "لامتناہی" کو تلاش کرتا ہے کہ میں کتنا عظیم ہوں ٹھیک اسی طرح جذبات میں چھپا ہوا دل۔ دل کے تاریک پہلوؤں کے راز کے افشا ہوتے ہی اپنی انتہا دیکھتا ہے۔ یہی دل کی خوشی ہے، خواستہ ونخواستہ کہتا ہے اور خواستہ ودیکھتا ہے۔

جس طرح کہ پرندے گاتے ہیں۔ چڑیاں اڑتی ہیں۔ برف پگھلتی ہے۔ گلاب کھلتے ہیں۔ مٹی کا دیا زندگی کی لہریں دیکھ کر بجھ جاتا ہے۔ صبح کا وقت، کالے کالے درختوں کے پیچھے سے جو کہ متکبر اور غیور پہاڑ کی چوٹی کے پیچھے کھڑا ہے۔ اور پہاڑ کی چوٹی برف کی طرح سفید ہو جاتی ہے۔

نرم بادل کی باریک سے باریک چادر بھی نہیں تھی۔ دور کی ٹھنڈی ہواؤں کا آوارہ سے آوارہ جھونکا بھی نہیں تھا۔ میں تھا اور وہ پھیلی ہوئی آگ اور میری لامحدود تنہائی تھی اور بس۔ دماغ میں ایک دھندلا سا خیال تھا اور زبان پر ایک تڑپتی ہوئی آہ تھی۔

محرمے خواست زمرغ چمن و باد و بہار
تکیہ پر صحبت آں کر دکہ پردازے داشت

میں دن بھر اپنی کوٹھری میں پریشان گم کردہ اور آوارہ پھرا کرتا۔ رات آتی اور بلاوجہ مجھے چھیڑ چھیڑ کر جگاتی رہی۔ بالآخر پریشانی میں گانا شروع کرتا، گانا گاتا اور یہاں تک گاتا کہ صبح اپنا زریں بربط لئے میرے نغموں سے اپنا ساز ملا ڈالتی اور میرے آس پاس کا بحر خموشی طیور کی ننھی ننھی اور میٹھی میٹھی آواز نغمہ میں تبدیل ہو جاتا اور میں بس صُم بُکم بن کر خاموش ہو جاتا۔ اگلے دن کی آوارگی و پریشانی لکھنے کیلئے اپنے بکھرے ہوئے حواس کو اکٹھا کر کے تیار ہو بیٹھتا۔ یہ تھی میری حالت جب رہتے ہوئے زخم کی طرح میں یہاں آیا تھا۔

آپ کا ایک شفقت نامہ اس زمانہ میں موصول ہوا تھا جو اب تک میرے سامنے جھلک رہا ہے۔ اس کے بعد آپ نہ جانے کہاں گئے اور کیا ہوئے۔ آج بھی جب میں یہ لکھ رہا ہوں نہیں جانتا کہ آپ کو کس مقام پر پاؤں گا۔ اور پاؤں گا بھی یا نہیں۔ کون جانتا ہے کہ اس کا کیا حشر ہو۔ بالفرض اگر کسی سیاہ دریا کے تاریک ساحل سے کسی برہم ساحل کے کنارے کسی تاریکی پر پہنچے اور عمیق راستوں سے ہوتا ہوا آپ تک پہنچ بھی گیا تو کیا ہے۔ آپ مجھے لکھیں گے اور سرفراز کریں گے (خدا کرے کہ آپ تک پہنچ جاؤں)۔

ہاں! اگر آپ کے پاس ہوں یا اگر کوئی دِقت نہ ہو تو ڈاکٹر اقبال کی اردو اور فارسی تصانیف جو منظوم ہوں مجھے بھیج دیجئے۔ زبورِ عجم آپ کی میٹھی یادگار میرے پاس ہے۔ اس کے علاوہ بھجوا دیجئے۔ کچھ نہ کچھ گاتا رہوں گا۔

مولانا عبدالغنی اور بھائی عبدالنبی کہاں ہیں؟ انھیں کچھ سعادت مل گئی یا ابھی نہیں؟ میں نے انھیں ایک خط بھیجا تھا لیکن خدا جانے وہ اب تک پہنچا یا نہیں۔ البتہ جواب مجھے نہیں ملا۔ میں نہیں جانتا اور کون کون سے اصحاب ہیں۔ اب محبّت اور آنسوؤں کے ساتھ وداع ہوتا ہوں۔ (۱۲ سالہ قیدی ملتان جیل)۔ آپ کا ہمیشہ وہی۔ شیر جنگ (کرنل چودھری شیر جنگ، پتہ ماڈل ٹاون، دہلی)

بھائی حَبیب الرحمٰن

آپ کا خط اور اخبار کی کٹنگ ملی۔ اس میں کچھ لکھا ہے وہ میرے لکھنے کا غلط مطلب نکال کر لکھا ہے۔ ہریجن پڑھئے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ میں نے دراصل کیا لکھا ہے۔

آپ کا م، ک، گاندھی

حَبیب روڈ، شفاعت منزل، لدھیانہ۔ اگست ۱۹۴۵ء

محترمہ مہاتماجی

خدا آپ کو سلامت رکھے۔ جن دعاؤں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا وہ دوسرے پرچہ پر ارسال ہیں

کل آپ کا بیان پڑھا کہ آپ مسٹر جناح کو پھر پاکستان دینے کو تیار ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کو جناح صاحب سے گجراتی (ہم وطن) ہونے کی وجہ سے بہت مُحبّت ہے۔ اس لئے آپ ان کو بھول نہیں سکتے اور ہمیشہ ان کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی غلط ہوں۔ آپ کے اسی شریفانہ طریقۂ کار نے رجعت پسند طاقتوں کو مضبوط کر دیا۔ جب سے پاکستان کا ریزولیوشن مُسلم لیگ نے منظور کیا ہے۔ اسی وقت سے آپ یہ فرمارہے ہیں کہ اگر مسلمان چاہیں تو ان کو پاکستان دیا جائے گا، میں اسی وقت سے آپ کے ان فقروں کا یہ مطلب خیال کرتا ہوں (یقین نہیں) کہ آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان صوبے الگ ہو جائیں اور ہندوستانی صوبوں کو مضبوط گورنمنٹ آسانی سے بن سکے تا کہ مُسلمانوں کے مطالبات کا قصہ ختم ہو جائے اور حالات کی مجبوری نے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا۔

خدائے پاک ہم سب کو صحیح سوچنے اور سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(مولانا) حبیب الرحمٰن لدھیانوی

دیوبند۔ ۱۹۴۵ء

محترم المقام زید مجدکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج مبارک۔ مورخہ ۱۷ر جنوری باعث سرفرازی ہوا۔ مکتوبات کے متعلق میری رائے نہیں تھی۔ مجھ پر بار بار زور دیا گیا، مگر میں نے انکار کیا جس کی وجہ متعدد ہیں۔ جن میں بڑی وجہ میری ہے۔ بفضلہ تعالیٰ ہمارے پاس حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور اکابر کے مکتوبات کا گرانی کا ذخیرہ نہایت مفید اور کارآمد موجود ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے مجھ جیسے نالائق اور کم علم بے مایہ کے مکتوبات کا ہونا انتہائی شرمناک ہے اور ان بزرگوں کی ہمسری کا ادعا ہے، کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ اپنی۔ نانیت کا مظاہرہ ہے آپ کو معلوم ہے کہ مجھ میں حضرت شاہ صاحب کا حافظہ اور تبحر نہیں ہے۔ نہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب مرحوم اور مولانا کفایت اللہ صاحب مرحوم کی ذکاوت ہے۔ نہ مولانا شبیر احمد صاحب کی حسن تقریر و تحریر اور عالمیت ہے۔ نہ ان حضرت کا متبحر اور وسعت علمی ہے۔ پھر ان حضرات کے مکتوبات کا شائع نہ ہونا اور میرے مکتوبات کی اشاعت کس قدر بے شرمی اور انانیت کی بات ہے۔ حضرت شیخ الہند، حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی قدس اللہ اسرارہم کے مکتوبات کہاں ہیں۔ حسین احمد کون چیز ہے جس کے مکتوبات شائع کئے جائیں۔ یہ عموماً باتوں پر مشتمل ہوں گے خصوصاً جب کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے اور کم مائگی کی بنا پر جیلوں اور ریلوں میں لکھے گئے ہیں کتابوں کے لئے اس کے استعداد سے خالی ہوں اور پھر تحریک آزادی کے انہماک نے مختلف اطوار اور احوال کے اندر مبتلا کیا ہو۔ کسی طرح مناسب نہیں تھا کہ ایسا ذخیرہ عام لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ مکتوبات علیحدہ علیحدہ ہونے میں اور حالت ہے جو کہ کاتب اور مکتوب الیہ کے معاملات خصوصیہ اور وقتی معاملات پر مبنی ہوتی ہے اور مجموعہ بصورت کتاب کی اور حالت ہے۔ مگر احباب نے کچھ نہ سنا اور جمع کر کے بغیر دکھائے ہوئے شائع کر دیا۔ میں اس کو غیر مفید اور ناچیز بلکہ مضر سمجھتا تھا۔ اس لئے میرا منع کرنا ان کے اور زیادہ اصرار کا باعث ہوا۔ میری کم مائگی ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ بہر حال جو نہ ہونا چاہئے تھا وہ ہو کر رہا۔ مجھ سے بار بار یہی کہا گیا کہ اس سے لوگوں کو فوائد ہوئے اور ہوں گے۔ واللہ اعلم۔ اب اگر وہ مفید ہوں فمن اللہ اور اگر غیر مفید یا مضر ہوں تو ننگ اسلاف کرام سے اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے۔

آپ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق تحریر کو پسند فرمایا۔ فللّٰہ الحمد والمنہ، جزاکم اللہ خیر الجزاء۔ مجھ کو اس کے طبع کے پہلے اور فوری دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ نیز آپ کے نشان دیئے مقامات پر نظر ڈالنے کی نوبت آئی۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مرحوم کے متعلق جو ان کی تنخواہ حیدر آباد کے متعلق لکھا گیا ہے وہی علم ہے اور موثوق ذریعے سے ہے۔ ممکن ہے کہ غلط ہو۔ مگر یہ بھی قابل غور ہے کہ سر اکبر حیدری صاحب نہ کوئی متشرع متقی ہے نہ انکو تحریکات آزادی سے لگاؤ تھا، بلکہ انگریز کے پروردہ اور اس کے آوردہ تھے۔ وہ اگر تحریک آزادی کی رکاوٹوں میں حصہ لے کر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کے مٹانے میں ایسے حضرات کو کام میں لائیں تو کیا تعجّب ہے۔ میرے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے روکنے کے لئے کیا کیا نہیں کیا گیا اور کیسے کیسے طریقے نہیں برتے گئے۔ اس کا علم مجھ کو یا واقفین اسرار

انگریز کو بہت کچھ ہے۔ میرے لئے تو بہت سے طریق ترغیب اور ترہیب کے لئے عمل میں لائے گئے اور اس میں بہت سے ثقات اور اربابِ تقویٰ سے مدد لی گئی۔ میں نہیں کہتا کہ وہ سب فاسد النیت تھے، مگر انھوں نے کیا اور بہت کچھ کیا۔ بہت کمزور تھے وہ ڈر گئے اور جو کچھ نہ کرنا چاہئے تھا، کر گزرے۔ بہر حال یہ زمانہ اور حال گزر چکا ہے۔ والعلم عند اللہ وھو یحسب لنا ولھم

مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم کیلئے وہ کلمہ غلط نہیں لکھا گیا۔ واقعات تو بہت زیادہ ہیں اتنے کلھے سے تو کوئی دوسرا زیادہ نفع اٹھا سکتا۔ ہماری معلومات تو اتنی پردہ میں ہی ہیں اور انشاء اللہ رہیں گی۔ یوم تبلی السرائر کے مشرور سے اللہ تعالیٰ ان کو اور ہم کو اور تمام مسلمانوں کو محفوظ رکھے۔

محترما! حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک نے بہت سوں کی قلعیاں کھول دیں اور بہت سے دوستوں کو دشمن اور بہت سے دشمنوں کو دوست ثابت کر دیا یا ظاہر کر دیا۔ عجیب امتحان تھا جس نے کھرے کھوٹے کا تمیز کر دیا

مرا دردیست دل اندر اگر گویم زباں سوزد　　وگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

عالیجاہا، آپ کا حُسنِ ظن مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے مگر یہ تنقیدات میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ ان مکتوبات کے ذخیرہ کو بالاستیعاب دیکھنے کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ اور نہ اب اتنی فرصت ہے۔ غلطیاں ہوں گی اور ضرور ہوں گی۔ مگر والا جاہ حسب قول شاعر ۔

مُن　ازدستِ　دیگر　ہرگز　نہ　نالم

کہ　بامن　اُنچہ　کردآں　آشنا　کرد

کاش آپ کی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے تنہائیوں میں باتیں ہوتیں تو شاید اس قدر حسنِ ظن یا اخفاء پر آپ ہم کو نہ فرماتے۔ والسلام

ننگ اسلام حسین احمد غفرلہٗ از دار العلوم دیوبند

(یہ خط ۲۳ جنوری ۱۹۴۵ء۔ مطابق ۷ا جمادی الاول ۱۳۷۳ھ کو ملا)

کوچہ رحمان۔ چاندنی چوک۔ دہلی۔ ۲۶/ جنوری ۱۹۵۴ء

بخدمت حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ حضرت کا والا نامہ ملا۔ مجھے اس بات کی سخت ندامت ہے کہ میں نے حضرت کو اس قسم کا خط کیوں لکھا۔ جو حضرت کو ناگوار خاطر ہوا۔ اللہ تعالےٰ مجھے معاف فرمائے اور آپ بھی معاف فرمائیں۔

یہ بات میں یقین سے عرض کرتا ہوں اس خط کے لکھنے میں میری نیت نیک تھی کوئی اعتراض مقصود نہ تھا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کے مخالفین کے حالات اور اندرونی واقعات کا مجھے بھی بہت کچھ علم ہے۔ مگر اسی بیماری کے زمانے میں پرانے "القاسم" رسالے دیکھ رہا تھا ایک رسالے میں اس ایڈریس کا خلاصہ درج تھا جو ۱۹۰۵ء میں گورنر لاٹوش کو مدرسہ میں دیا گیا تھا۔ اس کو پڑھ کر طبیعت ٹھنڈی ہوگئی۔ کہ مدرسہ کے بزرگوں میں دو قسم کے خیالات قدیم سے چلتے رہے ہیں۔ اس لئے اس بارے میں یہ خط لکھنے کی جرأت کی، ورنہ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں آپ کو لکھوں کہ یہ بات درست ہے یا غلط۔ آخر میں میں آپ سے پھر معافی چاہتا ہوں۔ اب تو میرا دل بہت چاہتا ہے کہ میں اپنا دردِ دل آپ کو سناؤں اور آپ سے سنوں جب بھی آپ مجھ کو وقت عنایت فرمائیں۔ والسلام

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

۲۰/ جمادی الاول ۱۳۷۳ھ

دیوبند

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج شریف۔ والانامہ مورخہ ۱۱، ستمبر باعث سرافرازی ہوا۔ یاد فرمائی کا شکر گزار ہوں۔ محترما!
مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اپنی نالائقی کی وجہ سے مہمانوں کی کماینبغی خدمت نہیں کر سکتا۔ میں جب کسی کے یہاں جاتا ہوں تو وہ حضرات قسم قسم کے عمدہ لذیذ کھانے کھلاتے ہیں۔ مگر جب وہ میرے غریب خانے پر تشریف لاتے ہیں تو نہایت معمولی اور غریبانہ کھانا پیش کیا جاتا ہے۔ وہ حضرات عنایت فرما کر اسی کو قبول کر لیتے ہیں۔ حقیقت میں یہ انہی کا احسان ہے۔ اسی طرح پینے کا پانی صرف تازہ پیش کیا جاتا ہے۔ برف کا کوئی انتظام نہیں۔ نہ کمرے عمدہ ہوادار ہیں نہ پلنگ حسب قاعدہ مکلف ہیں۔ نہ فرش اور توشک تکیہ کا انتظام ہے نہ متعدد پنکھے ہیں۔ اس لئے میں خود اپنی جگہ پر شرمندہ رہتا ہوں۔ کسی مہمان کا میرے یہاں آنا اور ٹھہرنا فقط اس کا احسان اور کرم ہے۔ میرا ہرگز ہرگز احسان نہیں ہے۔ مگر کیا کروں عاجز اور غریب ہوں پھر آپ کا کرم فرمانا اور بھی عظیم الشان ہے۔ آپ اُبلا ہوا سالن کھاتے ہیں جو کہ نہایت معمولی ہوتا ہے۔ آپ میرے مکان میں ٹھہرتے ہی نہیں، صاحب زادوں کے یہاں ہی قیام فرماتے ہیں، وہ ہی آپ کی خدمات انجام دیتے ہیں، اس پر ہی آپ کو رنجیدہ خبر پہنچائی گئی جس کی نہ مجھ کو اطلاع تھی نہ گھر والوں کو۔ ارشد کی والدہ کو اس کا سخت صدمہ ہوا اس نے اسی روز کہا تھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے کیوں آج خلاف عادت معاملہ کیا۔ وہ جب تشریف لاتے تھے حکم فرماتے تھے کہ میرے لئے ایسا سالن تیار کراؤ اور بالکل اپنے گھر کا سا معاملہ کرتے تھے۔ مگر آج ان کی روٹی سالن شیخ الادب صاحب کے یہاں سے گئی۔ اس کو اس زمانے سے جب کہ آپ کی اہلیہ محترمہ دیوبند آئی تھیں آپ کے خاندان سے خصوصی تعلق ہو گیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ مجھ کو کوئی خبر نہیں۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ روٹی پکانے والی نے یہ ناشائستہ کلمات کہے تھے۔ گھر والوں میں سے کسی کو اطلاع نہ تھی۔ اس پر آپ کو تاثر ہوا۔ یقیناً ایسے معاملہ پر جس قدر بھی مجھ کو اور والدہ ارشد کو شرمندگی ہو، کم ہے۔ اس لئے مجھ کو معافی طلب کرنی چاہئے۔ آپ تو الٹا معاملہ کر رہے ہیں۔ دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ فقط
والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ۔ از دارالعلوم دیوبند۔ ۱۶ر محرم ۷۴ ۱۳ھ

بخدمت حضرت استاذ المکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ریاست حیدر آباد کے متعلق جو ایجی ٹیشن آریہ سماج نے شروع کر رکھا ہے اس کا جواب حکومت کی طرف سے بھی نہیں دیا جا رہا اور باہر جو حیدر آباد کی حمایت ہو رہی ہے وہ بھی غلط ہے۔ لدھیانہ میں ۱۵، ۱۶، ۱۷ فروری کو آل انڈیا پرجامنڈل کانفرنس کا اجلاس تھا ہندوستان بھر کے ذمہ دار لوگ اس میں شریک ہوئے۔ کوئی ریاست نہیں جس کے نمائندے یہاں نہ آئے ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ریاست حیدر آباد سے بھی کوئی ذمہ دار آدمی یہاں آئے گا اور خوبصورت طریقے سے اپنے معاملے کو پیش کرے گا۔ لیکن وہاں سے چند آدمی آئے مگر وہ بے چارے سیاسی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ اپنے کو کہتے تھے کہ ہم گورنمنٹ کے آدمی نہیں ہیں۔ ہم پبلک کی طرف سے آئے ہیں، حالاں کہ وہ نظام گورنمنٹ کے آدمی ہیں۔ ان حضرات نے ایک اعلان بھی شائع کیا جو آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ ان کو کانفرنس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر میں نے پنڈت جواہر لال سے کہہ کر ان کو اجازت لے دی تاکہ یہ لوگ اپنا معاملہ پیش کریں۔ مگر ان حضرات نے وہاں جا کر یہ کہا کہ اگر ہمیں ووٹ دینے کا حق دیا جائے، تب ہم اپنا کیس پیش کریں گے ورنہ نہیں چنانچہ قاعدہ کے مطابق ان کو اجازت نہیں مل سکتی تھی، اس لئے انہوں نے اپنا کیس بھی پیش نہیں کیا جس سے انہوں نے ریاست کو شدید نقصان پہنچایا لیکن حسن اتفاق سے ڈیلی گیٹ میں سے ایک شخص نے یہ ترمیم پیش کی کہ جہاں ہم حیدر آباد میں ذمہ دار حکومت مانگتے ہیں اسی کے ساتھ ساتھ ہم آریہ سماج کی اس تحریک کو جو اس نے ریاست کے خلاف شروع کر رکھی ہے ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ تحریک پاس ہو گئی۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ریاست اپنی تمام قوت صرف کرنے کے بعد بھی اس تحریک کو پاس نہیں کرا سکتی تھی اور یہ حضرات جو حیدر آباد سے آئے تھے انہوں نے اس کا صلہ یہ دیا کہ رات کو مقامی مسلم لیگ کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف ایک جلسہ کیا۔ یہ خط میں نے آپ کو اس لئے لکھا ہے کہ شاید آپ

معاملہ کو صحیح لائن پر لا سکیں۔ ریاست حیدرآباد ایک بہت بڑی مشکل میں پھنس گئی ہے مگر وہاں کے لوگ اس کا کوئی حل نہیں سوچ سکتے۔ ریاستوں کے متعلق میرا تجربہ یہ ہے کہ ریاست کے حکمران حکومت اور روپیہ کے نشے میں کبھی کوئی بات نہیں سنتے۔ لیکن جب ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے تو پھر یہ اپنے مخالف کے قدموں پر ذلت کے ساتھ کرتے ہیں۔ جس طرح کہ جو حالت موجودہ وقت میں اکبر حیدری کی ہے کہ مسٹر اپنے کو تاریں دے رہے ہیں۔ کبھی ہندو یونیورسٹی کو ایک لاکھ روپے کا اعلان کیا جارہا ہے جس کو دوسری قوم نے رشوت کے نام سے تعبیر کیا۔ ریاستوں کے معاملے میں سب سے زیادہ بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان کے گرد جی حضوری ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثر سی آئی ڈی کے آدمی ہوتے ہیں۔ موجودہ آریہ سماج تحریک کا آسان جواب یہ تھا کہ ریاست ایسے پانچ سات ہندو مسلمانوں کو دعوت دیتی کہ جو ہندوستان میں کانگریسی اور پکے قوم پرست سمجھے جاتے ہیں اور ان کے سامنے آریہ سماج کا تمام حال رکھا جاتا کہ انہوں نے اسلام کے خلاف کیا کیا ہے۔ خیر تو ایسی ہی باتیں ہیں، کوئی ذمہ دار آدمی ملتا تو اس سے بات کی جاتی، جو نہ سی، آئی، ڈی ہو اور نہ جی حضوری ہو۔

کیا آپ جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس پر دہلی تشریف لائیں گے۔ اگر تشریف لانا ہو تو میں بھی ضرور دہلی پہنچوں گا۔ ورنہ ابھی تک میں نے دہلی جانے اکا ارادہ نہیں کیا۔ والسلام

(مولانا) حبیب الرحمٰن لدھیانوی، صدر مجلس احرار اسلام ہند

از ڈابھیل ضلع سورت

برادر محترم دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون آنکہ۔ آپ کا خط پہنچا۔ نہایت خوشی ہوئی۔ خدا کا شکر کہ اپنے مجمع میں تم جیسے شیر دل، مستقیم الحال، محب اسلام موجود ہیں۔ بھائی میں یہاں یک سوئی سے ایک گوشہ میں پڑا ہوا ڈھائی تین سال سے قرآن کریم اور استاد رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کی تھوڑی سی خدمت کر رہا تھا۔ فی الحقیقت مجھے بھی بے انتہا مسرت ہے کہ اس نے محض اپنے فضل ورحمت سے وہ کام کرا دیا جس کی توقع کم از کم مجھے اپنے سے نہ تھی۔ آپ دیکھ کر امید ہے بہت خوش ہوں گے۔ اوائل ربیع الاول میں میرا قصد وطن آنے کا ہو رہا ہے۔ کاش آپ سے ملاقات ہو سکے۔ مجھ کو آپ سے قلبی تعلق ہے اور آپ کے حق میں فلاح دارین کی دعا کرتا ہے۔ یہاں سب احباب خصوصاً عزیزم مولوی محمد یحییٰ سلمہٗ سلام مسنون کہتے ہیں۔ جناب مولانا عبدالرشید مرحوم کی وفات کا حال سن کر بہت قلق اور صدمہ ہوا۔ حق تعالےٰ مرحوم کو فردوس بریں میں پہنچائے اور ان کی یادگاریں بھی قائم رکھ کر ترقی دے۔

اپنے والد ماجد مولانا محمد رمضان صاحب۔ مولانا نعیم صاحب اور سب بھائیوں کو سلام مسنون کہہ دیں۔ گھر میں سب خورد وکلاں کو سلام ودعا کہہ دیں۔

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ۔ ۱۸ر صفر ۱۳۵۸ھ

دیوبند۔ ضلع سہارن پور

برادر محترم

بعد سلام مسنون آنکہ۔ کل آپ کا کارڈ غیر متوقع طور پر پہنچا۔ مجھے آپ کا دیوبند آنا معلوم ہوا تھا۔ اور یہ بھی کہ مجھ سے ملنے کا قصد کر رہے ہیں۔ بہر حال پھر کبھی موقع ہوگا تو ملاقات ہو جائے گی۔ میں آپ کے لئے دعائے خیر کرتا ہوں۔ میں تین سال سے امراض کے چکر میں ہوں۔ وقتاً فوقتاً دورے پڑتے رہتے ہیں پھر کچھ افاقہ ہو جاتا ہے۔ بقول اکبر مرحوم کمزور ہے میری صحت بھی کمزور مری بیماری بھی زندہ جو رہا کچھ کر نہ سکا۔ بیمار جو پڑا تو مر نہ سکا۔ دعا کی ضرورت مجھے بھی ہے۔ والسلام

شبیر احمد عثمانی

۲۵/ جمادی الاول ۱۳۶۶ھ

دیوبند ضلع سہارن پور

برادر محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا پرچہ مل گیا۔ اس سے قبل کوئی خط نہیں ملا۔ تعجّب ہے میں بالکل نہیں سمجھا کہ کس قصور کی معافی چاہتے ہیں۔ میرے ذہن میں تو شاید ہی آپ کے قصور کا تصور بھی نہیں۔ مجھے اس سے سخت تکلیف ہوئی کہ آپ کو میرا جواب نہ ملنے سے تکلیف ہو رہی ہے۔

میرے نہایت ہی عزیز اور محترم بھائی، اس کا تو وسوسہ بھی اپنے اندر اس دعاگو کی طرف سے نہ لایئے اور اگر فرض کیجئے کوئی قصور ہوا تو مجھے معلوم نہیں، تو آپ بالکلیہ اطمینان رکھئے کہ میرا قلب نہ صرف آپ کی طرف سے صاف ہے، بلکہ آپ کی سچی مُحبّت سے معمور ہے اور اسی طرح یہ بھی یقین رکھتا ہوں کہ آپ کے دل میں بھی میری محبت جاگزیں ہے۔ کیا آپ ایسی چیز ہیں جس کا تعلق ہمارے قلب سے محو ہو سکے۔ ہم کو آپ سے فی اللہ مُحبّت ہے۔ بلاشبہ میں نے پبلک زندگی سے ایک بڑی حد تک یک سوئی اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے اسباب جو کچھ ہوں اس لئے دائرہ خموشی میں پڑا ہوں مگر جان و دل سے اپنے احباب کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے اب آپ میری طرف سے بالکل مطمئن ہو جائیں گے۔ البتہ خدائے تعالٰے اپنے حفظ و امان میں رکھے اور تندرست کر دے۔ آپ کی زندگی بہت قیمتی ہے۔ فقط

شبیر احمد عُثمانی۔ ۲۷/ صفر ۱۳۶۱ھ

دیوبند۔ ضلع سہارن پور

برادر محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ میں اس مرتبہ بہت علیل رہا۔ درد نقرس اور درد حوالی گردہ کے شدید دورے پڑتے رہے۔ ایک ماہ تک گھر سے نہیں نکل سکا۔ اب مجھے البتہ صحت ہے۔ کچھ خفیف سا اثر پاؤں میں باقی ہے۔ امید ہے انشاء اللہ زائل ہو جائے گا۔

آپ کی خرابیٔ صحت کا حال معلوم کر کے بہت قلق ہوا۔ حق تعالٰے ظاہری و باطنی صحت عطا فرمائے ہر مُصیبت میں اللہ تعالٰے کی کچھ نعمتیں بھی مرد مومن کے لئے ہوتی ہیں جن کا اندازہ پہلے سے نہیں ہوتا۔ زندانی موت کی یک سوئی اور تنہائی نے قرآن کریم میں تدبر کا موقع دیا۔ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ بہت سے فقہاء محترمین پر قید کی سختیوں نے علوم کے دروازے کھلوائے۔ حق سبحانہ وتعالٰے آپ کو اور ہم سب کو قرآنی روح سے زندگی بخشے۔ حواشی قرآن کریم جس نقطہ نظر سے میں نے لکھے ہیں وہ اس سے مُختلف ہے جو اس وقت آپ کا نقطہ نظر ہے۔ الحمدللہ ان حواشی نے بہت سے لوگوں کے نظریۂ قرآن کے متعلق تبدیل کر دیئے اور ہر طبقہ کے تلاوت کرنے والوں کو ان سے درجہ بدرجہ فائدہ پہنچا۔ وہ بھی درست ہے۔ فی الحال جس نقطہ نظر کے ماتحت آپ مشورہ دے رہے ہیں، میں یہ ضرورت مدت سے محسوس کر رہا ہوں کاش اس کے لئے وقت مل جائے اور توفیق مساعد ہو۔ آپ بھی دعا فرمائیں۔ امید ہے دعا میں یاد رکھیں گے۔ سب احباب کی طرف سے سلام مسنون پہنچے۔ عزیزم مولوی مُحمد یحیٰی سلمہٗ کی طرف سے سلام مسنون۔

دعاگو

شبیر احمد عُثمانی

دیوبند

از ڈابھیل۔ ضلع سورت

بخدمت گرامی برادر محترم دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون آنکہ۔ آپ کا خط ملا۔ میں بہت زیادہ درس میں مشغول تھا۔ الحمدللہ کل صحیح بخاری ختم ہو گئی۔ آپ کی پھوپی کے صبرو

سکون کی دعا کی گئی اور مرحوم کی مغفرت کے لئے۔ آپ دونوں صاحب اس مرتبہ جو اثر لے گئے اسی طرح کا اثر آپ یقین کیجئے کہ ہمارے دلوں پر چھوڑ گئے ہیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کی مدد فرمائے اور بیش از بیش اپنے دین کی خدمت کا موقع دے۔ کبھی کبھی اپنے احوال سے اور مجلس کی کیفیت سے مطلع کرتے رہیں۔ ترجمان احرار علی گڑھ کے چند پرچے دیکھے۔ بعض مضامین بہت مفید اور پُر مغز ہیں۔ یہاں سب حضرات کو آپ کا خط سنادیا۔ سب سلام کہتے ہیں۔ عزیز الرحمٰن سلمہ کا حال معلوم نہ ہوا۔ کیا صورت ہوئی۔ شاہ صاحب سے ملاقات ہو تو سلام مسنون عرض کر دیں۔ میں انشاءاللہ ۱۲، ۱۳ شعبان تک دیوبند پہنچوں گا۔ کتاب کے متعلق دوسرا پرچہ ملاحظہ کیجئے۔

شبیر احمد عُثمانی

۲۰/رجب ۱۳۵۶ھ

دیوبند، ضلع سہارن پور

برادر محترم!

بعد سلام مسنون آنکہ نوازش نامہ پہنچا۔ بحمد اللہ اس کے مضمرات کو میں نے سمجھ لیا۔ اپنے مسلک سیاسی کے خلاف میری نرم سے نرم تحریر کو فتویٰ قتل سے تعبیر کرنے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا عام حالات کا جائزہ لے کر اس پر کوئی رائے قائم کرنا اور زیادہ سے زیادہ مہذب انداز میں اس کا اعلان صرف آپ ہی حضرات کا حق ہے۔ کسی دوسرے کو اس کی آزادی نہیں اور اگر محض تعلقات کی بنا پر یہ شکوہ کیا گیا ہے تو اس کا جواب اگر کبھی ملاقات ہوئی تو زبانی عرض کروں گا۔

اگر میرے طرزِ عمل سے آپ کو یہ واضح ہوگیا کہ حق بات کہنے میں کسی کا لحاظ نہیں کرنا چاہئے، تو یقیناً میں اس سے خوش ہوں بشرطیکہ اسی طرز و شان سے حق کہا جائے جس طرح میں نے کہا ہے ہاں اگر بدلحاظی کا جواز اس سے نکالا جاتا ہے تو

حسبنا اللہ ونعم الوکیل وَاللّٰہ المستعان علی ماتصفون

والسّلام

شبیر احمد عُثمانی

۷، ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ

دیوبند، ضلع سہارن پور

برادر محترم دامت برکاتہم

بعد سلام مسنون آنکہ۔ مدت ہوئی خط اور رسالہ "نصرۃ الابرار" مل چکا ہے۔ میں اپنے احوال و عوارض کی وجہ سے جلد جواب لکھنے کا موقع نہ پاسکا۔ اصولی حیثیت سے آپ کو اولاً میری تحریرات پر شرعاً یا عقلاً تنقید کر کے یہ ثابت کرنا تھا کہ جن مقدمات پر وہ مبنی ہیں وہ صحیح نہیں۔ محض زوردار اور مبالغہ آمیز الفاظ میں اپنے جذبات یا تنقیدات کا اظہار میرے مسلک کے ابطال کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ جن خوفناک عواقب دینیہ پر آپ متنبہ فرمارہے ہیں میں بحمد اللہ ان کے امکان سے غافل نہیں، لیکن اگر خدا نکردہ وہ وقوع میں آگئے تو اس کا سبب صرف وہ لوگ ہوں گے جو آنکھ بند کر کے ہندوؤں کی کانگریسی سیاست کے پیچھے چل پڑے اور اپنی قوم کے بہترین احساسات اور صحیح نصب العین کو نہایت لاپروائی سے بے سوچے سمجھے ٹھکرادیا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر مستقبل میں آپ لوگوں کی مہلک غلطیوں کا خمیازہ حاملین دین کو بھگتنا پڑا تو میری ذات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے گی۔ تاہم اگر میری بہت ہی ناتوان اور ضعیف مگر بروقت کوشش سے ان بُرے نتائج کی شدت میں کچھ کمی ہوگئی تو میں اسے بھی سب کے حق میں ایک طرح کی خوش قسمتی سمجھوں گا۔ کاش آپ سب حضرات دینداری اور سرفروشی کے سچے جذبے کے ساتھ اس سیاسی ادارے میں داخل ہو کر جس کا دروازہ ہر مدعی اسلام کے لئے ہر وقت کھلا ہوا ہے سچائی کی طاقت اور

جمہور مسلمین کی پشت پناہی سے اس پر قبضہ کر لینے اور بھیڑ بکریوں کے گلے کو بھیڑیوں کی پاسبانی میں چھوڑ کر دوسری طرف نہ بھاگ جاتے تو اللہ کے فضل سے اس روز سیاہ کے دیکھنے کا کوئی اندیشہ نہ رہتا جس کے تصور سے آپ گھبرا رہے ہیں۔

(اور وقت نہیں گیا۔ اب بھی ایسا کر سکتے ہیں)

آپ لوگوں نے اپنی قوم کا ساتھ دینے اور ان کی غلط کاریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے کھلم کھلا ایسا رویہ اختیار کر لیا جو قوم سے بے وفائی اور احکام شرعیہ سے لاپروائی کی طرف مشعر ہے۔ کیا ہندو اکثریت کی حکومت میں آپ "وار دھا اسکیم" سے بہتر نصب تعلیم بنائے جانے کی امید رکھتے ہیں۔

وہ جماعت جو بے شمار سُنّی مسلمانوں، قلیل التعداد شیعوں اور چند بزعم خود دعویٰ اسلام رکھنے والے اور کلمہ پڑھنے والے ملحدوں یا زندیقوں پر مشتمل ہوتے ہوئے مُسلم قوم کے استقلال اور کلمہ اسلام کی سربلندی کے نام پر لڑ رہی ہے۔ کیا اس کے مقابلے میں آپ اُس جماعت کا تسلط و اقتدار بڑھا کر، اسلام کو سربلند اور مسلمانوں کو معزز اور عُلماء کو موقر بنائیں گے جس میں اکثریت غالبہ اُن افراد کی ہے جو کلمہ اسلام سے علانیہ بیزار، حکومت الہیہ کے شدید ترین مخالف اور مسلمانوں کے قومی و سیاسی استقلال کے بدترین دشمن ہیں جن کی اسلام دشمنی برملا اور مکبرات و قرات ظاہر ہو چکی ہے اور اب بھی ظاہر ہو رہی ہے پھر وہاں دہریے بھی ہیں بلکہ ایک دہریہ ہی آج کل اسپرسٹر گاندھی کے بعد اقتدار رکھتا ہے، اور قادیانی، شیعہ، مشرقی مغربی کسی کے لئے اس کا دروازہ بند نہیں۔ یہ ہی کیمونسٹ جن کا ذکر مُسلم لیگ کے ساتھ بار بار کیا جاتا ہے کل تک اس میں سب شریک تھے، درآنحالیکہ اکابر عُلماء نے اس کے رکن اور عہدہ دار بنے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا اور اب بھی کیمونسٹ کو وہاں سے ان کے الحاد و ارتداد کی وجہ سے خارج نہیں کیا گیا۔ ورنہ جواہر لال نہرو ان سے پہلے خارج کئے جاتے جن کی مدح سرائی اب بھی سیاسی اسٹیج پر بڑے بڑے مقدسین کرتے ہیں۔ وہاں عُلماء، محدثین و مفسرین کی موجودگی میں مسٹر جناح کی قیادت کا مسئلہ تو آپ کو معلوم ہے۔ ہم نے ان کو ابتداءً قائد نہیں بنایا۔ وہ اپنی دماغی قابلیت یا دوسرے تکوینی اسباب کی بنا پر مسلم اکثریت کے قائدین بن گئے۔ اب ان کا مقابلہ کر کے جماعت مسلمین میں تفرقہ ڈالنا، درآنحالیکہ وہ اس وقت ایک مضبوط اصول اور صحیح نظریہ کے حامل بھی ہیں، کیسے درست ہو سکتا ہے جب کہ سلطان متغلب یا باقدار لشروط امیر اور خلیفہ کے متعلق اطاعت کی تصریحات موجود ہیں اور جب کہ اس قیادت کو خود اکابر عُلماء جمعیہ ۳۷ء میں مستقل اور کلی اختیارات سپرد کر کے خوب مستحکم اور مضبوط کر چکے ہیں۔ (دیکھو خط مطبوعہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ۳۷ء) غالباً ان حضرات کی نظر بھی اس وقت اسی نقطہ پر مرتکز ہوگی کہ یہ عصری سیاست کے موافق ایک آئینی جنگ ہے جس سے مسٹر جناح کی قیادت میں مسلمان اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ مسٹر جناح عالم نہ سہی خوش عقیدہ نہ سہی، محدث و مُفسر نہ سہی، لیکن جو آئینی کشتی لڑی جا رہی ہے اس کے داؤ پیچ سے خوب واقف ہے۔ لارڈز بسکو کے مقابلے میں اس گاماہی کو آگے بڑھائیں۔ آخر حضرت اشموئیل نبی کی موجودگی میں بنی اسرائیل کی درخواست پر اللہ تعالےٰ نے طالوت کو امیر لشکر بنایا تھا اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کرام نے یزید بن معاویہ کی قیادت میں مدینہ قیصر پر وہ چڑھائی کی جس کی بشارت صحیح بخاری میں آئی ہے۔ پھر میں نہیں جانتا کہ آج کسی مفسر قرآن کی موجودگی میں مسٹر جناح کو قائد بنا دینے سے کیا قیامت ٹوٹ پڑی اور جو چیز ۳۷ء میں جنّت تھی، ۴۵ء میں جہنم کس طرح بن گئی۔ جمعیۃ عُلماء اسلام نے اگر اس قیادت کی تعریف اور مُسلم لیگ کی تائید کی تو کیا گناہ کیا۔ اس کی تاسیس کرنے والوں کی نیت کیا تھی اور اندرونی احوال کیا تھے اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔ میں تو تمام عُلماء اسلام کے متعلق یہ ہی حسن ظن رکھتا ہوں کہ جس نے اپنے نزدیک جو رستہ بحالات موجودہ مسلمانوں کے لئے اصلح و انفع سمجھا، اختیار کر لیا یہ رایوں کا اختلاف ہے، آگے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ عالم السرائر ہے۔ فبما ہم علی اللہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے علم و ادب اور ذاتی عقائد و خیالات پر میں کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا نہ میں ان کو خود غرض سمجھتا ہوں۔ لیکن فی الحال جس لائن پر چل رہے ہیں میرے نزدیک وہ اس منزل مقصود پر پہنچانے والی نہیں جس کا نشان انہوں نے "الہلال" وغیرہ میں دیا تھا۔

اس کے باوجود میرے قلب میں ان کی عزت برابر موجود ہے۔ رسالہ "نصرۃ الابرار" میں جو کچھ لکھا ہے آج بھی اس کا مخالف کون ہے۔ دینوی معاملات میں ہندو کے ساتھ نفس اشتراکِ عمل کو مطلقاً کون ناجائز کہتا ہے۔ سر سیّد احمد خاں اب کہاں ہیں جو ان کے ذاتی عقاید کا مسئلہ زیرِ بحث لایا جائے۔ تمام علی گڑھ والوں کو یک قلم ان کے جملہ عقائد میں ہم نوا رکھنا محض تحکم ہے۔ کیا آپ کے یا دوسرے اکابر عُلماء کے نزدیک تمام علی گڑھ والے کافر مرتد نہیں۔ ایسے مسائل میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ غلط مبحث نہ کیجئے۔ کفر ارتداد کی بحث اسلام کے نازک ترین مباحث میں سے ہے۔ آپ کے آزاد پارلیمنٹری بورڈ نے جن لوگوں کو امیدوار منتخب کیا ہے کیا ان میں کوئی علیگ یا انگریزی تعلیم یافتہ نہیں اور اس میں فیصدی کتنے عُلماء دین لئے گئے ہیں۔ یہ بورڈ تو کانگریس کا نہ تھا۔ خالص مُسلمانوں کا تھا۔ جو پچاس فیصدی علماء کا مطالبہ آپ مسلم لیگ سے کر رہے ہیں، وہاں کیوں نہ منوایا گیا، بلکہ بعض ایسے کنڈیڈیٹ کھڑے کئے گئے جن کو منصب سے کوئی لگاؤ نہیں۔

ہاں تو "نصرۃ الابرار" کا ذکر تھا جو الفاظ آپ نے میرے نقل کئے ہیں میں اب بھی ان کو صحیح سمجھتا ہوں۔ لیکن آج کی کانگریس اٹھاون برس پہلے کی کانگریس نہیں۔ نہ آج کے عام حالات وہ ہیں جو اس وقت تھے۔ اگر آج کل کے حالات اس وقت ہوتے تو کیا "نصرۃ الابرار" صفحہ ۹ پر پہلے سوال کا جواب آپ کے اور عُلماءلدھیانہ کے نزدیک یہ ہی ہوتا کہ "سرکار انگلشیہ بہتر ہے کیونکہ سرکار دولتمدار مثل روس کے متعصب نہیں اور سلطان اور (جو ایک بڑا بادشاہ ذی اقتدار اہل اسلام خادم حرمین شریفین اور محافظ بیت المقدس (کربلائے معلی ہے) اور سرکار دولت مدار میں برخلاف روس کے اتحاد قائم چلا آتا ہے۔ اگر بالفرض والتقدیر سرکاری دولت مداری مملکت روس سے بہتر نہ سمجھی جائے تب بھی رعایائے اہل اسلام کو شرعاً حرام ہے کہ سرکار کے برخلاف روس یا سلطان روم وغیرہ سے درپر درابطہ واتحاد پیدا کرے۔" غور کیجئے کہ شرکت کانگریس کے متعلق جس سوال کا جواب عُلماء نے دیا ہے اس سوال میں یہ الفاظ بھی ہیں "اور ان کا (یعنی کانگریس والوں کا) اصل اصول یہ ہے کہ بحث ان ہی امور میں ہو جو کل جماعت ہائے ہند پر موثر ہوں اور ایسے امور کی بحث سے گریز کیا جائے جو کسی ملت یا مذہب کو مضر ہو یا خلاف سرکار ہو اس جماعت میں شریک ہونا درست ہے یا نہیں۔"

کیا آج بھی شرکت کانگریس کے متعلق آپ کے سوال کے یہ ہی الفاظ ہو سکتے ہیں۔ آپ تو بڑے سیاسی کارکن ہیں اور اگلے پچھلے احوال پر نظر رکھتے ہیں۔ تعجّب ہے کہ ۵۸ برس پہلے کے فتاویٰ کو موجودہ صورت حال پر منطبق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک چیز اور بھی واضح رہے کہ اس فتوے پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سے ایسے عُلماء کے دستخط ہیں جو یقیناً کسی سیاسی جماعت میں اس وقت کام نہیں کر رہے تھے۔ کیا آپ کے نزدیک ان عُلماء کبار کو ایسے سیاسی مسائل میں فتویٰ دینے کا حق تھا؟ اگر تھا تو آج کسی مولوی کو آپ اس حق سے کیوں محروم کرتے ہیں۔ میرے بھائی! اپنے کو حد سے زیادہ ذہین و فہیم اور دوسروں کو بالکل الّو نہ سمجھئے۔ کسی ایک چیز غائب کو حاضر سے بہتر سمجھ لینا ہے۔ میں جس چیز کو پورے غور و فکر کے بعد بحمد اللہ شریعت کی روشنی میں صحیح سمجھتا ہوں جب تک اس بنیادی اصول کی غلطی مجھ پر ظاہر نہ ہو زوائد سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ لیکن طویل خطوط کا سلسلہ قائم رکھنا نہ میری قدرت میں ہے نہ ہر ہر سطر کے جواب میں رسالہ لکھنا بحث کو ختم کرے گا۔ اس قسم کے شبہات جو نفس مسئلہ سے متعلق ہیں، ان کے متعلق میں ایک تحریر مرتب کر رہا ہوں جو چھپ کر شائع ہو جائے گی، کیونکہ ہر ایک شخص کو فرداً فرداً جواب دینا ممکن نہیں۔ ایک آپ ہی کے خط کے ہر ہر لفظ اور سطر پر بحث کی جائے تو خاصی کتاب تیار ہو جائے۔ یہ چند سطور قلم روک کر لکھی گئیں۔ امید ہے اسے پڑھ کر قدیم تعلقات کی نسبت کوئی برا اثر نہ لیں گے اور اگر یک سوئی کی ساعتوں میں ٹھنڈے دماغ سے غور کریں تو کیا بعید ہے کہ موجودہ حالات کے اعتبار سے صحیح راستہ سمجھ میں آجائے۔ سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے "الصادق یتقلب فی یوم واحد مأۃ مرۃ والمرائی یثبت علی حالۃ واحدۃ مأۃ سنۃ" (سچائی کا عاشق ایک دن میں سو مرتبہ بدل سکتا ہے اور ریاکار ایک ہی حالت پر برسوں جما رہتا ہے)۔ والسّلام

شبیر احمد عُثمانی[1]

حَبیب روڈ، لدھیانہ۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۴۵ء

حضرت استاذ المکرم علامہ مولانا شبیر احمد عُثمانی دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ جو فتویٰ ہمارے قتل کے جواز میں کلکتے میں تیار کیا گیا اس پر آپ کے دستخط پڑھ کر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ اس دنیا میں ہر چیز کی امید کرنی چاہئے۔ آپ کے ان دستخطوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حق بات کہنے میں کسی کا لحاظ نہیں ہونا چاہئے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ والسّلام

حَبیب الرحمٰن

حَبیب روڈ، لدھیانہ۔ ۲۶ر نومبر ۱۹۵۴ء

استاذ المکرم حضرت علامہ مولانا شبیر احمد صاحب عُثمانی

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ! آپ کا گرامی نامہ پہنچا۔ جواب کا بہت بہت ممنون ہوں۔ آپ کی عزت اور محبّت جس قدر میرے دل میں ہے اس کا اندازہ آپ نہیں فرماسکتے۔ آپ نے مجھ ہی کو نہیں بلکہ اپنے سینکڑوں بے غرض مخلص محبّت کرنے والوں کو بے گناہ قتل کر دیا ہے۔ جناح کی قیادت کا اعلان اور پاکستان کی حمایت سوائے قتل کے فتوے سے اور کن الفاظ سے تعبیر کروں۔ یہ کس کی مجال کہ کوئی آپ کو یہ کہے کہ آپ کو اپنی رائے کے اظہار کا حق نہیں۔ لیکن آپ انصاف فرمائیں کہ جو شخص کسی جماعت میں کوئی کام نہ کر رہا ہو اسے کسی سیاسی رائے دینے کا کیوں حق حاصل ہے۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ نے ہمارے ہی قتل کا فتویٰ نہیں دیا بلکہ آپ نے اپنے اور تمام عُلماء کے خلاف قتل کا فتویٰ صادر کر دیا ہے زمانہ میری اس بات کی شہادت دے گا اور وقت بتائے گا کہ عُلماء نے جناح کے پیچھے لگ کر اسلام کو کتنا نقصان پہنچایا۔ آپ آج اس جماعت کے ساتھ کھڑے ہیں جو قادنیوں، تبرائیوں، خدا اور مذہب کے منکر کمیونسٹوں کو ہمراہ لے کر اسلام کو سربلند کرنے کے لئے چلی ہے۔ آپ کے بزرگوں کا فتویٰ تو یہ تھا کہ سر سیّد احمد خاں کے ساتھ اشتراک عمل بھی جائز نہیں۔ اور ہندوؤں سے مل کر دیناوی کام چلانے میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔ تقریباً ۳۰ برس کا عرصہ ہوا آپ نے نصرۃ الابرار کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ تمہارے بزرگوں نے سر سیّد اور قادیانیوں کے بارے میں جس رائے کا اظہار فرمایا وہ ان کا کشف صریح تھا۔ اور انہوں نے مسلمانوں کو گمراہی سے بچالیا۔ رسالہ نصرۃ الابرار بھیج رہا ہوں۔ اس پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بھی دستخط ہیں۔ اللہ کی شان ہے سر سیّد احمد کو کافر کہنے والوں کی روحانی اولاد اسی سر سیّد احمد کی روحانی اولاد کے پیچھے ہاتھ جوڑے کھڑی ہے۔ اور اسی کو اسلام اور مُسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھتی ہے۔ میں اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سہارن پور میں آپ کے اس بیان کا ذکر کر رہے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کے آنسو آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے سے ہمارے اور اسلام کے دشمن ہم کو ذبح کرتے تھے۔ اب آپ نے ان کی جگہ لے لی۔ ایک طرف آپ کی عظمت اور عزت اور دوسری طرف دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں اپنی اور اسلام کی تباہی دیکھ رہے ہیں اور خاموش بھی نہیں رہ سکتے۔ آپ خود ہی فرمایئے کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ آپ نے لفظ بدلحاظی کا تحریر فرما کر مجھے بہت دکھ پہنچایا۔ میری بدلحاظی کی حقیقت یہ ہے کہ میں نے سہارن پور کے جلسے میں آپ کے اس بیان کا ذکر کرتے ہوئے یہ لفظ کہے ہیں کہ میں علامہ شبیر احمد صاحب کے جوتوں کو اپنے سر پر رکھنا باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔ آپ نے مجھے جناح خیال فرمالیا ہے کہ میں اپنے سے اختلاف رائے رکھنے والے کو گالی دوں اور ان کی بے عزتی کروں، میں نے آج تک اپنی تقریر میں معمولی سے معمولی لیگی کے متعلق سخت بات نہیں کہی چہ جائے کہ آپ جیسی بزرگ ہستی کے متعلق کوئی بات کہوں یا دل میں بھی لاؤں۔ حضرت اقدس غور

[1] اگر آج مولانا شبیر احمد عُثمانی زندہ ہوتے تو خود دیکھ لیتے کہ جن لوگوں نے پاکستان لیا تھا انہوں نے پاکستان کو اور مذہب کو کس قدر ذلیل وخوار کیا ہے۔ رئیس الاحرار کی رائے کس قدر صحیح تھی۔

سے سنئے۔ یہ مُسلم لیگی طبقہ کسی بھی عالم کا وقار اور اس کی عزت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ صرف اپنے اقتدار کو بڑھانے کے لئے اور مذہب کو مٹانے کے لئے مذہب کے نام پر آپ حضرات سے کام لے رہا ہے۔ میں نے اعلان کیا تھا کہ اگر مُسلم لیگ میں صداقت ہے تو پچاس فیصدی نشستیں عُلماء کے لئے مخصوص کر دے۔ ہم پنجاب سے احرار اور کانگریس کے ٹکٹ پر چھ مُستند عُلماء کھڑے کر رہے ہیں۔ عالموں کے لئے میں کوئی شرط لگانا نہیں چاہتا۔ عالم ہوں، خواہ بریلوی ہوں، خواہ دیوبندی ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک ہندوستان کے مسئلہ کا حل اور مذہب کی آزادی اور ہندو مسلمان کی حفاظت صرف عُلماء کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔ اسمبلیوں کے اندر اور باہر سیاسیات پر عُلماء کا قبضہ ہونا چاہئے۔ جب تک عُلماء اسمبلیوں میں پچاس فی صدی نہیں ہوں گے ہندوستان کا مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا اور یہ پاکستانی مسلمان اسمبلیوں کے ذریعے سے ایسا نصاب تعلیم بنائے گا جس سے مذہب کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ اگر عُلماء اسمبلیوں کے اندر کیا یہ حقیقت نہیں واجب لا حترام بزرگ جمیعۃ عُلماء اسلام کلکتہ کو اس لئے وجود میں لایا گیا کہ وہ جناح صاحب اور مُسلم لیگ کی واحد نمائندگی کی لوگوں میں تبلیغ کرے نہ کہ عُلماء کی قیادت اور مذہب کی سربلندی کے لئے۔ دوسرے لفظوں میں اس جماعت کا وجود انگریزی اقتدار کو قائم کرنے کے لئے عمل میں لایا گیا۔ آپ خود جانتے ہیں کہ ان میں اکثر وہ عُلماء ہیں جو تحریک خلافت سے لے کر آج تک ہر اسلامی تحریک کی مخالفت کرتے رہے۔ اگر آپ یا یہ عُلماء یہ کہتے ہیں کہ ہماری تقلید کرو۔ ہم قربانی اور ایثار کے راستے سے ہندوستان کو آزاد کرائیں گے اور اسلام کو سربلند کر کے دکھا دیں گے تا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے ہم صرف مسجدوں کے ملاہی نہیں بلکہ ہم قرآن شریف کی تعلیم کے ذریعے سے دنیا کی سیاسی رہنمائی کر سکتے ہیں اور قرآن ہی کی تعلیم سے دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ مگر آپ نے جمیعۃ عُلماء اسلام نے کہا تو یہ کہا کہ جناح کی تقلید کرو، وہی ہندوستان کا سیاسی رہنما ہو سکتا ہے۔ اس کا اعلان بھی سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ قرآن جاننے والے قرآن کے ذریعے سے ہو تو میرے دل کو بے حد مسرت ہوتی۔ سیاسی رہنمائی نہیں کر سکتے۔ مگر مولانا ابو الکلام کی عزت اس وقت میرے دل میں اس لئے سب سے زیادہ ہے کہ وہ کانگریس کے صدر ہو کر مذہب اسلام کی حفاظت کر رہے ہیں انہوں نے کانگریس کی صدارت سے لے کر دہریوں اور تمام غیر مذاہب ہی پر نہیں بلکہ مسلمانوں کے اس غیر اسلامی ذہن رکھنے والے طبقے پر یہ ثابت کر دیا کہ قرآن کا عالم اور صرف قرآن کا عالم جو جناح کی موجودہ تعلیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا وہ اس دنیا میں بڑی سے بڑی سیاسی رہنمائی کر سکتا ہے۔ مولانا آزاد کے اس طرزِ عمل نے یہ اعلان کر دیا کہ قرآن کا جاننے والا ہی حقیقی معنی میں ملک کی آزادی اور امن قائم کر سکتا ہے۔ کاش آج آپ بجائے جناح کے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ہوتے تا کہ دنیا پکار اٹھتی کہ قرآن جاننے والے مولانا ہی ہندوستان کو آزاد کرائیں گے۔ نصاب تعلیم میں مذہب کا خیال رکھا جائے گا۔ مجھے آپ کے اس لکھنے سے کہ جناح کو ہندوستان کا سیاسی لیڈر تسلیم کیا جائے بڑا دکھ ہوا ہے، گویا ہندوستان کے، قرآن کے سب سے بڑے مفسر نے انگریزی داں طبقے کے سامنے اقرار کر لیا ہے کہ مولوی سیاست نہیں جانتا اور یہ بھی اقرار کر لیا کہ وقت کی سیاست کو قرآن کا مفسر نہ چلا سکتا تھا، نہ سمجھ سکتا تھا۔ یہ عُلماء کے قتل کا فتویٰ نہیں تو اور کیا ہے۔ میرے محترم پاکستان الیکشن کے لئے ایک نعرہ ہے۔ الیکشن ختم ہو جائے گا تو مُسلم لیگ کانگریس کے ساتھ مل کر وزارتیں بنانے کی کوشش کرے گی۔ واحد نمائندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام اقتدار بد دین طبقے کے ہاتھ میں رہے اور سیاسی اقتدار کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں نہ آجائے جو مذاہب کی سربلندی اور ہندوستان کی آزادی کی خواہش مند ہوں۔ اور یہ بھی کہ آپ کو میری بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ انگریزی داں طبقہ کانگریس سے صلح کرنے کے بعد عُلماء کو کچلنے کے لئے عُلماء سے بھی یہ فتویٰ پیش کرائے گا کہ ان عُلماء نے ہم کو کانگریس میں شریک نہ ہونے اور وطن کی آزادی کے لئے روکا کیونکہ اس طبقہ سے سامنے مذہب نہیں ہے چند نوکریاں اور نشستیں ہیں اور بس۔ اور جب ہندو نے یہ ٹکڑا اس کے سامنے ڈال دیا۔ اور یہ طبقہ انگریز سے مایوس ہو گیا۔ تو پھر یہ طبقہ اپنی ملازمتوں اور نشستوں کی طرح اسلام کو مٹا کر ہندو دوستی کا ثبوت دے گا۔ میں نے اپنے دل کا سارا دکھ ان الفاظ میں آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب آپ کا جی چاہے اپنوں کے ساتھ رہیں یا غیروں کے ساتھ رہیں۔ مُصیبت زدہ درد مند اور بالخصوص جس کو اپنوں ہی نے مارا ہو وہ اچھی زبان اور

اچھی زبان اور اچھے الفاظ لکھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

والسّلام
حبیب الرحمٰن لدھیانوی

حبیب روڈ، لدھیانہ۔ ۹؍ جنوری ۱۹۴۶ء

حضرت استاذ المکرم مولانا شبیر[1] احمد عثمانی صاحب دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ گرامی نامہ اور "نصرۃ الابرار" دونوں اکٹھے موصول ہوئے۔ آپ کے گرامی نامے کو میں نے بغور پڑھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ نے آنے والے خطرے کو محسوس فرمالیا۔ باقی اس کی ذمہ داری کس پر ہے اور اس کا حل کیا ہے یہ آنے والا وقت بتلائے گا۔ آپ سے عقیدت اور محبّت ہے اس لئے آپ سے میرا کوئی بحث ومناظرہ نہیں چل سکتا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی امداد فرمائے چونکہ آپ کے اچانک بیان سے ایک صدمہ پہنچا تھا اس لئے اپنے جذبات وخیالات بغیر کسی نفاق کے آپ کے سامنے رکھ دیئے۔ کوئی گستاخی ہو تو معافی چاہتا ہوں باوجود اس کے آپ کی رائے کو اسلام اور مسلمانوں کے لئے مہلک جانتا ہوں اگر اجازت ہو تو خط وکتابت شائع کردی جائے۔ والسّلام

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

بازار بلیماران دہلی۔ ۲۵؍ اپریل ۱۹۳۹ء

محترم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب زید مجدکم

السّلام علیکم۔ الحمدللہ کہ آپ کی ضمانت تو ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں ڈھائی ماہ کے بعد برما سے واپس ہوا۔ یہاں پہنچ کر تبادلہ خیالات کا بھی موقع نہ ملا تھا کہ آپ گرفتار ہوگئے۔ یہاں کی پارٹیوں میں جو صورت حالات درپیش ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ مسلمانوں میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ کسی معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ ذاتی اغراض اور ذاتی منافع کے پیش نظر یا جماعتی وقار اور جماعتی استحکام کے مدنظر مختلف باتیں کہتے جارہے ہیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کش مکش کے مقابلے میں نہ فلسطین کی فکر ہے اور نہ عرب کی ہے۔ انگریز نے ایسا خوش نما لقمہ ڈالا ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں مبتلا ہوگیا ہے۔ آپ مقدمہ کو وسیع کیجئے۔ میں کل آٹھ یوم کے لئے ڈابھیل اور راندیر جارہا ہوں واپسی پر انشاء اللہ پہلی ٹرین سے لدھیانہ حاضر ہوں گا۔ آپ سے زبانی باتیں کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کروں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر آپ لدھیانہ سے جانے پر کوئی پابندی نہ ہو تو آپ کو دہلی بلالوں گا۔ بہر حال تبادلہ خیالات کی ضرورت ہے۔ آپ اس عرصے میں تمام ممبران کو خط لکھ کر جواب حاصل کرلیجئے۔ میں اس رائے سے متفق ہوں کہ آپ ایک اجتماع بہت جلد لدھیانہ میں کیجئے۔ جو لوگ سفر خرچ نہ برداشت کر سکیں ان کے لئے سفر خرچ کا بھی انتظام کردیا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ لیکن آپ اجتماع سے پہلے اکیس آدمیوں کو خط لکھ کر ان کی رائے معلوم کر لیتے تاکہ کسی کو عذر باقی نہ رہے میں اتنے ڈابھیل سے واپس آجاؤں۔ نقلیں بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ جو کچھ آپ نے کہا ہوگا وہ میں جانتا ہوں اور جو کچھ کہا گیا ہے اسے بھی سمجھتا ہوں۔ آپ میرے خط کا جواب ضرور دیں۔ ڈاک ڈابھیل جائے گی، اگر کوئی ضروری امر ہو تو میں ڈابھیل ہی سے جواب دے دوں گا۔ میں نے ڈاک کا انتظام کردیا ہے امید کہ آپ بھی بخیر ہوں گے۔

فقیر احمد خاں
گلی قاسم جان، دہلی

بازار بلیماران، دہلی۔ ۲۴؍ مئی ۱۹۳۸ء

1 مولانا شبیر احمد کی رائے پاکستان میں رئیس الاحرار کے ارشاد کے مطابق فیل ہوگئی آج پاکستان میں کیا ہورہا ہے یا ہوچکا ہے کیا ہونے والا ہے سب جانتے ہیں۔ شاہ ایران نے جو مشورہ پاکستان کو دیا ہے اُسے سامنے رکھنا ضروری ہے شاہ ایران کی کتاب پڑھنی بھی ضروری ہے۔

محتـــرم مولانا ازاد مجد کم

السَّلام علیکم۔ بیاول کی واپسی پر مفصل خط ملا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں انقلاب کی خواہش کا بہت بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچے گا اور وہ سب آزاد ہو جائیں گے۔

انہی جذبات کے ماتحت ہر قسم کی جدوجہد کی گئی تھی لیکن ۲۰ سالہ نتیجہ آپ کے سامنے ہے انگریز کی قوت بحال موجود ہے۔ ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کے ساتھ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ سرحدی مسلمان، فلسطین کے مسلمان، عرب اور افریقہ کے مسلمان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

ہماری حالت یہ ہے کہ انگریز سے جنگ یا مسلمانوں کی امداد یا ملک کی آزادی صرف زبانوں پر رہ گئی ہے جب کہ ہمارے سامنے وزارتیں ہیں، ملازمتیں ہیں اور ناقص آئین کو چلانا ہے۔ کانگریسی حکومتوں سے منافع حاصل کرنا ہے، خواہ خوشامد کی راہ سے ہو یا ان کو مرعوب کر کے ہو۔ انگریز کی پوزیشن بالکل محفوظ ہے، اگر کوئی حرکت کرنے کا خیال بھی کرتا ہے تو مسٹر پنت اور سر سکندر کی وزارتیں سامنے آجاتی ہیں۔ ان حالت میں آپ ہی فرمایئے کہ کیا کیا جائے۔ قراردادوں میں پہلی اور بڑی قرارداد وہی ہے اور اخبار میں شائع بھی ہوئی ہے میں اس کی نقل ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ استقبالیہ کمیٹی کی تقریب اعزازی پارٹی سے شروع ہوئی اس لئے مجبوراً شریک ہونا پڑا اور نہ میرا تو ارادہ شرکت کا نہ تھا۔ پارٹی کے بعد استقبالیہ کا سلسلہ شروع ہوا اور جو کچھ ہوا اس سے کم و بیش آپ واقف ہو چکے ہوں گے۔ میں آپ کی توجہ دفعہ نمبر ۶۲ کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں اس میں اپنے اراکین کا جلسہ منعقد کر کے کہا ہے اگر چہ عاملہ یا مُنتظمہ کا نام نہیں ہے لیکن بظاہر مُنتظمہ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ صوبہ کی جمعیۃ کے اراکین تو وہی ہیں جو اس کی مُنتظمہ کے رکن ہیں۔

رہا معاملہ کہ آپ کی مُنتظمہ کے کون حضرات ہیں ان کا حال آپ کو معلوم ہوگا۔ بہر حال آپ لوگوں کو اطلاع دے دیجئے، جو حضرات جمع ہو جائیں ان سے ہی مشورہ کر کے منتخب کر لیں۔

فقیر احمد سعید۔ کان اللہ لہٗ

بازار بلیماران، دہلی۔ ۲۰ رمئی ۱۹۳۸ء

محتـــرم و مکرم جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

السَّلام علیکم! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی خدمت میں ابھی تک حاضر نہیں ہو سکا۔ لیکن میں آپ کے کام سے غافل نہیں ہوں۔ راندیر میں حافظ صالح صاحب کو آپ کے کام کا انچارج کر آیا ہوں۔ معل اللہ محل مشابحل ذلک اقرا۔

جمعیۃ کے سالانہ اجلاس کی دہلی میں سعی کر رہا ہوں۔ خیال تو یہ تھا کہ وسط جون میں ہو جائے لیکن باہمی اختلاف کے باعث کچھ تاخیر ہو گئی۔ اختلاف کو سلجھانا آپ جانتے ہیں کس قدر مشکل ہے۔

ذاتی رقابتوں اور عداوتوں کے اظہار کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ کسی اجتماع کے موقع پر اس کا مظاہرہ کیا جائے۔ بہر حال حالات پر قابو پانے کی سعی کر رہا ہوں دعا فرمایئے۔

کانگریس اور احرار کی باہمی کش مکش سے توقع ہے کہ امرت سر میں مُسلم لیگ کامیاب ہو گئی ہوگی۔ میں نے ایک انتخابی اعلان کیا تھا جو نظر سے گزرا ہوگا۔ پنجاب میں اگر چہ عُلماء کا وجود عدم برابر ہو گیا ہے لیکن آپ ہی حضرات کا نام مفتخر عُلما میں ہے اور آپ ہی کا نام احرار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جمعیۃ مرکزیہ کے لئے عُلماء کا انتخاب ہو جائے، کیونکہ اگر مرکزی جماعت نے انتخاب کیا تو نہ معلوم کس قسم کے حضرات کو منتخب کیا جائے۔ بہتر ہے کہ آپ اور مولانا مُفتی نعیم صاحب اور مولوی عبد المنان اور مولانا احمد علی صاحب اور دیگر حضرات باہمی مشاورت سے انتخاب کر دیں۔ میں آپ کی خدمت میں اصول و ضوابط کی کاپیاں بھیج چکا ہوں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ مُفتی مُحمد نعیم صاحب کی خدمت میں بھی آج خط روانہ کر رہا ہوں۔

جواب کا منتظر
فقیر احمد سعید
گلی قاسم جان، دہلی

بازار بلیماران۔ دہلی۔ ۴، جون ۱۹۳۸ء
محترم مولانا آزاد مجدکم

السلام علیکم۔ الحمد للہ آپ کا مقدمہ بدل گیا۔ خدا کرے آپ کی ۱۵۳ بھی ختم ہو۔ آپ کا جیل میں رہنا اس وقت مفید نہیں بلکہ آپ کو باہر رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے آپ کو کہا تھا کہ آپ عُلماء کا ایک اجتماع کر کے انتخاب کر دیجئے۔ مولانا محمد نعیم صاحب سے بھی ذکر کیا تھا اور وہ بھی آمادہ تھے اور انہوں نے غالباً اخبار کو ایک بیان بھی اس سلسلہ میں دیا تھا۔
ملاقات کے سلسلے میں آپ سے بہت نادم ہوں۔ مجھے خود بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ جمعیۃ عُلماء اور مجلس احرار کے متحد العمل ہونے کا بہترین وقت یہی ہے۔ جانبین میں اس قسم کی خواہش ترقی پر ہے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہئے اور تمام مخالف قوتوں کا صحیح اور متحدہ قوت سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ میں جلد از جلد آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعی کر رہا ہوں۔ میں ممنون ہوں گا اگر آپ فیصلے کی آخری تاریخ سے مطلع فرمائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخر جولائی تک تو بہر حال مقدمہ جاری رہے گا۔
بہر حال احباب کو سلام۔

خیریت کا طالب
فقیر احمد سعید خاں
گلی قاسم جان، دہلی

دہلی۔ ۶، ستمبر
سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کا مکتوب مسٹر محمد علی جناح کے نام
مسٹر جناح کی حالیہ تقریر پر سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب نے حسب ذیل خط مسٹر جناح کو روانہ کیا ہے۔
محترم مکرم جناب محمد علی جناح صاحب

سلام مسنون۔ آپ نے تقریباً دو سال کے بعد پھر اس ضرورت کو محسوس کیا ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہو جانا چاہئے۔ آپ نے جمعیۃ عُلماء مجلس احرار، جماعت خاکسار اور نیشنلسٹ مُسلمانوں کا نام لے کر ان سے اپیل کی ہے کہ وہ مُسلم لیگ کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت بھی ایسی نہیں ہے جو باہمی اتحاد کا احساس نہ کرتی ہو بالخصوص ایسے زمانے میں جب کہ اس باہمی اتحاد پر آئندہ مسلمانوں کی باعزت زندگی کا دارومدار ہو۔
لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ اس قسم کی عام دعوت دیتے ہیں تو غیر آئینی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں آپ کو اس سے پیشتر بھی سیالکوٹ کی تقریر پر مطلع کر چکا ہوں۔ آپ تمام مسلمانوں کو تو لیگ کے پرچم کے زیر سایہ بلا سکتے ہیں۔ لیکن جماعتوں کو دعوت دینے کا یہ طریقہ یقیناً غیر آئینی ہے۔ اگر آپ فی الواقع یہ چاہتے ہیں کہ تمام مُسلمان باہمی مل کر مستقبل کے لئے کوئی راہ مقرر کریں۔ تو آپ کا فرض ہے کہ ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کریں۔ یا تمام جماعتوں کے مخصوص نمائندوں کو ایک مشترکہ اجتماع کی غرض سے جمع کریں اور اس اجتماع میں مسلم لیگ کے بھی مخصوص نمائندے جمع ہوں اور باہم تبادلۂ خیالات سے ایک مشترکہ اور مُتفقہ راہِ عمل مقرر کریں اور ان اختلافی امور پر غور کریں جن کی وجہ سے مسلمانوں کی آزادی پسند جماعتیں اس وقت تک مسلم لیگ سے علیٰحدہ رہی ہیں۔ یا شریک ہو کر علیٰحدہ ہو گئیں۔ اگر

آپ میری رائے سے متفق ہوں اور اس قسم کے اجتماع کی دعوت دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مسلم جماعتیں جن کا آپ نے اپنی تقریر میں نام لیا ہے باہم جمع ہو کر مسلم لیگ سے تبادلۂ خیالات ہ کریں۔ اور کسی مفید نتیجے تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوں۔ میرے نزدیک یہ طریقہ بہت غیر آئینی بلکہ غیر جمہوری ہے کہ آپ اپنی طے شدہ پالیسی کو قبول کرنے کی دعوت دیں جس سے ملک کا ایک بہت بڑا اور معقول طبقہ متفق نہ ہو۔ بلکہ آپ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو باہم مشورہ سے پالیسی طے کرنے کی دعوت دیجئے۔ تاکہ یہ سمجھا جائے کہ آپ غیر لیگی مسلمانوں کی رائے کو بھی سننے اور اس پر غور کرنے کو تیار ہیں اور آپ کی یہ خواہش ہے کہ تمام مسلمانوں کی متفقہ رائے سے مسلم قوم کے مفاد کی کوئی راہ تلاش کی جائے۔

میں آپ سے توقع کرتا ہوں کہ آپ میرے عریضہ پر خاص توجہ فرمائیں گے۔ میں آپ کے امید افزا جواب کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیریت ہوں گے۔ چونکہ آپ کی تقریر پریس میں شائع ہو چکی ہے۔ اس لئے میں بھی اپنا یہ خط پریس کو دے رہا ہوں۔

فقط

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

صدر جمعیۃ علماء صوبہ دلّی

نوٹ:۔ یہ خط مولانا احمد سعید صاحب نے رئیس الاحرار کو لدھیانہ ارسال کیا تھا جو رئیس الاحرار نے ریکارڈ کر لیا۔

موتمر المصنفین۔ کوچہ چیلان۔ بیت السعید دہلی۔ ۲۹/ جولائی ۴۵ء

محترم و مکرم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب زید مجدکم

السلام علیکم! گرامی نامہ ملا۔ شکریہ۔ اپنی کامیاب رہائی پر دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ میں تقریباً ایک سال سے صاحب فراش ہوں۔ قلب اور معدے کے دوروں نے ختم کر دیا ہے۔ ریاحی بواسیر کا یہ انجام ہوا کہ نہ سفر کے قابل ہوں اور نہ تقریر کر سکتا ہوں۔ خیال تھا کہ آپ دہلی تشریف لائیں گے تو زیارت کر لوں گا۔ سیاسی حالات کے متعلق بھی یہ ہے کہ صرف وضعداری نباہ رہا ہوں۔ زندہ ہوں مگر زندگی کی لذتوں سے محروم ہوں۔

کوشش سچے سمجھوتے کی ہمیشہ رہے گی۔ لیکن خدا جانے کیوں ناکامی ہوتی ہے۔ دہلی میں احرار کارکن اور ورکر جو کچھ کر رہے ہیں وہ جمعیۃ اور احرار کے سمجھوتہ کی راہ میں حائل ہیں اس لئے آپ کو اندازہ نہیں کہ سمجھوتہ کی راہ میں کون سی باتیں حائل ہیں۔

صاحب زادے بلند اقبال جس کام کے لئے تشریف لائے ہیں اس کی کوشش ہو رہی ہے دعا فرمایئے کہ خدا تعالےٰ کامیاب فرمائے۔ سیرت کی ایک کتاب ارسال کر رہا ہوں۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

ناظم موتمر المصنفین

لدھیانہ۔ ۷، مارچ ۱۹۳۰ء

بخدمت حضرت مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند دہلی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ میرا ارادہ تھا کہ میں مجلس تحفظ ناموس شریعت کے اجلاس مورخہ ۸، مارچ ۱۹۳۰ء کو جو دہلی میں منعقد ہونے والا ہے شرکت کروں۔ لیکن یکایک میری صحت آج خراب ہوگئی اور نیز میرے لئے ۹، مارچ کو لاہور پہنچنا ضروری ہے۔ اس لئے اپنی غیر حاضری کی معذرت چاہتا ہوں۔

شاردا ایکٹ کے سلسلہ میں جمعیت کے حکم پر مسلمانوں نے ہڑتال اور جلسوں اور جلوسوں اور تاروں پر قریباً ایک کروڑ روپے کا نقصان برداشت کیا ہوگا۔ اب ہر مسلمان اس بات کا منتظر ہے کہ آیا جمعیۃ یکم اپریل سے کس قسم کی سول نافرمانی کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے۔ ہندوستان کے تمام آدمی اب تحقیقاتی کمیشنوں کی حقیقت سے واقف ہوچکے ہیں اور ان کو یقین ہے کہ یہ کمیشن صرف وقت اور روپیہ کے ضائع کرنے کے لئے مقرر ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں اگر ہم اراکین جمعیۃ کے وقار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور واقعی شاردا ایکٹ کی نامنظوری ہماری دلی خواہش ہے، تو ہمارا فرض ہے کہ ہم جمعیۃ کی طرف سے سول نافرمانی کا عملی قدم یکم اپریل سے پہلے اٹھائیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہر مسلمان جس نے جمعیۃ کے حکم پر اپنا وقت اور روپیہ کا نقصان کیا ہے ہم پر ملامت کرنے میں حق بجانب ہوگا۔

حبیب الرحمٰن

مولانا احمد سعید کے نام

لدھیانہ، حبیب روڈ، شفاعت منزل۔ ۴، نومبر ۷ ۱۹۳ء

محترمی مولانا

سلام مسنون! مسٹر رفیع احمد قدوائی کے نام میں نے ایک خط لکھا ہے۔ اس کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اس پر بہت جلد غور فرمائیں۔

میں بجنور کے الیکشن سے فارغ ہو کر میرٹھ فلسطین کانفرنس میں پہنچا۔ وہاں سے سیدھا سہارن پور آیا۔ چار دن سے یہاں صرف اس لئے ٹھہرا رہا کہ یہ معلوم کرلوں کہ یہاں کوئی شخص کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوسکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہماری کئی سال کی محنت ڈسٹرکٹ بورڈ کے کانگریس پریذیڈنٹ نے فنا کردی۔ دو ماہ پہلے تمام مسلمان کانگریس کے حق میں تھے۔ مگر یہاں کے کانگریسی حضرات کی مخلصانہ کوشش سے وہ مسلمان کانگریس سے بالکل دور ہوگئے۔ یہاں کی سیٹ پر تین آدمیوں میں سے ایک کامیاب ہوگا۔ نمبر ۱ خان بہادر مقصود علی خاں نمبر ۲ مولانا منفعت علی صاحب وکیل سہارن پور نمبر ۳ شاہ نذر حسین صاحب۔ ان تینوں میں سے دو جس طرف ہوں گے وہ کامیاب ہوگا۔ بلکہ حالات کا فیصلہ اس وقت یہ ہے کہ مولوی منفعت علی صاحب اگر مقصود علی خاں کی طرف ہوں تو وہ کامیاب ہوجائیں گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مولوی منفعت علی کے اس فیصلہ کے بعد کہ وہ کس طرف ہوں گے۔ دوسرا فریق مقابلہ ہی نہ کرے۔

کل ووٹ چھ ہزار ۶۰۰۰ ہیں۔ جس میں سے ساڑھے تین ہزار مولوی منفعت علی خاں صاحب وکیل کی برادری کے ہیں۔ جو ان کے زیر اثر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مولوی منفعت علی صاحب، مقصود علی خاں صاحب کے ساتھ ہوں گے۔ میں نے مقصود علی خاں سے کہہ دیا ہے کہ ہم اس شخص کی مدد کریں گے جو کانگریس کے ٹکٹ پر ہوگا۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے جس کو چاہیں ٹکٹ دیں، نہ دیں۔ اگر آپ نے ان تینوں آدمیوں کے سوا کسی اور کانگریس کا ٹکٹ دیا تو پھر کانگریس کنڈیڈیٹ کو عبدالسمیع کی طرح شکست ہوگی۔ اگر آپ کو کوئی اور اچھا کنڈیڈیٹ نہ ملے یا یہ لوگ کانگریس کا ٹکٹ نہ لیں تو بہتر ہے کہ آپ یہاں اپنا امیدوار کھڑا نہ کریں۔ مجھے یہ بھی معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اس الیکشن میں غیر جانب دار رہیں گے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر آپ لوگوں کے لئے اور بھی زیادہ مشکل ہوگی۔ اس خط کی وصولی کی اطلاع مجھ کو لدھیانہ کے پتے پر ملنی چاہئے۔ پتہ یہ ہے۔ حبیب روڈ، شفاعت منزل، لدھیانہ۔

حبیب الرحمٰن

از سہارن پور

دہلی۔ ۷، جولائی ۱۹۴۸ء۔

سنٹرل خلافت کمیٹی

جناب محترم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میں نے جناب کی خدمت میں ایک عریضہ اس مضمون کا ارسال کیا تھا کہ حسب تجویز مرکزی خلافت کمیٹی، آپ کی موجودہ خلافت کمیٹی پنجاب کا الحاق مرکزی کمیٹی سے توڑ دیا گیا ہے۔ اور مرکزی خلافت کمیٹی پنجاب میں ایک صوبہ کی جدید خلافت کمیٹی قائم ہو گئی ہے۔ لہٰذا حسب سابق پنجاب خلافت کمیٹی کا سارا ریکارڈ جدید خلافت کمیٹی کے سکریٹری کے حوالے کر کے ان سے رسید لے لیجئے کہ جدید خلافت کمیٹی باضابطہ کام کر سکے۔

میرے اس عریضے کے جواب میں جناب نے مجھے لکھا ہے کہ میں مرکزی خلافت کمیٹی کی وہ تجویز آپ کے پاس بھیج دوں جس کی رو سے پنجاب خلافت کمیٹی کا الحاق مرکزی کمیٹی سے توڑا گیا ہے اور اس قرارداد کی نقل پر مولانا شوکت علی صاحب کے دستخط ہوں۔ نیز میں اس امر کی بھی آپ کو اطلاع دوں کہ فلاں مقام اور فلاں تاریخ پر پنجاب خلافت کمیٹی کا الحاق توڑا گیا ہے اور اس کے وجوہ بھی لکھوں۔

جواباً گزارش ہے کہ قرارداد حسب ذیل ہے:

''صوبہ پنجاب کی خلافت کمیٹی نے جمعیۃ خلافت کے قواعد وضوابط کی اس طرح خلاف ورزی کی ہے کہ جن ہدایات کے مطابق عمل کرنا از روئے دفعہ (۱) اس کا فرض تھا اس کے خلاف عمل کرنے اور پروپیگنڈا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور پھر کمیٹی کی رپورٹ کی موافقت میں ہدایات جمعیۃ خلافت کے خلاف مسلسل کاروائی کی جس کے بعض نہایت اہم حصوں کے خلاف جمعیۃ مرکزیہ نے لکھنو میں فیصلہ کیا تھا، اور بالآخر صوبہ پنجاب کی خلافت کمیٹی کے عہدہ داروں اور نمایندوں نے نہرو رپورٹ کی بے جا حمایت میں مرکزی کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۴؍ دسمبر مقام کلکتہ میں ناجائز طور پر امتیاز پیدا کرنا چاہا اور جمعیۃ مرکزی کے عہدہ داروں اور والنٹیروں کے خلاف جھوٹے، بے بنیاد اور نہایت رکیک الزامات لگائے اور ان کو اخبارات میں شائع کرا دیا۔ اور ایک بے ضابطہ جلسہ میں شریک ہو کر جلسہ کے فیصلے کو جمعیۃ مرکزی کا فیصلہ قرار دے کر نہرو کمیٹی رپورٹ کی حمایت میں آل پارٹیز کنونشن میں شرکت کے لئے نمائندے بھیجے۔ اس لئے مجلس مرکزیہ نہایت افسوس کے ساتھ ان پر اس اختیار کو استعمال کرتی ہے۔ جو از روئے دفعہ (۳) دستور میں اسے دیا گیا ہے۔ اور پنجاب کی خلافت کمیٹی کو الحاق سے علیٰحدہ کرتی ہے اور عہدہ داران کو جمعیۃ خلافت ہدایت کرتی ہے کہ جلد سے جلد پنجاب کے صوبے میں خلافت کمیٹی کو از سر نو قائم کریں اور تمام صوبہ میں خلافت کمیٹی کی مقامی شاخیں قائم کریں۔

یہ تجویز ۲۸؍ دسمبر کو کلکتہ میں پاس ہوئی ہے جس میں پنجاب خلافت کمیٹی کا الحاق مرکزی کمیٹی سے توڑا گیا ہے اور تجویز میں ان وجوہ کا بھی علیٰحدہ ذکر کر دیا گیا ہے جن کی بنا پر الحاق توڑا گیا ہے۔

قرارداد کی نقل پر مولانا شوکت علی صاحب کے دستخط کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ یہ محض ایک رسمی اور دفتری چیز ہے جسے کوئی بھی سکریٹری انجام دے سکتا ہے۔ اس قدر لکھنے کے بعد مجھے یقین ہے کہ آپ اس فضول بحث کو طول نہ دے کر قدیم خلافت کمیٹی کا سارا ریکارڈ جدید خلافت کمیٹی کے حوالے کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کریں گے۔

محمد عرفان

دفتر جمعیۃ خلافتِ ہند، بمبئی

بمبئی۔ ۷، اگست ۱۹۲۸ء۔ سنٹرل خلافت کمیٹی

برادرم! السّلام علیکم

مسلمانوں کی آج ہندوستان میں جو حالت ہے۔ اس کا آپ کو بخوبی علم ہے۔ فضول آہ وبکا کرنے اور شکوہ شکایت سے کام نہیں چلے

گا۔ بہت سے عناصر ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو افتراق و انتشار کا باعث ہو رہے ہیں اور مستقل نظام عمل کو مستحکم نہیں ہونے دیتے۔ حکومت جس طریقے سے اس انتشار سے نفع اٹھا رہی ہے اس کا سب کو علم ہے اور ہندو مہاسبھا و آریہ سماج جیسے خیالات کے ہندو اصحاب کے دلخراش اور تکلیف دہ طرز عمل نے حکومت کو اچھا موقع دیا ہے کہ مسلمانوں میں اور بھی انتشار پھیلائے۔ خود مسلمانوں میں بھی ایسے عنصر پہلے سے موجود تھے جو ذاتی خواہشات کی بنا پر ملک و ملت کے نقصان کا باعث ہوتے تھے اور اس میں اب بہت سے اور کمزور دل اصحاب بھی شامل ہو گئے ہیں۔ بعض مہاسبھا والے گروہ کی غلط کاریوں کی وجہ سے ہر کام سے بد دل ہو گئے ہیں۔ مہاسبھا کا اثر ہندو جماعت پر بڑھ رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے قوم پرست ہندو بھی اس سے مرعوب اور خائف ہو گئے ہیں۔ جو کچھ بھی ہو۔ ہم مسلمانوں کا ہر حال میں فرض ہے کہ ہم اپنی شیرازہ بندی کریں اور اپنے لئے ایک مضبوط نظام عمل تیار کریں۔ اس لحاظ سے یہ مناسب خیال کیا گیا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا اجلاس آل پارٹیز کانفرنس پیشتر ۲۵، ۲۶، ۲۷ اگست کو لکھنؤ میں بلایا جائے اور اسی کے ساتھ مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء کی مجالس عاملہ سے بھی درخواست کی جائے کہ وہ اپنے اجلاس لکھنؤ میں انہیں تاریخوں میں طلب کریں تاکہ ایک مشترکہ اجلاس بھی منعقد کیا جاسکے جس میں مسلمان مشورہ کر کے کوئی متفقہ رائے موجودہ مسائل پر قائم کر سکیں اور اس کو پوری قوت کے ساتھ آل پارٹیز کانفرنس میں پیش کریں۔ اس سلسلہ میں ہمرشتہ دو نہایت ضروری خطوط بھیجے جاتے ہیں۔ ایک مولانا شفیع داؤدی صاحب صدر جمعیۃ خلافت کا ہے اور دوسرا ڈاکٹر انصاری صاحب کا مشترکہ خط ہے۔

حسب ذیل مسائل مرکزی خلافت کمیٹی کے اجلاس میں پیش ہوں گے۔

۱۔ آل پارٹیز کانفرنس اور اس کے متعلق ہدایات۔

۲۔ سیوری سامل کی نسبت تصفیہ اور ڈاکٹر انصاری صاحب و مولانا شفیع داؤدی صاحب کی تجویز پر غور۔

۳۔ مجلس عاملہ خلافت منعقدہ بمبئی مورخہ ۲۰، و ۲۱ رمئی کی تجویز اور ممبران سنٹرل خلافت کمیٹی مقیم بمبئی کی تحریک کے دفتر اور پریس کے لئے اپنے مکان کی خریداری کی جائے۔

۴۔ رپورٹ دربارہ انتظام سیوری مل۔

۵۔ رپورٹ دربارہ خلافت پریس۔

۶۔ رپورٹ مدارس شبینہ۔

۷۔ معاملات مصر دبار دولی۔

۸۔ ششماہی بجٹ اور خلافت کمیٹی کی مالی حالت کی اصلاح۔

۹۔ دیگر معاملات جو جناب صدر پیش کرنے کی اجازت دیں۔

ہماری باادب درخواست ہے کہ ممبران سنٹرل خلافت کمیٹی جہاں تک ممکن ہو سکے اور کاموں کو پس پشت ڈال کر ان اہم اجلاسوں میں ضرور شریک ہوں۔ اگر ذمہ دار حضرات اس وقت تساہل اختیار کیا اور غفلت برتی اور باہمی اتفاق و مشورہ سے کوئی صحیح پروگرام نہ بنایا اور کام کو مضبوط و مستحکم چٹان پر قائم نہ کیا تو مسلمانوں کی آئندہ نسلیں اپنی بدبختی و پستی کی تمام تر ذمہ داری ان پر عاید کریں گی اور اس میں وہ حق بجانب ہوں گی۔ قیام وغیرہ کا انتظام کیا جارہا ہے۔ آمد کی تاریخ و وقت سے مولانا عبدالماجد صاحب صدر خلافت کمیٹی کو مطلع کیا جائے۔

آپ کے بھائی

شوکت علی (خادم کعبہ) شعیب قریشی۔ محمد عرفان۔ قمر احمد

نقل خط جو ممبران سنٹرل خلافت کمیٹی مقیم بمبئی کی جانب سے ۵، جولائی کو ارکان مجلس عاملہ کی خدمت میں بھیجا گیا۔

بمبئی۔ ۵ جولائی۔

برادرم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ ہم آپ کی توجہ ایک بہت ضروری امر کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ یقین ہے کہ آپ اس کو مناسب خیال فرماکر اس کی منظوری دیں گے۔ سنٹرل خلافت کمیٹی کا صدر دفتر اور پریس بمبئی میں ابتدا سے قائم ہے۔ افسوس ہے کہ ہم کو اول سے خیال نہ آیا، ورنہ نہایت معمولی قیمت پر اپنا مکان خریدا جاسکتا تھا اور جو روپیہ کرایہ کی صورت میں مالکان مکان کو دیا گیا ہے وہ بچ جاتا اور دوسرے اہم کاموں میں صرف کیا جاتا۔ گزشتہ آٹھ سال میں مکانوں کے کرایہ کی مد میں قریباً اسی ہزار روپیہ دیا گیا۔ آج بھی جمعیۃ خلافت اپنے دفتر اور پریس وغیرہ پر تقریباً پانچ سو روپیہ ماہوار صرف کرتی ہے اور پھر بھی آرام نہیں ملتا۔ اس وقت مکان بہت سستے بک رہے ہیں اور جناب صدر و دیگر احباب کے مشورہ کے بعد جو گزشتہ مئی کی مجلس عاملہ کے وقت ہم کو دیا گیا تھا۔ ہم مکان کی تلاش میں ہیں۔ ایک مکان تلاش کیا گیا جو غالباً تیس ہزار روپیہ میں مل جائے گا۔ ایک وسیع احاطے میں تین مختلف قطعات ہیں علاوہ شاگرد پیشہ وغیرہ کے یہ دفتر خلافت، عملہ پریس اور موٹر وغیرہ سب سامان آسانی سے اس میں آسکے گا اور پھر بھی اس کے کچھ قطعات بچ رہیں گے جو کرایہ پر اٹھائے جاسکیں گے۔ تقریباً پانچ ہزار سے دس ہزار تک اس کی مرمت اور اصلاح میں صرف ہوگا۔ غالباً پانچ ہزار میں آسانی کے ساتھ کام ہو جائے گا مگر احتیاط دس ہزار تک کی منظوری طلب کی جاتی ہے۔ ہم خادمان خلافت نے جو بمبئی میں مقیم ہیں اس کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے اور ہماری تجویز ہے کہ:

"چھوٹانی ملز" سے چالیس ہزار روپیہ تک قرض لے کر دفتر خلافت اور پریس کے لئے اپنا مکان خرید لیا جائے جو ہمیشہ کے لئے ایک مستقل جائداد ہوگی "چھوٹانی سالمز" کا روپیہ بنک میں جمع ہے جس پر پانچ فی صدی منافع ملتا ہے۔ وہی منافع بلکہ اس سے تھوڑا یا زیادہ جمعیت خلافت چھوٹانی سالمز کو ماہانہ ادا کر دیا کرے گی اور اس کے علاوہ عطیات اور ماہانہ مصارف سے بچا کر رفتہ رفتہ اس قرض کو ادا کرے گی بلکہ ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مکان خرید کر چھوٹانی سالمز کے پاس رہن کر دیا جائے۔

ہم کو قوی امید ہے کہ دفتر عملہ اور پریس سب کو جگہ دینے کے بعد اتنی مکانیت بچ جائے گی کہ انشاء اللہ اس کے کرایہ سے چھوٹانی سامل کے روپیہ کا منافع ادا کر دیا جائے گا اور دفتر و پریس پانچ سو روپیہ ماہوار کے بوجھ سے سبک دوش ہو جائے گا۔ بینک کا منافع چالیس ہزار روپیہ پر دو ہزار سالانہ ہوتا ہے جو کرایہ کی آمدنی سے بآسانی ادا ہو جائے گا۔ خود تحریک خلافت کے لئے اس کا مستقل مکان اس کے استحکام کا باعث ہوگا۔ یہ جائداد ہر وقت انشاء اللہ اپنی قیمت وصول کر سکے گی۔ اور کسی طرح اس میں کسی قسم کے خسارہ اور خطرہ کا اندیشہ نہیں ہے۔ ہم دستخط کرنے والوں میں جمعیت خلافت کے خدام ہی نہیں بلکہ شہر بمبئی کے ذمہ دار ایسے تاجر بھی ہیں جو تحریک خلافت سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اس کے سب ہی خواہ ہیں۔

امید ہے کہ آپ بواپسی ڈاک بہت جلد اپنی تحریری اجازت عطا فرمایئے گا تاکہ یہ موقع ہاتھ سے نہ نکل جائے اور جلد تر ہم پانچ ساڑھے پانچ سو روپے ماہوار کے بار سے سبک دوش ہو جائیں۔ اگر اول سے ایسا کرنا ممکن ہوتا تو اسی ۸۰ ہزار کی رقم دوسروں کی جیب میں نہ جاتی۔ اب ہم کو آئندہ جو کام کرنا ہے وہ مضبوطی اور استحکام کے ساتھ کرنا ہے جس کے لئے ایک مستقل مرکز کی ضرورت ہے۔ والسّلام

آپ کے نیاز مند بھائی۔ عبدالستار بقلم خود۔ ۲۔ عمر بھائی چاند بھائی۔ ۳۔ عبدالرؤف خاں ۴۔ سید عبدالرؤف حاجی عبدالکریم ۵۔ منشی ولی اللہ ۶۔ محمد یوسف ولد محمد حسن سردار ۷۔ محمد فاروق یامدرے والے ۸۔ حید احمد ۹۔ قمر احمد سکریٹری ۱۰۔ ایچ۔ اے جلال الدین ۱۱۔ شوکت علی خادم کعبہ و آنریری سکریٹری سنٹر خلافت کمیٹی ۱۲۔ عبدالشکور صالح محمد ۱۳۔ شعیب قریشی آنریری سکریٹری خلافت کمیٹی ۱۴۔ عبدالرحمٰن صدیقی بہ قلم شوکت علی بعد اجازت ۱۵۔ محمد جمشید علی

محب مکرم

السّلام علیکم! ہم اس خط کے ذریعہ آپ کی توجہ ایک اہم معاملہ کی طرف منعطف کرانا چاہتے ہیں کہ آپ مرکزی خلافت کمیٹی کے

آئندہ اجلاس میں جو ۲۵، ۲۶، ۲۷/ اگست ۱۹۲۸ء کو لکھنؤ میں منعقد ہونے والا ہے شرکت فرمائیں گے اور اس وقت تک ہماری تجویز پر غور کر کے کوئی رائے قائم کرلیں گے تا کہ اس جلسہ میں اس ضروری امر کا فیصلہ ہو سکے۔

آپ صاحبان کے سامنے ان گراں بہا خدمات کا ذکر کرنا جو آپ کی جمعیت خلافت نے ترکوں، اسلام اور خلافت اسلامی کے لئے کی ہیں تحصیل حاصل ہے۔ ترکوں کی مصیبت و ابتلاء کے وقت مسلمانانِ ہند کی عدیم المثال قربانیاں ہماری ملت کی تاریخ میں ہمیشہ ایک درخشاں صفحہ رہیں گی۔ ہم مسلمانانِ ہند ایک غریب جماعت ہیں، منتشر ہیں، پریشان ہیں۔ لیکن باوجود اپنی تمام اندرونی مشکلات کے جب خلافت اسلامی خطرے میں تھی تو ہم نے نہ اپنے مال کو مال سمجھا۔ نہ جان کو جان جانا۔ ہماری مفلس جماعت نے ترک مجاہدوں کو تقریباً ۳۰ لاکھ روپیہ نقد بھیجا۔ خود ملک کے اندر مسلمانوں میں ایسی بیداری پیدا کی اور ان کے منتشر اوراق کی اس طرح شیرازہ بندی کی کہ ترکی معاملات میں ۷ کروڑ مسلمانان ہند کی ایک متحدہ رائے بن گئی جس کے اخلاقی وزن نے آخر ترکی صلح نامہ کی ترتیب میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی تلوار کے اثرات کو معتد بہ مدد پہنچائی اور اس گئے گزرے وقت میں بھی دنیا کو توحید ملت اسلامی کا روح پرور نظارہ دکھلایا۔ جتنی رقم نقد ترکوں کو بھیجی گئی تقریباً اسی قدر ہندوستانی مسلمانوں میں بیداری و نظم پیدا کرنے کے اہم کام پر صرف کی گئی۔ جمعیۃ خلافت کے پاس ان کثیر مصارف کے بعد جب صرف چھوٹانی سامل کا سرمایہ باقی رہا تو اسی وقت سے خلافت کے کارکنوں میں ایک بااثر جماعت اس خیال کی حامی تھی کہ اس سرمایہ کو ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف ضروریات کے لئے ایک مرکزی سرمایہ کی شکل دی جائے۔ لیکن پھر بھی ہم نے اپنی ضرورتوں کو پس پشت ڈالا اور جب ہلال احمر کا وفد ہندوستان آیا تو اس کے لئے ملک میں باوجود پژمردگی کی فضا کے کافی سرمایہ جمع کر دیا اور اگرچہ اس وقت تک "چھوٹانی مل" باضابطہ قانونی طور پر جمعیت خلافت کے نام منتقل نہ ہو سکی تھی۔ تاہم اس وفد کی خدمت میں ہم نے یہ "مل" بھی ترکوں کی مدد کے لئے پیش کر دیا۔ اس وفد کے اراکین نے قریباً ڈیڑھ لاکھ کا سامان فروخت کیا اور خود "مل" کو بھی فروخت کرنے کی کوشش کی۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے ہاتھ بیچنے کی کوشش کی گئی۔ صوبہ بمبئی کی حکومت اور محکمہ جنگلات کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ وفد کے جانے کے بعد جب اس مل کا حق ملکیت باضابطہ جمعیت خلافت کے نام منتقل ہو گیا تو اس جمعیۃ نے بھی ہر طرح اس کو بیچنے کی کوشش کی۔ لیکن خریداری کی کوئی معقول اور قابل قبول تجویز پیش نہ ہوئی۔ لاچار جمعیۃ خلافت اس کارخانہ کو چلاتی رہی اور عرصہ تک نقصان پر چلاتی رہی اور کہیں اب جا کر بہزار وقت اس کی آمدنی و خرچ میں توازن پیدا ہو سکا ہے۔

ہماری رائے میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہم سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کریں کہ اس کارخانہ کے متعلق کیا کیا جائے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ترک اپنی مصیبت و ابتلاء کے زمانے سے نکل چکے۔ اب ان کی ضروریات کی کفالت کے لئے ایک آزاد اور مضبوط قومی حکومت کے تمام وسائل موجود ہیں۔ دوسری طرف ہم مسلمانانِ ہند کی موجودہ حالت نہایت تشویشناک ہے۔ جمعیۃ خلافت نے مسلمانوں کی جو شیرازہ بندی کی تھی اس میں پھر انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ قومی تحریکوں میں پژمردگی آ گئی ہے۔ ہمارے مفید سے مفید کام سرمایہ کی کمی کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔ اور اگر چل رہے ہیں تو نہایت دقت و پریشانی کی حالت میں۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہماری تجویز ہے کہ بجائے اس کے کہ "چھوٹانی مل" کو فروخت کر کے ترکوں کو بھیج دیا جائے یا ترک آ کر اسے چلائیں اور یہ دونوں صورتیں تقریباً ناممکن ہیں۔ ہمیں اس کارخانہ کو مسلمانان ہند کی قومی ضروریات اور ملی کاموں کے لئے بطور محفوظ سرمایہ کے رکھنا چاہئے تا کہ اشد ضرورت کے وقت قومی تحریکوں اور ملی اداروں کو اس سے قرضہ دے کے ان کی دشواریوں کو رفع کیا جا سکے اور ان کے وجود کو مستحکم بنایا جائے۔ ضرورت رفع ہونے پر یہ رقم قرضہ پھر واپس لے کر اسی سرمایہ محفوظ میں شامل کر دی جائے۔ تا کہ آئندہ اس قسم کے کاموں میں ان سے مدد پہنچائی جا سکے۔

اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے ہم دو مثالیں آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ مرکزی جمعیۃ خلافت کی موجودہ مالی مشکلات سے

آپ ناواقف نہیں ہیں۔ جمعیت کا دفتر آغاز کار سے اب تک کرایہ کے مکان میں ہے اور محض کرایہ مکان میں ۸۰ ہزار روپیہ ادا کیا جا چکا ہے۔ کیا یہ قرین مصلحت نہیں کہ "چھوٹانی مل" کے سرمایہ سے کوئی رقم قرض دے کر جمعیۃ کے دفتر کے لئے ایک اوسط درجہ کا مکان بمبئی میں خرید لیا جائے۔ جس سے اس وقت جمعیۃ خلافت کی مالی مشکلات میں بھی معقول کمی ہو جائے گی اور جمعیۃ کے پاس اپنی جائیداد بھی رہے گی۔ جمعیۃ کے کارکن فضا کے بہتر ہونے کے ساتھ ہی اس رقم کو پھر سرمایہ محفوظ میں واپس کر دیں گے۔

یا پھر مُسلمانانِ ہند کی واحد آزاد تعلیم گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو لیجئے جو ہماری گزشتہ تگ و دو کا نہایت اہم تعمیری نتیجہ ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت اس درس گاہ کو نہایت اچھے اور مخلص اساتذہ مل گئے ہیں۔ کام کرنے والوں کی یہاں کمی نہیں۔ لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ ان لوگوں کی تمام کوششیں اور ایثار و قربانی کہیں بے کار نہ جائے کیا ہماری قومی دور اندیشی کا یہ تقاضا نہ ہونا چاہئے کہ اس محفوظ سرمایہ سے ہم جامعہ ملیہ کو ایک معقول رقم قرض دے کر ان کی مشکلات کو کم سے کم عارضی طور پر رفع کر دیں تا کہ جب جامعہ کے کارکنوں کو اطمینان نصیب ہو تو وہ اپنے لئے جلد کچھ سرمایہ فراہم کر سکیں اور اس قرض کو واپس کر دیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے مفہوم کو کافی طور پر واضح کر دیا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ معاملہ متذکرہ صدر پر مرکزی خلافت کمیٹی کے آئندہ جلسہ تک غور فرمالیں گے اور اس جلسہ میں تشریف لا کر اس کے متعلق یہ فیصلہ کرنے میں مدد دیں گے کہ "چھوٹانی سامل" کو بجائے ترکوں کو دینے کے مرکزی خلافت کمیٹی اسے اپنے قبضے میں رکھے اور اس سے مُسلمانانِ ہند کے قومی کاموں کے لئے بطور سرمایہ محفوظ کے کام لے۔ والسّلام

نیاز مند

مختار احمد انصاری۔ محمد شفیع داؤدی

از شملہ۔ مورخہ ۱۵؍جولائی ۱۹۳۴ء

مکرمی و معظمی مولانا صاحب دام لطفکم

السّلام علیکم۔ میں چند روز کے لئے یہاں رہا ہوا ہوں۔ ہفتہ کو لاہور واپس جاؤں گا۔ میں نے لاہور میں یہ خبر پڑھی تھی کہ جماعت احرار نے فیصلہ کیا ہے کہ اسمبلی کے الیکشن میں اپنے امیدوار پیش کرے۔ میرا ارادہ تھا کہ جس وقت آپ کی طرف سے یہ اعلان ہو گا کہ مختلف امیدوار صاحبان آپ کو درخواستیں دیویں تو میں اپنا نام بھی پیش کروں گا۔ لیکن آج شملہ میں ایک دوست سے معلوم ہوا کہ شاید آپ یہ اعلان نہ کریں۔ اس واسطے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ آپ کو اپنے ارادے سے مطلع کر دوں۔ میں نے حتمی طور پر یہ فیصلہ تو کر لیا ہے کہ شخصی ٹکٹ پر کھڑا نہیں ہوں گا۔ ہاں اگر آپ جیسی جماعت مجھے نامزد کرے تو اس صورت میں میں ملک اور قوم کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں اور اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لوں گا۔ مجھے اپنے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میری سیاسی خدمات آپ کو معلوم ہیں۔ میرا زاویہ نگاہ اور آپ کی جماعت کا سیاسی اعتقاد ہم سے ملے ہوئے ہیں اور میں پورے ضمیر کے ساتھ آپ کی جماعت کا لائحہ عمل اور سیاسی اعتقاد قبول کر سکتا ہوں۔ اس لئے آپ کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لے سکتا ہوں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ملک و قوم کی کچھ خدمت ممبر اسمبلی بن کر کر سکتا ہوں تو میں اس صورت میں آپ کی جماعت کی امداد کو اپنے لئے باعث عزت سمجھوں گا۔ اور آپ سے دو خواست کروں گا کہ آپ مجھے نامزد فرمائیں۔ لیکن اگر آپ اس فرض کے مجھے اہل نہ سمجھیں تو پھر قصہ ہی ختم ہو جائے گا اور میں اس الیکشن میں حصہ نہ لوں گا۔ اس کا جواب اگر ضروری سمجھیں تو لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں فقط

خاکسار۔ ملک برکت علی (لاہوری سابق ایڈیٹر آبزرور انگریزی روزنامہ۔ حکومت ہند کا پرانا معتوب کان پور روڈ۔ الہ آباد)

مخدوم و مکرم بندہ حضرت مولانا صاحب

السَّلام علیکم۔ میں بفضلہٖ ۲۵؍ تاریخ کو کان پور اور ۲۶؍ کو الہ آباد پہنچ گیا اور اسی رات کو سلطان پور گیا۔ جہاں سے یکم جنوری کو واپسی ہوئی۔ پھر یہاں کام ہی میں مصروف رہنا پڑا حافظ خلیل کا خط روپیہ کے لئے آیا ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ بچہ کی ولادت کے سلسلے میں ضرورت ہوگی۔ مبلغ ؎سو روپیہ کا چیک ہمرشتہ ارسال ہے جو مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کے نام کا ہے۔ وہ اس کو وصول کر کے روپیہ حافظ خلیل کو اور روپیہ مولوی وحید الزماں صاحب کو دیں گے۔ یہ گائے کی آباد کاری کی کتابت کے سلسلے میں ہے۔ رسالہ آباد کاری گائے کی ۱۰۰ یا اس سے کچھ زاید جلدیں جو ۵ سیر کے پارسل میں آسکیں بذریعے ریلوے پارسل میرے پتے پر روانہ کرادیجئے گا۔ اخبار سے معلوم ہوا کہ پارلیمنٹ کا اجلاس ۱۰؍ فروری سے ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی پروگرام نہیں بنا سکا ہوں امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

کنہیا صاحب کے ریلوے پاس کے متعلق جو خط ریلوے بورڈ کو لکھا تھا۔ اس کا جواب آگیا ہے۔ وہ بھی ہمرشتہ ارسال ہے۔ سیّد مجتبیٰ صاحب کی خدمت میں سلام مسنون۔ والسَّلام

خاکسار
محمد احمد کاظمی

۱۱؍ جنوری ۱۹۴۵ء

مخدوم مکرم حضرت مولانا

السَّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یو۔ پی کے اہم معاملات کی وجہ سے لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ تانگہ پر روانہ ہو رہا تھا تو مولوی اصلیح الحسن کا تار ملا جس میں ۱۲؍ جنوری کو لدھیانہ نہ پہنچنے کا حکم تھا۔ مگر میری اہلیہ سخت علیل ہیں۔ تنفس کا سخت دورہ ہو رہا ہے۔ میں ۱۱؍ کو دہلی واپس آیا۔ کل ڈاکٹر کا معائنہ ہے پرسوں نسخہ تجویز کرا کر ۱۳؍ کو سرحد کے دورے کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ اس لئے ۱۲؍ کو حاضری سے معذور ہوں۔ سخت شرمندہ ہوں مگر کیا کروں، وقتی پریشانی نے مجبور کر دیا۔ اگر فرنٹیر میل سے روانہ ہوا تو تار دوں گا اور اگر بھٹنڈہ سے روانہ ہوا تو واپسی سے اطلاع دوں گا۔ مجھے سخت افسوس ہے جناب محترم نے میری گزارش کا قطعاً کوئی جواب نہ دیا۔ اور نہ اس کو قابل اعتنا سمجھا۔ حالاں کہ میں نے محمود علی خاں صاحب کو دیوبند بلا کر کہا تھا کہ آپ کو اس عرض سے تکلیف دیں اور خود میں نے بھی تحریر کیا تھا۔ مگر اب اس کا وقت گزر چکا۔

آپ کا مخلص
محمد حفظ الرحمٰن

دفتر جمعیۃ علماء ہند گلی قاسم جان۔ دہلی

معظم و محترم زید مجدکم

السَّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گرامی نامہ موصول ہوا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آج ہی میرٹھ تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کا خط ان کو دکھلا دیا تھا۔ ان کی ہدایت کے مطابق یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ گزارش ہے کہ ایشیائی کانفرس ۲۳، ۲۴ مارچ کو ہوگی۔ یعنے اس کے کھلے اجلاس ۲۳، ۲۴ مارچ کو ہوں گے۔ اس کے قیمتی ٹکٹ دس دس روپے تک ہیں۔ مشاہیر کے لئے پاس بھی ہیں۔ اگر آپ تشریف لائیں گے تو میں آپ کے لئے پاس حاصل کرنے سعی کروں گا اور امید ہے کہ آپ کے لئے پاس مل جائے گا۔ والسَّلام

محمد میاں
(دفتر جمعیۃ العماہند)

آل انڈیا جمعیۃ علماء ہند

مخدوم ومکرم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی۔ گرامی نامہ موصول ہوکر باعثِ عزت ہوا میں نے ابھی وصی احمد صاحب اور حکیم آفتاب احمد صاحب کو خط لکھا ہے اور ان سے اپیل کی ہے کہ دہلی کے اجتماع کے بعد لکھنؤ میں آپ ہی کے زیرِ اہتمام صوبائی اجتماع کرلیا جائے گا۔ مگر مرکزی اجتماع دہلی میں ہی ہو جانے دیجئے۔ کل مولانا آزاد صاحب سے بھی باتیں ہوئیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کانفرنس سے قبل لائحہ عمل طے کرنا ضروری ہے۔ اس کے لئے ۲۳/ اگست کو تعلیمی کمیٹی کا جو جلسہ دہلی میں مولانا کے مکان پر ہوگا اسی دوران میں اس کے متعلق بھی ایک نشست ہوجائے گی۔ بہتر ہو کہ آپ ہی ۲۲/ اگست کو یہاں تشریف لے آئیں۔ ناسازیٔ مزاج سے اللہ تعالیٰ جلد شفائے کلی عطا فرمائے۔

آپ کا مخلص

محمد حفظ الرحمٰن

۱۵/ رمضان المبارک

از دہلی۔ ۱۵/ نومبر ۱۹۴۵ء

مخدوم ومکرم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی۔ بارہ روز کے بعد دورے سے واپس آیا ہوں اور کل عید کا دن چھوڑ کر پھر جا رہا ہوں۔ ۲۵/ نومبر تک یہی سلسلہ رہے گا۔ معاملات پر تو پھر گفتگو ہوتی رہے گی۔ اس وقت آپ کی آمد کی یہاں اشد ضرورت ہے۔ مولانا بشیر احمد بھٹا صاحب کسی نہ کسی وقت یہاں موجود ہی رہیں گے۔ چند دن جو مرکزی اسمبلی کے سلسلے میں باقی ہیں اس میں ان کی امداد مل جاتی تو اچھا ہوتا۔ مالی مصارف کے متعلق مولانا بشیر احمد بھٹا صاحب سے گفتگو ہو جاتی۔ اور کوئی بات نہیں جو باعثِ تصدیع ہو۔ والسّلام۔

آپ کا مخلص

محمد حفظ الرحمٰن

از دہلی۔

مکرم ومحترم۔ زبدت معالیکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی۔ گرامی نامہ موصول ہوکر باعث مسرت ہوا۔ کانفرنس کے متعلق آپ نے جو کچھ فرمایا ہے میری ناقص رائے میں ایسی عجلت نہ چاہئے۔ اس لئے کہ اول تو ابھی لیگ کانگرس مفاہمت کا نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ آج کے دن تک نازک مرحلہ پر ہے اور ہر وقت ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ دوم کانفرنس کے انعقاد کے اعلان سے قبل پہلے جمعیۃ علماء اور مجلس احرار کے ذمہ دار حضرات کو مشورہ کرکے یہ طے کرنا چاہئے کہ اس کانفرنس کی غرض وغایت کیا ہوگی۔ کیا اس سے قبل کسی نقطہ نظر پر پہنچنے کی اشد ضرورت ہے یا بغیر کسی نقطہ نظر متعین کئے مدعوئین کانفرنس پر چھوڑ دینا ہے کہ وہ جو کچھ طے کرلیں گے وہی دونوں جماعتوں کے لئے فیصلہ کن ہے۔ ان دونوں امور میں سے کس امر کے پیشِ نظر کانفرنس کرنا ہے۔ اس کا طے ہونا ازحد ضروری ہے تاکہ کانفرنس کسی نتیجہ پر پہنچ سکے۔

اس لئے ابھی لیگ کانگریس سمجھوتے کے نتیجے کا انتظار کرلیجئے اور پھر باہم مشورہ کرکے کانفرنس کی طرح ڈالئے۔ میرا خیال ہے کہ ملتان کی واپسی پر ۲۵/ اکتوبر سے دیوبند میں دارالعلوم کی مجلس شروع کی ہے۔ اس درمیان میں لیگ کانگریس کی مفاہمت کا جو نتیجہ نکلے اس کے پیشِ نظر ۳۲، یا ۴۲، کو چند گھنٹوں کے لئے آپ تشریف لے آئیں۔ غالباً شیخ حسام الدین صاحب بھی ان تاریخوں میں سہارن پور موجود ہوں اور حضرت مولانا سعید صاحب اور حضرت مفتی صاحب بھی ہوں گے تو باہم مشورہ ہو سکے گا۔ اگر اس مشورہ کے لئے وہاں وقت نکل سکا اور آپ نے اس عرض کو قبول فرمالینے کی مجھے جلد اطلاع دے دی تو پھر میں ۱۲/ یا ۲۲/ کو ارجنٹ تار دے کر آپ کی دیوبند تشریف آوری کے لئے جرأت کروں گا۔ ملتان کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ جمعیۃ کانفرنس کے ارکان مقامی مجلس احرار کا تعاون ضرور چاہتے ہیں۔ ٹھیک وہی اشکال

پیش آرہاہے جو ابتداءً لاہور میں پیش آیا تھا کہ اگر تعاون حاصل کیا جائے تو تعاون دینے کی بجائے اس کی کوشش ہے کہ اس کانفرس کا یہ پہلو نمایاں نہ رہے کہ یہ جمعیۃ عُلماء کی کانفرنس ہے اور سمجھا جائے کہ یہ سب کچھ ہمارا صدقہ ہے۔ اور اگر نہ حاصل کیا جائے تو تفرقہ کا الزام جمعیۃ کانفرنس اور ارکان پر لگا کر ناخوش گوار حالات کا انتظار کیا جائے۔

مگر میں نے اپنی افتادِ طبیعت کے مطابق جمعیۃ کے ارکان کو سختی کے ساتھ ہدایت کر دی ہے کہ اب ہم اس مرحلہ پر نہیں ہیں کہ اس قسم کی تیسرے درجہ کی باتیں سوچیں اور کریں۔ آپ بلا تکلف مقامی احرار کا تعاون حاصل کیجئے اور حتی الامکان عملی زندگی میں دو جماعتیں نہ سمجھ کر باہمی یک جہتی کو کام میں لائیے۔ ملتان سے آج دوسرا خط آیا ہے جس میں وقت پر پہنچنے کی تاکید کی ہے لیکن اس کے اندر ناساز گار حالات کا ذکر تک نہیں ہے۔ تاہم میں نے آپ کے گرامی نامہ کی روشنی میں ان کو صحیح کوائف سے مطلع کرنے کی تاکید لکھ دی ہے اور خط اور تار دونوں پر اطلاع طَلب کی ہے۔ امید کہ مزاج گرامی روبصحت ہوگا۔

آپ کا مُخلص
محمد حفظ الرحمٰن

از دہلی۔ ۱۴ر رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ

مخدوم و محترم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ! مزاج گرامی۔ گرامی نامہ موصول ہو کر باعث مسرت ہوا۔ میں تو ہر دن کے اخبار پڑھ کر حیران ہوں کہ آخر ہماری جدوجہد کا آغاز کب ہوگا اور کب یہ طے ہوگا کہ کون کون سی جاعتیں باہم نزدیک ہو کر اس جدوجہد میں متحدہ محاذ بنانے کو تیار ہیں۔ اور مالی اور اخلاقی مدد کے لئے ہر جماعت اپنے حلقہ اثر میں کب اپیل کر کے یہ اپنے ارادوں کا ثبوت دے گی۔ ہندو نیشنلسٹ کیا کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق تو زبانی عرض کروں گا کہ ان سے نقصان پہنچ رہا ہے یا نہیں یا وہ لیگ کے موجودہ ہنگاموں سے متاثر ہو کر مجبوراً اس قسم کی صورتیں اختیار کرتے ہیں جو بالواسطہ قوم پرور مُسلمانوں کے لئے مضر ہو جاتی ہیں۔ اس وقت تو سب سے زیادہ اہم باہم مشورت کے بعد پوری جدوجہد کا ہے اور اس بات کو آپ آسان فرما رہے ہیں۔ مجھے تو وہی سب سے زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ علالت اور کمزوری کے باوجود رمضان المبارک میں ہی ایک روز کے لئے خدمت میں حاضر ہوں۔ اگر ہمّت ہوئی تو پیر کو یا منگل کو حاضر ہوں گا یعنی ۱۸ر یا ۱۹ر کو ورنہ پھر ۲۴، ۲۵ رمضان کو، اس وقت تفصیلی گزارشات پیش کروں گا۔ صاحبزادی کی علالت کے متعلق عرض ہے اللہ تعالےٰ اُن کو صحت کامل عطا فرمائے۔ تمام رفقاء سلام کہتے ہیں اور مزاج پرسی کرتے ہیں۔

آپ کا مُخلص
محمد حفظ الرحمٰن

از دہلی۔ ۳ر ستمبر ۱۹۴۵ء

مخدوم محترم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مزاج گرامی۔ اس سے قبل ایک عریضہ ارسال خدمت کر چکا ہوں موصول ہوا ہوگا۔ وقت کی قلت اور کام کی اہمیت کے پیش نظر مجلس عاملہ اور مجلس مرکزیہ کے اجلاس بالترتیب ۱۶، ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ ستمبر ہونے قرار پائے ہیں۔ میں نے کوشش کی کہ رمضان سے قبل حاضر ہوں۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ دردِ سر اور کمزوری سفر سے مانع رہا۔ خدارا اب عید کے فوراً بعد آپ تکلیف گوارا فرما کر مجلس احرار کے ذمہ دار حضرات سے اس بارے میں قطعی گفتگو کر لیجئے کہ وہ جمعیۃ عُلماء ہند کی اس دعوت پر شرکت فرما کر اشتراک عمل کے لئے تیار ہیں یا نہیں۔ وقت بہت کم ہے اس لئے لاہور میں اگر مجلس حرار کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۱۵، ۱۶ میں ہو رہا ہے تو ۱۶ر کو شب میں روانہ ہو کر ۱۷ر کی صبح تک وہ حضرات یہاں پہنچ سکتے ہیں جو اس غرض سے منتخب کر لئے گئے ہوں لیکن آپ کا اس اجلاس میں شروع سے ہی شریک رہنا ضروری

ہے۔ مجلس عاملہ اور مرکزیہ دونوں میں شرکت فرماکر اپنے قیمتی مشورہ سے مستفید فرمائیں۔

آپ کا مخلص
محمد حفظ الرحمٰن

از دہلی۔ ۳؍اکتوبر ۱۹۴۶ء

مکرم و معظم حضرت مولانا! زیدت مکارمکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ! مزاج گرامی۔ گرامی نامہ موصول ہوا تھا۔ پیہم اسفار کی وجہ سے جلد جواب نہ دے سکا، ادھر شیخ حسام الدین صاحب سے ملاقات ہوگئی تھی۔ ان سے زبانی گفتگو ہوئی اس لئے جلد عریضہ ارسال نہ کر سکا۔ معلوم ہوا کہ کانفرنس سے، مراد آپ کی یہ ہے کہ جمعیۃ علماء اور مجلس احرار کے چند ذمہ دار حضرات کو مدعو کرکے مشورہ کیا جائے تو اس کے لئے جمعیۃ علماء ہند کی ورکنگ کمیٹی کے ساتھ ساتھ قبل یا بعد دہلی میں ہی دعوت دی جاسکتی ہے۔ اگر حضرت محترم اس کو پسند فرمائیں۔ ورنہ جو رائے عالی ہو اس سے مطلع فرمائیں کہ اس سلسلہ میں قدم اٹھایا جائے۔

آپ کا مخلص
محمد حفظ الرحمٰن

از دہلی۔ ۴؍ستمبر۔ ۲۶؍رمضان ۱۹۴۵ء

جناب محترم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کو معلوم ہے کہ ملک میں انتخابی مہم نے نازک صورت حال اختیار کرلی ہے۔ قوم پرور جماعتوں کے لئے یہ درد بہت زیادہ پُر آشوب ہے۔ اس لئے جمعیۃ علماء ہند حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ضروری سمجھتی ہے کہ ۱۶، ۱۷ ستمبر ۱۹۴۵ء کو جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کے جلسہ میں قوم پرور حضرات اور قوم پرور جماعتوں کے چند نمائندگان کو بھی دعوت دی جائے۔ تاکہ یہ طے ہوسکے کہ کیا اس انتخابی مہم کو تمام قوم پرور متحد ہو کر سر کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں جدا جدا طاقت آزمائی قطعاً بے کار اور بے سود ثابت ہوگی۔ اس لئے جناب والا سے پُرزور درخواست ہے کہ اس موقع پر ضرور شرکت فرماکر ممنون فرمائیں اور اپنے بیش قیمت مشوروں سے مستفید ہونے کا موقع بخشیں۔ اجلاس کی کارروائی دفتر جمعیۃ علماء ہند (گلی قاسم جان) میں ۱۶؍ستمبر کو ۹ بجے سے شروع ہوگی۔ جواب سے جلد مطلع فرمائیں۔ والسّلام

حسین احمد غفرلہٗ صدر جمعیۃ علماء ہند۔ محمد حفظ الرحمٰن ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند

۳۰؍مئی ۱۹۴۱ء عزوجل

عزیزی مولوی عزیز الرحمٰن صاحب۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا ایک مکتوب مجھے ایک ہفتہ ہوا موصول ہوا تھا جس کا جواب میں نے لکھ دیا ہے۔ کچھ ضرورت کی اشیاء انہوں نے طلب کی ہیں اور یہ فرمایا ہے کہ تم ڈی، آئی، جی سے ملاقات کی اجازت حاصل کرو اور انہیں یقین دلا دو کہ سیاسی گفتگو نہیں ہوگی۔ اس لئے اگر مجھے اجازت مل گئی تو خود اپنے ہمراہ اشیاء مطلوبہ لے جاؤں گا۔ ورنہ کوئی دوسری صورت اختیار کروں گا۔ ڈاکٹر گوپی چند صاحب نظربندی سے رہا ہوگئے ہیں۔ ان کی رہائی نے مولانا عبد الرؤف کی رہائی کے امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ مگر خدا بھلا کرے دفتر احرار کا کہ انہوں نے نئی مجلس عاملہ کے اراکین کا اعلان کرتے ہوئے جہاں اور فرضی نام لکھ دیئے ہیں وہاں مولانا موصوف کا نام بھی لکھ دیا ہے اس سے میری کوشش کو سخت دھکا لگے گا۔ آپ مہربانی کرکے اخبارات میں اشاعت کے لئے ایک بیان مجھے لکھ کر بھیج دیں تاکہ

اس کی اشاعت اخبارات میں کر دوں مگر جس قدر جلد ممکن ہو۔ تاخیر مناسب نہیں جس میں آپ یہ ذکر کریں کہ میں نے قبلہ والد صاحب سے جیل میں کئی دفعہ ملاقات کی۔ انہوں نے غیر مبہم طور پر مجھ سے ارشاد فرمایا کہ مولانا داؤد غزنوی صاحب کا کانگریس میں شمولیت کے متعلق بیان ہماری آپس کی باہمی گفتگو کا نتیجہ ہے اور ہم دونوں کافی غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہم اپنی تمام سیاسی سربراہی صرف کانگریس کے ساتھ وابستہ رکھیں۔ اس لئے میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ دفتر احرار نے نئی مجلس عاملہ کے اراکین کی فہرست میں قبلہ والد صاحب کا اسم گرامی ان کی اجازت اور منشا کے بغیر شائع کیا ہے جو شرعاً اور اخلاقاً نہایت ناپسندیدہ چیز ہے۔ غرض اس قسم کے مناسب الفاظ لکھ کر اور آخر میں یہ بھی اظہار کر دیں کہ گجرات جیل میں بھی کئی ایک احرار ڈکٹیٹرز نے مجھ سے انہی خیالات اور عزائم کا اظہار کیا۔

فقط والسلام

فقیر محمد داؤد غزنوی۔ لاہور

محترم بھائی۔ السلام علیکم

امید ہے کہ ہمارے خط آپ کو مل گئے ہوں گے۔ برادر عزیز محمد طیب سخت بیمار ہے۔ ۳۰، مئی کو اسے ۱۰۴ درجہ کا بخار تھا۔ ہمارے پاس کوئی دوالانے والا بھی نہیں ہے۔ روزانہ بخار ہو جاتا ہے والدہ کی حالت بدستور ویسی ہی ہے۔ اس لئے جلد آنے کی کوشش کریں۔ مجلس احرار سے اختلافات اس تاریخ سے شروع ہوئے۔ والسلام

بلقیس فاطمہ۔ لدھیانہ دختر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

۶، اکتوبر ۱۹۳۹ء

مولانا المکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ امرتسر کے احباب کے فیصلے اور چودھری افضل حق صاحب اور مولوی مظہر علی صاحب کی تائید و توثیق کے بعد یہ اطلاعاً عرض کر رہا ہوں کہ قرار پایا ہے کہ یہ عاجز اور آپ دونوں واردھا جا کر مولانا ابوالکلام صاحب اور پنڈت جواہر لال نہرو صاحب سے ملاقات کریں اور موجودہ حالات کے متعلق جو پنجاب میں ہمیں پیش آرہے ہیں اس کے تمام پہلوؤں پر ان سے گفتگو کریں اور بھی بہت سی باتیں جو بغرض اختصار تحریر میں نہیں لائی جاسکتیں اس لئے یہ عاجز ہفتہ کی شام کو لاہور سے براستہ امرتسر ولدھیانہ عازم دہلی ہو جائے گا۔ آپ اگر لدھیانہ میں تشریف فرماہیں تو لدھیانہ سے، نہیں تو دہلی اسٹیشن پر ملیں۔ آپ کے کرایہ کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اگر آپ کے نزدیک یہ سفر غیر مفید یا نامناسب ہو تو بذریعہ تار مجھے لاہور میں اطلاع دیں تاکہ میں رک جاؤں۔ میں ۵ بجے شام ہفتہ کو لاہور میں رہوں گا۔ اس کے بعد بعزم دہلی امرتسر چلا جاؤں گا۔ ایک اور صاحب بھی میرے ہمراہ شامل ہو جائیں گے۔ والسلام

فقیر بارگاہ محمدی۔ محمد داؤد غزنوی۔ لاہور

۲۳/ اگست ۱۹۳۵ء باسمہ عزوجل

مولانا المحترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دستی خط موصول ہوا۔ زبانی بھی حالات معلوم ہوئے۔ میں اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے صدارت کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں اور اس تازہ صدمے نے مجھے بالکل ادھ موا کر دیا ہے۔ پھر یہاں کی مسجد کی جماعت کی ذمہ داریاں بھی مجھ پر ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر صدارت کے فرائض سرانجام دینے سے بالکل قاصر ہوں ایسی حالت میں مولوی خلیل الرحمٰن اور مولوی عزیز الرحمٰن کا استعفا مجلس احرار سے مناسب ہو گا یا نہیں؟ یعنی ایسی صورت میں وہ کانگریس میں کام کرنے کو تیار ہوں گے کہ نہیں آپ سوچ لیں۔ اس لئے میں نے عبدالرحمٰن سے کہہ دیا کہ ان کا استعفاء ابھی دفتر میں مت دو۔ معلوم نہیں آپ اسے پسند کریں یا نہیں۔ مولانا مظہر علی صاحب کا معلوم نہیں آج کل

مزاج کیا ہے۔ اگر آپ ان سے بات کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔ مجھ سے تو وہ بہت ہی پر خاش رکھتے ہیں۔ نہ میری لڑکی کی وفات پر تعزیت کے لئے آئے نہ میری رہائی پر آئے۔ جب ان کے احساسات ایسے ہوں تو میرا ملنا مناسب نہیں۔ آپ ہی ان سے ملاقات کر کے کچھ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ پنڈت جی کو مل کر آپ کا خط سنا دوں گا۔ آپ کا خط بہت صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے۔ لیکن بعض فقرے بہت تیز ہیں۔ یہ اسی صورت میں لکھے جانے چاہئیں جب تعلقات ختم کرنے ہوں۔ اس لئے میں نے اس میں صرف دو فقرے قلم زد کر دیئے ہیں۔ ایک بازاری عورت کی طرح استعمال کرنے کا فقرہ۔ دوسرا فقہ پریس میں دیئے جانے کا۔ باقی جوں کا توں رہنے دیا ہے اور پنڈت جی کو سنا دوں گا۔ اگر انہوں نے جواب دیا تو دستی بھجوا دوں گا۔

مقدمہ دائر کرنا بے حد مفید ہو گا۔ انشاء اللہ جو مقصد مخالف کرنا چاہتے تھے وہ اُلٹا ثابت ہو گیا۔ ولا یحیق المکر السیئی الا باھلہٖ آپ نے یہ لکھا ہے کہ اس بارے میں کوئی کوشش ہونی چاہئے کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہو۔ آیا عدالتی فیصلہ ہو یا نجی اس سے جلد مطلع فرمائیں انشاء اللہ جو خدمت سرانجام دے سکتا ہوں اس میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ والسّلام

داؤد غزنوی۔ لاہور

۲۷ر اگست ۱۹۴۱ء باسمہ عزوجل

اخی المکرّم۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب وجہ اللہ ورضی عنہ وارضاہ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ بعض اخبارات میں یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور اس کی وجہ سے آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ مہربانی فرما کر اپنی صحت سے بہت جلد مطلع فرمائیں نہایت شکر گزار ہوں گا۔ میرے معدے کی تکلیف بہت بڑھ گئی ہے۔ گزشتہ دو ماہ سے بڑی تکلیف میں ہوں۔ تبخیر معدہ کی وجہ سے دل کی حرکت پر برا اثر پڑتا ہے۔ خون کا دباؤ دماغ کی طرف ہو جاتا ہے اس سے ناقابل بیان تکلیف ہوتی ہے۔ سوء ہضم ایسا ہو گیا ہے کہ مرغن یا ثقیل غذا کھانے سے اسہال شروع ہو جاتا ہے۔ اسی پریشانی میں اس سال باہر کہیں نہیں جا سکا۔ اس خیال سے کہ شاید باہر علاج ہو سکے۔ آپ کو بھی خط نہیں لکھ سکا۔ نہایت نادم ہوں۔ مگر معذور ہوں۔ واللہ عند کرام الناس معتبدل۔ آپ کی صحت کے لئے گنہگار ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہوں اور سب دوستوں سے دعا کی درخواست کرتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ ہم عاصیوں کی دعا قبول فرمائے۔

ڈاکٹر گوپی چند صاحب سے میں نے آپ کے متعلق گفتگو کی۔ آپ کی تکالیف کے سلسلے میں کچھ کوشش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ کامیابی عطا فرمائے۔ آپ کے لئے بستر کی چادریں اور بڑی چادر انشاء اللہ کسی آنے والے کے ہاتھ بھیج دوں گا۔ آپ سے ملاقات کی اجازت نہیں ملی۔ مہربانی فرما کر اپنی صحت سے بہت جلد مطلع فرمائیں۔ والسّلام

فقیر محمد داؤد غزنوی۔ لاہور

اور ونعم الوکیل بہت کثرت سے پڑھئے۔ اگر دس ہزار مرتبہ پڑھ سکیں تو بہتر، ورنہ ایک ہزار مرتبہ ضرور پڑھیں۔ درود شریف ۱۱۔۱۱ مرتبہ۔ اگر وضو ٹوٹ جائے تو پھر وضو کر لیں۔

لدھیانہ۔ جناب عالی

کل بتاریخ ۲۲ر اگست ۱۹۴۷ء شہر کے لوگوں کا ایک ضروری اجتماع میری صدارت میں دو منزل مسجد میں منعقد ہوا۔ مختصر اطلاع کے باوجود شہر کے چار پانچ سو اصحاب شریک تھے۔ میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ شہر و ضلع میں گڑبڑ اور فساد سے جو کھچاؤ بڑھ رہا ہے۔ اس کے سدھار اور وطن پرستی کا جذبہ بڑھانے کے لئے شہر میں پنچایت قائم ہو جس کا نام وطن پارٹی ہو جس میں سارے شہر کی مدد شریک ہو۔ یہ پارٹی فوری قیام امن کی کوشش کرے۔ فرقہ وارانہ اتحاد قائم کرے۔ شہری حقوق، لوگوں کی آبرو عزت اور کاروبار کی حفاظت کرے۔ پبلک کے اعتماد سے

حکومت کی مدد کرے، تاکہ ہندوستانی قومی حکومت مضبوط ہو۔ یہ پروگرام اس وقت چل سکتا ہے جب تمام لوگ پوری طرح اس میں شریک ہوں۔ اس لئے باہمی مشورہ سے مشترکہ پروگرام چلانے کے لئے ایک ضروری میٹنگ بتاریخ ۲۵/ اگست بوقت ۳ بجے شام یوسف باغ محلہ اقبال گنج میں منعقد ہوگی۔ آپ جیسے وطن پرست اور دردمند انسان سے درخواست ہے کہ آپ اس میں ضرور شریک ہوں اور اپنے مفید مشوروں سے نیک کاموں میں شہر کی رہنمائی فرمائیں۔

مخلص

محمد یوسف خواجہ

یوسف باغ اقبال گنج، لدھیانہ

ڈھاکہ۔ ۱۴/ جنوری ۱۹۴۶ء

مُحب مکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ سنا جاتا ہے کہ آپ بہار سے بہت خفا ہیں اور میں آپ کو بہار میں بلانے کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔ اب اس کا فیصلہ خود آپ ہی کر لیں کہ یہ دعوت میری ذاتی غرض کے لئے ہے یا قومی۔

میں چمپارن ضلع کے حلقہ ڈھاکہ سے اپنے الیکشن کے لئے کھڑا ہوا ہوں۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے ناکام بنانے کے لئے مُسلم لیگ ایڑی چوٹی کا زور لگا دے گی۔ فضا پھر بھی کہیں بہتر ہے لیکن میری اور یہاں کے لوگوں کی خواہش ہے کہ آپ ایک دو دن کے لئے اس ضلع میں تشریف لائیں۔ یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ یوں تو آپ آئیں گے نہیں۔ لیکن میرے الیکشن کے بہانے سے میں آپ کو مجبور کروں گا آپ یہاں ضرور آئیں۔ پنجاب کا الیکشن ختم کر کے بہار آنے کا قصد کیجئے۔

مہربانی فرما کر مجھے ابھی سے بذریعہ تار آنے کی تاریخ سے مطلع فرمایئے اور ایک خط سکریٹری جمعیۃ عُلماء ڈھاکہ ضلع چمپارن کے نام بھی لکھ دیجئے تاکہ وہ نجی انتظامات کر سکیں۔ بہار میں اور جگہ بھی گھومنا ہوگا۔ آپ سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر امید ہے کہ آپ میری گزارش ضرور قبول فرمائیں گے۔

فقط والسلام

آپ کا مُخلص دیرینہ

سیّد محمود (ڈاکٹر سیّد محمود و نائب وزیر خارجہ حکومت ہند ہوئے)

جون ۱۹۴۸ء

جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سلام مسنون

السلام علیکم۔ ملکی حالات نے مدت سے سفر کی اجازت نہ دی جس کی وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ دل چاہتا ہے۔ انشاءاللہ رمضان شریف کے بعد زیارت حاصل کروں گا۔ ہندوستان کی تقسیم کا اعلان سن کر دل سہم گیا۔ قہر درویش بجان درویش۔ قوم پرست مسلمانوں کے لئے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا قصہ ہے۔ تیئس۲۳ سالہ محنت کا پھل وہی غلامی۔ پانچ کروڑ مُسلمان ہندوستان میں اکثریت کے زیر اثر اور کچھ ریاستوں میں اور تین کروڑ بے دینوں کی قیادت و جاگیرداروں، سرمایہ داروں امیروں سروں، نوابوں اور انگریز کی منشا کے مطابق ان کی پکڑ کے ماتحت انگریز کی کامن ویلتھ میں سارے کا سارا مُسلمان غلامی و غربت کی نئی کڑی سے جکڑا گیا۔ قوم پرست مُسلمان نہ ان کو اس حالت میں دیکھ سکتا ہے نہ بدل سکتا ہے جبکہ انہوں نے خود اپنے اوپر یہ حالت لائی۔ آخر پھر بھی انہیں لوگوں نے کچھ سوچنا ہے اور بہتری کی طرف حرکت کرانی اور کرنی ہے۔ علاوہ ازیں اخبار میں آپ کا مضمون پڑھا۔ کہ آپ قوم پرست ہندوستان میں رہنے والے مُسلمانوں کو یک جائی کی دعوت، حفاظت حقوق دے رہے ہیں اور علی بہادر صاحب کی صدارت نے بھی تو اپنے گزشتہ تجربہ کی بنا پر آپ کو اتنا عرض کر دینے پر مجبور

کر دیا۔ اگر آپ دانا ہیں اور سب کچھ آپ کے ہاتھوں میں گزرا پرانے تجربہ کار ہیں۔ ہم نے بھی آپ کی خدمتوں سے اور زبانوں سے حاصل کیا۔ اپنے فرائض کو پورا کرنے کے لئے عرض کر دیتے ہیں باوجود تیس سالہ محنت کے بھی نقصان و پریشانی کا سبب جس کو دوبارہ دور کرنا ہے وہ ہے کئی جماعتوں میں بٹ جانا اور کئی جماعتوں کا ہونا اگر چہ وہ مخلص بھی ہوں۔ ایک دوسرے کی تعریف بھی کرتے رہیں پرانی دوائی کا استعمال جس نے بیماری میں اضافہ کیا خطرناک ہے جب کہ ہمارے پاس مسلمانوں میں ۸۰ سال کا بنایا ہوا مرکز جس کے علمی فیض سے تمام ہندوستان فیض یاب ہے ان کی سیاسی قربانیاں بھی کسی سے کم نہیں مسلمانوں کے اسلامی و دنیاوی حقوق کا بھی محافظ شرعی صورت میں حق رکھتا ہے اس کی اکثر شخصیتیں اور خصوصاً شیخ الہند صاحب صدر مخلص و نیک دل ہیں۔ ہندوستان کا اعلیٰ مُسلمان اس بات کا فخر رکھتا ہے جب کہ وہ دیوبند کا سند یافتہ ہو۔ ہندوستانیوں کو اس بات کا بھی فخر ہے کہ ایسا مرکز دنیا میں نہیں۔ اگر چہ مُسلمان خود بھی اس مرکز کو نہیں پہچانتے، لیکن انگریز دیر سے اس مرکز کو پہنچان کر قسم قسم کے نشانوں سے اس پر وار کر رہا ہے تا کہ مُسلمانوں کے دل میں اس مرکز کا اثر نہ رہے حتیٰ کہ وہابی کہلایا، کفر کے فتوے دلائے۔ گالیاں دلوائیں، ہندو پرور اور ہندو فروخت شدہ کہلوایا، انگریز کے سامنے یہی ایک مرکز دیوبند مُسلمانوں کا تھا جس کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ اس نے عُلماء دیوبند پر طرح طرح کے الزام ترشوائے تا کہ لوگوں کے دلوں میں سے ان لوگوں کی عزت و وقار نہ رہے۔ اگر آج ہم بھی ان لوگوں کو چھوڑ دیں اور پرانے مرکز پر مٹی ڈالکر نئے مرکز کی تلاش میں چلیں تو لیگیوں میں اور ہمارے میں کون سا فرق رہا جب کہ ان کو چھوڑنے میں انگریز کی بھی خوشی ہو اور لیگیوں کی بھی۔ اور پرانی دوائی کو بھی استعمال کیا جائے جس سے مرض میں اضافہ ہوا۔ ہم نے اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ اگر چہ آپ پہلے سے اس تجربہ کے شکار ہیں۔ عزیزان کو سلام علیکم

صوفی اللہ داد خاں

از عیسیٰ خیل ضلع میانوالی

۳۰/ اگست ۱۹۳۹ء

حضرت مدنی کا خط بسلسلہ مدح صحابہ

مسئلہ مدح صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے متعلق گزشتہ مئی میں شیعان لکھنؤ سے میں نے التجا کی تھی کہ وہ فضاء لکھنؤ کو صاف کر دیں تو قوی امید ہے کہ ان کے حقوق مسئلہ مذکورہ بالا میں حاصل ہو جائیں۔ میں جد وجہد کر رہا ہوں اور مجھ کو کامیابی کی امید ہے۔ اگر خدا نخواستہ ناکامی ہوئی تو کوئی موثر قدم اٹھایا جائے گا۔ میں لکھنؤ کے شیعوں کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری عرض سنی اور درستی فضاء و امن و سکون کا قابل رشک مظاہرہ کیا۔ میں نے اس مدت میں بہت زیادہ کوشش کی اور ہر اس دروازہ کو کھٹکھٹاتا رہا جس سے کسی فائدہ کی امید ہو سکتی تھی۔ مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بدقسمتی سے آج تک مجھ کو کامیابی کا منھ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ میں شیعان لکھنؤ کو تلقین صبر کرتے کرتے تھک گیا۔ جب کہ وہ حضرات بھی اپنے جذبات کو روکتے روکتے تھک گئے۔ اب مزید انتظار کے لئے ان کو روکنے کا میرے پاس کوئی معقول پہلو موجود نہیں۔ شیعانِ لکھنؤ خود غور و فکر اور اہلِ عقل و تدبیر سے مشورہ کر کے جو مناسب تجویز اور راہ عمل قرار پائے با امن و امان رہ کر اس پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ میں ان ذمہ داریوں کے پیش نظر طاقت کے موافق خدمات پیش کرتا رہوں گا۔ واللہ ولی التوفیق۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

۳۰/ اگست ۱۹۳۹ء دیوبند

۳۰/ اگست ۱۹۳۲ء

مکرمی جناب وصی احمد صاحب سکریٹری مجلس احرار اسلام لکھنؤ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ اس عریضہ کے ہمراہ اس بیان کی نقل ارسال خدمت ہے جو حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ

العالی نے بغرض اشاعت مرحمت فرمایا ہے۔ اگرچہ آپ لوگوں کا شخصی نقطہ نظر باہمی گفتگو کے موقع پر ظاہر ہو چکا ہے۔ لیکن مناسب ہو گا کہ آپ جماعتی حیثیت سے اس بیان پر غور فرما کر اپنی جماعت کے ارادہ سے ہمیں مطلع کریں کہ آیا قانون شکنی شروع کرنے کی صورت میں ان کی جماعت ہمارے ساتھ شریک رہے گی یا موجودہ مصالح کی بنا پر آپ لوگ قانون شکنی کے لئے فی الحال تیار ہوں گے۔

ہم لوگ تو اس بات کو پہلے طے کر چکے تھے اور گزشتہ مئی میں ہماری غیر موجودگی میں ہماری جماعت کے لوگوں نے قانون شکنی بھی شروع کر دی تھی۔ اب صرف حکومت کو ایک انتہاہی اطلاع کر دینا ہے جس کے بعد ۱۰ ستمبر یا اس کے بعد ہم قانون شکنی شروع کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں میں سے جن کا تعلق کانگریس سے باضابطہ ہے یا جو فی الحال ماس کینٹکٹ کمیٹی کی خدمت میں منسلک ہیں ان کے لئے میں جانتا ہوں کہ قانون شکنی میں شریک ہونا بہت سی مشکلات کا باعث ہو گا مگر اس سے بچنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ فی الحال ایسے اصحاب کو جماعت سے رخصت دے دی جائے۔ بشرطیکہ آپ کی جماعت اس اقدام میں ہمارے ساتھ شریک ہونے کا فیصلہ کرے۔ اس عریضہ کے جواب میں براہ کرم مطلع فرمایئے کہ آپ کی جماعت کا فیصلہ کب تک معلوم ہو سکے گا۔ اگر آپ جلد ہی فیصلہ کر سکیں تو میں اس کی اشاعت (مولانا کے بیان کی) اس کے بعد کروں تا کہ ساتھ ہی ساتھ اپنی طرف سے اس کا اعلان بھی کیا جا سکے کہ ہم نے قانون شکنی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ والسّلام

خاکسار

ظفر الملک علوی لکھنؤ

نوٹ: براہ کرم مولانا کا بیان ابھی صیغہ راز میں رکھا جائے۔ اس کی اشاعت نہ کی جائے۔ میں مناسب وقت پر اشاعت کروں گا۔ ظفر الملک

از شفاعت منزل

مخدوم المکرم دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا گرامی نامہ آج لدھیانہ میں مجھ کو ملا۔ اس خط کو پڑھ کر بے حد حیرت بھی ہوئی اور صدمہ بھی۔ حیران ہوں کہ اس کا کیا جوب لکھوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا عبد الشّکور صاحب کیا کر رہے ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں۔

غریب مفلس لفنگے اور نوخیز لونڈوں کی جماعت نے کام شروع کیا اور مدح صحابہ کے سلسلے میں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال دیا۔ سب خاموش ہی نہ رہے بلکہ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یہ تحریک ہماری طرف سے نہیں ہے اور ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حکومت نے ان حالات کو سن کو پورا تشدد کیا صوبہ کی مجلس احرار نے کام کو ہاتھ میں لے لیا اور ڈکٹیٹر مقرر کر دیا۔ جنگ شروع کرنے سے پہلے مشورے اور کانفرنسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جب جنگ شروع ہو جائے پھر یا تو اس کی مدد کی جاتی ہے اور یا اس کو فنا کرنے کے لئے مختلف کانفرنسیں بلائی جاتی ہیں۔ اب کانفرنس کا کیا مطلب ہے کچھ نہیں سوائے اس کے کہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے دوسروں کی آڑ تلاش کی جائے۔ اب تو سیدھی اور صاف بات ہے کہ جس کے دل میں مدح صحابہ کی بندش کے خلاف جذبہ ہے اس کو چاہئے کہ لفنگوں کی زیر قیادت یا تو جیل میں جائے اور یا خاموش ہو کے بیٹھ جائے۔ میرے مالی حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں ضرور لکھنؤ جاؤں اگر ہو سکا تو صرف خط بھیجوں گا، وہ بھی آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے۔ ورنہ میں اس احتجاج کو بالکل بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ یہ عریضہ صرف آپ ہی کے لئے ہے۔ (یہ خط حضرت مدنی مدظلہٗ کے نام ہے)

حبیب الرحمٰن لدھیانوی

از دفتر مرکزی سیرت کمیٹی ضلع لاہور۔ ۱۱، ستمبر ۱۹۳۹ء

محترمی و معظمی زاد لطفہٗ

السّلام علیکم۔ اس وقت سیرت کمیٹی کی طرف سے جمعہ کے لئے جو اردو وعظ شائع کئے جا رہے ہیں وہ ہر جمعہ کے دن پانچ ہزار

مسجدوں میں سنائے جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے کو اور زیادہ وسعت دے کر دس ہزار مسجدوں پر حاوی کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ خطبات وعظ ایک ایسا ذریعہ ہیں جس سے سری نگر سے راس کماری تک کے مُسلمانوں میں ایک آواز کی گونج پیدا کی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کو جنگِ عظیم کے حالات اور مسائل سے باخبر رکھنے کے لئے خطبات جمعہ کا ایک خاص کورس شائع کیا جائے۔ اس میں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ آپ کی رائے میں ایسے بنیادی اصول کون سے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر یہ خطبات لکھے جائیں؟ مُسلم لیگ نے اپنے گزشتہ اجلاس میں فلسطین اور حقوق کے متعلق جن شکایتوں کا اعادہ کیا تھا، ان خطبات میں ان کا ذکر کرنا چاہئے یا نہیں؟ موجودہ جنگ کے متعلق مُسلمانوں کے لئے کون سی پالیسی پر عمل کرنا بہتر ہو سکتا ہے؟ چونکہ یہ مسئلہ نازک تھا اس لئے آپ سے استصواب کرنا ضروری سمجھا گیا۔ امید ہے کہ آپ واضح جواب سے ضرور مشکور فرمائیں گے۔ والسّلام

خاکسار عبد المجید قریشی[1]
پٹی، ضلع قصور

نوٹ:۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قریشی صاحب سی، آئی، ڈی کا کام بھی کرتے ہیں جواب نہیں دیا گیا۔

مخدوم المکرم

السّلام علیکم۔ ذیل کے سولات ارسال خدمت ہیں۔ حالات کا اقتضا ہے کہ ان کا جواب جلد از جلد ملک میں شائع کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد صاف اور مختصر مدلل جواب ارسال فرما کر مشکور فرمائیں گے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ اس وقت شاہ امان اللہ غازی پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے اور باغیوں کی شرعی حَیثیّت سے امداد کی جا رہی ہے۔ جس سے دشمنان اسلام بے حد فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سَلطنت اسلام کو برباد کر رہے ہیں۔

سوالات

۱۔ کیا فرماتے ہیں عُلمائے دین اس مسئلہ میں کہ شاہ امان اللہ غازی والئی افغانستان نے جو اصلاحات اپنے ملک میں جاری کی ہیں کیا وہ ان کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا؟

۲۔ (الف) کیا ان اصلاحات کا اجراء شاہ امان اللہ کے خلاف بغاوت کرنے کی شرعاً اجازت دیتا ہے؟

(ب) اور جو جماعت ان اصلات کے اجراء کی بنا پر بغاوت کرنا چاہتی ہے اس کی کسی قسم کی معاونت کرنا کسی مُسلمان کے لئے شرعاً جائز ہے؟

۳۔ جو لوگ ان اصلاحات کے اجراء کی وجہ سے شاہ امان اللہ کو کافر کہتے ہیں وہ حق پر ہیں؟

۴۔ جب کی دشمنانِ اسلام مُختلف ذرائع سے سَلطنت افغانستان کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان حالات میں شاہ امان اللہ کی امداد کرنا ہر مُسلمان پر شرعاً فرض نہیں؟

سنٹرل خلافت کمیٹی بمبئی

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دام مجدہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ آپ کا پہلا خط پہنچا تھا۔ بمبئی میں بے شک اتنی دور سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لئے کہ یہ معاملات

[1] لاہور میں ۱۹۴۷ء میں قریشی صاحب جس مکان میں ٹھہرے تھے وہ انار کلی میں تھا۔ کسی نے رات کو قریشی صاحب کو قتل کر کے غسل خانہ میں بند کر دیا۔ آٹھ روز تک لاش غسل خانہ میں سڑتی رہی۔ آخر بھنگی نے لاش کو نکالا اور بلا جنازہ کے بو کی وجہ سے دفن کر دی گئی۔

خطوط اور مراسلات سے نہیں حل ہو سکتے، بلکہ خود جانا چاہئے اور تدبیروں اور حکمت عملیوں کے ساتھ ان بے ایمان سرمایہ داروں سے روپیہ وصول کرنا چاہئے۔

اس بارے میں میں نے خاموشی اختیار کی تھی۔ میاں منیر بخش سے کہنے کے لئے کئی دفعہ گیا۔ مگر وہ آج کل ایک عرصہ سے دیولالی میں مقیم ہیں۔ انشاء اللہ رمضان کے آخری عشرہ میں جب کہ وہ ماہم پہنچ جائیں گے ان سے عرض کروں گا۔ میں نے کہا تھا اگر آپ خود بمبئی آجائیں تو میاں منیر بخش اور ان کے بھائی میاں محمد دین جو بہت زیادہ امیر ہیں کوشش کی جائے۔ محمد دین صاحب پر مولانا محمد علی کا بھی خاصا اثر ہے اور میں نے سنا ہے کہ کوئی شخص ان کے دروازے پر سے خالی نہیں جا سکتا۔ میں رمضان کے بعد دہلی آؤں گا۔

مسئلہ افغانستان میں بھی آپ کی دوستی اور طریق کار مخصوص ہیں۔ ہماری ذاتی اطلاعات یہ ہیں کہ افغانستان میں سوائے چند نوجوانوں کے ایک متنفس بھی نہیں جو شاہ امان اللہ خاں کے عمل موافق ہو۔ یہ مسئلہ کسی ایک گروہ کی بغاوت کا نہیں ہے۔ بلکہ تقریباً تمام عمال حکومت، وزراء اور تقریباً ساری پبلک کی مخالفت کا ہے اور یہ سارا کیس کم از کم مجھے انقلاب افغانستان سے چار ماہ پہلے معلوم تھا جب سردار علی احمد خان بمبئی میں آئے تھے تو اس وقت ان سے سارے حالات معلوم ہو گئے تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اب آئندہ افغانستان میں ضرور کوئی نہ کوئی تبدیلی ہو گی بہر کیف ہماری معلومات یہ تھیں کہ سردار علی احمد خاں، جنرل نادر خاں اور ان کے دونوں بھائی۔ سردار محمد ولی خاں شیر علی خاں، والدہ امان اللہ خاں سراج انور اور تقریباً ساری فوج اور عُلماء یہ سب امان اللہ خاں کی پالیسی کے موافق نہیں ہے اور خود افغانستان کے انقلاب نے بھی یہی ثابت کیا ہے کہ فوج اور عمال حکومت موافق نہ تھی۔ ورنہ خوست کی بغاوت تو چند ہفتوں میں قلع قمع کر دی جائے لیکن ایک بچہ سقہ کی بغاوت جسے ڈاکو کہا جاتا ہے اتنی مؤثر اور ہمہ گیر ہے کہ اس کے سامنے ساری سلطانی فوج نے ہتھیار ڈال دے اور اپنی بے چارگی کا اعلان کر دے۔ بہر حال ہماری اطلاع افغانی سرکاری ذرائع سے یہ ہے کہ بچہ سقہ تو برائے نام ہے اور اس کی پُشت پر تقریباً سارا ملک ہے۔

ایسے حالات میں جو آپ کا رویہ ہے وہ بہت نامعقول ہے اور افغانستان کے لئے تباہ کن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ امان اللہ خاں سے بہتر سرزمین افغانستان کے لئے کوئی دوسرا شخص نہیں ہو سکتا لیکن ان کو واپس لانے کی تدبیر بھی یہ نہیں کہ تمام عُلماء افغانستان کو گالیاں دی جائیں اور بچہ سقہ نام کا جو ایک شخص ہے اسے کتا اور کیا کیا کہا جائے۔ صورت یہی ہے کہ امان اللہ خاں کو بھی سمجھایا جائے کہ ساری اصلاحات عورتوں کے ننگے بدن میں نہیں رکھی ہوتیں اور ادھر عُلماء اور مشائخ اور قبائل کے سرداروں کو بھی سمجھایا جائے کہ یہ چیزیں اتنی اہم نہیں ہیں کہ آپ ان کی وجہ سے ایک بہتر آدمی کو ضائع کر دیں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ مرکزی خلافت کے ٹکڑے ہو گئے ہیں ورنہ ایک جگہ بیٹھ کر اگر کوئی مشورہ ہوتا تو سب ایک ہی رائے پر جمع ہو جاتے۔

جن حاجیوں کو آپ بھیجنا چاہتے ہیں، ان کی روانگی سے قبل تار دے دیں تاکہ اسٹیشن پر انہیں رضا کار ملیں اور انہیں ہر قسم کا آرام پہنچائیں۔ اگر مسافر خانہ میں جگہ ہوئی تو انتظام کر دوں گا۔ ورنہ کوئی کمرہ دے دوں گا بہر کیف انہی کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ نہ لائیں اور نہ خریدیں، اس لئے کہ کمپنی کے تمام جہازوں میں مُسلم ہوٹل کھل گئے ہیں جو نہایت عمدہ اور سستا کھانا بہم پہنچاتے ہیں۔

محمد عرفان
(دفتر خلافت کمیٹی۔ بمبئی)

سِکندرا راروڈ۔ دہلی جدید۔ ۲۲/ مارچ ۱۹۳۹ء

جناب مستطاب مولانا حَبیب الرحمٰن صاحب زاد الطافکم

السَّلام علیکم۔ امید ہے کہ مزاج دہاج ترین عافیت ہوگا۔ منشور کے پرچے مطبوعہ مورخہ ۲۲، مارچ میں کچھ مضمون آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جس کا تعلق امان اللہ خاں سے ہے چونکہ آپ دیرینہ کرم فرما ہیں لہٰذا یہ جسارت اِستفسار کرتا ہوں کہ آیا فی الحقیقت یہ

آپ کا بیان ہے یا یونہی آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے؟ زیادہ ایام بکام

مخلص محمد فاضل

از سفارت خانہ افغانستان

ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ ۷ار اگست ۱۹۲۹ء

عالی جناب مخدومی و محترمی حضرت فخر الاحرار صاحب مدظلہ العالی

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مزاج اقدس۔ رندان زمان جب کہ ہر طرف سے حوادثات انقلابی رونما ہو رہے ہیں اور ہندوستان و افغانستان میں بحیثیت سیاسیات دشوار عبور طرائق سے گزر رہے ہیں ایک سلطنت کا دوسری ہمسایہ سلطنت پر اثر ہونا ہر حیثیت سے ضروری ہے۔ اعلیٰ حضرت غازی محمد نادر شاہ ناجی و استقلال بخش افغانستان و سلطنت محروسہ اش کے برخلاف چند گمراہ کوتاہ اندیش اشخاص نے ضرورت حال و اقتضائے زمانہ سے ناآشنا ہو کر گمراہ کن پراپیگنڈا شروع کر رکھا ہے جو منافی امن۔ اصلاح و قیام سلطنت ہے، اس سے جناب بھی باخبر و واقف ہوں گے۔

اکابر اسلام کی متفقہ آواز کو نہایت سرد مہری و کم دانشی سے پس پشت ڈال کر بے سروپا خود ساختہ افسانے گھڑ کر عام مسلمان کو دولت عالیہ افغانستان کے خلاف بدظن کرنے کی جو ناپاک کوششیں شروع کر رکھی ہیں ان سب ہتھ کنڈوں سے جناب والا مطلع ہوں گے۔ کیا اب وقت نہیں آیا کہ اکابر اسلام کی مقتدر و واجب الاحترام جماعت ارشاد ربانی لاتفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا کی تعمیل کر کے اعلائے کلمۃ الحق فرما کر ایک آزاد شان دار اسلامی سلطنت کو اشرار کے شر سے جنہوں نے اپنی بے جا ضد اور ہٹ پر مفاد اسلامی کو قربان کرنے کی ٹھان رکھی ہے، نجات دلائے اور ایک اہم فرض سے سبک ہو کر عام مسلمانوں کو جن کی نگاہیں بے قراری سے ان طرف اٹھ رہی ہیں رہنمائی کرے۔

برائے مہربانی اپنے ارادہ و خیال سے جو شرعی و پولیٹیکل نکتہ نگاہ اور موجودہ ضرورت وقت کی بنا پر ہو کسی قریبی فرصت میں مطلع فرما کر مسرور فرمادیں۔

افغانستان پراپیگنڈا کمیٹی نہایت بے چینی سے جناب کے ارشاد کی منتظر ہے۔ والسّلام

نیاز مند۔ (شاہزادہ) فضل داد صدر افغانستان پراپیگنڈا کمیٹی۔ کوچہ حافظ جمال

ڈیرہ اسمٰعیل خاں

(بالکل پرائیویٹ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وقت آنست کہ خود را ہمہ ایثار کنیم اصلاح پئے اصلاح وطن کوشش بسیار کنیم

ہفتہ وار

رایگاں

جلد اول۔ حاجی۔ یوم چہار شنبہ۔ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۸ر اگست ۱۹۲۹ء شمارہ ۴

ھواللہ خواہش میکنم

برادرم مدیر صاحب جریدہ اصلاح! این مکتوب مراعیناً درج جریدہ اصلاح نمائید جریدہ عاجزانہ اصلاح باین متقین است کہ برادران ہمدرد ہنوی ما از ہیچگونہ امداد و اعانت خودداری نکردہ بغوریت اس اعانت مالی خود شان را لباس عملی خواہند پوشاند، چرا برادران حساس ہندی مادر اوقات مصائب ملل شرق خصوصاً ملل اسلامی ہمہ وقت اعانت و ہمدردی خود شان را عملاً ثابت کردہ اند، چندہ ایکہ چند مرتبہ در محاربہ ہائے بلقان و طرابلس و یانان وغیرہ بہ برادران ترکی ما فرشادہ اید یک مسئلہ مسلم است، ہمچناں در ہمیں انقلاب حاضرہ افغانستان وقتیکہ امیر امان اللہ خاں مخلوع در قتدار بر علیہ سقویہا کارروائی داشتند۔ جمعیت ہائے تعاولی ہندخیلی نداکاری نمودند۔ جریدہ اصلاح امید میکند کہ عنقریب این اعانت و امداد مالی برادران ہندی ما کہ امروز نجات مملکت افغانستان ازیں تہلکہ است و تاحین حیات آئید یک کروڑ نفوس اسلامی وسط آسیار امیناید، خیلے

بسرعت درمیدان عمل اثبات وملت درر سیده الم کشیده افغانستان راممنون ومرهونِ احسان خویش فرمایند،

همچنان این جریده محقره ازهمه نوع بشر استمداد هرگز نه امداد واعانت دردمندانه انسانیت کارانه شلزار نسبت به این حالت تباه ملت و مملکت افغانستان چشمداشت دارد،

نوحه کابل

برادران غیور افغان مان!

مااهالی کابل بزیر اثر حکومت افغانی دریں سالهایے درازخدمت، فداکاری وجان نثاری نموده برایشما برادران افغانی خود اسباب همه گونه استراحت وآرامی بودیم۔ آیا، هیچوقت ازخدمت شماکوتاهی کرده ایم۔ مزدور شمابودیم، بطاخی، بانبائی، خیاطی، چپلی سازی پیرزددوزی، دباغت وامثال آن برایشما نمیکردیم؟ سراسرها، دکانها، خانه هاں هابرای راحت دبودوباش شمانبود؟ اگر مانگوییم ازشام استفاده یعنی کمائی نکرده ایم، بلی، ماقبل هستیم که شماحفاظت مال، جان، ناموس وشرف مارا بینمودید بزیرسایه شماآرام بونه یم، ازپول شمافائده نیکردیم، شب وروز به دعائے استقرار حکومت وسلطنت شمابودیم،

لے امروز اگر فلکت وتباهی مارا به بنید میدانید که ماچه مصائب ونوائب وچاریم برایمانان نمیرسد، فام نمانده، ناموس مابربادرفت، اختیار جان، مال، زن وبچه خودرانداریم، روز وشب بشکنجه اذیت این وزدان وظالمان خونخوار ایم، اگر شماگمان کنید که ماخاموش هستیم واین خاموشی ما بواسط آراسیت، نے، انیقسم نیست، خاموش بودن ماازاستبداد وظم وسفاکی این وزد ظالم واشرار معیت اوست، تاحال بهر طرف دست و پازدیم، واز هیچگونه نه وسائطی که دررفع فسق وفساداین ظالمان ازدست موپوره بود کوتاهی نکردیم، سلے چوں کمک ماوجب ازدیگر طرف براشانر سیدماتنهاوبیکس مانده زیاده تربشکنجه اذیت وزد ظالم گرفتارشدیم وهزارهاجوانان مااشخاص سربرآورده وخدمتگاران شمااقوام بلکه اکثر پیشوایان ومقتد یان ماوشمامقتول، مجروح محبوس تهین زمانه، بے پرده، بے آب، بے ناموس وضبط وتراج گردیدند، ایں واقعات نیست که شماخبر نداشته باشید، البته اگر عموم شماچشم خودندیه اند، بعضی نفری شماکه درکابل آمده ایں حالت زارد ابتلاس عظیم ماملاحظه دره اند، آیاهمان کابلیکه پیشتر دیده بودید حالا هم هماں قسم دیدید، آدمرادیدید که خنداں فرحاں باشد، وکان بود، ؟ مسافران دیده میشد؟ مساکین ومردمان غریب که خود شان برائے خرید وفراهم کردن نفقه خود دربازاء میرفتند آیایک نفرشان راکسے دیده، متاصفه اهالی کابل درشهرمانده، درمساجد پنجنفر برابردائے فریضه نماز که اے خداوندی است رفته دیکهاشده نمیستواند، خاص اینکه هرآدم ازسفاکی وخونخواری وزدان فاسق ترساں دلرزاں است انمااشکوا بثی وحذنی الی الله

شهر کابل پایه تخت سلطنت افغانی امروز جاء فسق وفجور پنجنفر وزد کوهدانی نه کوهستانی شده وبس، دروقتیکه ازطرف بچه سقه وشهرت شدکه بعضی نفری افاغنه ازجنوبی آمده بودند میخواستیم که زن ومرد مادر سرکهابرآمده وحشت وبربریت وبهیمیت بچه سقاد وزدان معیت اءدار حال تباه خودرابرای شان عرض نمائیم، میدانستیم که این اقوام ولاور باغیرت سمت جنوبی که پیشتر محض برائے یک جزئی مسئله مکه دار مسائل دینی و دنیاوی فداکاری وجاں نثاری نموده اند، حالا ایں همه بیدینی وبے ناموسی این وزدان رایگان یگان دیدیه وواقف هستندچه طور برائے اصلاح و اطاعت بچه سقدرهزن مے آیند، ماانیطور قیاس کردیم که البته اینهابرای اخذمعلومات وحالت تباه ماوظلم وبیداد ایں وزدان چند نفر رافرستا ده خواهد بود لذا باید عرض حال خودرابرائے شان برسانیم، ولی کجامابیچاره که چاهر نفرهم یکجاشده نمیستوانیم، خودراباین تسلی کردیم که شاید خدائے رحمٰن ومنان ازفضل بیکراں خود ذریعه بسازد که ماعرض حال خودرابه برادران باغیرت خود برسانیم وازانهااستمداد وستعانت کنم، تاینکه بعضی پرچه هاں اخبار مبارک اصلاح راکه بعضی برادران باغیرت وجوانانِ باهمت مابکابل رسانیده بودند مطالعه نمودیم

لله الحمد هرآں چیز که خاطر میخواست

آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

علاوہ ازیں از خبرہائے مسرت آور اتحاد و اتفاق شما اقوام باغیرت سمت جنوبی و سمت مشرقی و مجاہدت مردانہ اسلامیت کارانہ تان واقف شدیم و شکر بہ حضرت الٰہی رابجا آوردہ منتظر نعمتِ نجات خود بفضل و احسان خدائے سبحان از دست ایں ظلمان گردیدیم، خوش بختانہ بایں مسئلہ زیادہ تر خورسند شدیم کہ جریدہ اصلاح میتواند عرض حال و مظلومیت مارا بہ عموم شما برادران غیور و ہمدرد ما برساند، لہذا این احوال جانکاہ خود را بشما برادران تقدیم در جامیکنم کہ وقت غیرت، ہمّت، اسلامیت، ترحم ناموس دارش، مروت، شفقت بحال مابیچارہ ہاد مظلومین و دور کردن لکہ بدنامی از دامن پاک سلطنت افغانی خود تان ہمیں است۔ زود شوید، ہمّت کنید، بہ پنجر دزہ زحمت خود خود ہارا و مابیچارہ ہارا حیات دوبارہ بدہد۔ در دین و دنیا خود را ازیں معقولیت بکشیدہ سقادیان دوباہ خصال کسے نیتند کہ طقت یک ساعتہ حملہ مردانہ شمارا داشتہ باشند، فقط سنبلی، غفلت و بے پروائی خود شما است کہ این ظالمان راظاہر اقوی ساختہ، برادران ننگابی و ہزارہ ہا خیلے حملہ ہائے مردانہ نمودہ و نمایند، و این دزدان و خاندان سقادی رابدرقہ اساتذہ اند کہ بہ اصلاح، کابلی ہاموش در قطعی شدہ ولی سردی و خاموشی شما دو سمت باغیرت مارا خیلے مایوس ساختہ۔

درخاتمہ از جناب مدیر جریدہ اصلاح رجا میکنم کہ این عرض عاجزانہ مرا در اولترین شمارہ جریدہ مبارکہ کود درج و باقوام باغیرت و برادران باہمت مان اقوام غیور سمت جنوبی و مشرقی و عموم افغانستان شائع نماید، س، ع کابلی

حوادث داخلہ

ملکان احمد زئی ازیر، حفرد، غوگیزہ، برگ، چکری وغیرہ بہ تعاد شصت نفر بہ عــلی خیل آمدہ بودند، بیان شان این بود کہ پنجہر ار لشکر مامستعد خدمت است، برنقطہ کہ اجازہ باشید داخل خدمت ملیشویم، جناب اعلیٰ محمد نادر خاں غازی بآنہاہدایت داد ند کہ حال در حدود خود متوقف باشند، بعد از فیصلہ گردیز کہ دیگر لشکر ہابطرف سہوگر د حرکت کردند رابوقت لشکر ہائے شماہم شامل خدمت شوند۔

اطلاع از دیگر ذرائع موثق کہ معلومات دارد سہ ہزار لشکر این اقوام جمع و مستعد خدمت اند،

محاربہ گردیز

اقدام اشرار سقادی:۔ شب ماہ ۱، ربیع الاول اشرار سقدی بمعاونت دریخیل جدران و بعضی از نفری مینگل بہ ماتحتی نیستک و خانوی و خان پسر سنک و آدم خان پسر خان ولی و چند نفر طوطاخیل و احمد زائی ہائیکہ بہ سقاد بیعت داوہ بودند تابہ حدود طوطاخیل آمدہ شب نقاط مہم حربی رااخذ و استحکام خود ساختند کوہ سیکرام الی کندر خیل۔ ایں حدود ۶ کروڑ بطرف مشرق گردیز واقع است،

شجاعت فوق الارادہ مجاہدین حریت

ہزیمیت بزرگ و تلفات زیادہ سقادیان،

ساعت ۲ بجے صبح محاربہ شروع گرید۔ محادبہ خیلے بشدت ۲ ساعت و دوام نمود، بساعت ۸ سقاد بہا تاب مقادمت را نا ور دہ بہ عقب نشینی مجبور شدند، ۲ توپ ایطالوی و یکتوپ نہ پونڈ صحرائی، ماشنیداز زیاد و خیمے اسلحہ و جبہ خانہ شان غنیمت مجاہدین گردیہ تا اند ازہ پنجصد نفر شان زندہ اسیر د مانفر سقادی مقتول و مجروح شدند، لشکر ہائے مجاہدین سقادیان را تاحدود بالاوہ کہ از استحکامات مذکو ۲ کروڑ مسفہ آنست و ۲ کرور بگرریز قریب است، تصقبت شان را کردہ استحکامات و نقاط مہم رامجاہدین اشغال نمودند، شب محاربہ معطل و لشکر ہا استراحت داشتند،

پسپائی عارضی مجاہدین:۔

فردار آن لشکر ہابزبہ تغرض شروع نمودند، ولے دریں روز نظر بہ بے اعتباری کی دربین بعضی طوائف لشکری پیدا اشہد بود، مجاہدین بہ پیشتر وقت اقدام نکردہ و صعلتِ مدافعہ را اختیار نمودند، بعضی نفری فوق لاذکر پیشتر بہ سقاد بیعت دادہ بودند، برائے اینکہ مصنویات لشکری

خراب شود بہ پسپائی شروع کردند، قوم در بخیل وسقادیہا ازیں موقع استفادہ کردہ بہ پیش رفت طرف رود احمد زئی اقدام کردند

خدا ناترسی وسفاکی سقاویان

احمد زئی ہائیکہ طرفدار سقادی نبودند، وبیعت ندادہ بودن، آنہامال وعایلہ خودرا کشیدہ کنارہ کردند وکسانیکہ طرفدار ومطیع ومنقاد بودند آنہا نجاطرجمع بہ قلعہ ہائے خود باقیماندہ بودند، افسوس بحال اینہا کہ ازاہالی شہر کابل وخوشی وباخواب سوگر در دیگر نقاط کہ سقوتہا بمال وناموس طرفداران خود چہ ظلم وجبر کردند، بدبختانہ ہیچ تنبیہ نشد، بخواب غفلت بودند۔ خیر بہمہ جہت دیدند آنچہ دیدند

نتیجہ خدمت دزدان یامکافات عمل

سقویہا کہ ڈال رود احمد زائی شدند اولاً ہماں اشخاص مطیع ومنقاد خود را چور وچپاول کردہ زنہائے شانرا زندہ اسیر بردہ، حتیٰ دونفر طفل صغیر ملک عبدالرحمٰن کٹور احمد زئی رود را کہ یگانہ طرفدار سقوی وبکابل ہم رفتہ بود ذبح کردند، ملاداؤد شاہ مالی خیل کہ دین را بدنیا فروختہ بہ پنجرہ وپیہ سقادی برعلیہ جمیع اقوام افاغنہ وجناب حضرت صاحب کہ پیر او بود شدہ کارروائی نمود، سقادیہا قلعہ اور اسوختاندہ خودش را باسعت نفر قوم وعاملہ کو خورد وکلاں اور بہ تیغ ستم خویش شقہ کردہ کشتند، باقی قلعہ ہائے احمد زائی وطوطاخیل را تا کند خیل آتش دادند، فاعتبروا یااولی الابصار

جریدہ اصلاح

اینست نتیجہ مہربانی سقاد کہ بطر فداران خودش تطبیق گردید جان، مال، ناموس، شان برباد شد، ولے آنہائیکہ طرفدار سقاد بنودند الحمد جان ومال، شان محفوظ ماند، اگر بانیہم اقوام افاغنہ تنبیہ نمیشوند بہ الحال شان، نظر باین حیات مرگ شان بہتر ونسبت باین موجودیت عدم آنہا افضل است، ازاقوام باغیرت افاغنہ چہ شد غیرت، ناموسداری شہامت، شجاعت، دینداری، قوم پروری شان، آیا ازیں ذلت خود تنبیہ نمیشوید، این واقعات جانسوز شمارا از خواب غفلت شان بیدار نمیکنند، ہنوزم قریب وتلبیس دشمن رامیخورید، دیدید کہ فریب خوردہ ہابشماچہ شدند، ناموس جان ومال، شان راسقوی باچطور سرباد دادند، بجز شمشیر وغیرت ومجاہدات، شان، اتفاق واتحاد شان چیز دیگر ذریعہ نجات شما نمیشود، باخبر باشید ہنوز سروقت است

اسیران سقاوی کہ بجمعیہ سقاوی رسیدہ

گل محمد غند مشریادارہ بزرگ	یکنفر
کند کمشرہا	۲ نفر
تولی مشر	۱نفر
سپاہی	۱۱۹ نفر

پسپائی دوبارہ سقاویان

ساعت ½۲ بجہ شب ۲۲، ربیع الاول اطلاع رسیدہ:

اطلاع آتش دادن قلعہ ہائے احمد زائی مکندر خیل، طوطاخیل کہ بہ لشکرہائے مجاہدین رسید، فوراً بیک جوش وخروش بہ تعرض آغاز کردحد واز ہر طرف دشمن رابزیر آتش گرفتند، حسن خیل واحمد خیل جاجی از ہمہ اولتر داخل محاربہ شدند، دیگر لشکر ہائے جاجی ودیگر اقوام مینگل میرزتہ، احمدزائی طوطاخیل یکے بعد دیگرے داخل خطوط حربی گشتند، تاحال کہ ساعت ۶ عصر محاربہ دوام دارد، سقادیہا قریباً ۶ میل عقب نشستند، مجاہدین نقاط مہم وہماں استحکامات اولیہ خود شان را کہ از سقادیہا گرفتہ بودند دوبارہ اشغال کردند، سقادیان بزدردہ بالا محصور شدہ اند، تلفات زیاد سقاد یہادریں محاربہ دادہ اند تفصیل آن در ثانی دادہ میشود،

می زائی جدران کہ ملکان شان بیشتر آندہ بودندیک لشکر قومی جمع آوری کردہ ودر علگے رسید مدلی غلگی از گردیز قریباً ۶ کروڑ جساقہ دار د خط فرستادہ بودند کہ مادر کدام نقطہ داخل محاربہ شدیم، برائے شان ہدایت حربی دادہ شد، مروم درہ، دزاذء کہ طرفدار سقادی بودند بآمدن ملکان و لشکرہائے میزائی امید است کہ درست شوند

اصلاح دعائے کامیابی داتحادواتفاق لشکرہائے مجاہدین رانمایید وہمچنیں فتوحات شاندار شانرااز خداوند مسئلت میکند۔

قندھار

کوہستانی وکوہدانی سقادی در شہر قندھار توقف دارند از سوء رفتار آنہا اہالی شہر بہ تنگ آمدہ خیلی پریشان اند، اقوام قندھاری مثل زمیند اور وگرم سیل وجمیع اہال محالات آن تدارک وتہیہ لشکر را بر علیہ سقوی ہادارند،

سقادیہادرداخل شہر تہیہ استحکامات وپیش بینی محصوریت خود را دارند، قندہاریہاراچیز یکہ پیشتر متاثر ومشتعل ساختہ پشیمانی اعمال خود شان است وازبے ہمتی خود کہ سقادیہادر شہر قندھار داخل ساختند خیلے نادم اند،

دوکندک از شش کروتی کابل کہ بقندھار فرستادہ شدہ روز آنہادر منزل باغ توقف دارند، توخاندان عسکری قندھار کوشش دارد کہ آنہا داخل شہر ویادو کندک کوبدامنی وکوہستانی یک جاشوند ولے کندکہاے شش کروتی کہ ازافعال دسور رفتار کوہدامنی ہاتنفر اند داخل شہر نمیشوند، اختلاف زیادے دربین عسکری سقادی ہم است۔

امید است کہ عنقریب اقوام قندھاری از میحوقعے استفادہ وازیں خجالت، خود را برہانند بعون اللہ تعالےٰ۔

وحشت درمظالم سقوی

تگاب:

سقویہابعض کہ یک فتح عارضی در تگاب حاصل کردند، قلوبہے تگاب را آتش دارند، اشجار رایکلی پے دباغ باد آراضی مزروعہ شان را خراب کردند، درحق اہالی آں تاجائیکہ دست شان میرسید، یک قتل عام راجاری حتیٰ ریش سفیدان پاماندہ واطفال معصوم شاکزابہ تیغ ستم ہلاک نمودہ ازبنارابردن،

این مظالم راحالا وحشیان امزکعبہ نم اجرا میکند، درٌن عصر حاضر این اولین وحشت اس کہ محض برائے تعیش ونفس پرستی یک دزد ظالم درحق مسلمانہاوافغانہائے افغانستان اجرامی شود،

خدایا اگر افاغنہ غیرت نمیکنند وغیرت ازالنبار فتہ، توغیور ہستی، منتقم حقیقی ہستی، توغیرت ناموس مظلومین بکس وانتقام این مظالم راکہ در حق مابیچارہ بااجراء میشود مگر ومارااز شر این دزواں وحشی محفوظ دار۔

"مجروحین سقاوی"

مجرومین ودیگر اسیران سقادی کہ مجاہدین درین محاربہ اسیر گرفتہ اند، دورعلی خیل جاجی توقف دارند، مجروحین آن کہ انفراست طوریکہ مجروحین مجاہدین پرستاری وتیارداری میشوند، ہمان قسم تحت معالجہ گرفتہ شدہ اند، غذاد ادویہ شان خیلے بہ نظامت دادہ میشوند، بقیہ اسیران آنہارا جائے علیٰحدہ دادہ شدہ، خوراک مثل افراد لشکری بادشان دادہ میشود، اسیر گفتہ نمیشوند، اگر راست بگوئیم مجاہدین جاجی آنہا رابطوریک مہمان محافظ میکنند حالا وحشت سقوی وانسانیت مجاہدین راملاحظہ کنید کہ آنہاچہ مظالم مینمایند وانیہاچہ سلوک میکند

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تابکجا

ایک واقعہ جانکاہ، شہادت یکنفر جوان رسید وطن خواہ آقائے فضل احمد خاں فرقہ شریک جوان وطن دوست وافر بقلم یافتہ حربی بود،

قراریکہ ما پیشتر مطلع شدہ بودیم در حبس خانہ ارگ محبوس بود۔

حالا جراند۔ ہندی خبر شہادت معزی الیہ راشائع کردہ اند، نظر سفاکی و وحشت سقاد سقادیان کہ در حق دیگر صاحمصان و اعزہ افغانستان اجراشدہ، ما این خبر را تسلیم میکنم، ما از خدائے متعال برائے شہید راہ حریت طلب مغفرت و برائے پسماندگان شان صبر جمیل میخواہم و خاتمہ ایں مظالم رانیاز میکنم

از لاہور۔ ۱۹/ اکتوبر ۱۹۴۶ء

جناب مولانا صاحب

تسلیم۔ آپ کے دونوں خط مورخہ ۲۸/ اکتوبر آج موصول ہوئے۔ ۲۹/ ستمبر کا خط شملہ سے بذریعہ ڈاک واپس آیا ہے۔ وزیر اعظم آج کل اس وقت لاہور میں ہیں۔ امید ہے کہ ۱۵/ اکتوبر کے قریب قریب لاہور پہنچ جائیں گے۔ امید ہے کہ لاہور پہنچنے پر جلد از جلد آپ کو ملاقات کے لئے تحریر فرمایا جائے گا۔

آگے آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ۱۱/ تاریخ کی شام کو لدھیانہ پہنچ رہا ہوں امید ہے کہ وہاں آپ کے نیاز حاصل ہوں گے۔

خیر اندیش

بھیم سین سچر

مجلس احرار اسلام ہند، لدھیانہ۔ ۱۳/ اپریل ۱۹۳۸ء

والد حضرت

انشاء اللہ مزاشما بخیر خواہد، عرض حال اینکہ در حال ما یان آل انڈیا احرار پولٹیکل کانفرنس در پشاور منعقد کردہ بودیم و درا و اعلان پالیسی خود کہ در اخبارات شائع شدہ است بالفاظ ذیل کردیم۔

”ایں اجلاس افغانستانِ قبائلی و سرحد رامتنبہ میکند کہ بعضے از حکومتہائے غیر ملکی از عرصہ درپے برپائے انقلاب در افغانستان زبستہ دوانیان دارند۔ چنانکہ ایشان در ۱۹۲۹ء برخلاف حکومت امان اللہ خان شورش برپا کردہ تختہ اش را بباد دادند، خصوصاً دراں چنیں ایام وقتیکہ در اور دیا اندیشہ جنگ عظیم در پیش باشد، قبائل را باید کہ نہایت محتاط و ہوشیار باشند و گوش بر پر بچندہ غلط ندہند۔ ایں اجلاس بخدمت مسطع و اخبارات ہندی نہایت مؤدبانہ استدعا دارد کہ ایشان از اشاعت۔ اخبارِ دروغ نسبت حکومت افغانستا کہ ہمسایہ ملک اسلامی ما است پرہیز کنند دنیا بر ذاتی مفاد و اغراض خویش درامن اش رخنہ اندازی نکنند“ والسلام

نیاز آگیں

حبیب الرحمٰن

صدر مجلس احرار الہند۔ حبیب روڈ، لدھیانہ

حبیب روڈ۔ شفاعت منزل، لدھیانہ۔ ۳۱/ مارچ ۱۹۴۷ء

برادر مکرم و محترم شاہ صاحب

السلام علیکم۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو مجھے یاد ہے کہ سیاسیات میں آنے سے پہلے میرے اور آپ کے ذاتی تعلقات ۱۹۱۴ء سے آج تک میں نے پوری سچائی اور نیک نیتی کے ساتھ آپ کی دوستی کو نبھایا اور یہ کبھی امید نہ رکھی کہ دوست میرے متعلق آپ کو کیا کچھ کہتے رہے جس سے آپ کبھی متاثر ہوئے اور کبھی شدت کے ساتھ میرے مخالف دوستوں کی زبان بند کی۔

اس فیصلہ سے قبل میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کی اور برادرم شیخ حسام الدین صاحب کی موجودگی میں ایسا تباہ کن طریق کار پاس کیا

جائے گا۔ مجھے امید تھی کہ آپ میری دوستی اور اخلاص کی بنا پر کسی فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے اجلاس کو ملتوی کر دیں گے۔ مگر میری امید کے خلاف ایسا نہ ہوا۔ میں آپ سے جدا ہو رہا ہوں اس حال میں مجھے انتہائی دکھ اور رنج ہے، لیکن میں اپنی سیاسی رائے اور معلومات کی بنا پر ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور ہوا۔ مجھے مجلس احرار کے دوستوں سے نہ کوئی ذاتی گلہ ہے نہ رنج، بلکہ میں نے اپنی تشریحی چٹھی میں جو کچھ لکھا ہے وہ مجلس احرار کی مجموعی پالیسی اور احرار دوستوں کی بعض ایسی سیاسی آرا کی مخالفت کی ہے جن سے مجھے کسی حال میں بھی اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔

کاش اب یہ دوست آپ کے ساتھ رہیں۔ یا آپ ان کو اپنے ساتھ چلا سکیں، کیونکہ میں واقعات کی بنا پر جانتا ہوں کہ زیادہ دنوں تک احرار کی گاڑی نہ چل سکے گی۔

ماسٹر تاج الدین صاحب بھی دیرینہ دوست ہیں۔ انہوں نے اپنے مقاصد میں جس وقت مجھے چاہا مجھ سے کام لیا اور اب جب وہ خود آگے بڑھ کر کام کرنے لگے تو انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ مجھے مستعفی ہونے کا مشورہ دیں۔ مجھے ماسٹر صاحب کے اس طرز عمل پر کوئی شکوہ نہیں، وقت اور حالات خود بتا دیں گے کہ ان کا طرز عمل صحیح تھا یا غلط۔

میری تشریحی چٹھی اس ہفتہ تک پریس میں جائے گی اور آپ سے امید کرتا ہوں کہ آپ اسے اپنے اخبار میں شائع کریں گے۔ مجلس سے علیٰحدہ ہوتے ہوئے بھی میرے اور آپ کے ذاتی تعلقات میں کمی نہ ہوگی اور ہمیشہ یہ امید کروں گا کہ آپ بھی ذاتی تعلقات کو فراموش نہ کریں گے۔ والسلام

حبیب الرحمٰن لدھیانوی
سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند

حبیب روڈ۔ شفاعت منزل۔ لدھیانہ۔ ۱۳/ مارچ ۱۹۴۷ء

محترم گرامی حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب
صدر مجلس احرار اسلام ہند۔ لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ۲۳/ مارچ ۱۹۴۷ء کو مجلس احرار ہند کی مجلس عاملہ نے جس میں ۲۱ ممبران میں سے ۷ حاضر تھے یو، پی، دہلی اور سرحد سے کوئی بھی اس اجلاس میں شامل نہیں ہوا جس طریقہ کار کا اعلان کیا اور جس طریقہ سے اس کی تشریحات غیر ذمہ دارانہ طور پر اخبار آزاد کے ذریعہ سے کی گئی ہیں مجھے افسوس ہے کہ میں ایسے حالات میں مجلس احرار کے دوستوں سے مل کر کام کرنے سے معذور ہوں، لہٰذا مجلس احرار کی نائب صدارت اور ابتدائی رکنیت سے علیٰحدہ ہوتا ہوں۔

ماسٹر تاج الدین صاحب سے اس سلسلہ میں میں نے جو گفتگو کی تو انہوں نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ اب تمہارے لئے استعفا دینا ہی مناسب ہے، جن دوستوں اور جس جماعت کے لئے اپنی زندگی کی ہر متاع خرچ کر دی، مجھے دکھ ہے کہ آج انہیں دوستوں نے مجھے جماعت سے علیٰحدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

حبیب الرحمٰن لدھیانوی سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند

نوٹ:۔ یہ استعفٰی مہربانی کر کے اخبار آزاد میں شائع فرما دیں۔ اس استعفے کے ساتھ ایک تشریحی خط بھی ہے۔ امید ہے کہ وہ بھی اخبار آزاد میں شائع فرما دیں گے۔

حبیب الرحمٰن لدھیانوی
جنوری ۱۹۵۵ء

قصہ کشمیر

مہاراجہ ہری سنگھ مزول والئی کشمیر جب گدی نشین ہوئے تو انہوں نے اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی دو کام ایسے کئے جس کی وجہ سے انگریزی حکومت ان سے ناراض ہوگئی۔ کشمیر میں سے یونین جیک کا جھنڈا اتار دیا گیا کہ یہ میرا جھنڈا نہیں ہے اور ریذیڈنٹ بجائے جموں یا کشمیر کے سیالکوٹ میں رہنے لگا۔ مہاراجہ کا یہ طرز عمل انگریزوں کو قدرتی طور پر ناگوار تھا۔ انگریز بدلا لینے میں نہ جلدی کرتا ہے، نہ شور مچاتا ہے، وہ ٹھنڈے طریقے سے اپنے مخالف کو ایسے طریقوں سے شکست دیتا ہے کہ دنیا یہ نہ سمجھے کہ وہ اپنے کسی واقعہ کا بدلہ لے رہا ہے۔ کشمیر میں خواجہ کمال الدین لاہوری مرزا کے بھائی خواجہ جمال الدین انسپکٹر تعلیمات تھے۔ ان کے اثر و رسوخ سے کشمیر میں تمام تعلیمی اداروں میں لاہوری قادیانی اور مرزائی بھرتی کر لئے گئے اور شیخ محمد عبداللہ کو لاہوری قادیانیوں سے علی گڑھ یونیورسٹی سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے امداد بہم پہنچائی۔ شیخ صاحب چونکہ نہایت نیک خوش مزاج اور اچھے نوجوان مقرر تھے اس لئے تعلیمی زمانے میں ان کا تعارف کشمیری عوام میں کر دیا گیا۔ گویا قادیانیوں نے حکومت کے اشارے سے ان کو طالب علمی کے زمانے میں رہنمائی کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ اور شیخ محمد عبداللہ کے فوٹو ریاست میں اس قدر تقسیم کئے گئے کہ وہاں کا ہر مُسلمان ان سے واقف ہو جائے۔

۱۹۳۱ء میں جب کانگریس کو نمک سول نافرمانی کی تحریک میں ایک حد تک کامیابی ہوئی یعنی "گاندھی اروِن" سمجھوتہ ہوا، اسی زمانے میں یکایک تحریک کشمیر کا آغاز ہوا۔ مئی ۱۹۳۱ء میں یہ شور مچا کہ جموں میں کسی ہندو سپاہی نے قرآن شریف کی توہین کی ہے جب کہ ایک مُسلمان سپاہی پولیس لائن میں قرآن شریف پڑھتا تھا۔ اس واقعہ کا شور تمام کشمیر اور ہندوستان میں بڑے پیمانہ پر ہوا اور حکومت کشمیر کو ان واقعات کی بنا پر جموں اور کشمیر میں دو مرتبہ گولی چلانی پڑی۔ جب حالات زیادہ نازک ہوگئے تو مہاراجہ کشمیر نے مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسروں کو کشمیر بلا کر مشورہ کیا کہ اس معاملہ میں کیا کرنا چاہئے۔ اس سلسلہ میں کیا ان سے بات چیت ہوئی یہ ہم نہیں جانتے۔ لیکن یہ ضرور سمجھا گیا کہ مہاراجہ کا ذہن غیر فرقہ وارانہ ہے کیونکہ مشورہ کے لئے انہوں نے ایسے اشخاص کو منتخب کیا جن میں سے ایک کانگریس کے بڑے وفادار لیڈر تھے اور دوسرے اعتدال پسند ہم سے یہ بھی کہا گیا کہ مہاراجہ یہ چاہتے ہیں کہ مُسلمان عوام جن کی آبادی ۹۰ فیصدی ہے اگر کچھ مطالبات کریں تو میں غور بھی کروں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پنڈتوں اور ڈوگروں کا راج ہے وہ یہاں کی آبادی کو ابھرنے دینا نہیں چاہتے۔ ان دونوں لیڈروں کے مشورہ اور ملاقات کے باوجود حالات میں کوئی سکون پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ کشمیری عوام میں زیادہ گڑبڑ شروع ہوگئی اور سارے ملک میں ہندو مُسلم فرقہ واریت ترقی کرنے لگی۔ آخری جون اور شروع جولائی میں چودھری افضل حق مرحوم جو کانگریس کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے جیل سے رہا ہو کر آئے تھے اور احرار کے وفادار لیڈر تھے انہوں نے اپنے تمام ساتھیوں کو بلا کر یہ کہا کہ کشمیر کا فتنہ انگریز نے شروع کرایا ہے اور وہ اس کے ذریعے تمام ہندو مُسلم اتحاد ختم و برباد کرا دے گا۔ اور کشمیر میں مسلمانوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرے گا اور ان کو کوئی نفع نہ ہوگا۔ مگر سب نے ان کی بات سن کر ان سنی کر دی اور ٹال دیا۔

یہ بات سب سے زیادہ عجیب تھی کہ سرہری کشن کول جو انگریزی حکومت کو سب سے زیادہ مقبول تھے وہ کشمیر کے وزیر اعظم بنا دیئے گئے۔ اب ہم کیا دیکھتے ہیں کہ یکایک لاہوری اور قادیانی مرزائیوں نے کشمیری مسلمانوں کی ہمدردی میں بے پناہ اور زہر آلود فرقہ وارانہ پروپیگنڈا شروع کر دیا اور کشمیر کے دس نئے لیڈر سامنے آئے، شیخ عبداللہ بتانے گئے اور انہوں نے اس قسم کے مطالبات رکھے کہ جو جائز ضرور تھے مگر فرقہ وارنہ تھے۔

"کشمیر کمیٹی کا قیام"

۲۴ر جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ میں سر میاں فضل حسین کے اشارے سے تمام سرکاری مُسلمانوں کا اجتماع ہوا جس میں کشمیر کے یہ نئے لیڈر بھی شریک ہوئے۔ اس اجتماع میں مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان کو کشمیر کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ مسٹر عبدالرحیم درد کو جو خلیفہ کے پرائیویٹ سکریٹری تھے کشمیر کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ اور وہیں شملہ میں مرزا صاحب کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ کشمیر کے سلسلے میں تمام

مسلمانوں نے مجھے اپنار ہنما تسلیم کر لیا ہے۔ اس لئے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ ۱۴ر اگست ۱۹۳۱ء کو تمام ہندوستان میں "یوم کشمیر منایا جائے۔ مسٹر عبد الرحیم درد نے ہندوستان کے تمام مشہور عُلماء، فضلاء، وکلاء اور ڈاکٹروں کو خطوط لکھے کہ آپ کو کشمیر کمیٹی کا ممبر بنایا گیا ہے اس سلسلہ میں آپ کی منظور کا انتظار بھی نہیں کیا گیا جائے گا۔ چنانچہ ممبر بنانے کے یہ خطوط عُلماء دیوبند اور عُلماء دہلی کو بھی موصول ہوئے، چونکہ تمام عُلماء اور ملک کے لوگ حقیقت حال سے ناوقف تھے کسی نے اس سازش کی طرف توجہ نہ کی کہ انگریز اور قادیانی مل کر ملک میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔

ہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ غالباً ۱۴ر اگست ۱۹۳۱ء کو ہی مہاتما گاندھی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن روانہ ہوگئے۔ اب جب کہ ملک کو بہت زیادہ اتحاد کی ضرورت تھی، اس وقت کشمیر کمیٹی کا وجود عمل میں آیا اور ٹھیک گاندھی جی کی روانگی کے وقت کشمیر کمیٹی نے ۱۴ر اگست ۱۹۳۱ء کو کشمیر ڈے منانے کا فیصلہ کیا۔

بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس ۷، لغایتہ ۱۲ر اگست ۱۹۳۱ء ہوا، اس میں شریک ہونے کے لئے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، شیخ حسام الدین اور حبیب الرحمٰن لدھیانوی بمبئی پہنچے۔ اس اجلاس میں ان تینوں نے کشمیر کے تمام معاملات میں وہاں کے لیڈروں سے بات کی۔ کئی ایک لیڈر نے کہا کہ کشمیری عوام کو کچھ بیدار ہونا چاہئے تاکہ وہاں کچھ اصلاح ہو سکے۔

ادھر پنجاب میں قادیانیوں نے کشمیر کمیٹی کے نام پر ہنگامہ برپا کر دیا۔ چونکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کشمیر کمیٹی کے وائس پریذیڈنٹ تھے اور میاں سر فضل حسین اس کمیٹی کے سرپرست تھے اس لئے تمام انگریزی داں اور سرکاری طبقہ کشمیر کمیٹی کے ساتھ ہو گیا۔ عوام بھی اسلام کے نام پر ہندو راجہ کے خلاف ہوگئے۔

احرار اور کشمیر

لاہور اور پنجاب میں جب احرار دوستوں اور رہنماؤں نے محسوس کیا کہ ساری مُسلمان قوم مذہبی طور سے قادیانیوں کی طرف مائل ہو جائے گی اور ہندوستان کی مشترک سیاسی زندگی اور آزادی کی جدوجہد کو سخت دھکا لگے گا۔ تب انہوں نے فوراً کشمیر کے مسئلہ میں دخل دیا۔ مولانا مظہر علی اظہر کو اسی وقت ڈکٹیٹر بنا دیا گیا اور تمام ہندو مسلمان اور سیاسی جماعتوں کو دعوت دی کہ کشمیر کا مسئلہ ہم سب کو مل کر حل کر دینا چاہئے، ورنہ کشمیر کمیٹی صورت حال کو ملک میں خطرناک بنا دے گی۔ اور اُدھر مہاراجہ صاحب کو لکھا گیا کہ ہم آپ کے خلاف نہیں ہیں بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ آپ میں اور کشمیر کے عوام میں اچھے تعلقات ہو جائیں اور ان کو بھی حق زندگی ملے۔ اور ہم آپ کو گدی سے اتارنے کے حق میں نہیں ہیں۔ مہاراجہ کے سکریٹری نے اس کے جواب میں لکھا کہ گدی سے اتارنے کا حل ہی آپ کے ذہن میں کیوں آیا۔ ہم نے ان کو بتایا کہ کشمیر کمیٹی آپ کو گدی سے اتارنا چاہتی ہے۔ ان کا مقصد نہ کشمیری عوام کا بھلا ہے اور نہ وہ وہاں کوئی سیاسی زندگی چاہتے ہیں، مگر بدقسمتی ہندو پریس نے ہماری مخالفت شروع کر دی اور تمام نیشنلسٹ مُسلمان احرار کی مواقفت تو کیا کرتے، بلکہ مخالفت شروع کر دی اور انہوں نے ہر طرح کے الزام احرار کے خلاف لگائے۔ عجیب بات یہ تھی کہ کشمیر کے لیڈر تو یہ کہتے تھے کہ احرار حکومت ہند سے مخالفت کر کے اور میاں سر فضل حسین کو ناراض کر کے ہم کو نقصان پہنچائیں گے اور دوسری طرف نیشنلسٹ مسلمان اور ہندو پریس یہ کہتے تھے کہ احرار میاں سر فضل حسین سے مل کر کشمیر میں انگریزی راج چاہتے ہیں، یہاں تک کہ مہاتما گاندھی جی نے بھی ایک بیان لندن سے احرار کے خلاف دے دیا۔ مگر احرار پختہ عقیدہ اور مضبوط عزم کی جماعت تھی جس نے ایک ہی ہلّہ سے کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا اور قادیانیوں کو میدان سے بھاگنا پڑا اور ملک میں وہ کوئی فساد نہ کر سکے۔ یہاں فضل حسین نے چودھری افضل حق سے کہا کہ تم کشمیر کے مسئلہ میں جنہیں ذلیل کر رہے ہو میں احرار کو ایک ہی دن میں مٹا دوں گا، تو والد صاحب مرحوم نے بڑے نرم الفاظ میں کہا کہ ہم تو پہلے ہی سے مٹے ہوئے ہیں۔ اب اپنی فکر کیجئے کشمیر تحریک کے سلسلے میں تقریباً چالیس ہزار والنیٹر جیلوں میں چلے گئے۔ سرکار پرست اور نیشنلسٹ مُسلمان مل کر اس تحریک کو روکنا چاہتے ہیں دونوں نے کوشش کی کہ والنیٹر معافی مانگ کر باہر آجائیں، مگر ان سب کو ناکامی ہوئی۔ احرار اور کشمیر لیڈروں نے اختلاف کیا تھا۔ احرار کہتے تھے کہ کشمیر

میں ذمہ دار حکومت قائم ہو۔ کشمیری لیڈر کہتے ہیں کہ راجہ گدی سے اترے اور حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں منتقل کر دی جائے، اور یہی کشمیر کمیٹی کا مطالبہ تھا۔ سرکار پرست مُسلمانوں اور ہندو پریس نے احرار سے پوچھا کہ کیا وہ حیدر آباد میں بھی ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کریں گے تو احرار نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور کہا کہ وہاں بھی اسمبلی ہونی چاہئے، بلکہ احرار نے یہاں تک کہا کہ تمام ریاستوں میں ذمہ دار اسمبلی بن جانی چاہئے تاکہ ملک میں آزادی کا راستہ جلدی طے ہو سکے۔ جب تمام ریاستوں کے لئے احرار نے ایسا کہا تو نواب بھوپال نے احرار کے خلاف اور مہاراجہ کے موافقت میں ایک بیان دے دیا۔ حَبیب الرحمٰن نے چودھری افضل حق مرحوم سے کہا کہ احرار نے کشمیر میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کر کے تمام ریاستوں کو اپنا دشمن بنالیا اور انگریزی حکومت کی جڑوں کو ہلا دیا۔ اس لئے احرار کو جیل جانے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ احرار کے ستانے میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو اپنے آپ کو آزادی پسند اور عوام کا خیر خواہ کہتے تھے۔ مگر خدا کا فضل احرار کے شامل حال تھا، وہ اپنی غربت اور افلاس کے باوجود ہر کام کرتے رہے اور آخر کار حکومت ہند کو جھکنا پڑا اور اس نے گلف کمیشن کا تقرر کیا کہ کشمیر میں کیسی حکومت ہو اور عوام کو کس قدر حقوق دیئے جائیں۔

از دہلی۔ ۷/اپریل ۱۹۵۰ء

مکرم و محترم جناب نواب زادہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان

السّلام علیکم۔ آپ کے اس دوستانہ مشن کے ہندوستان آنے پر جتنی خوشی مجھے ہوئی ہے میں اسے بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں پاتا۔ آپ کے ہاتھوں میں کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہے بحیثیت ایک مسلمان کے میرا یہ دل چاہتا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلموں کے لئے ہر قیمت پر عملی طور پر ایسا امن و انصاف موجود ہو جائے جن کے بعد کوئی نہ کہہ سکے کہ اسلامی حکومت اور ظلم کی حکومت دو مترادف الفاظ ہیں۔ جب کوئی شخص تقریر و تحریر میں اسلامی حکومت اور ظلم کی حکومت کے مترادف معنیٰ بیان کرتا ہے تو میرا دل و جگر زخمی ہو جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں لکھنے والے اور کہنے والے کو کس طرح سمجھاؤں کہ اسلامی حکومت امن و انصاف اور رحمت کی حکومت ہے۔

آپ ہندوستان کے مسلمانوں کے مصائب سے بے نیاز ہو کر اسلامی نقطہ نظر اسلامی روایات کے مطابق پاکستان میں غیر مُسلم اقلیت کو ایسے حقوق دے دیں جس پر ہندوستان کی غیر مذہبی حکومت اور یہاں کے غیر مُسلم عوام رشک کریں۔

ہندوستان و پاکستان اگر مل کر اپنا ایک مساویانہ یونٹ بنالیں تو یہ دونوں ملک ایشیا کی رہنمائی کا فخر حاصل کر سکتے ہیں اور جنوب و مشرقی ایشیا کے ممالک کو تیسری جنگ سے بچاسکتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ عرب میں یہودی حکومت کے بڑھتے ہوئے اثرات فوراً رک جائیں گے اور دنیا میں مُسلمان حکومتوں پر جو مصائب آنے والے ہیں وہ بھی ٹل جائیں گے۔ وہ کیا مصائب ہیں، آپ خود جانتے ہیں ان کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

ہندوستان کے ساتھ بہتر تعلقات کے بارے میں میری یہ قطعی رائے ہے کہ پاکستان کا پریس پنڈت جواہر لال نہرو کی عظمت کے ساتھ ساتھ سردار پٹیل کی بھی عظمت کرے کیونکہ شخصیتوں کی عظمت ہی سے قوموں کی زندگی بدل جاتی ہے۔ موجودہ ہونے والے فیصلے کے بارے میں میں ذیل کے نکات کی طرف ان کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں:

۱۔ موجودہ معاہدے اور فیصلے کے بعد یہاں سے یا پاکستان پہنچ کر آپ مغربی پنجاب، سندھ، سرحد کے ان غیر مسلموں کے متعلق بھی جو ۱۹۴۷ء میں تباہ ہوئے تھے ایک ہمدردانہ بیان دیں گے جس سے مستقبل قریب میں ان غیر مسلموں کو بھی پاکستان آنے جانے کی امید پیدا ہو جائے۔

۲۔ ہندوستان میں رہنے والے لاکھوں شرنارتھی ایسے ہیں جو صدق دل سے پاکستان کو اپنا وطن بنانے پر راضی ہیں اور پر امن زندگی میں

پاکستان کے وفادار رہنے پر رضامند ہیں۔ ان میں نہ شرارت کا جذبہ ہے اور نہ بغاوت کا۔

۳۔ پاکستان اور ہندوستان میں ملے جلے دوستانہ مشنوں کے خیر مقدم کی فضا پیدا کی جائے۔

۴۔ پاکستانی پریس اسلامی طرز اختیار کرلے اور دنیا کے ہر شخص کے لئے امن چاہے۔

۵۔ آپس میں جنگ نہ کرنے کا اعلان بھی اس دوستانہ فضا میں اگر ہو جائے تو دونوں ملکوں کے لئے باعثِ رحمت ہے۔

۶۔ کشمیر کا مسئلہ اسی طرح دوستانہ کانفرنس بلا کر حل کر لیا جائے۔

۷۔ پاکستان اگر ہندوستان کی دوستی حاصل کرے تو وہ دنیا کی تاریخ بدل سکتا ہے۔

۸۔ پاکستان میں اسلام کے نام پر اقلیت کے لئے ایسے شہری حقوق و اختیارات دینے کا اعلان کیا جائے جس سے دنیا کے دوسرے غیر اسلامی ممالک بھی رشک کریں۔

۹۔ ہندوستان و پاکستان میں آزادانہ تجارت کا معاہدہ فوری ہونا چاہئے۔

۱۰۔ پرمٹ سسٹم کی بجائے پاسپورٹ کا طریقہ رائج کیا جائے تاکہ پرمٹ کی اصطلاح تاخیر کی بنا پر کوئی شخص نکاسی نہ بن سکے۔

۱۱۔ نکاسی جائدادوں کے بارے میں ایسا واضح اعلان کر دیا جائے جس سے مغربی پنجاب، سرحد، سندھ کے پناہ گزیں اپنی جائدادوں کے بارے میں مطمئن ہو جائیں۔

۱۲۔ ہندوستان و پاکستان مل کر ایشیا کی تب ہی رہنمائی کر سکتے ہیں جب دونوں حکومتیں اپنی اندرونی سرحدات کے خطرات سے نجات حاصل کر لیں۔

۱۳۔ پاکستان کے اخبارات اور پریس سے آپ اپیل کیجئے بلکہ اپیل کے بعد حکم نافذ کیجئے کہ وہ غیر مسلموں کو تحریر و تقریر، نظم و نثر میں کفر اور کافر کا طعنہ دیتے ہیں پرہیز کریں کیونکہ کفر کا طعنہ اسلام کی تبلیغی شان کے بھی خلاف ہے اور پھر اس کے جواب میں دنیا سے وہ سب کچھ سننا پڑتا ہے جس کے سننے کو کوئی بھی مسلمان تیار نہیں ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری معروضات کی طرف ضرور توجہ فرمائیں گے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میرے درد مند دل کی آواز ہے جس کو آپ تک پہنچانا ضروری سمجھا، آخر میں میری دعا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے دوستانہ اتحاد کا یہ آغاز ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے اور دونوں حکومتیں ایشیا میں اپنے صوابدید کے مطابق پھلیں اور پھولیں۔

والسلام

مخلص حبیب الرحمٰن لدھیانوی

حال مقیم کوچہ رحمٰن گلی شملہ والی

گھنٹہ گھر۔ چاندنی چوک۔ دہلی

مورخہ ۹، فروری ۱۹۴۲ء

از دفتر مجلس احرار اسلام ہند لاہور

سرکلر نمبر ۱۸ — نمبر ۱۸۵۹/۸۴۰ لدھیانہ

مکرمی و محترمی جناب سکریٹری صاحب مجلس احرار اسلام

آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی عرصہ سوا سال سے منٹگمری جیل میں نظر بند ہیں۔ ان کی صحت کے متعلق متعدد دفعہ اطلاعات موصول نہیں ہوتیں کہ طبیعت خراب ہے۔ بدن کے ایک حصہ کے شل ہو جانے کی بھی اطلاع آئی۔ ماہ دسمبر میں

مولانا سید محمد احمد صاحب کاظمی ممبر سنٹرل اسمبلی نے آپ سے ملاقات کی۔ ملاقات کے بعد آپ نے مولانا صاحب کی صحت کے متعلق ایک دردناک بیان پریس کو دیا۔ اب تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ مولانا کی صحت بہت بگڑتی جارہی ہے۔

حکومت ہند کے ایما سے صوبائی حکومتوں نے اپنے اپنے نظر بندوں کو گجرات اسپیل جیل میں مقید کر دیا ہے۔ چنانچہ حکومت پنجاب نے بھی دیولی کیمپ اور دیگر جیلوں کے نظر بندوں کو گجرات اسپیشل جیل میں اکٹھا کر دیا ہے۔ ۳۰، جنوری کو مجلس احرار اسلام منٹگمری کی طرف سے ایک تار موصول ہوا کہ مولانا صاحب منٹگمری سے گجرات تبدیل کئے جارہے ہیں۔ زیارت کے لئے بیسیوں کارکن رات کے ایک بجے تک لاہور اسٹیشن پر انتظار کرتے رہے۔ اور جب ٹرین آئی تو دوسرے نظر بندوں کی زبانی معلوم ہوا کہ مولانا کا سامان اسٹیشن پر پہنچ چکا تھا۔ مولانا کو ہتھکڑی بھی لگ چکی تھی لیکن جب مولانا ڈیوڑھی سے چلنے لگے تو گورنمنٹ پنجاب نے تار کے ذریعہ آپ کا چالان روک لیا۔ اس وقت مولانا اکیلے ہی منٹگمری جیل میں نظر بند ہیں۔ کسی قیدی کو آپ کی بیمار پرسی کی اجازت نہیں۔ مولانا صاحب کے ساتھ یہ امتیازی سلوک انتقامی جذبہ کے ماتحت کیا جارہا ہے کیونکہ آپ مجلس احرار اسلام کے مخلص اور مقتدر رہنما ہیں۔

مجلس مرکزیہ نے مورخہ ۲۰ر فروری بروز جمعہ تمام ہندوستان میں "یوم حبیب الرحمٰن" منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لئے آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ اس دن پبلک جلسے منعقد کریں۔

۱۔ رزولیوشن پاس کریں جس میں حکومت ہند و پنجاب سے مولانا کی رہائی کا مطالبہ کیا جائے۔

۲۔ ورنہ مولانا پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے اور ان کے کثیر اہل وعیال کے گزران کے لئے معقول الاؤنس کا انتظام کیا جائے۔

ریزولیوشن کی نقول براہ راست حکومت ہند و پنجاب اور دفتر مرکزیہ احرار لاہور میں بھیجی جائیں۔

والسلام

عبدالغفور انوری

سپرنٹنڈنٹ دفتر مجلس احرار اسلام ہند، لاہور

مورخہ ۳۰ر اگست ۱۹۴۲ء

از دفتر مجلس احرار اسلام ہند۔ لاہور

سرکلر نمبر ۲۲ بنام ممبران و کارکنان   نمبر ۹۸۷/۵۲

۱۔ مجلس عاملہ احرار اسلام ہند نے ۱۷، ۱۸ اگست کے اجلاس میں ملک کی موجودہ حالت پر غور کیا اور ایک قرارداد پاس کی جو اخبار "زمزم" مورخہ ۲۳ر اگست اور اخبار "الفضل" مورخہ ۱۲ر اگست ۱۹۴۲ء میں مَن وعَن شائع ہوئی ہے۔ مجلس عاملہ نے تاکید کی ہے کہ احرار کے تمام ارکان، کارکن اور رضا کار اس فیصلہ کی پابندی کریں۔ اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہوں، خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ اس قرارداد میں مجلس عاملہ نے بحالات موجودہ سول نافرمانی کے خلاف فیصلہ کیا ہے اور مجلس مرکزیہ کے ۱۲ فروری کے فیصلہ کی تائید کی ہے۔

پس تمام ارکان احرار کا فرض ہے کہ وہ سول نافرمانی یا کسی اور جارحانہ اقدام سے قطعاً باز رہیں اور مجلس کے تعمیری پروگرام کو تندہی سے انجام دیں۔

۲۔ سرکلر ۱۸ جنرل کے ذریعے مجالس ماتحت کو دفاعی اور خدمت خلق کے پروگرام پر عامل ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔ مجالس نے اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کیا۔ یہ ایک ٹھوس اور مستقل پروگرام نہایت غور و فکر کے بعد تیار کیا گیا تھا، کیونکہ آنے والے خطرات و حالات میں ایسی لائن پر گامزن ہوتے ہوئے مجلس احرار ملک و قوم کی خدمت انجام دے سکتی ہے۔

گزشتہ چندماہ سے حالات پہلے سے بھی زیادہ ہولناک ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مجالس اس پروگرام پر زیادہ سختی اور کوشش سے عمل کرکے عوام کی ہمدردی حاصل کریں اور اپنی کارکردگی کی اطلاع دفتر مرکزیہ اور دفتر اخبار الفضل سہارن پور کو دیں۔

۳۔ دستور العمل مرکزیہ کی دفعہ ۴جزو(و) کے ماتحت عام ممبران کی بھرتی ۳۱ر دسمبر تک مکمل ہو جانی چاہئے۔ تمام کارکنان احرار ممبران کی بھرتی پر پوری توجہ دیں۔ کیونکہ کسی جماعت کی طاقت ممبران کی تعداد پر تصور کی جاتی ہے۔ ہر ہمدرد نہیں بلکہ ہر مُسلمان کے پاس پہنچ کر جماعتی پروگرام بتایا جائے۔ اور ممبر بنانے کی کوشش کی جائے۔ انتخابات کی تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ فقط

عبد الغفور نوری

سپرنٹنڈنٹ دفتر مرکزیہ، احرار اسلام ہند لاہور

مورخہ یکم دسمبر ۱۹۴۲ء

از دفتر مجلس مرکزیہ احرار اسلام ہند لاہور

سرکلر ۲۳ جنرل

۱۔ عبارت کے ذریعہ آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند عرصہ پونے دو سال سے منٹگمری جیسے سخت گرم علاقے کی جیل میں نظر بند تھے۔ اب موسم سرما کے شروع میں حکومت پنجاب نے انھیں دھرم سالہ جیسے سرد ترین مقام پر تبدیل کر دیا ہے۔ یہ تبدیلی حکومت کی منتقمانہ پالیسی کا بین ثبوت ہے کہ ایک فالج کے مریض کو گرمیوں میں ایسے علاقے میں رکھا جو پنجاب بھر میں گرم اور ریتلا ہے، جہاں بارشیں بہت کم ہوتی ہیں اور انتہائی درجہ کی گرمی ہوتی ہے اور سردیوں کے شروع میں دھرم سالہ جیل میں منتقل کر دیا جو برفانی علاقہ کے علاوہ ایک سرد پہاڑی مقام ہے۔ مولانا کی صحت بہت خراب ہو چکی ہے۔ آپ کا وزن ۲۵ پونڈ کم ہو گیا ہے۔ آپ دائم المریض ہیں۔ متعدد امراض میں مدت سے مبتلا ہیں۔ مثلاً خونی و بادی بواسیر ذیابیطس (پیشاب کا زیادہ آنا) درد گردہ، اختلاج قلب اور فالج جیسے موذی امراض کی ہمیشہ شکایت رہی ہے۔ مزید یہ معلوم کرکے بہت افسوس ہوا کہ آپ کے تمام دانتوں میں بھی تکلیف ہو گئی ہے ضعیف العمر اور دائم المریض بزرگ کو ایسی چھوٹی اور تنگ جیل میں اکیلا نظر بند رکھنا جہاں کل تیس چالیس قیدی مقید ہوں اور علاج کے لئے ادویات تو کیا خود کھانے پینے کی اشیاء یعنی سبزی وغیرہ بھی میسر نہیں آسکتی۔ یہ حکومت پنجاب کی غیر منصفانہ اور منتقمانہ پالیسی کی کھلی دلیل ہے۔

لہٰذا صدر مرکزیہ محترم شیخ حسام الدین صاحب نے جملہ ماتحت مجالس کو یہ حکم دیا ہے کہ مورخہ ۱۱ دسمبر بروز جمعۃ المبارک ہندوستان بھر میں "یوم مولانا حبیب الرحمٰن منایا جائے اور عام جلسے منعقد کرکے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کیا جائے اور اس کی نقول براہ راست حکومت پنجاب اور سر منوہر لال اور وزیر جیل خانہ جات پنجاب کے نام بذریعہ ڈاک بھیجی جائیں۔ اس کے علاوہ اخبارات اور دفتر مرکزیہ و اراکین مجلس احرار "الفضل" سہارن پور کو اپنی مفصل کاروائی سے آگاہ کیا جائے۔

ریزولیوشن

مُسلمانان... کا یہ عظیم الشان جلسہ حکومت پنجاب کے اس منتقمانہ اور غیر منصفانہ رویہ پر صدائے احتجاج بلند کرتا ہے جو اس نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے ساتھ روا کر رکھا ہے۔

(الف) کہ متعدد دفعہ مجالس احرار، اور عوام کی طرف سے حکومت سے مطالبہ کیا جا چکا ہے کہ حکومت نے جو مولانا صاحب کو غیر معین عرصہ کے لئے بلاوجہ نظر بند کر رکھا ہے، رہا کر دے یا کھلی عدالت میں مقدمہ چلا کر جرم ثابت کرے۔

(ب) کہ مولانا موصوف کی بیماری کے پیش نظر اکثر دفعہ حکومت کو توجہ دلائی گئی کہ وہ مولانا صاحب کی بیماریوں کا خاطر خواہ علاج کرائے یا موقع

دیا جائے، تاکہ وہ خود باہر سے علاج کرالیں۔

(ج) کہ مولانا موصوف کثیر العیال ہیں اور ان کے اہل وعیال کا گذران آپ کے کمزور کندھوں پر تھا۔ حکومت نے آپ کو نظر بند کرکے گھر والوں کے لئے کوئی الاؤنس نہیں دیا جس کے لئے ہندوستان بھر سے فیملی الاؤنس کا مطالبہ کیا جا چکا ہے مگر افسوس کہ حکومت پنجاب نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جس کے لئے یہ اجلاس حکومت کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ فی الفور مندرجہ بالا مطالبات کی طرف توجہ دے، نیز یہ اجلاس حکومت پنجاب اور وزیر جیل خانہ جات پنجاب سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مولانا موصوف کو لاہور جیسے مرکزی مقام پر منتقل کرکے علاج کرانے کا موقع دے کیونکہ مولانا صاحب ہومیوپیتھک اور یونانی علاج کے عادی ہیں۔ اس علاج کے لئے آپ کو پوری سہولیات پہنچائی جائیں

فقط

عبد الغفور نوری

سپرنٹنڈنٹ دفتر احرار اسلام ہند۔ لاہور

گومین روڈ لکھنؤ۔ ۲ مارچ ۱۹۵۵ء

مخدومی ومحترمی زید مجدہ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ سے دہلی میں اس عجلت اور رواداری میں ملاقات ہوئی، جس کو ملاقات کہنا صحیح نہیں۔ میں اگلے ہی روز سفر پر روانہ ہو گیا۔ اور چار روز سفر میں لگ گئے۔ اب ایک جگہ بیٹھنا نصیب ہوا، تو آپ کی خدمت میں یہ عریضہ پیش کر رہا ہوں۔

مجھے دہلی میں اور بھی دوسرے مقامات پر یہ معلوم کرکے سخت حیرت اور کلفت ہوئی کہ ابھی تک آپ کو میری حقیر ذات کے متعلق وہی غلط فہمیاں ہیں جن کی تردید بار بار کر چکا ہوں اور اپنی دانست میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اطمینان حاصل ہو چکا ہے۔ میں آپ کی ذات کو اس سے کہیں بالاتر سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی واضح ثبوت کے آپ کسی شخص کے متعلق کوئی رائے قائم کریں گے اور پھر اس کی تردید اور اظہار براءت کے باوجود اس پر اصرار فرمائیں گے اور اس کا مختلف مجالس میں اظہار واعلان بھی فرماتے رہیں گے۔ البتہ میں نے آپ کو جو مقام عطا فرمایا ہے اس سے یہ بات بہت قریں ہے کہ آپ اپنے چھوٹوں اور نیاز مندوں کی ذات کو مستقل موضوع سخن بنالیں۔ میرا گزشتہ سفر مشرق وسطیٰ کوئی راز سربستہ نہیں اس میں جو کچھ مجھے کہنے کا موقع ملا وہ سب میری مفصل ڈائری میں چھپ گیا ہے۔ اس کے اثرات کے متعلق سفیر ہند متعینہ حجاز سے پوچھا جاسکتا ہے۔ اتنا بلا مبالغہ عرض کروں گا کہ عرصہ دراز سے کسی ہندوستانی کے سفر سے اتنا بہتر اثر نہیں پڑا اور مسلمانان ہند کا اتنا بلند اور دقیع تصور قائم نہیں ہوا۔ اور ان کے اداروں اور ان کی زندگی کے مختلف مظاہر ومراکز کا اتنا مؤثر تعارف نہیں ہوا جتنا اس حقیر کے سفر سے ہوا۔ اور یہ سب کسی مصلحت یا منفعت کے ماتحت نہیں ہوا بلکہ اپنے ضمیر اور عقیدہ کے مطابق ہوا جس پر کسی انعام یا خوشنودی کا طالب نہیں۔

رہا اخوان کا معاملہ، تو میرا تعلق ان سے محض اتنا ہی ہے جتنا ایک صاحب احساس اور صاحب ضمیر کا ہو سکتا ہے۔ ان سے میرا کوئی عملی ربط یا ضابطہ کا تعلق نہیں۔ ان کے تازہ حالات سے بھی بے خبر ہوں۔ میں چونکہ ممالک عرب کے حالات سے واقف ہوں اور مجھے ان کا گہرا اور تفصیلی مطالعہ کرنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اسلئے اخوان کی تحریک کو جس کا آغاز شیخ حسن البناء مرحوم نے کیا تھا ان ممالک کے لئے اسلام نشاۃ ثانیہ کا پیغام سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کوئی ..... طاقت ور ہمہ گیر تحریک نہیں۔ جو شخص وہاں کی ملحدانہ تحریکات اور مخالف دین رجحانات سے واقف ہے اس کی اخوان کے ساتھ ہمدردی بالکل طبعی اور قدرتی ہے۔

مجھے جب ایسی اطلاعات ملیں تو میرے قلب کو سخت تکلیف پہنچی۔ اس اظہارِ تکلیف میں میری زبان سے جو کچھ نکلا اس کی معافی چاہتا

ہوں تاکہ اس کا مواخذہ قیامت میں بھی باقی نہ رہے۔ آپ کی بزرگانہ حیثیت سے امید یہی ہے کہ آپ درگزر فرمائیں گے۔ دوسری درخواست یہ ہے کہ مجھے ایک گوشہ نشین طالبعلم سمجھ کر جو نہ کسی نفع میں ہے نہ ضرر میں۔ اپنا مسلک تو یہ ہے

ماقصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر ووفا مپرس

اس عریضہ کا جواب حسب ذیل پتہ پر عنایت ہو۔
ابوالحسن علی ۳۷ گوئین روڈ، لکھنؤ

نیاز مند
ابوالحسن علی[1]
ناظم ندوہ العلماء لکھنؤ

۳۷۔ گوئین روڈ۔ لکھنؤ تحریر آفس۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۵۶ء

مخدومی و محترمی! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ

مزاج گرامی۔ عنایت نامہ نے سرفراز کیا۔ الحمد للہ کہ مضمون آپ کو پسند آیا۔ یہ میرے لئے اطمینان کا باعث ہے۔ مرسلہ مضامین پہنچے۔ دوسرا مضمون جسے آنجناب نے بعض روحانی واقعات اور اہل روحانیت کا حوالہ دیا ہے۔ میرے ناقص خیال میں اس کی عام اشاعت کچھ مفید نہ ہوگی۔ بلکہ اس سے غلط فہمیوں کا اندیشہ ہے۔ غالباً وہ اشاعت عام کے لئے ہے بھی نہیں، آپ نے مخصوص احباب کو بھیجا ہوگا۔

لکھنؤ کے احتجاجی جلسہ کی کارروائی آپ نے قومی آواز میں پڑھی ہوگی۔ مولانا منظور صاحب نے اپنی صدارتی تقریباً وہی بات کہی جو آپ نے اپنے مضمون میں لکھی ہے۔ ضروری نہیں ہم لوگ اس سلسلہ میں مزید وضاحت اور تشریح کریں۔

الفرقان کے لئے دفتر میں کہہ دیا تھا۔ پھر انشاء اللہ کہہ دوں گا۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوگا۔ ابھی معلوم ہوا کہ الفرقان ارسال خدمات کیا جاچکا ہے۔ والسّلام

خاکسار
ابوالحسن علی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۹ر نومبر ۱۹۵۵ء۔ از طرف چوھدری عبدالرحمٰن

میرے بھائی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہ العالی

السّلام علیکم۔ پہلے تو آپ کے متعلق پتہ چلا کہ آپ اور آپ کے دو صاحبزادے حج کو تشریف لے جارہے ہیں۔ یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی اور مسرت ہوئی۔ دعا تو پہلے ہی ناچیز ہمیشہ آپ کے لئے کرتا ہی ہے۔ پھر یہ دعا کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ خیریت کے ساتھ آپ حضرات کو مکہ معظمہ میں پہنچائے اور اپنے فضل و کرم سے تمام خیرت کی اطلاع بہت دنوں سے نہیں ملی۔ مہربانی فرماکے آپ اپنی اور بچوں کی خیریت کی

---

1 مولانا علی میاں اس بات سے ناواقف تھے کہ پنڈت جی کو ان کے دوروں کی وجہ سے بڑی تشویش تھی۔ رئیس الاحرار اس تشویش کو دور کرنے پر لگے ہوئے تھے۔ جب علی میاں کا یہ خط آیا تو رئیس الاحرار نے یہ خط لے جاکر خود پنڈت جی کو سنایا ہندوستان کا وزیر اعظم اس خط سے مطمئن ہوگیا۔ اس طرح رئیس الاحرار نے علی میاں کی خدمت کی اور مرتے دم تک یہ بات علی میاں کو نہیں بتائی چونکہ مرتب بھی رئیس الاحرار کے ساتھ تھا اس لئے یہ واقعہ معلوم ہوا رئیس الاحرار علی میاں کا ذکر کرتے ہوئے ہمیشہ یہ مصرع پڑھا کرتے تھے۔ قرب سلطاں آتش سوزاں بود۔ جماعت اسلامی اقصی آتش سوزاں معنی نذر ہوگئی (مرتب)

اطلاع دیں بڑی مہربانی ہوگی۔ باقی ایک پرانی بات آپ کو یاد دلاتا ہوں۔ میں خود اور لڑکے محمد عبد اللہ کو ساتھ لے کر اور آپ بھی وہاں پر موجود تھے حضرت رائے پوری مدظلہ العالی کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے بسم اللہ کرانے سے پہلے یہ فرمایا کہ حضرت عالی کی خدمت میں عرض کرنا کہ اس کو کچھ چبا کر کھلانا تو ہم نے عرض کیا۔ تو حضرت مدظلہ العالی نے شفقت فرمائی۔ چبا کر کھلائی۔ بڑی خوشی اور مسرت ہوئی۔ باقی عرض یہ ہے اور آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ پہلے میرا نام غلام محمد والدین نے رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اللہ کے نیک بندوں سے ملنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن مکی سے محبّت زیادہ ہوگئی اور اکثر ان کی خدمت میں جاتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے چُون گروکی مسجد میں فرمایا کہ تمہارے نام میں عربی کے اطوار سے مشرقیت کو بو نہیں۔ تو میں نے سن کر ان کی خدمت میں عرض کی کہ پھر اس کو بدل دینا چاہیے۔ اس کے بعد جب نام تجویز کرنے لگے تو میرے منھ سے نکلا کہ عبد الرحمٰن رکھ دو اس کے بعد پھر مولانا مکی صاحب نے فرمایا کہ حضور انے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو دو نام زیادہ پسند ہیں۔ عبد الرحمٰن، محمد عبد اللہ۔ حضور اکا یہ فرمان سن کر کہ اللہ تعالیٰ کو دو نام پسند ہیں تو ابھی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا تو اس کا نام محمد عبد اللہ رکھیں گے۔ جب باری تعالیٰ نے بچہ عنایت فرمایا تو میں نے محمد عبد اللہ نام رکھا۔ اب برخوردار کا نام ڈال کر کام شروع کیا ہے۔

چودھری عبد الرحمٰن

لکھنؤ ۱۸؍ نومبر ۱۹۵۵ء

مخدوم مکرم بندہ۔ دامت برکاتہم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ والا نامہ صادر ہو کر کاشف حالات ہوا۔ میں جناب کی توجہ و مہربانی پر انتہائی ممنون ہوں مجھے یہی امید ہے کہ آپ پوری پوری سعی میرے معاملہ میں فرمارہے ہوں گے اور بفضل خدا اس کے نتیجے میں جلد کامیابی حاصل ہوگی انشاء اللہ۔ پنڈت جی کو بھی توجہ دلایئے۔ جناب والد صاحب بھی دہلی تشریف لے گئے ہیں اور شرف نیاز حاصل کریں گے۔

میں یہاں حاضر ہونے سے قبل رائے پور حضرت اقدس مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوا تھا بفضل خدا صحت بہتر ہے۔ بھائی بھی وہاں ملے تھے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ کوئی بات معلوم ہو تو مطلع فرمایئے گا۔

آپ کا خادم محمود علی خاں (ایم۔ ایل۔ اے)

پتہ: محمود علی خاں ایم۔ ایل۔ اے۔ کمرہ 1 بی بلاک۔ دار الشفاء، لکھنؤ۔

دار الشفاء۔ بی بلاک۔ ۵ مارچ ۱۹۵۶ء

مخدوم مکرم بندہ زاد الطافکم

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ والا نامہ صادر ہو کر کاشف حالات ہوا۔ جناب نے تحریر فرمایا تھا کہ میں پنڈت جی سے ذکر کروں گا۔ امید ہے کہ ملاقات ضرور ہوگی۔ اگر نہ ہو سکی ہو تو درخواست ہے کہ اس طرف توجہ فرمایئے۔ مجھے امید ہے کہ پنڈت جی ضرور اس طرف توجہ فرمائیں گے اور یہاں اشارہ فرمادیں گے۔ پہلے بھی دوسرے لوگوں کے بارے میں پنڈت جی فرما چکے ہیں اور ان کے کام ہوگئے ہیں۔

دوسری درخواست یہ ہے کہ شری لال بہادر شاستری جی سے بھی اپنے سامنے فون پر کہلا دیجئے ان کا فرمانا بھی مؤثر ہوگا۔ اس لئے ان سے بھی مل لیجئے۔

یہ کام آپ کو ہی کرانا ہے اور آپ کی توجہات خصوصی سے کامیابی انشاء اللہ یقینی ہو جائے گی اس لئے درخواست ہے کہ اولین موقع پر ملاقات دونوں صاحبان سے فرمالیجئے۔ ممنون ہوں گا۔ مجھے جناب کی نوازشات کریمانہ سے پوری امید ہے کہ میری عرضداشت ضرور شرف

قبولیت حاصل کرے گی۔

برادران محترم کو سلام مسنون۔ آپ کا محمود۔ کمرہ 1 بی بلاک دارالشفاء۔ لکھنؤ۔

شری سمپورنا نانند جی باہر گئے ہوئے تھے۔ اب کل یا پرسوں کو ان سے مل کر آفتاب مرحوم کی بیوہ کے بارے میں آپ کا بیان ان کو پہنچادوں گا۔ علاوہ ازیں وصی صاحب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے حافظ صاحب سے مل کر روپیہ ان کی بیوہ کو ادا کرنے کا حکم دلایا ہے۔

محمود

لکھنؤ۔ دارالشفاء بی بلاک۔ کمرہ 1

مخدوم مکرم وہ بندہ۔ دام ظلکم

السّلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ باعث تصیعہ یہ ہے کہ میرے معاملے میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا اس لئے پریشانی ہے۔ جناب کے الطاف بزرگانہ کے پیش نظر جناب کو ہی اس مسئلہ پر توجہ دلاتا ہوں۔ یہ سمجھتا ہوں کہ جناب میری پریشانی کو دور کرکے کامیابی کی صورت نکال سکتے ہیں دَست بستہ التجا ہے کہ اس مسئلہ پر خاص توجہ مبذول فرمایئے۔ یہ گتھی پنڈت جی کے ذریعہ ہی نکل سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پنڈت جی معاملات میں مداخلت نہ فرماتے ہوں۔

پنڈت جی کا فون پر پیغام یا سفارشی خط انتہائی ضروری ہے کہ مصلحتاً یہ تقرر ضروری ہے پھر کوئی دقت نہ ہوگی اور مجھ پر احسان عظیم ہوگا۔ گزارش ہے کہ جس طرح بھی ہو تکلیف گوارا فرما کر پنڈت جی سے مل لیجئے۔ جب آپ نے میرا کام کرانے کا تہیہ فرمایا ہے تو پھر اسے ضرور کرا دیجئے۔ درمیان میں میری کشتی کو نہ چھوڑیئے بلکہ ساحل کو مراد پر پہنچا دیجئے۔ آنجناب جیسے ناخدا سے یہی امید ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں کیونکہ جانتا ہوں کہ جناب کو میرا پورا خیال ہے اور مجھے جناب ضرور کامیابی کی راہ دکھائیں گے۔ پھر یہ عرض ہے کہ پنڈت جی کی مدد حاصل کرنا بہر حال ضروری ہے۔ میں خود حاضر ہوتا۔ لیکن اس زمانے میں یہاں کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ سمجھتا ہوں کہ میرا عریضہ ہی جناب کو اس طرف پورے طور پر متوجہ کرنے میں خاصا کامیاب ہوگا اور جناب میری اس درخواست کو شرف منظوری بخشیں گے۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ برادران عزیز کو سلام مسنون

آپ کا محمود[1]

۲۳ر فروری ۱۹۵۶ء



[1] خان محمود علی خاں آخر کار رئیس الاحرار کی دعاؤں اور سلسلہ جنبانی سے وزیر اوقاف بن گئے ہیں اور اب بہت ہی محنت و دیانت سے حکومت کا کام کر رہے ہیں۔ خان صاحب کے پاس اب دو منسٹریاں ہیں ایک آب و برق کی اور ایک اوقاف کی۔ کتاب کے شروع میں خاں صاحب کا مضمون بھی ہے اور میرے بھی بڑے مہربان ہیں (مرتب)

تسلیم جاں ہے زندگی

جلوس آدم سے پہلے کائنات عالم کی ترتیب وتنظیم میں کیفیت وکمیت دونوں قسم کے احساسات کائنات کے ہر حصے میں پائے جاتے تھے "انسان کا وجود اور وہ بھی اشرف المخلوقات کے اعزاز کے ساتھ" اس دنیا میں بھیجا گیا۔ جس نے دنیا میں آکر کائنات عالم کی رنگیوں میں دلکش و دل پسند اور مسرت والم سے بھرپور زندگی کا اضافہ کیا۔

لیکن عجیب بات ہے کہ ہم آدم اول سے لے کر اب تک زندگی کے مفہوم ومقاصد کو کھو بیٹھے۔ کوئی پیدا ہوتا ہے خوشی ومسرت کے احساسات جاگ اٹھتے ہیں اور کوئی مرتا ہے تو غم والم کی دردناک داستانیں مسلسل دلی ٹیش اور کسک بن جاتی ہیں۔ انسان نے سب کچھ سمجھا ہے لیکن مہد سے لحد تک کے حالات پر انسان کو ابھی تک عبور حاصل نہیں ہوا۔ قرآن مجید میں ایک بات کہہ کر معاملہ صاف کر دیا گیا ہے۔ "ہم اللہ ہی کی طرف سے آئے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ رہے ہیں" دنیا کے دانش مندوں نے زندگی کا سراغ لگانے کے لئے لامحدود خامہ فرسائی کی ہے۔

اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے آپ جو خطوط "تعزیت" پڑھیں گے تو قاری کو اپنے احساس پر قابو رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ زندگی ناختم ہونے والا ایک سلسلہ ہے جہاں ہم سلسلہ بصارت کو ختم دیکھتے ہیں وہیں موت کا حکم لگا دیتے ہیں۔ حالانکہ بصارت کے بند ہوتے ہی نور بصیرت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ حقیقت میں زندگی ایک مسلسل عمل کا نام ہے اور یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے اس لئے جو روحانی آدمی نور بصیرت لے کر اس دنیا سے گئے ہیں انہیں مراہوا نہ سمجھو، وہ زندہ جاوید ہیں۔

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی



رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

خطوط کے آئینہ میںؒ

تعزیتی خطوط

دیدۂ بیدار دور اندیشؒ زی

مرتبہ

عزیز الرحمٰن جامعی، لدھیانوی ثم دھلوی

مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی

تعلیم و ترقی کا ایک فرد

از: ایڈیٹر تعلیم و ترقی جامعہ فروری ۱۹۵۲ء

میں لدھیانہ (پنجاب) کے ایک ایسے خاندان میں (۱۹۱۹ء میں) پیدا ہوا جسے حکومت پنجاب کی فہرست میں "۱۸۵۷ء کا باغی خاندان" کا لقب دیا گیا تھا۔ میں جب پانچ سال کا تھا اس وقت خلافت کی تحریک بڑے زور پر تھی۔ والد صاحب (مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی) جیل جا چکے تھے اور ہمارے گھر کا مال و اسباب سڑک پر لاکر نیلام کیا جارہا تھا۔ یہ تھا وہ ماحول جس کی گود میں نے آنکھ کھولی۔

خلافت کا دور گزر گیا اور والد صاحب جیل سے باہر تشریف لائے تو میری تعلیم کی فکر ہوئی اور انہوں نے میرے لئے دیوبند کا مدرسہ (دارالعلوم) منتخب کیا۔ دیوبند میں ایک ہی سال رہنے پایا تھا کہ مکہ شریف میں میری تعلیم کا انتظام ہو گیا اور مجھے وہاں بھیج دیا گیا۔ مگر وہاں بھی دو ہی سال رہنے کا موقع ملا۔ دو سال کے بعد جب میں وطن واپس آیا تو یہاں پھر سیاسی جدوجہد شروع ہو گئی تھی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد والد صاحب پھر جیل چلے گئے۔ جیل میں اتفاق سے والد صاحب اور ڈاکٹر انصاری مرحوم ایک ہی جگہ رہتے تھے وہیں ڈاکٹر صاحب نے والد صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ مجھے جامیہ ملیہ میں بھیج دیں چنانچہ میں ۱۹۲۹ء تک میں نے مختلف تحریکوں میں کام کیا کئی بار جیل گیا، کبھی مزدوروں میں کام کیا تو کبھی انتخابی جنگ میں، یہاں تک کہ ہندستان کی آزادی کی منزل سامنے آگئی اور ملک کی تقسیم کے سلسلے میں میرے عزیز رشتے دار تو پاکستان چلے گئے مگر والد صاحب اور ان کا پورا خاندان اپنا آبائی وطن چھوڑ کر دہلی چلا آیا۔

دہلی میں ۱۹۴۸ء میں بالغوں کی تعلیم کے سلسلے میں تعلیمی مرکزوں کی تحریک جاری تھی، میں نے اس تحریک کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اب جب کہ ملک کی سیاسی جنگ ختم ہو چکی ہے، ضرورت ہے کہ اس کی تعمیر نو کا پروگرام شروع کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے میں جامعہ کے شعبۂ "تعلیم بالغان" ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ" کے حلقے میں شامل ہو گیا اور اس کے ایک تعلیمی مرکز کے وارڈن کی حیثیت سے کام شروع کیا۔

تعلیمی مرکزوں کے راستے میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہے وہ بستی کے پرانے سماجی ادارے اور وہ روایات ہیں جن کے یہ ادارے حامل ہوتے ہیں۔ پہلے پہل تو وہ تعلیمی مرکز کو اچنبھے کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور کچھ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں مگر آہستہ آہستہ جب انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مرکز کی بدولت پس ماندہ طبقے کو ابھرنے کا موقع مل رہا ہے اور سماجی زندگی کا پرانا ڈھانچا کمزور ہو رہا ہے تو وہ خائف ہونے لگتے ہیں۔ اور اس خوف کا نتیجہ مرکز کے خلاف طرح طرح کی سازشوں میں نکلتا ہے۔ اس ذیل میں مجھے جن باتوں کا احساس ہوا انہیں مختصراً اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

(۱) امیر طبقہ پس ماندہ طبقے کی ترقی اور بیداری سے جلنے لگتا ہے۔

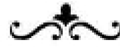
(۲) اونچی نسلوں اور خاندانوں کے لوگ ہمساندہ طبقے پر ہر قیمت پر اپنی فوقیت قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

(۳) سیاسی مزاج کے لوگ مرکز کو پردے ہی پردے میں اپنی سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں اور جب اس مہم میں ان

کو ناکامی ہوتی ہے تو مرکز کے خلاف اپنے سیاسی ڈھنگ پر پروپیگنڈ اشروع کر دیتے ہیں۔

میں نے اپنے چار سال کے تجربے میں نہ صرف ان مشکلات کو سمجھا ہے بلکہ ان کا مقابلہ کر کے مرکز کو چلایا ہے۔ یہ تو ضرور ہوا ہے کہ بستی کے کچھ لوگ مرکز اور ان کے کارکنوں سے ناراض ہو گئے ہیں۔ مگر بہ حیثیت مجموعی بستی کی عام جنتا مرکز کی تحریک کی بدولت گھل مل کر ایک جان ہو گئی ہے اور میری رائے میں کسی مرکز کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ بستی کے خصوصاً پس ماندہ طبقوں کے لوگ گھل مل کر ایک جگہ جمع ہونے لگیں اور اپنی مشکلات اور مسائل پر خود قابو حاصل کرنے کے عادی ہو جائیں۔ میں نے مرکز میں کام شروع کرنے کے بعد حالات کا جائزہ لیا اور اس کی روشنی میں اپنے لئے کام کا جو خاکہ ترتیب دیا اس کا ذکر اپنی سالانہ رپورٹ میں ان الفاظ میں کیا تھا:

> ''بستی کے مرکز کو لوگ عام طور پر مدرسہ سمجھتے تھے اور اس غلط فہمی کی وجہ سے کام میں بڑی رکاوٹ پڑتی تھی۔ میں نے اپنے لئے پہلا کام یہ تجویز کیا کہ بستی کے باشندوں کے دل و دماغ سے یہ غلط فہمی دور کر دینی چاہئے اور ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دینی چاہئے کہ ''تعلیمی مرکز'' کوئی مدرسہ نہیں ہے بلکہ یہ بالغوں کی تعلیم، بچوں کی غیر نصابی تربیت، والدین کی تربیت وغیرہ کا مرکز ہے جس کے ذریعے ایک اچھے سماج کی تشکیل و تعمیر مقصود ہے۔''



حضرت مرشدی ومولائی شاہ عبدالقادر نور اللہ مرقدہٗ کا خط

از احقر عبدالقادر! ۔۔۔۔۴ر ستمبر ۱۹۵۶ء

برخوردار موی عزیز الرحمٰن ۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

برخوردار تمہارا خط آیا۔ خیریت وکیفیت معلوم ہوئی۔ برخوردار حضرت مولانا مرحوم کے انتقال پر مُلال سے تمہاری ہی کیا کمر ٹوٹ گئی۔ آپ لوگوں کے ساتھ اور بھی اس میں شریک ہیں۔ مولانا تو بہت لوگوں کے سہارا تھے۔ ہم لوگ بھی ان کا انتظار ہی کرتے رہتے تھے کہ کب تشریف لادیں۔ اب سوائے دعا کے کیا عرض کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو بڑے درجے عطا فرمادیں۔ باقی برخوردار اب تم ہی اب سب بھائیوں میں سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔ تم ہی اپنے والد بزرگوار کی جگہ ان کا خیال رکھو۔ آپس میں اتفاق واتحاد اوان کی نیکی کا خیال رکھو۔ احقر بھی آپ لوگوں کے لئے دعا کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ سب کو خوش وخرم رکھیں۔

مولوی محمد احمد۔ ازہر۔ طیب۔ بھائی خلیل۔ فراست وغیرہ اور سب گھروں میں میرا سلام عرض ہے۔ بقلم عبد المنان خادم حضرت والا

نوٹ: حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری، رئیس الاحرار کے پیر ومرشد تھے۔ مرید نے تمام عمر اطاعت کی اور ہر قسم کی روحانی اور سیاسی رہنمائی حاصل کی اور مرشد نے اپنے مرید پر ہمیشہ اپنی شفقت ومحبّت کی بارش کی۔ عزیز۔ ۱۱ر جنوری ۱۹۷۵ء

راشٹر پتی بھون۔ نیو دہلی۔ ۳، ستمبر ۱۹۵۶ء

عزیزم سعید الرحمٰن لدھیانوی! یہ معلوم کرکے مجھے افسوس ہوا کہ آپ کے والد ماجد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے ہیں۔ ایک مدت سے میں انہیں جانتا تھا۔ اس دوران میں میں نے یہ محسوس کیا کہ انہوں نے بے غرضی اور خلوص کے ساتھ قومی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا۔ ان کی جدائی سے جو صدمہ آپ کو ہوا ہے۔ اس میں میں پوری طرح شریک ہوں اور امید کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اس صدمے کو برداشت کرنے کی توفیق دے گا۔

خیر اندیش

راجندر پرشاد

صدر جمہوریہ ہند

عزیزم مولوی سعید الرحمٰن لدھیانوی۔ کوچہ رحمٰن۔ دہلی

(یہ خط دستی آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس دن کی تمام مصروفیات ختم کردی تھیں)

دہلی۔ ۳، ستمبر ۱۹۵۶ء

عزیزم خلیل الرحمٰن صاحب! مجھے یہ سن کر نہایت ہی افسوس ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ مرحوم نے اس ملک کی جنگِ آزادی میں جو نمایاں حصہ لیا ہندوستان کی تاریخ حریت میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ میں آپ کے دکھ میں پوری طرح سے شریک ہوں اور خدا سے دعا کرتی ہوں کہ مولانا مرحوم کو جنّت نصیب ہو اور لواحقین کو اس صدمہ عظیم کے برداشت کرنے کی ہمّت ملے۔

آپ کی امرت کور

وزیر صحت حکومتِ ہند، نیو دہلی

لاہور۔ ۳، ستمبر ۱۹۵۶ء۔ (بذریعہ ڈاک)

"..... امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کے انتقال پر"

امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو جب رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال کی خبر دی گئی تو شاہ صاحب دیر تک سکتے کے عالم میں رہے۔ اور جب نامہ نگار نے شاہ صاحب سے حضرت مولانا مرحوم پر بیان دینے کو کہا تو فرمایا:

"ایک اچھے رفیق، مونس و غم خوار اور سراپا ایثار ساتھی کی جدائی نے میرے سینے میں ایک اور زخم کا اضافہ کیا ہے۔ مولانا کی وفات ملت کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے۔"

اس سانحہ عظیم پر حضرت امیر شریعت دن بھر سوگوار رہے اور مولانا کے ساتھ اپنی دیرینہ رفاقت او. مختلف مراحل کا بار بار ذکر کرتے رہے۔

۳، ستمبر ۱۹۵۶ء۔ دہلی۔

محترمی مولانا عزیز الرحمٰن صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال پر ملال پر ہماری صوبہ کمیٹی نے جو تعزیتی تجویز آج کی میٹنگ میں منظور کی ہے وہ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ آپ کے بھائیوں اور بہنوں سے اس حادثۂ جانکاہ میں ہماری کمیٹی کو پوری ہمدردی ہے لیکن یقین جانئے کہ یہ پوری قوم کا نقصان ہے اور تمام محبانِ وطن اس کو محسوس کر رہے ہیں۔

آپ کا مخلص

مقیم الدین فاروقی

سکریٹری کمیونسٹ پارٹی۔ دہلی

۳، ستمبر ۱۹۵۶ء۔ دہلی

کمیونسٹ پارٹی کی دہلی صوبائی کمیٹی کی قرارداد: مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے انتقال کے سلسلہ میں

"ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی دہلی صوبائی کمیٹی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی بے وقت موت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے اور مرحوم کے پس ماندگان سے اظہار ہمدردی کرتی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی موت ہندوستان کے قوم پرست حلقوں کے لئے ایک حادثۂ جانکاہ ہے۔" انگریزی سامراج کے خلاف ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مولانا مرحوم نے جو حصہ ادا کیا وہ تاریخ میں ہمیشہ سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا جنگِ آزادی کی کامیابی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی جدوجہد کرنا مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی کا ایک اہم حصہ تھا۔

"ہندوستان کے تمام محبانِ وطن کا فرض ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے سامراج دشمن جذبہ اور ہندو مسلم اتحاد کی مساعی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھیں۔"

مقیم الدین فاروقی

سکریٹری کمیونسٹ پارٹی، دہلی اسٹیٹ۔ دہلی

لاہور۔ ۳، ستمبر ۱۹۵۶ء۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

برخوردار خلیل الرحمٰن سلمہٗ۔ السلام علیکم۔ کل رات جب ریڈیو پاکستان نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ مولانا حبیب الرحمٰن انتقال فرما گئے۔ دل کو بے حد صدمہ ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس خبر کے بعد ریڈیو پر کیا خبریں سنائی دیں۔ دل تھام کر بیٹھ گیا۔ گو زمانے نے میرے اور مولانا کے درمیان قدغن کھڑی کر دی تھی مگر حد بندیوں کی دوری ہماری دلوں پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ بچپن، جوانی اور بڑھاپے تک کی دلی رفاقت

کانقشہ آنکھوں کے سامنے اس طرح آیا کہ اس تصور کے ٹوٹتے ہی میں آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب کر رہ گیا۔ ایک نیک سیرت انسان اور ایک بہادر اور جری رفیق اور میرے بچپن کا ساتھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منہ موڑ گیا۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ چین اور سکون نصیب کرے اور جنت میں جگہ دے اور ہم سب پس ماندگان کو جو ان کی محبّت کے دامن سے وابستہ تھے صبرِ جمیل عطا کرے۔ برخوردار اب تم صبر کرو۔ تمہارا جلیل القدر باپ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہم سب کو اسی راہ پر گامزن ہونا ہے۔ بخاری صاحب کو علاج کے لئے ملتان سے لاہور کے لئے لائے تھے۔ کل وہ بھی دن، بھر آنسو بہاتے رہے.....

تمہارا غمزدہ چچا
تاج انصاری (لدھیانوی مرحوم)

دفتر مجلس احرار اسلام ہند۔ بیرون دہلی دروازہ متصل شاہ محمد غوث۔ لاہور۔ پاکستان۔

نوٹ: تاج الدین صاحب انصاری مولانا مرحوم کے بچپن کے ساتھیوں میں سے تھے۔ تمام عُمر قیدوبند کی مصیبتیں مولانا کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔ جون ۱۹۷۰ء میں تاج الدین صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور اپنے ساتھی سے جاملے۔۔۔ عزیز۔ ۱۸؍ جنوری ۱۹۷۱ء

لدھیانہ۔ ۳؍ ستمبر ۱۹۵۶ء

برادرم سعید الرحمٰن صاحب۔ بزرگوارم حضرت مولانا صاحب کی ناگہانی موت کی خبر سن کر ہم سب کو ازحد رنج اور قلق ہوا۔ تمام بال بچے سخت غم میں مستغرق ہیں۔ ان کی بزرگانہ عاطفت سب کے دل میں نقش ہے۔ تمام شہر میں احباب نے ماتم کیا۔ ایسے برگزیدہ بزرگوں کا سایہ سر سے اُٹھ جانا ہم سب کی بدقسمتی ہے۔ ایشور ان کو شانتی، روحانی تسکین اور تمام برادران کو تسلی دیں۔ بہت افسوس صد افسوس۔

آپ کا بھائی
ہر بھگوان مودگل
(وکیل اور سابق ایم۔ ایل۔ اے لدھیانہ)

ضلع میرٹھ۔ ۳؍ ستمبر ۱۹۵۶ء۔

بخدمت شریف جناب مولانا عزیز الرحمٰن صاحب لدھیانوی

خدمت میں ملتمس ہوں کہ حضرت مولانا کے انتقال کی خبر سن کر دل کو بے حد افسوس اور صدمہ ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

ایں امانت چند روزہ نزد ماست
درحقیقت مالک ہر شے خداست

جس طرح آپ اس دنیا میں ہمارے لیڈر تھے اور ہمارے راہبر تھے۔ اسی طرح آپ دنیائے جاودانی میں بھی ہمارے رہبر رہیں گے اور سبھی مسلمان طبقہ کو راہ نجات دکھلا کر پل صراط سے گزار کر بہشت بریں میں داخل کر دیں گے اور ہمارے بادشاہ خدا کی اور خدا کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے مامور کر دیئے جائیں گے۔ آمین

جناب باری تعالیٰ نے کلام پاک میں فرمایا ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت ''ہر جان دار کو فنا ہونا ہے'' دنیا فانی ہے پھر اس پر افسوس کیا۔ حضور اکرم ﷺ کی عمرِ مبارک بھی ۶۳ سال ہوئی تھی اور حضرت مولانا کی عُمر مبارک بھی صرف ۶۴ سال کی ہوئی یعنی خداوند کریم کو اپنے محبوب بندوں کی عُمر اتنی ہی مقبول ہے۔

حضرت مولانا نے اپنے ۷، شوال ۱۳۷۵ھ کے نامۂ مبارک میں خادم کو لکھا تھا کہ ''خداوند کریم ہم سب کو ہر قسم کی آزمائشوں سے محفوظ

رکھیں" "میری صحت و سلامتی ایمان اور خاتمہ بالخیر کے لئے دعا کرتے رہئے۔"

مندرجہ بالا جملات میں جناب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ آپ انہیں جملوں کے نظریہ کو لے کر جو مولانا نے فرمائے ہیں خادم کے لئے دعا فرمایئے گا عین عنایت ہوگی۔ چونکہ تعلیمی کام زیادہ ہیں اس لئے ایک پارہ شریف کی علی الصبح تلاوت کر کے اس کا ثواب حضرت مولانا کی روح کو پہنچا دیتا ہوں اور ماہ ستمبر کی ۳۰؍ تاریخ تک انشاءاللہ پورے کلام کی تلاوت کر کے حضرت کی روح کو اس کا ثواب پہنچا دیا جائے گا۔ ایک ساتھی صلاح الدین بھی نصف پارہ قرآن شریف کی تلاوت روزانہ کر کے حضرت کی روح اس کا ثواب پہنچا دیتے ہیں۔ حضرت مولانا کو خداوند کریم بہشت بریں کا بادشاہ معمور فرمادیں۔ آمین۔ فقط زیادہ حد ادب۔

خادم سمیع الدین
طالبعلم جے۔ ٹی۔ سی کالج۔ ہاپوڑ ضلع میرٹھ

لدھیانہ۔ ۳؍ ستمبر ۱۹۵۶ء۔

محترم مولانا صاحب۔ جے ہند۔ محترم مولانا صاحب کی موت کی خبر نے مجھے بہت بے چین کیا۔ آپ کو شاید پتہ نہ ہو۔ میں تقریباً تین ماہ سے بستر پر پڑا ہوں۔ کل جب ریڈیو سے یہ خبر ملی تو بہت دکھ ہوا۔ لدھیانہ کے دوستوں نے ان کی جدائی کو بہت محسوس کیا ہے خدا ان کی روح کو تسکین دے۔ لدھیانہ کا ہر شہری آپ کے اس دُکھ میں شریک ہے۔

آپ کا بھائی
سرداری لال کپور
جگراؤں روڈ۔ لدھیانہ

کراچی۔ ۳؍ ستمبر ۱۹۵۶ء

برادرم سردار صاحب تسلیم۔ السّلام علیکم! واضح ہو کہ اس سے قبل ایک خط آپ کی خدمت میں تحریر کر چکا ہوں۔ امید ہے مل چکا ہوگا۔ میں پچھلے ۸۔ ۱۰ روز سے سخت پیٹ کے درد کی تکلیف میں ہوں اور چونکہ دفتر میں دوہری ذمہ داریاں یعنی اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور ڈپٹی کا کام سرانجام دینی پڑ رہی ہے اس لئے مرتے پڑتے دفتر جانا ضروری ہے۔ پچھلے دو چار روز سے بے حد نڈھال اور مضمحل سا ہوں۔ بہر حال اسی طرح یہ ہفتہ عشرہ گزر رہا ہے۔ ایسے ماحول میں یہ خط نہایت غم و اندوہ کی حالت میں لکھ رہا ہوں۔ یعنی اگر چہ گھر میں ریڈیو نہیں ہے اور اس طرح میں محض اپنی کوفت کو ختم کرنے کے لئے کل بعد مغرب گھر سے باہر سڑک پر گھومنے نکل گیا۔ وہاں ایک مکان میں خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ میرے پہنچنے کے بعد جو خبروں کا خلاصہ میرے سننے میں آیا ان میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی وفات حسرت آیات کی خبر تھی، جس سے مجھے اس قدر صدمہ ہوا کہ میرے لئے کھڑا ہونا مشکل ہو گیا اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ فرطِ غم سے میرا سر حکرا رہا تھا اور بدن میں رعشہ طاری تھا۔ وائے بدنصیبی اور دوری زمانہ کی تعزیت کے اظہار کو بھی ہفتوں میں پہنچایا جاسکے۔ جہاں مولانا مرحوم کے ساتھ قلبی اور مُخلصانہ تعلقات کے احساس اور لگاؤ سے دل بھر بھر آتا ہے وہاں یہ قلق بھی ہے کہ آخری دیدار بھی نصیب نہ ہو سکا۔ بہر حال مولانا مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کے ساتھ ساتھ پس ماندگان کے لئے خداوند کریم سے صبر جمیل عطا کرنے کی دعا کی۔ مجھے بالخصوص مولانا خلیل صاحب کا خیال آتا ہے کہ دل کے عارضہ میں ان پر اس غم جانکاہ سے کیا بنی ہوگی؟ تاہم خداوند کریم سے ملتجیانہ دعا ہے کہ انہیں اور دیگر خویش واقارب کو اس موقع پر استقامت اور صبر کامل عطا کرے۔ آمین ثم آمین

میرے پاس مولانا خلیل کا پتہ نہیں اس لئے یہ خط آپ کی خدمت میں تحریر کر رہا ہوں۔ اس لئے بھی کہ مولانا مرحوم کے آپ کے ساتھ بھی ویسے ہی مشفقانہ تعلقات تھے جو خود مولوی خلیل صاحب اور دوسروں سے تھے۔ آہ وہ کیا کیا زمانے تھے۔ میری نظروں میں ان کی

بیٹھک کا ماحول میری نظروں میں بارہا آتا رہا۔ وہی لدھیانہ۔ وہی ماحول۔ وہی ایام اور پھر یہ غم و آلام۔ خداوند کریم ہم سب پر رحم کرے اور صبر جمیل عطا ہو۔ آپ مناسب سمجھیں تو میری طرف سے بھی جملہ افراد خانہ کی خدمت میں اظہار تعزیت لکھ بھیجیں یا میرا یہ خط ہی مولانا خلیل صاحب کو ارسال کر دیں۔ آپ کے یہاں بھاوجہ صاحبہ اور لائل پور میں بھی دیگر افراد خانہ کی خدمت میں اسی قسم کے اظہار غم کا اظہار کر دیں۔ والدہ منیر بھی انتہائی رقت قلب سے اظہار تعزیت میں شریک ہیں۔ فقط والسّلام۔ احقر مفہوم

آپ کا محمود

کراچی

ملتان۔ ۳/ستمبر ۱۹۵۶ء

برادران مولوی خلیل الرحمٰن، مولوی عزیز الرحمٰن صاحب سلمہٗ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

مخدومی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ کی وفات سے بہت صدمہ پہنچا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالےٰ حضرت کو اپنے قربِ خاص میں جگہ مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ برادرم یہ صدمہ بھولنے والا نہیں۔ ہماری بدقسمتی کہ ملاقات سے بھی محرومی رہی۔ تمنّا تھی کہ اگر کسی طرح اجازت مل جائے تو ایک دفعہ ملاقات جی بھر کر ہو جائے۔ مگر وائے قسمت یہ بات نصیب نہ ہوئی۔ مولانا صاحب کی وفات سے آپ ہی یتیم نہیں ہوئے پوری ملّتِ اسلامیہ یتیم ہوگئی۔ نامعلوم بھارت کے مُسلمان پر کیا گزرے گی، جن کا بہادر بزرگ اور مضبوط سہارا ختم ہو گیا۔ میں رات کہہ رہا تھا قدرت کا کرشمہ کہ مولانا صاحب کا خاندان دونوں طرف کس طرح منتشر ہو گیا۔ آپ کی طبیعت جس طرح پہلے متین اور متحمل تھی اب بھی ایسی ہی رہے۔ برادران اور اہل خاندان کی نگرانی کریں۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے اور دعامیں یاد رکھیں گے۔ اپنے حالات سے اطلاع فرمادیں۔ سب کو نام بنام سلام۔ بچوں کو دعاء

فقط والسّلام

محمد علی جالندھری۔ ملتان

مجلس تحفّظ ختم نبوت پاکستان

سہارن پور۔ ۳/ستمبر ۱۹۵۶ء۔ مکرم و محترم۔ السّلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حضرت شیخ الحدیث کے نام پر پہنچے ہوئے تار سے آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کے انتقال کی خبر معلوم ہو کر پورے ادارے میں رنج و غم کی ایک بہر دوڑ گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ اور حق بات کہنے میں بڑے نڈر اور جری تھے۔ جدوجہد آزادی کے صف اول کے کام کرنے والوں میں ان کی خدمات ایک زبردست و دقیع حیثیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے ملک کے آزاد کرانے میں اس وقت قربانیاں دیں جب واقعۃً جدوجہد آزادی کا ایک مفہوم تھا اور اس میں حصہ لینے والوں کو غیر ملکی حکومت کے سخت سے سخت مصائب کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

مولانا کی وفات ملک وملت کا ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی مستقبل قریب میں دشوار معلوم ہوتی ہے۔ ارباب مدرسہ آپ، آپ کے جملہ برادران و اقارب اور مولانا سے تعلق رکھنے والے افراد کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ حق تعالےٰ مولانا مرحوم کو جنّت الفردوس میں درجات عالی سے سرفراز فرمائے اور متعلقین و متوسلین کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا کرے۔ مولانا مرحوم کے لئے قرآن شریف ختم کرا کے ایصال ثواب کرایا گیا ہے۔ اور بعد ختم و ایصال دعائے مغفرت کی گئی ہے۔

محمد اسعد اللہ عفی عنہ

ناظم مظاہر علوم۔ سہارن پور

سہارن پور۔ ۳؍ستمبر ۱۹۵۶ء

برادرِ محترم۔ سلام مسنون۔ آج کے اخبار میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھ کر انتہائی صدمہ ہوا۔ سر چکرا گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دیر تک ہوش و حواس گم رہے۔ موصوف میرے سیاسی پیر، محسن، رہنما اور مربی سرپرست تھے اور ان کی نوازشات کریمانہ و توجہات بزرگانہ ہمیشہ مجھ پر مبذول رہیں۔ لیکن آہ میں ان سے محروم کر دیا گیا۔ قلب حزیں کی حالت کا نقشہ الفاظ میں کھینچنا ممکن نہیں۔ اپنی اس محرومی پر جتنا رنج و غم کروں تھوڑا ہے۔

آپ کا اور برادران عزیز کا تصور کرتا ہوں تو دل اور بے چین ہوتا ہے۔ مجھے بھی شریک غم تصور فرمایئے خدا آپ کو صبر دے اور انہیں جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ مجھے ہمیشہ اپنا ہی تصور فرمایئے۔ برادران محترم کو سلامِ مسنون اور مضمون واحد۔

آپ کا محمود علی خاں

(حال وزیر اوقاف و آبپاشی)

لکھنؤ۔ ۳؍ستمبر ۱۹۵۶ء

برادران گرامی قدر! سلامِ مسنون۔ کل صبح بالکل اچانک قومی آواز میں مولانا مرحوم کے سانحہ ارتحال کی خبر پڑھی۔ چونکہ علالت وغیرہ کی کوئی اطلاع نہ تھی، اس لئے حیرت ہوئی، اور کسی ذریعے سے کچھ اور معلوم ہونے کا انتظار رہا۔ شام کو الجمعیۃ ڈاک سے آیا تو تفصیل معلوم ہوئی اور یقین کرنا پڑا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون سوچ رہا تھا اس موقع پر خود ہی جاؤں۔ اس لئے کل خط بھی نہ لکھا۔ لیکن بعض خاص مصرفیتوں کی وجہ سے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ انشاء اللہ اگلے ہفتہ حاضر ہوں گا اللہ تعالےٰ مولانا مرحوم کے تمام اہل تعلق کو اس حق کے ادا کرنے کی توفیق بخشیں جو اس دنیا سے جانے کے بعد جانے والے کا سب سے بڑا حق ہوتا ہے۔ اور آپ حضرات کو مولانا کی زندگی کے ان پہلوؤں کا وارث و حامل بنائیں جو اس کے نزدیک پسندیدہ تھے۔

والسّلام

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

(مدیر الفرقان لکھنؤ)

کراچی۔ ۳؍ستمبر ۱۹۵۶ء

مکرمی جناب عزیز الرحمٰن صاحب۔ السّلام علیکم! آج بروز پیر بتاریخ ۳، ستمبر روزنامہ انجام میں قبلہ مولانا صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم و مغفور کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ مولانا صاحب کی ہستی قوم کے لئے مشعل راہ تھی جس کی تلافی اس دور میں تقریباً ناممکن ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ لوگوں کو ان کا صحیح معنوں میں جانشین ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ جیسا کہ مولانا مرحوم و مغفور کی زندگی کا طریقہ رہا ہے۔ فقط والسّلام۔

آپ کا مخلص

جلیل الرحمٰن

۲۷۷، برٹو روڈ۔ کراچی

لائل پور۔ ۳؍ستمبر ۱۹۵۶ء

عزیز القدر مولوی محمد احمد صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ۔

سلام مسنون۔ گزشتہ شب عشاء کے قریب یکایک۔ مہ جانکاہ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا حبیب الرحمٰن کی خبر وصال سن کر

بے حد متاثر ہوا۔ احقر تو پہلے ہی بیمار رہتا ہے۔ پھر حضرت مولانا کی خبر وصال نے بالکل ہی کمزور کر دیا۔ آپ تو خیر مولانا مرحوم کی اولاد ہیں۔ لیکن جو محبّت احقر سے فرماتے تھے، اس کے پیش نظر بے حد صدمہ ہوا۔ مولانا مرحوم بلا مبالغہ اپنی نظیر آپ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین قیم کی خدمت بفضلہ تعالیٰ آپ سے لی۔ مولانا مرحوم کا ایثار، مجاہدہ، صبر و شکر، شفقت علی الخلق۔ حکیمانہ تبلیغی کارنامے اخلاص اور مولا تعالیٰ کی رضا و محبّت کے کام ایسے نہیں ہیں کہ زمانہ اس کو فراموش کر دے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت فرمائے، بلند درجات نصیب ہوں۔ آمین۔ آپ کے تمام بھائیوں، بہنوں، اعزائی، اقرباء سب کی خدمت میں سلام مسنون اور یہ تعزیتی مضمون عرض ہے۔ مولوی انیس الرحمٰن سلمہٗ پہنچ گئے ہوں گے یہاں سے آپ کی پھوپی صاحبہ اور سب لڑکے تعزیت پیش کرتے ہیں۔ والسّلام

(مولانا) محمد عفا اللہ عنہ انوری

لائل پور۔ پاکستان

لکھنؤ۔ ۳۔ ستمبر ۱۹۵۶ء

محبّان مکریان زید لطفہم۔ السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج اچانک قومی آواز سے حادثہ فاجعہ کی اطلاع ملی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن میں خیریت دریافت کرنے کے لئے خط لکھنے والا تھا کہ بجائے عیادت کے یہ تعزیت نامہ لکھنے کی نوبت آگئی۔ کچھ تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ کیا خبر تھی آج سے دو ہفتہ پہلے جو ملاقات ہوئی تھی وہ آخری ملاقات ہوگی غفر اللہ لہٗ واکرم شواہ۔ آپ سب بھائیوں کے ساتھ دیرینہ تعلقات کی بنا پر اور مرحوم کی بزرگانہ شفقت کی بنا شریک غم ہوں اور مغفرت و رضا کے لئے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ بھائیوں سے اپنی پسندیدگی کا کام لے اور مرضیات کی توفیق دے اور آپ حضرات سے خاندان کا نام روشن کرے۔ فقط

خاکسار

ابوالحسن علی

ناظم ندوۃ العلماء۔ لکھنو

دیوبند۔ ۳، ستمبر ۱۹۵۶ء

عزیزم میاں سعید الرحمٰن و عزیز الرحمٰن صاحبان سلمہٗ بعد دعائے خیر والد صاحب کی اچانک خبر نے میرے قلب حزیں کو پاش پاش کر دیا۔ بڑے افسوس کے ساتھ چند حرف لکھنے کو قلم اٹھایا ہے۔ انتقال پر ملال کی خبر سن کر سخت صدمہ پہنچا۔ ان کی پر خلوص محبت اور ہمدردی جو ہمارے ساتھ تھی وہ قابل قدر چیز تھی۔ میاں ازہر شاہ و میاں انظر شاہ سلمہٗ کو بھی بہت رنج و ملال ہے۔ اب ہمارا ایسا ہمدرد اور محبت والا کوئی نہیں ہے۔ ہم لوگ جتنا صدمہ کریں کم ہے۔ مرحوم کے تعلقات ہمارے ساتھ محبّت و ہمدردی کے تھے۔ تمہارے جذبہ و محبت کا جو والد صاحب کی ذات گرامی سے تھا مجھے کماحقہ واقفیت اور پورا پورا احساس علم ہے۔ اور مجھے تمہاری موجودہ قلبی حالت سے گہری ہمدردی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ کارخانۂ قدرت میں بے بس و بے کس انسان کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ وہ ازل سے مجبور و لاچار پیدا کیا گیا ہے۔ والد صاحب مرحوم کی وفات کی خبر میرے سینے میں ایک موہوم تڑپ بن کر رہ گئی ہے۔ میں اپنے جذبات درد کو تحریر میں لانے سے قاصر ہوں۔ واقعی گم شدہ محبّت کو تلاش کرنا کتنا صبر آزما ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ آپ سب بہن بھائیوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں عالی جگہ عطا فرمائے۔ میری جانب سے سب بہن بھائیوں کو تسلی اور صبر کی تلقین کریں۔ میں ضرور تمہارے غم میں شریک ہوتی۔ لیکن اپنی پرانی علالت کی وجہ سے نہ آسکی، انشاء اللہ تمہارے ہر دو بھائی ضرور آئیں گے۔ ہم تمہارے سب بہن بھائیوں کے غم میں شریک ہیں۔

اس مسافر گاہ میں دم بھر ٹھکانے کے لئے
سب مسافر آتے ہیں ایک روز جانے کے لئے

میری پُرخلوص دعائیں تمہارے ساتھ ہمیشہ رہیں گی۔

فقط والدہ ازہر شاہ قیصر کاشمیری
اہلیہ حضرت علامہ سید انور شاہ کاشمیری
دیوبند

دیوبند۔۳، ستمبر ۱۹۵۶ء۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سب بھائیوں کے نام۔ سلامِ مسنون!

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کا مضمون تعزیت، قلم کا جگر شق ہوتا ہے اور کاتب کا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ آنکھ کھولنے اور ہوش و حواس سنبھالنے کے بعد جن دو چار بزرگوں کا اخلاص، بزرگانہ شفقت ہم شکستہ حالوں کے کام آئی مولانا مرحوم کو ان سب میں خاص مقام حاصل ہے۔ آہ کہ آج شفقت سے ہمارے سروں پر ہاتھ رکھنے والا اٹھ گیا۔ اباجی مرحوم کا خادم خاص نیاز مند، نام لیوا، ان کی اولاد پر جان چھڑکنے والا رخصت ہوا۔ عزیز بھائیو! یہ آپ کا تنہا حادثہ نہیں بلکہ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے سر پر سے آج باپ کا سایہ اٹھا ہے۔ ہم کس کو تعزیت دیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ تم لوگوں کی طرح ہم بھی تعزیت کے مستحق ہیں۔ وہ مجاہد اپنے خدا کے حضور حاضر ہو چکا اور اپنی طویل نیک نامیوں کا اجر لینے کے لئے ہمارے سامنے سے روپوش ہو گیا۔ خدا تعالےٰ ان کی تربت کو ٹھنڈی رکھے اور اپنی خاص عنایتوں سے سرفراز فرمائے۔ ختم نبوت کا محافظ، مدحت صحابہ کا ثناخواں، آزادی ہند کا نڈر سپاہی، بوڑھا حبیب الرحمٰن، خداوندا تیرے حضور حاضر ہے۔ اس پر اپنی رحمتوں کی بارش برسا آمین۔ ثم آمین

فرصت ملتے ہی ہم دونوں بھائیوں کا ارادہ حاضری کا ہے۔ تم بھائیوں کے رنج و غم میں ہم برابر کے شریک ہیں۔ اماں بھی مغموم ہیں اور تمہارے رنج والم کا شدید احساس لئے ہوئے ہیں۔ میری طرف سے یہ خط تمام بھائیوں کو سنا دیا جائے۔

والسّلام
انظر شاہ۔ دیوبند

کراچی۔ ۳ر ستمبر ۱۹۵۶ء

عزیز بھائی! السّلام علیکم۔ میں خبریں پڑھتا ضرور ہوں لیکن سنتا اس لئے نہیں کہ میرے پاس ریڈیو نہیں ہے۔ آج اتفاق سے میں نے خبریں اس لئے سنیں کہ ریڈیو پاکستان کراچی سے خبروں کے فوراً بعد میری تقریر تھی اور میں دس منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔ یقین کیجئے حضرت قبلہ مولانا کے انتقال کی خبر سے مجھے اتنا دکھ ہوا کہ میں تقریر کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی ابھی واپس آ کر میں نے مولانا سالک کو بھی اس حادثۂ جانکاہ کی خبر سنائی۔ انہیں کل بے احد افسوس ہوا۔ سیاسی مسلک خواہ کچھ ہو۔ لیکن شخصیت بہر حال گنی جاتی ہیں اور مولانا مرحوم کی شخصیت کو کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ آپ کو اور بھائی خلیل کو اور دیگر متعلقین کو صبر کی توفیق دے۔ اس کے سوا میں اور کیا لکھوں۔ صبر اگرچہ خود ہی صبر ہے۔ لیکن یہ صبر بھی انسان کو کرنا ہی پڑتا ہے۔

آپ کا نیاز مند
مجید لاہوری

دیوبند۔ ۳؍ ستمبر ۱۹۵۳ء

محترم بھائی عزیز الرحمٰن صاحب۔ السّلام علیکم

مولانا حبیب الرحمٰن کے انتقال کی خبر نے دل و دماغ پر ایک بجلی گرا دی۔ عزیز بھائیو! تمہارے باپ کا انتقال نہیں ہوا بلکہ ایک ایسا مجاہد اٹھ گیا جس نے خطرات کو خطرات نہیں سمجھا۔ جو تختہ دار کے سامنے بھی کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا محافظ، آج روح محمدی کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ آسمان کی بلندیوں پر غلغلہ ہے کہ آقائے نامدار کی عزت و حرمت پر شیر کی طرح گونجنے والا حبیب الرحمٰن آ رہا ہے۔ اباجی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی یادگار اٹھ گئی۔ ہم دونوں بھائیوں کا شفیق سرپرست ہم سے جدا ہو گیا۔ وہ ہستی جاتی رہی جس کے ہر سانس میں ازہر و انظر کے لئے بوئے محبّت تھی۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایک بڑی طاقت، بڑی قوت، بڑا سہارا ہم سے چھن گیا۔ اللہ تعالےٰ! تیری عنایات و الطاف کا ہزار ہزار شکریہ۔ رنج و غم کے اس موقع پر ہم ناصبوروں کا کیا موقع ہے کہ کوئی حرف شکایت زبان پر لائیں۔ اپنے بندوں کے ساتھ ہمہ وقت بڑا معاملہ رحمت و مغفرت ہی کا ہے چاہے اس کی ظاہری شکل تیرے کوتاہ نظر بندوں کو سخت گیر ہی کیوں نظر نہ آئے۔

الہٰ العالمین تیری بارگاہ رحمت میں مولانا حبیب الرحمٰن کی دینی، قومی اور ملی خدمات کو قبول فرمانے اور آخرت میں انہیں مقام بلند عنایت فرمانے کی دعا ہے۔ کریما! ہم دل شکستگان درد فراق کو بھی تاب جدائی اور طاقت صبر عنایت فرما۔ عزیز بھائیو! صبر و ہمّت سے کام لو، تمہارا باپ اپنی بہادری و شجاعت اور اِستقلال کا غیر فانی نقش چھوڑ کر گیا ہے۔ اس رنج و حسرت کے موقع پر تمہیں اس کی رہبری کرنی چاہئے۔

والسّلام

تمہارا غمزدہ بھائی

سیّد ازہر شاہ قیصر

شاہ منزل، دیوبند

خط نمبر ۸۸۔ چٹان۔ لاہور۔

عزیز بھائی! السّلام علیکم۔ کل دو بجے دوپہر کھانا کھا رہا تھا تو آل انڈیا ریڈیو سے اردو خبروں کا پروگرام شروع ہوا۔ پہلی خبر تھی آج صبح ۸ بجے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی انتقال فرما گئے۔ یہ خبر سنتے ہی میں اپنی جگہ ساکت و جامد ہو گیا۔

عزیز بھائی! آپ کے ساتھ اس دنیا سے میرا باپ بھی اٹھ گیا۔ کئی باتیں مجھ میں اور مولانا میں مشترک تھی۔ میں جنگ شروع ہوتے ہی ۱۳؍ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ملتان میں گرفتار کر کے منٹگمری جیل میں بند کر دیا گیا۔ اور ۱۹۴۴ء کے شروع میں رہا ہو کر تھانہ انار کلی میں نظر بند رہا "صدر احرار" ۱۷؍ دسمبر ۱۹۴۰ء کو گرفتار ہوئے اور ۴؍ جولائی ۱۹۴۵ء کو دھرم سالہ جیل سے رہا ہوئے۔ اس طرح وہ بھی پانچ سال نظر بند رہے اور میں بھی پانچ سال نظر بند رہا۔

مولانا منٹگمری جیل میں چھ بارہ دریاں یا چھ احاطے چھوڑ کر نظر بند کئے گئے اور افغانی وزیر کے نام سے جیل میں مشہور ہوئے۔ میں بھی چھ احاطے چھوڑ کر ساتویں میں نظر بند تھا۔ کچھ دنوں بعد مجھے پتہ چلا کہ منٹگمری جیل میں کوئی افغانی وزیر نہیں "صدر احرار" ہند ہیں۔ ملنے کی تدبیریں کیں راہ پیدا کی۔ ہفتے عشرے میں کامیابی ہوئی۔ ایک جمعدار کی مدد سے یہ ملاقات خفیہ ہوتی تھی۔ مولانا نے بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا اور ہاتھ ملایا۔ جب میرے اور ساتھیوں کے حالات سنے تو ان کی آنکھوں سے موتیوں کی طرح آنسو بہہ نکلے۔ فرمایا "میں کوشش کروں گا کہ تم لوگوں کی سختیاں کم ہو جائیں، اور جیل کا عملہ انسانیت سے پیش آئے۔ تم تو تین چار ساتھی ہو، میں اکیلا قیدِ تنہائی میں بند ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ دل و دماغ پر کوئی ملال نہیں۔ ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ قرآن پڑھتا ہوں اور قرآن کے رموز و نکات پر غور کرتا ہوں۔ تمہارے

اور میرے ملنے کی ایک ہی راہ ہے کہ تم حکومت کو درخواست دو کہ میں مولانا حبیب الرحمٰن سے قرآن پڑھنا چاہتا ہوں۔" مولانا یہ کہہ کر تشریف لے گئے، دونوں طرف کے احاطوں کے مہیب اور خوفناک دروازے بند ہوگئے۔ یہ دروازے اس لئے بند ہوئے کیونکہ ہم ہندوستان میں "احرار" اور کانگریسی تھے۔

میں نے مولانا کے ارشاد کے مطابق حکومت پنجاب اور سر سکندر حیات خاں کو لکھا کہ میں مولانا سے تفسیر قرآن پڑھنا چاہتا ہوں۔ اس کی اجازت دی جائے۔ سکندر حیات نے جواب دیا نہ آپ مولانا سے مل سکتے ہیں نہ تفسیر پڑھ سکتے ہیں۔ آپ کے لئے کسی ملّا کا انتظام کر دیا جائے گا۔ میں نے حکومت کے اس خط کا بڑا سخت جواب دیا۔[1]

دوسری بات مجھ میں اور مولانا میں یہ مشترک تھی کہ میں اور مولانا دونوں پھانسی کے تختے پر حق بات کہنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور اس میں خوشی محسوس کرتے کہ اللہ کے نام کو اور کلمہ حق کو پھانسی کے تختے پر بلند کیا جائے۔ مولانا صحابہ کا خمیر اور میں صحابہ کا اسیر ہوں اور ان کے نقش قدم پر چل رہا ہوں۔

جنگ کے زمانے کی نظر بندی بھی خوب تھی۔ مولانا مظہر علی اظہر قائد احرار بن بیٹھے اور خضر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب سے راہ و رسم پیدا کرلی۔ شیخ حسام الدین اپنے بھائیوں کی وجہ سے رہا ہوئے۔ اور پھر نہ بولے۔ خاموشی سے زندگی گزارتے رہے۔ مولانا مظہر علی اظہر نے پاکستانی حلقوں میں مقبول ہونے کے لئے حکومت الٰہیہ کا ئر الاپا۔ لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور لیگ کے حلقوں نے انہیں قبول نہ کیا۔ مجھے اور مولانا کو جیل ہی میں یہ حالات معلوم ہوگئے تھے۔

منٹگمری سے مولانا کو دھرم شالہ جیسے جیل میں بھیج کر حکومت نے انتقام کا آغاز کیا۔ کیونکہ مولانا نے سکندر حیات خاں اور میاں عبد الحی وزیر تعلیم پنجاب کو سخت چٹھیاں لکھی تھیں۔ میرا بھی یہی حال تھا مجھ پر بھی منٹگمری جیل میں کیا کیا نہ ستم توڑے گئے۔ مولانا دھرم شالہ جیل میں اور میں منٹگمری جیل میں حکومت کے خلاف ڈٹے رہے۔ ایمان اور خودداری پر آنچ نہ آنے دی۔ مولانا فالج میں مبتلا ہوئے اور میں سخت قسم کی پیچش میں۔

آج مولانا اس دنیا میں نہیں ہیں پر ان کی یاد تڑپا رہی ہے۔ ایسا مجاہد کہاں پیدا ہوگا جو پس دیوار زنداں بھی اعلائے کلمۃ الحق کرتا رہے۔ حکومت مولانا اور مجھ کو تشدد پسند سمجھتی رہی۔ حکومت کے فائلوں میں میرے اور مولانا بھی اعلائے کلمۃ الحق کرتا رہے۔ حکومت مولانا اور مجھ کو تشدد پسند سمجھتی رہی۔ حکومت کے فائلوں میں میرے اور مولانا کے لئے تشدد پسند کا لفظ استعمال ہوتا رہا۔ مولانا پر سبھاش چندر بوس سے ساز باز کرنے کا الزام تھا اور مجھے بم بار پارٹی کا ہم نوا سمجھا گیا۔ اللہ تعالےٰ مولانا کو مقام سرمدی عطا فرمائے اور مجھے ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا ہو میں ایک بھائی کی حیثیت سے آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور ایسا بیٹا ہوں جس کا مجاہد باپ بھی پانچ سال تک نظر بند رہا اور مجاہد بیٹا بھی پانچ سال تک قید رہا اور مظالم سہتا رہا۔ ان کی بہت سی باتیں یاد آتی ہیں اور مشعل راہ بنیں گی۔ ۱۹۴۶ء میں آزاد اخبار میں ان کی زندگی پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا اور اس میں بہت سے واقعات آگئے تھے۔ اپنی زندگی پر کتاب لکھوں گا تو مولانا کا ذکر مسلسل آئے گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو صبر کی توفیق دے۔ آمین۔

تمہارا بھائی
شورش کاشمیری
۳؍ دسمبر ۱۹۵۶ء

1 خواجہ محمد طاہر بزرگ مسلم لیگ کے سکریٹری تھے اور بڑے پر جوش انسان لیکن رئیس الاحرار کے باوجود لیگی ہونے کے عقیدت مند رہے (مرتب)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مدظلہ کا خاص خط

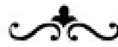
خط نمبر ۸۶ عزیز گرامی قدر و منزلت! تمہاری مرتبہ کتاب پہنچی تھی اور میں نے فرط شوق میں اپنے واقفین کے حالات عشاء کے بعد کواڑ بند کر کے سن لئے تھے اور رسید بھی لکھوادی تھی جس میں غالباً میں نے اس کا بھی اظہار کیا تھا کہ تمہارے والد صاحب کے حالات بہت ہی کم آئے۔ مگر کل کی ڈاک سے تمہار محبّت نامہ پہنچا جس میں مولانا مرحوم کے مفصل حالات پر تمہاری تالیف معلوم ہو کر بہت ہی مسرت ہوئی۔ خدا کرے میری زندگی میں چھپ جائے تو میں بھی سننے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس سعی میں کامیاب فرمائے۔ بہت اشتیاق پیدا ہو گیا۔ میں نے مولانا کا ذکر تو متعدد کتابوں میں کیا ہے۔ اس لئے کہ مولانا کی ابتداء تو میرے اور ان کے ذوق کے خلاف کی تھی اور منتہا تو نہایت ہی محبّت اور یگانگت کی تھی مگر میں تو جب سے آیا ہوں اس قدر ہجوم میں گھرا ہوں کہ ماہ مبارک میں تقریباً دو ہزار کا مجمع مستقل رہا اور اس سے پہلے میری آمد کا ہجوم رہا اور اب واپسی کا ہجوم بہت رہا ہے اس واسطے مجھے تو بالکل ذہن میں نہیں کہ آپ نے جس مضمون کا اشارہ لکھا ہے وہ کس کتاب[1] میں ہوگا اور وہ کون سا مضمون ہے۔ میرا ایک سلسلہ تالیف آپ بیتی کا کئی سال سے چل رہا ہے۔ شاید اس میں تو مولانا کا تذکرہ بار بار آیا ہی ہوگا۔ مگر مولوی نصیر نے بیان کیا کہ اس کی کئی جلدیں ختم ہو گئیں۔ اس وقت تو میں ضروری خطوط بھی نہیں لکھوا سکتا اور مسلسل مضامین مجھے یاد بھی نہیں رہتے تذکرہ پر باب ۶ پر بات یاد آتی ہے۔ مدینہ پاک پہنچ کر حج کے دو ماہ بعد کچھ دماغ فارغ ہو سکتا ہے۔

فقط والسّلام

حضرت اقدس شیخ الحدیث صاحب فیوضہم بقلم مظہر عالم مظفر پوری

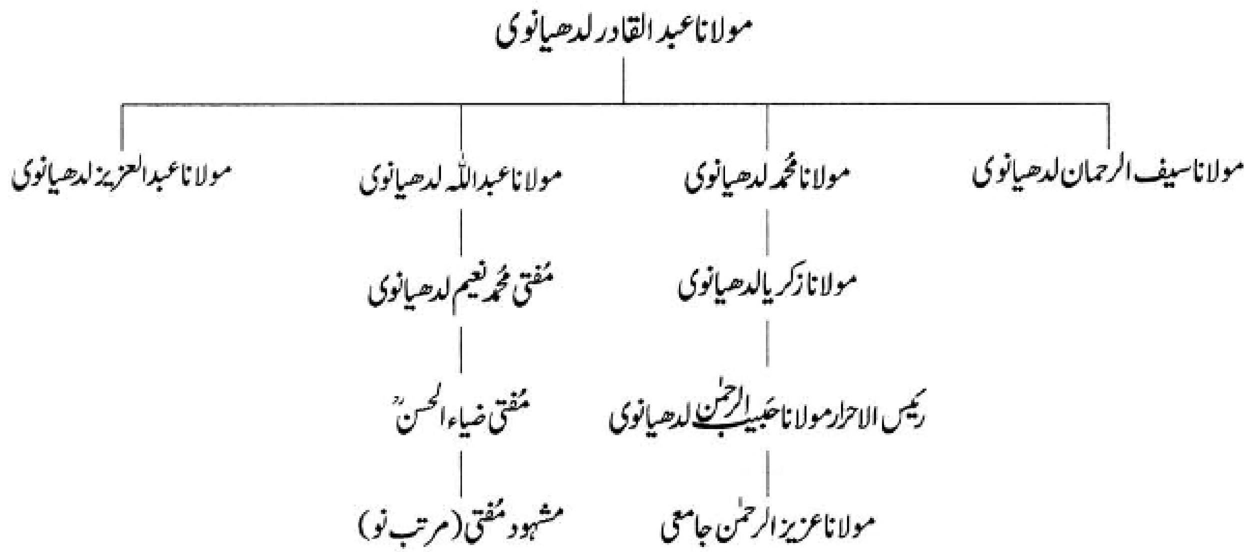
۱۱ر شوال ۵۹ھ سہارن پور (یوپی)

الٰہی سلامت حبیب و بخاری	شریعت ہماری، سیاست ہماری
مٹے گی نہ باطل کے گندے عمل سے	حمیت ہماری حرارت ہماری
اگر اک امیر شریعت بنا ہے	تو پھر دوسرے کی سیاست ہے بھاری
بڑی تمکنت سے بڑی گھن گرج سے	لگاتے ہیں دشمن پہ یہ ضربِ کاری
فرنگی کے غمخوار لرزاں ہیں ان سے	عدو پر بڑی ان کی دہشت ہے طاری
ہیں ختم نبوت کے دونوں محافظ	رہے تاقیامت یہی مشن جاری



[1] حضرت شیخ الحدیث نے جنگ آزادی کے مسلم مجاہدین کی تیسری جلد کا ذکر کیا ہے اور زیر نظر کتاب رئیس الاحرار در حدیث دیگراں پر خوشی کا اظہار فرمایا ہے۔ حضرت شیخ کی دعاء سے جنگِ آزادی کے مسلم مجاہدین کتاب صرف ایک مہینے میں فروخت ہو گئی۔ (مرتب)

خاندان[1] مولانا عبدالقادر لدھیانوی



Grand Son of Mufti Mohammad Naeem Ludihanavi

1 نوٹ: اس شجرے میں صرف چند قابل ذکر اشخاص کا تذکرہ ہے تفصیلی شجرہ نسب نہیں ہے۔

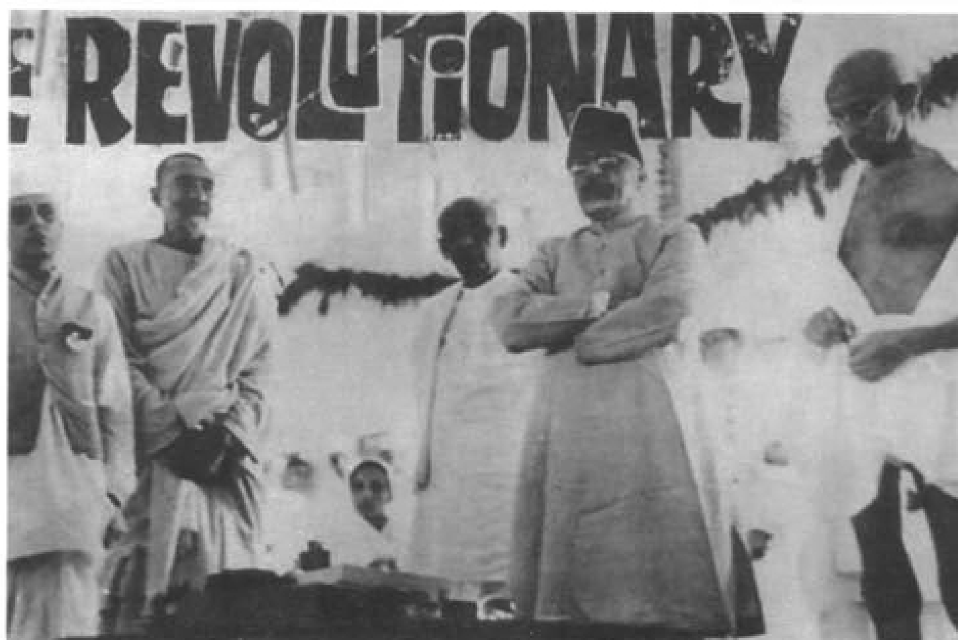


Prime Minister Pt. Jwahar Lal Nehru & Moulana Habib-ur-Rehman Ludhianvi



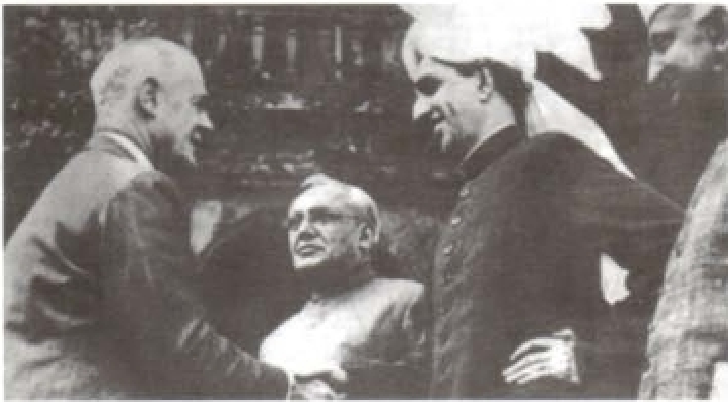


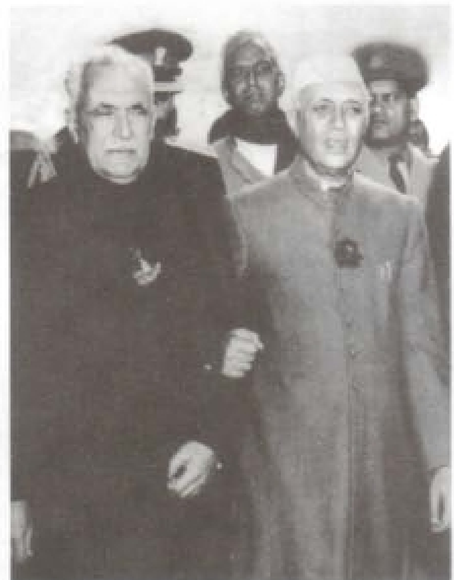
Maulana Abul Kalam Azad in conversation with Malik Hizar, Premier of Punjab in Simla, where they had gone to attend Leaders Conference in June 1945.















احرار کانفرنس اوکاڑہ ۱۹۴۹ء
جیش احرار کی پریڈ دیکھتے ہوئے بائیں سے دائیں حضرت امیر شریعتؒ، قاضی احسان احمد شجاع آبادیؒ، ماسٹر تاج الدین انصاریؒ اور پانچویں شیخ حسام الدینؒ



رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان اور سلطان سعود اوّل
راشٹر پتی بھون میں خصوصی ملاقات فرما رہے ہیں



امیر شریعت، خطیب الامت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ









مولانا عزیز الرحمٰن جامعی لدھیانوی شدہ دہلوی کتاب کی تصنیف میں مصروف

maulvi (Ludhiami) Aziz-ul-Rehman



To meet His Majesty King Saud of Saudi Arabia.

The Prime Minister

requests the pleasure of your company

at Lunch on Monday

Nov. 28 . 1955 at 1.15

R.S.V.P.—
Reception Officer,
Prime Minister's House

Invitation for Lunch by Pandit ji to meet H.M.King Saud of S.Arabia. Total invitees 25only.





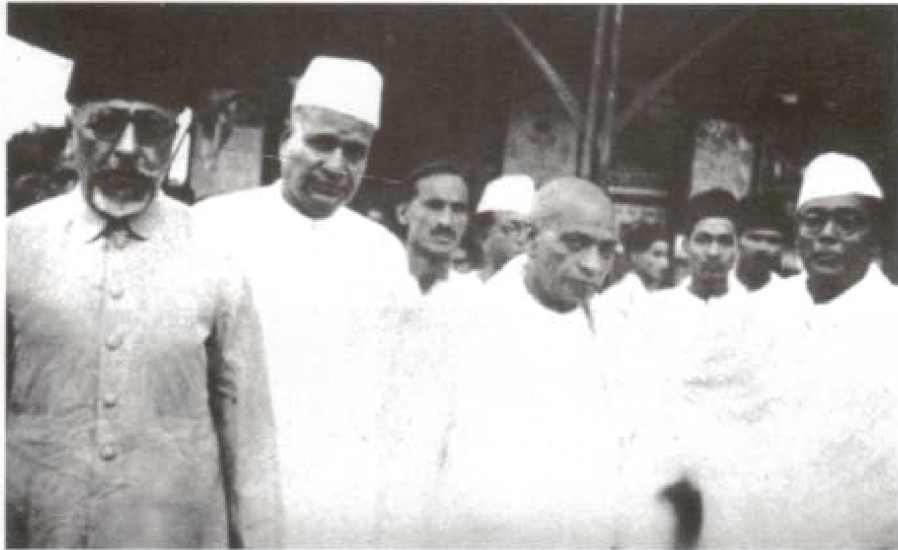




Quit India Session: With Maulana Azad Acharya Kripalani



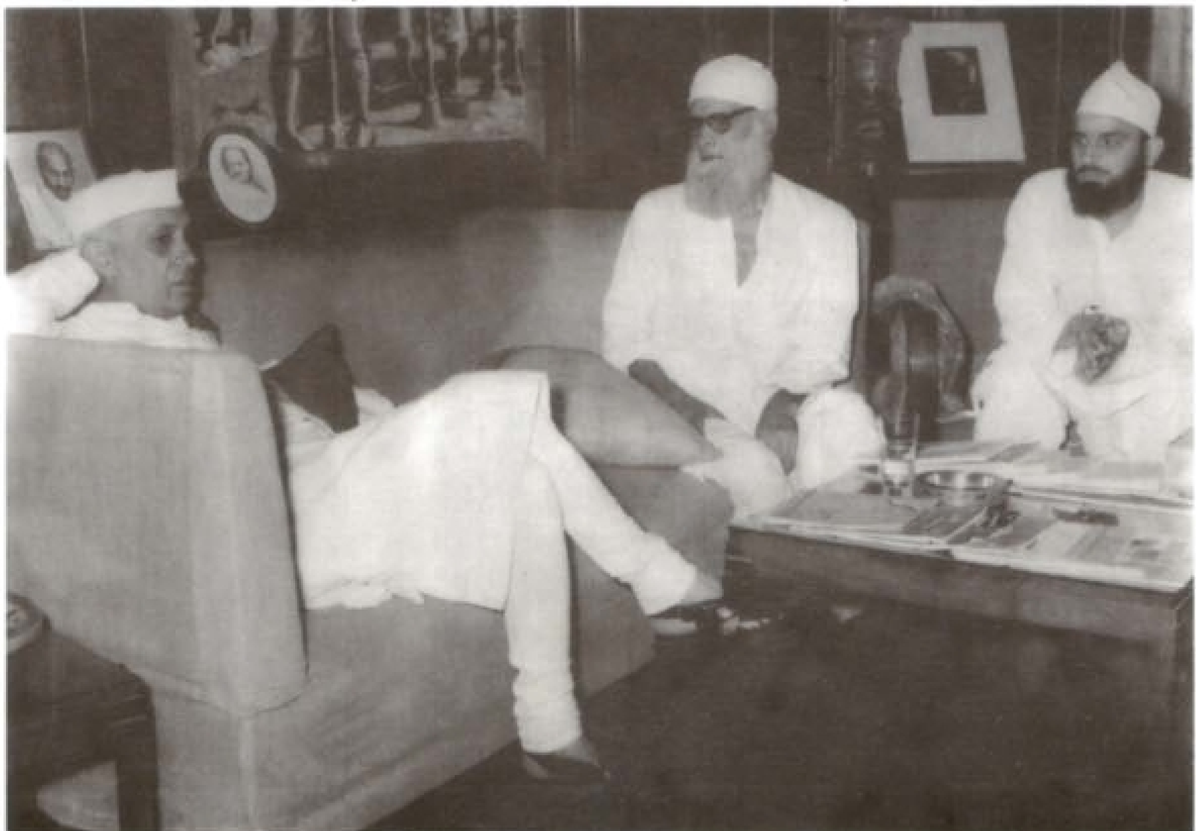








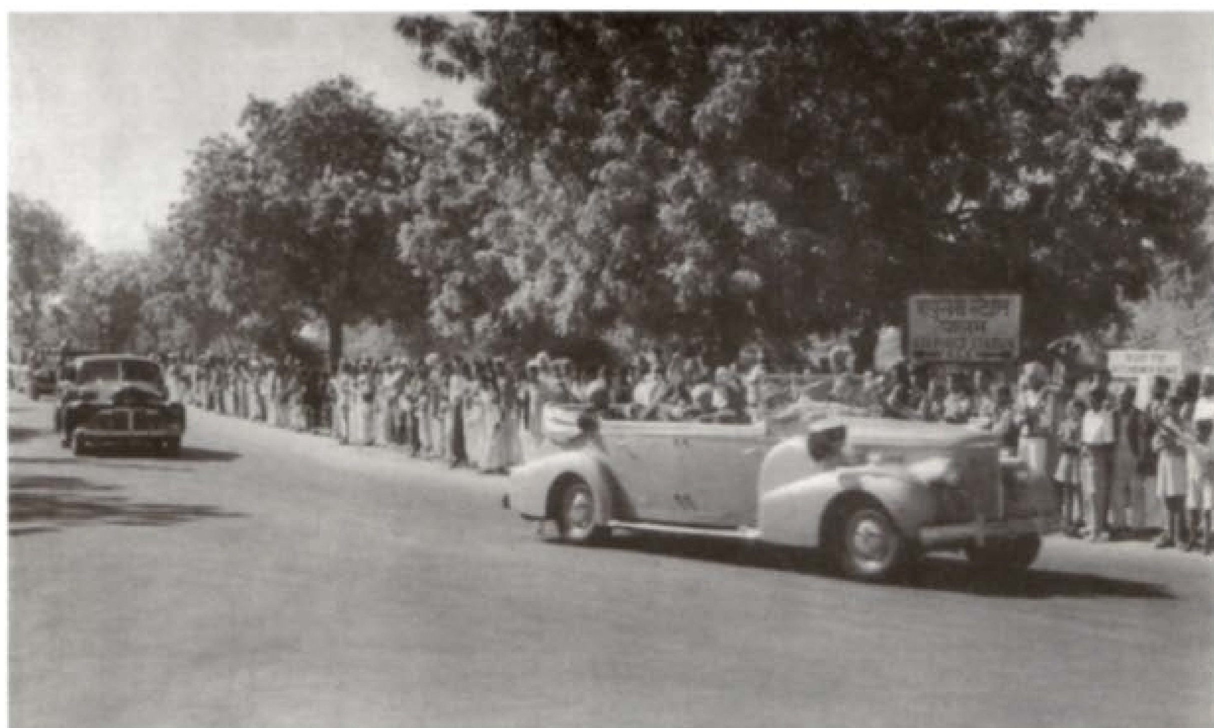
Pt. Jawahar Lal Nehru, Rais-ul-Ahrar Moulana Habib-ur-Rehman Ludhianave,
Aali Leater, Master Tara Singh, Sat Guru Partap Singh & Dr. Siaf-ud-deen Kishalu.
(Photo 1936 in Bhani Sahib, Ludhiana)



Prime Minister Pt. Jwahar Lal Nehru, Moulana Habib-ur-Rehman Ludhianvi &
Moulana Sareed-ur-Rehman Ludhianvi



















Cabinet Mission to India 1946





January 31, 1950: Members of the Central Ministry, with President Rajendra Prasad at Government House, New Delhi. Seated from left are B.R. Ambedkar, Rafi Ahmed Kidwai, Sardar Baldev Singh, Abul Kalam Azad, (Prime Minister) Jawaharlal Nehru, the President, (Deputy Prime Minister) Vallabhbhai Patel, John Matthai, Jagjivan Ram, Rajkumari Amrit Kaur, and Shyama Prasad Mookherjee. Standing, from left, are Khurshed Lal, R.R.Diwakar, Mohanlal Saxena, N. Gopalswamy Ayyangar, N.V. Gadgil, K.C. Neogy, Jairamdas Daultram, K. Santhanam, Satya Narayan Sinha and B.V. Keskar.





















۱۹۵۵ء میں سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سعود بھارت کے دورے پر آئے
تو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے رفقاء جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ہمراہ ان کا استقبال کیا۔



حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس اللہ سرہ العزیز



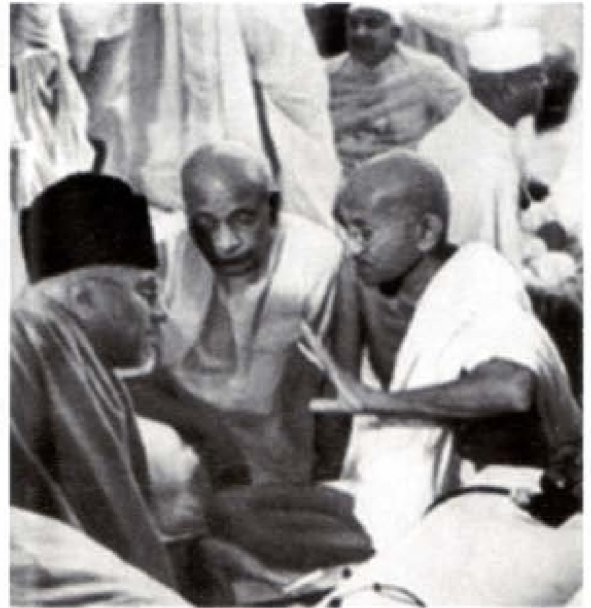




مولانا ابوالکلام آزاد کا سفر آخرت



Congress Working Committee members who met at Subhas Chandra Bose's residence in 1937. From (R to L) A. Kirpalani, Maulana Abul Kalam Azad, S. Patel, Pt. Nehru, Subhas C. Bose and Rafi A. Qidwai are seen.





Pt. Jawaharlal Nehru with Maulana Abul Kalam Azad, Abdul Ghaffar Khan, Bhulabhai Desai, Harikrishan Mehtab and Dr. Rajendra Prasad near the flag post after the flag hosting ceremony at Ramgarh session of the Congress in 1940.



The Jamiat leader, Maulana Ahmed Sayeed conducting the prayers at the thanks giving service in the Jama Masjid, Delhi on September 26 held in response to the appeal by H.E. Shri Rajagoplachari. A congregation of about 20,000 Muslims participated in the ceremony which expressed gratefulness to the Almighty for solution of the Hyderabad problem. Seated behind H.E.C. Rajagopalachri and Maulana Abul Kalam Azad

























Planning Commission meeting 1952 with the Congress working Committee on October 16, 1952. Facing Camera seen in the picture (R to L) Shri N.V. Gdgil, Maulana Abul Kalam Azad, Jawaharlal Nehru, Shri Kailashnath Katju, Shri Rafi Ahmed Qidwai, Shri Jagjiwan Ram, Shri Lal Bahadur Shastri, Shri Gulzarilal Nanda.









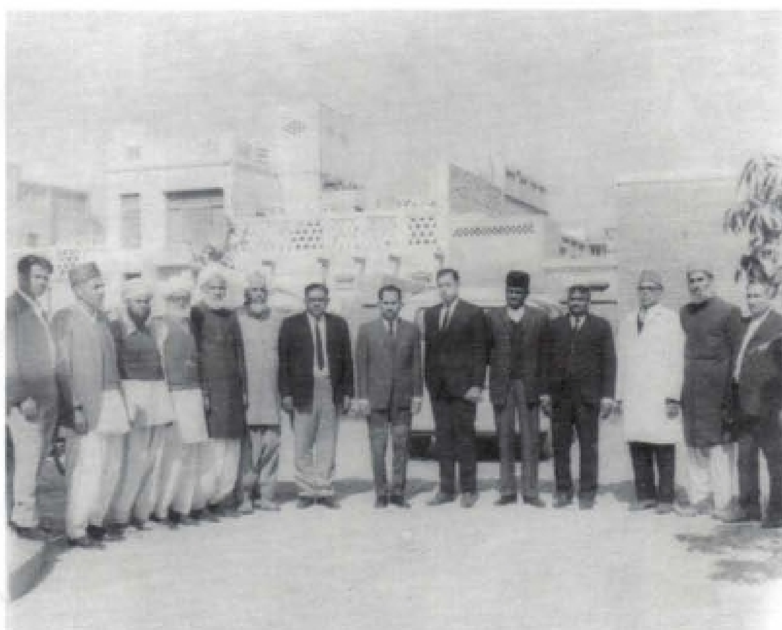






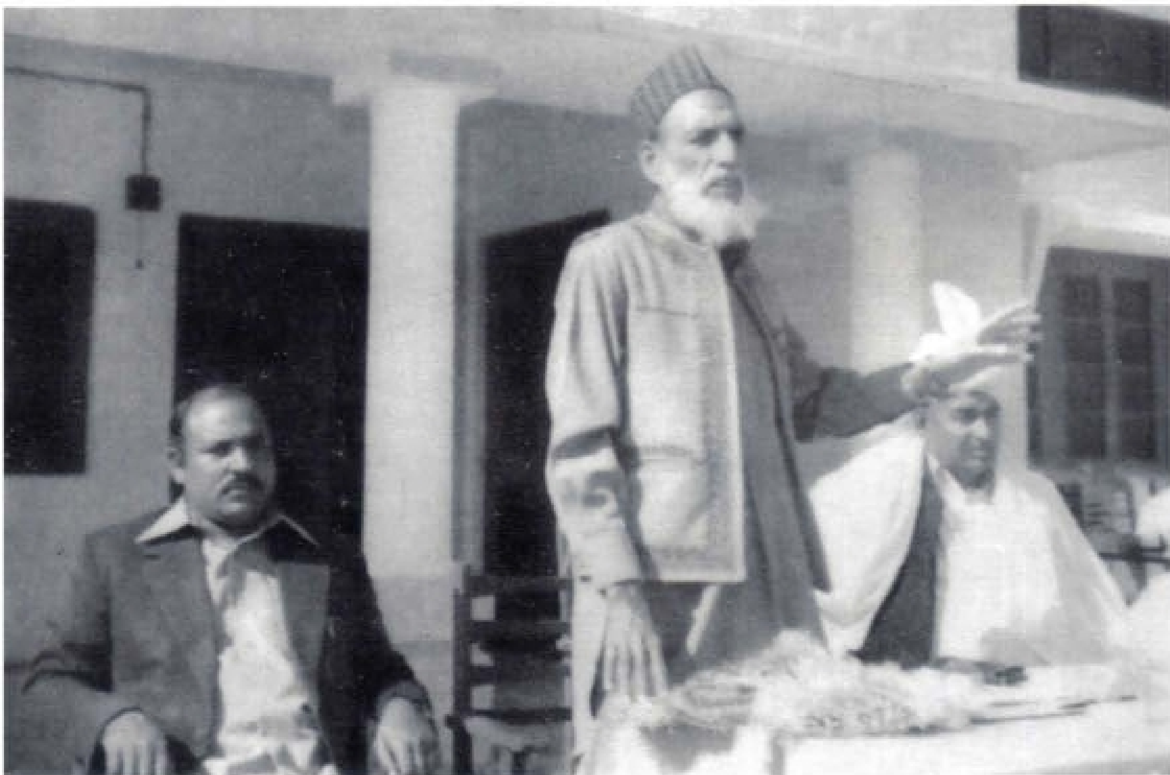








Mufti Zia-ul-Hasan with Deputy Commissioner Muzafir Qadir

















Mufti Mohammad Naeem
and his son Mufti Tayyab

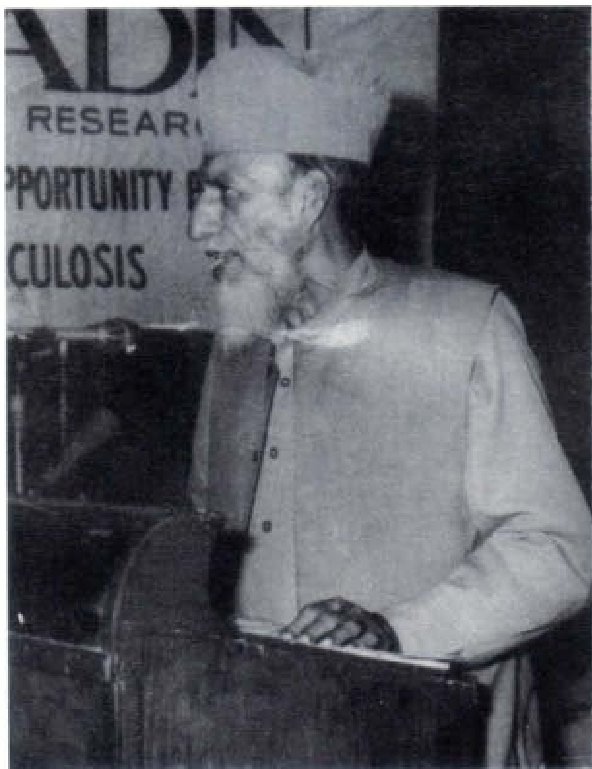


Mufti Mohammad Naeem,
Mufti Tayyab and
Mufti Zia-ul-Hassan Late



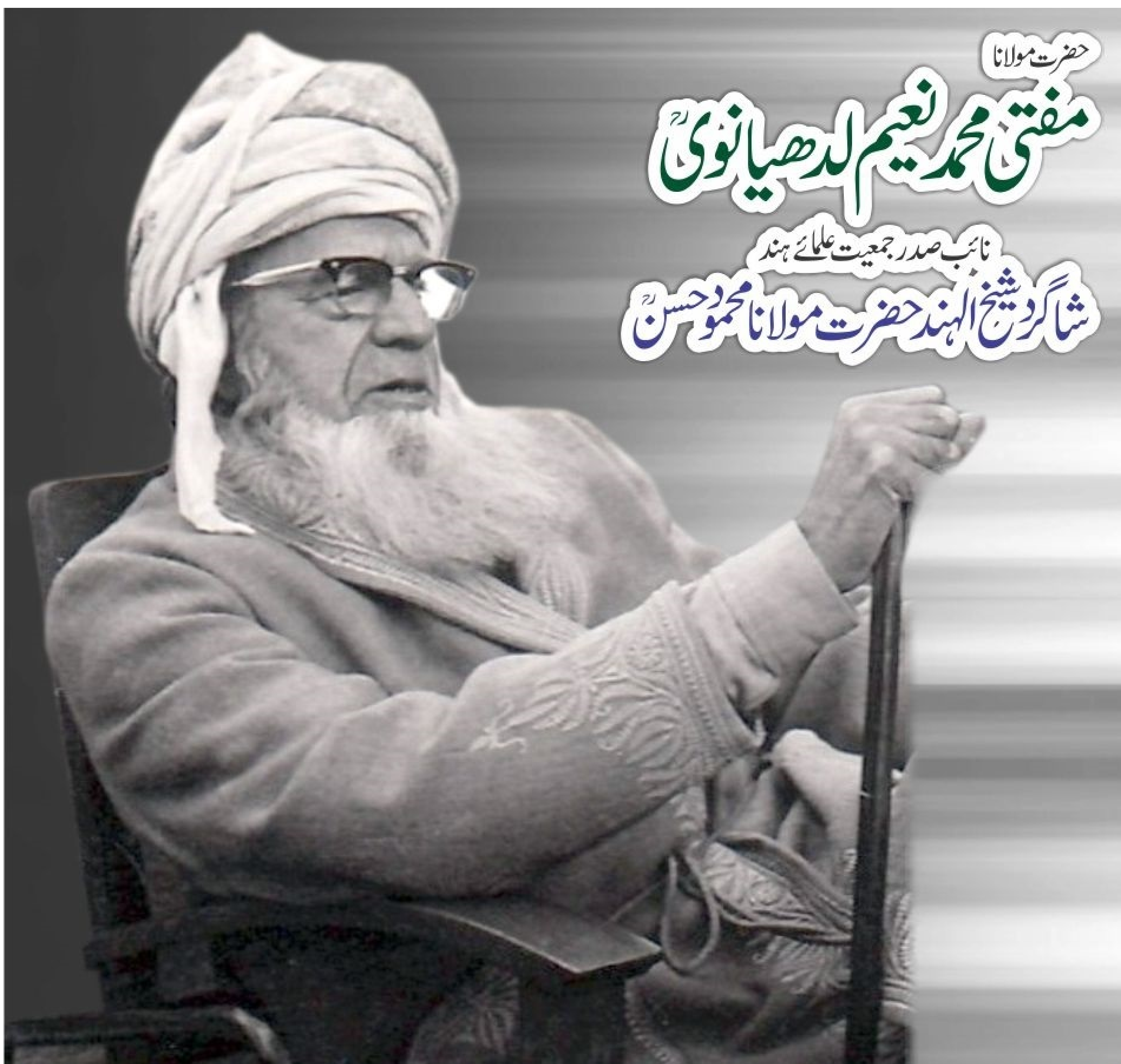


Mufti Zia-ul-Hasan with President of Pakistan General Ayub Khan



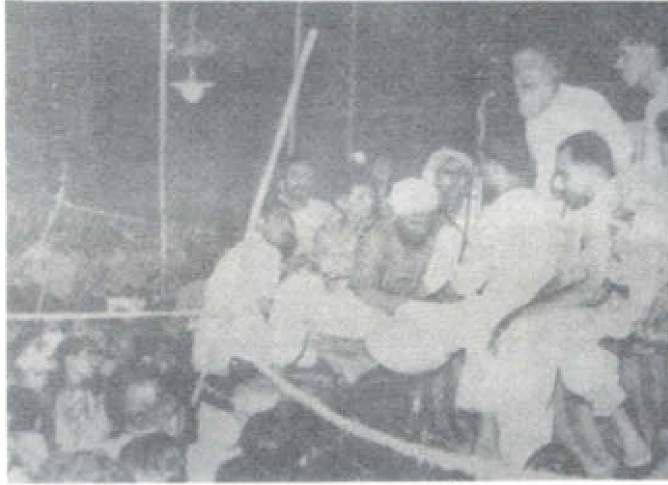


Mufti Zia-ul-Hasan Late and his father
Mufti Muhammad Naeem Ludihanavi Late



Mufti Muhammad Naeem Ludhianvi (r.a)
Vice President Jamiat Ulama e Hind





قیام پاکستان سے قبل موچی دروازہ لاہور میں ایک جلسہ سے خطاب
دائیں آغاز شورش کاشمیریؒ صدارت کر رہے ہیں۔ بائیں آپ کے فرزند سید ابوذر بخاریؒ بیٹھے ہیں



۱۹۴۲ء سرِ سکندر حیات (وزیراعلیٰ پنجاب) کے چلائے ہوئے
مقدمۂ بغاوت سے بری ہونے کے بعد لاہور ہائی کورٹ کے دروازے پر
بائیں آپ کے فرزند مولانا سیّد ابوذر بخاریؒ، دائیں گواہ استغاثہ لدھارام



مولانا ابوالکلام آزاد کا مزار



Mufti Zia-ul-Hasan with Mr. Javed Qureshi (Former Chief Secretary Punjab)



Mufti Zia-ul-Hasan with G.M. Paracha Commissioner Multan



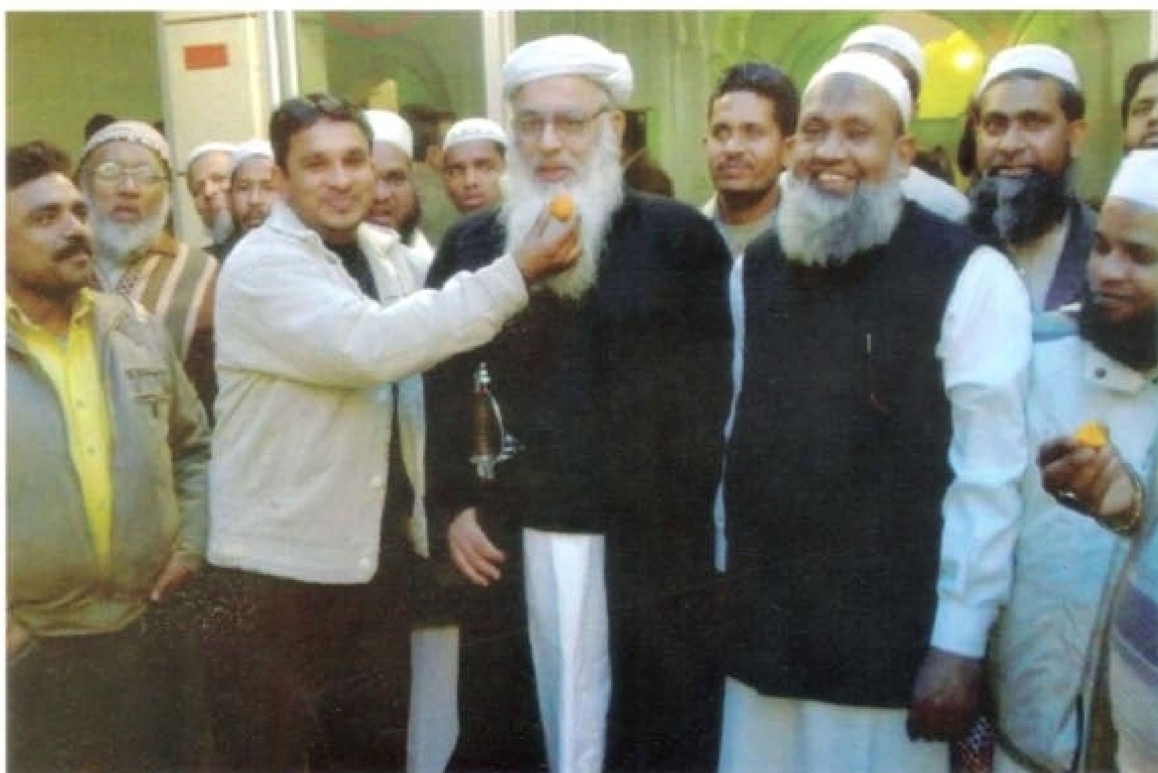


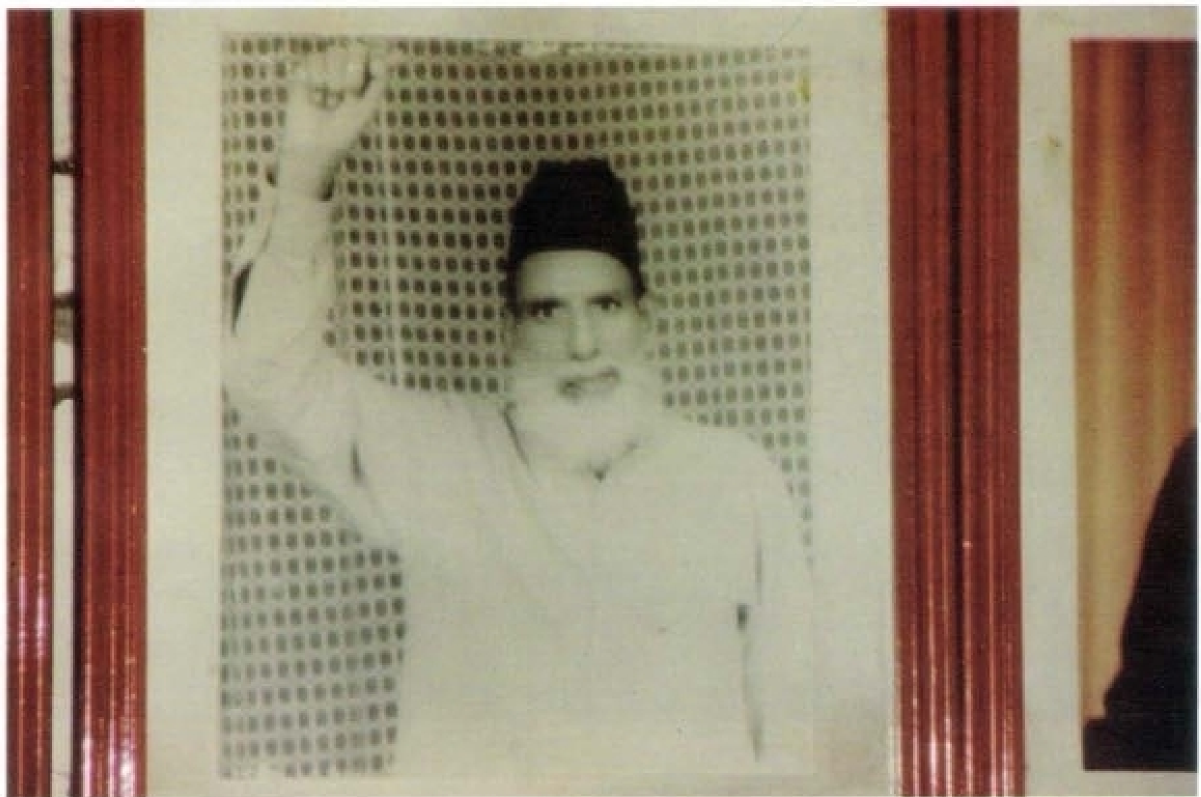




Mufti Zia-ul-Hasan Late with Deputy Commissioner











Mufti Zia-ul-Hasan with
Governor Punjab General Sawar Khan



Mufti Zia-ul-Hasan with
Governor Punjab Nawab of Kala Bagh



Mufti Zia-ul-Hasan late with Malik Binyameen
(President Sahiwal Muslim League)



Jamia Zia-ul-Quran mady by Miss Kalsoom Mufti sahiba Late



Schools made by Mufti Zia-ul-Hasan Late


Schools made by Mufti Zia-ul-Hasan Late



Schools made by Mufti Zia-ul-Hasan Late



Schools made by Mufti Zia-ul-Hasan Late

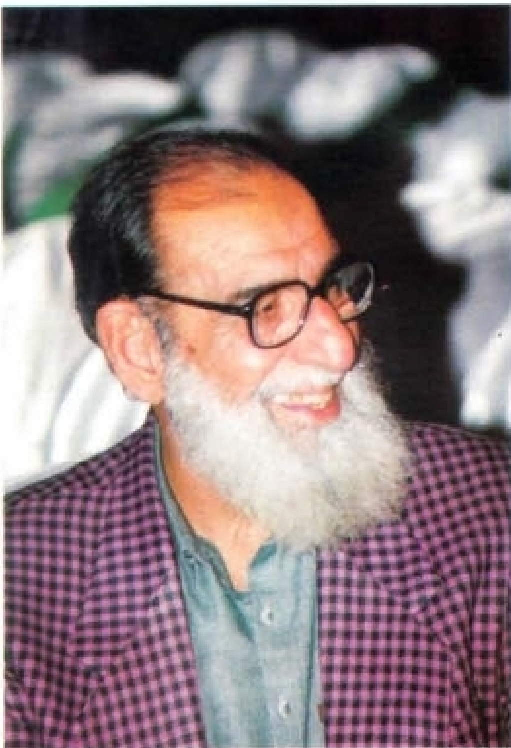


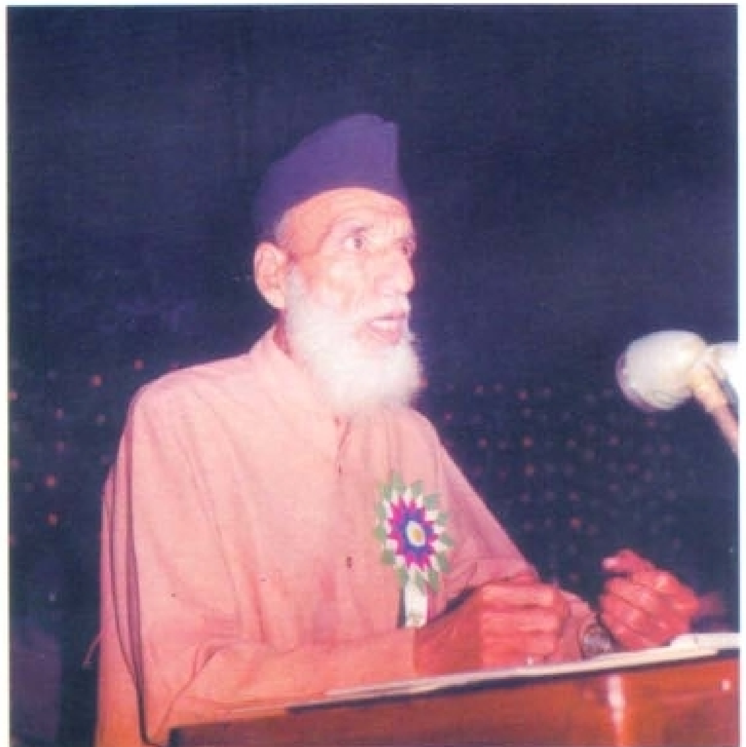




Jamia Zia-ul-Quran mady by Miss Kalsoom Mufti sahiba Late














WELCOME


WELCOME


Sucessors Organisation



Moulana Attiq-ur-Rehman Ludhianvi Grand Son of Moulana Habib-ur-Rehman Ludhianvi
with President Congress Sonia Gandhi in India.







Moulana Habib-ur-Rehman Sani Ludhianvi Reconstructing an old mosque in India






JAMIAT ULAMA-I-HIND'S
Qari Syed M
Osman Sahab
1429 H.)
Nov. 2008









Deevan Jagdeesh Chander a fmous freedom fighter of India gave a reception in honour of Mufti Zia ul Hussain Late



Doctor Deevan Norotham Chander with Mufti Zia ul Hussain in a function held in Ludihana India.





Mufti Zia-ul-Hasan Late





Mufti Zia-ul-Hasan





Schools Made by Mufti Zia-ul-Hasan Late



Schools Made by Mufti Zia-ul-Hasan Late



Mufti Zia-ul-Hasan Late with Deputy Commissioner











چند نامور شخصیاتؒ اور رئیسؒ الاحرار

رئیس الاحرار اور جواہر لال نہرو

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی سے میں بہت برسوں سے واقف ہوں۔ جدوجہد آزادی کے دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب رہے۔ اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

مولانا موصوف جس عقیدہ میں یقین رکھتے تھے اور جس جرأت اور آہنی استقامت کے ساتھ وہ اس پر قائم رہے اس کے سبب میں ہمیشہ ان کا مداح رہا اور ان کا احترام کرتا رہا.......... وہ اپنے شہر لدھیانہ میں ہندو مسلمان اور سکھ سب کے ہی محترم رہے۔ ان کے انتقال سے مجھے گہرا صدمہ ہوا...... وہ ایک جواں مرد سپاہی کی حیثیت سے ہماری آزادی کی تحریک میں یاد کیے جانے کے قابل ہیں۔

جواہر لال نہرو
وزیر اعظم ہندوستان

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور رئیس الاحرار کے تعلقات

"حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا (حبیب الرحمان لدھیانوی) سے، ان کے گھر، ان کی اولاد اور ان کے خاندان سے اس طرح مانوس تھے جیسے اپنے گھر اور خاندان سے۔ یہ واقعہ ہے کہ علامہ انور شاہ وقار و تمکنت کے ایک گوہِ گراں بار تھے۔ ہر کہ و مہ سے ان کا بے تکلف ہونا امرِ دشوار تھا اور نہ زندگی کے عام معاملات سے ان کا کوئی ربط تھا۔ مگر مولانا (حبیب الرحمان لدھیانوی) ان کی محبت یہ تھی کہ جس زمانے میں مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی ملتان جیل میں قید تھے، حضرت علامہ بغیر کسی اطلاع کے لدھیانہ ان کے گھر پہنچ گئے، گھر پہنچے تو مردانہ میں نہ جھاڑو لگی ہوئی تھی اور نہ فرش بچھا ہوا تھا، حضرت علامہ نے گھر میں مولانا کی اہلیہ صاحبہ اور ان کے بچوں کو کہلوایا کہ جھاڑ اور فرش بھیج دو۔ جھاڑو آگئی تو اپنے خدام سے فرمایا کہ بھائی! جھاڑو دو، فرش بچھاؤ یہ اپنا گھر ہے، یہاں کسی کا تکلف نہیں۔ گھر میں کون ہے جو باہر آکر ہمارے بیٹھنے کی جگہ بنائے گا۔ خود اپنا گھر بچھاؤ۔

حضرت قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ اور رئیس الاحرار کا خاندان

حقیقت یہ ہے کہ ولی اللّٰہی خاندان کی شاخ جہاں بھی چلی گئی، شاخِ طوبیٰ ہی ثابت ہوئی۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ جد امجد قاسم العلوم، مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرّہ، بانی دارالعلوم دیوبند، جب پہلے حج کے لیے کراچی سے حجازِ مقدس روانہ ہوئے، تو بادبانی جہاز ہوا ناموافق ہونے کی وجہ سے بصرہ میں لنگر انداز ہو گیا، اور کئی دن تک ٹھہرا رہا۔ مسافر بصرہ کی سیر کرنے کے لیے اُتر گئے۔ حضرت قاسم العلوم بھی اُترے مگر تفریحِ طبع کے لیے نہیں بلکہ بصرہ کے اس دور کے ایک مشہور و معروف محدث سے سندِ حدیث حاصل کرنے کے لیے، محدثِ ممدوح نے حضرت سے دریافت کیا کہ آپ کی سندِ حدیث کہاں سے ہے؟ فرمایا: شاہ عبد الغنی محدث دہلوی سے۔ فرمایا کون شاہ عبد الغنی؟ عرض کیا شاہ اسحاق دہلوی کے تلمیذ۔ فرمایا کون شاہ اسحاق؟ عرض کیا کہ شاہ ولی اللہ کے تلمیذ۔ تو جھوم کر فرمایا کہ ہاں! ولی اللہ شجرۂ طوبیٰ ہے جس طرح اہل جنّت کا کوئی قصر اور محل خالی نہ ہو گا کہ اس میں شجرۂ طوبیٰ کی شاخ پہنچی ہوئی نہ ہو۔ اسی طرح ہندوستان میں علم کا کوئی گھرانہ نہ ملے گا جس میں خاندان ولی اللّٰہی کی کوئی شاخ نہ آئی ہو۔ اور یہ فرما کر بڑی شفقت سے حضرت قاسم العلوم کو سند عطا فرمائی۔ بہر حال اسی طوبائی خاندان جنّت نشان کی علمی شاخ لدھیانہ کا علمی خاندان بھی ہے جو ولی اللّٰہی علوم اور ولی اللّٰہی جذبات کی امانت سینوں میں لیے ہوئے ہیں۔

قاری محمد طیب
مہتمم: دارالعلوم دیوبند